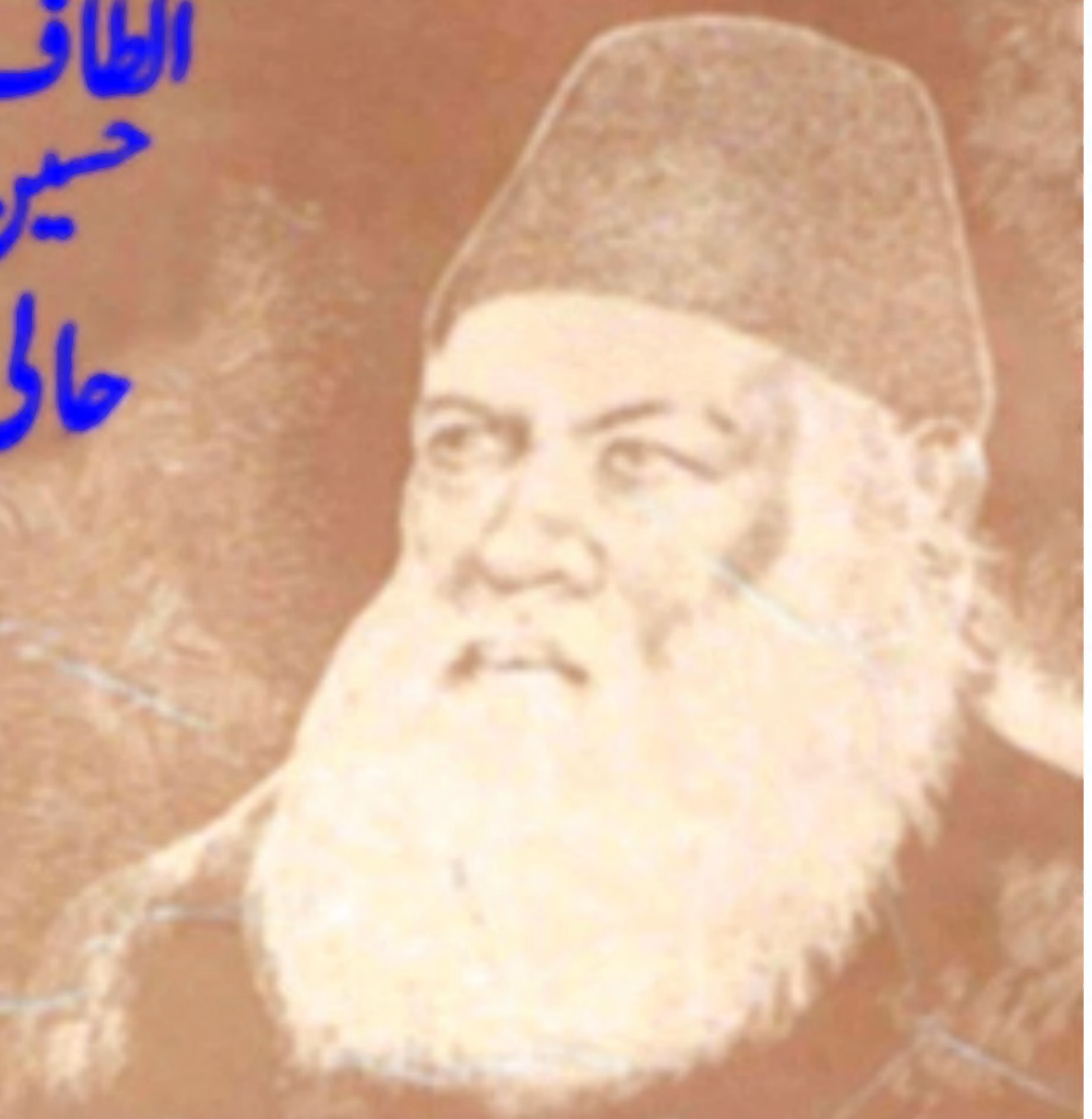


الطاف
حسین
حالی



حیاتِ جاوید

حیاتِ جاوید

جلد اول

مولانا الطاف حسین حالی

ارسلان بکس

علامہ قسطل روضہ میرپور آزاد کشمیر

حیاتِ جاوید

مولانا الطاف حسین حالی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر ————— ارسلان محمود

اہتمام ————— امجد محمود

اشاعت ————— مئی 2000ء

طابع ————— زاہد بشیر پرنٹر لاہور

کلمات ————— قاری محمد حبیب الرحمن

قیمت ————— 550/- روپے

ملنے کا پتہ : —————

ارشاد بک سیلرز

چوک شہیدان، میرپور، آزاد کشمیر

فون : 42327 (058610)

49522 - 49503

فہرست

66	تحقیقات	پہلا باب (1817ء - 1838ء)
	آثار الصنادید کا رائل ایشیائٹک	
69	سوسائٹی لندن میں پیش ہونا	25 تاریخ ولادت اور خاندان
69	آثار الصنادید پر نظر ثانی کرنا	30 سرسید کی نضیال
	آثار الصنادید کا فرانسیسی میں	36 سرسید کی والدہ
70	ترجمہ	44 بچپن
	رائل ایشیائٹک سوسائٹی میں	52 تعلیم
70	سرسید کا آنری فیلو مقرر ہونا	55 عنفوان شباب
71	تالیف رسائل مذہبی وغیرہ	
72	دلی سے بجنور کی تبدیلی	دوسرا باب (1838ء - 1857ء)
73	ضلع بجنور کی تاریخ لکھنا	
	آئین اکبری کی تصحیح اس کی	60 ملازمت
	مشکلات اور مشاہیر دہلی کی اس	63 تالیف رسائل مذہبی وغیرہ
75	پر تقریظیں	64 خطاب بادشاہی
	آئین اکبری پر اہل یورپ	فتح پور سے دلی کی منصفی پر
79	کی رائیں	تبدیلی، دوبارہ رہنگ کی صدر
	بجنور میں علاوہ فرائض منصبی	65 امینی پر جانا
	کے کمیٹی رفقاء عام کے تمام کام	کسی قدر تعلیم میں ترقی، آثار
80	سرا انجام کرنے	65 الصنادید لکھنا
		عمارات دہلی و نواح دہلی کی

تیسرا باب (1857ء - 1868ء)

صاحب ممدوح کا فرخ آباد		ایام غدر کے مصائب اور	
کے والیسیگل دربار میں ناراضی		خدمات	81
کا اظہار کرنا مگر بعد شافی		خدمات غدر کا صلہ اور تعلقہ	
جواب ملنے کے صاف ہو جانا	105	بچاؤ پور کے لینے سے	
سرکاری طور پر رسالہ مذکور کے		- انکار کرنا	93
متعدد ترجمے ہونا	106	مراد آباد کی صدر الصدوری پر ترقی	
ملک معظمہ کے اشتہار معافی کا		اور کمیشن تحقیقات جاکداد	
شکریہ پندرہ ہزار مسلمانوں		منقبہ باغیان کی ممبری	96
کے مجمع میں ادا کرنا	107	مولانا عالم علی مراد آبادی کا	
رسالہ لائل محمدز آؤف انڈیا		بغاوت کے الزام سے	
جاری کرنا	112	بری کرنا	98
رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ		ترتیب تاریخ سرکشی بجنور	98
لکھنے کی ضرورت	119	مراد آباد میں اسکول	
انتظام قحط ضلع مراد آباد	121	قائم کرنا	99
ہندو مسلمانوں کے یتیم لاوارث		درنیکر اسکولوں کے خلاف رائے	
بچوں کی بابت مشنریوں سے جھگڑا	124	لکھ کر گورنمنٹ میں پیش کرنا	99
تاریخ فیروز شاہی ضیائے ہنی کی		رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھ کر	
تصحیح	125	پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہند میں	
تبین الکلام (ابا بیل کی تفسیر) اصول		بھیجنا	102
اسلام کے موافق لکھنا	126	بعض دوستوں کا رسالہ مذکور کے	
سرمد کی چھٹی متعلق بہ تفسیر		بھیجنے سے مانع آنا	104
مذکور موسومہ جان میولسن آر نڈ اور		مسٹر سل بیڈن کا رسالہ مذکور کو	
اس پر جان میولسن کا		ایک باغیانہ تحریر خیال کرنا	105
ریکارڈ	132		
مصر کے ایک عیسائی عالم کی کتاب			

153	بنارس کی تبدیلی	136	”وحدۃ الادیان“ کا ذکر
154	ورنیکلر یونیورسٹی کے لیے تحریک		مصر کے اخبار ”اتحاد اسلامی“
158	سوسائٹی کی ترقی کی ایک خاص تدبیر	136	کا ذکر
159	ہومیوپیتھک علاج کی حمایت		تبیین الکلام پر فرانس کے مشہور
160	اردو زبان اور فارسی خط کی حمایت	137	عالم گار ساں دتاسی کی رائے
	رسالہ ”طعام المل کتاب“ اور انگریزوں	138	بی بی کا انتقال
167	کے ساتھ کھانے کا پرہیز ترک کرنا		غازی پور کی بدلی اور وہاں جا کر
	چوتھا باب (1869ء - 1870ء)	138	سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنا
	سفر انگلستان اور درخواست رخصت		سوسائٹی کی ضرورت اور اس
	میں اس سفر کی ضرورت گورنمنٹ پر	139	کے مقاصد
170	ظاہر کرنا		ڈیوک آف آرمگائل وزیر ہند
173	سفر نامہ میں حب وطن کے خیالات		نے سوسائٹی کا پیٹرن اور لغتیتٹ
177	لندن کے عائد سے ملنا		گورنران شمال مغرب و پنجاب نے وائس
	سول انجینئرس سوسائٹی کے جلسہ میں		پیٹرن ہونا منظور کیا
178	شریک ہونا اور وہاں اسپینج دینا	140	سوسائٹی کے لئے کلکتہ کا
160	سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملنا		سفر کرنا اور مجلس مذاکرہ علیہ میں
180	لطیفہ	141	سوسائٹی پر فارسی میں لکچر دینا
181	ملکہ معظمہ کی لوی میں شریک ہونا	141	غازی پور میں مدرسہ قائم کرنا
182	پرنس آف ویلز کی لوی میں جانا	143	غازی پور سے علی گڑھ کی تبدیلی
182	ابنہینیم کلب کی ممبری		سوسائٹی کا دفتر علی گڑھ میں ساتھ لانا
183	کیمبرج یونیورسٹی میں جانا	143	اور یہاں آکر اس کو ترقی دینا
	انگلستان کی تعلیم و ترقی پر غور کرنا	146	برٹش ایڈمین ایسوسی ایشن قائم کرنا
	اور انگلستان کے ناقص طریقہ		اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں
		148	قائم کرنا
		149	سوسائٹی سے اخبار نکالنا

194	پبلک پر	184	تعلیم پر پمفلٹ لکھنا
	تہذیب الاخلاق کے مقاصد اور اس		اہل وطن کی اطلاع کے لیے ولایت
195	کے مردود و مقبول ہونے کی وجہ		سے مضامین لکھ کر ہندوستان
	تہذیب الاخلاق کا بند ہونا اور پھر	186	میں بھیجنا
198	دوسری اور تیسری بار جاری ہونا	186	خطبات احمدیہ کا لکھنا اور چھپوانا
	کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم		سرید کی ریس سے ہندوستانیوں میں
199	مسلمانان قائم کرنا		ولایت کی تعلیم
	سرید کے جوش ہمدردی کی نسبت	188	کا خیال پیدا ہونا
201	محسن الملک کی ایک حکایت		نواب محسن الملک کی رائے سرید کے
	انعامی اشتہار جاری کرنا اور اس	188	سفر انگلستان کی نسبت
	پر 32 رسالوں کا لکھا جانا جن میں	189	انگلستان سے واپس آنا
201	سے تین کو انعام دیا گیا		اخبار ہوم ورڈ میل میں سرید
	رسائل مذکورہ سے ایک رپورٹ تیار	189	کی نسبت ایک آرٹیکل
	کرنا جس میں مسلمانوں کی تعلیم کے		
202	موائع بیان کیے گئے تھے		پانچواں باب (1870ء - 1878ء)
	رپورٹ مذکورہ کا گورنمنٹ ہند		
	میں اور تمام لوکل گورنمنٹوں	191	ہندوستان پہنچنا
	میں بھیجنا اور وہاں سے قابل	192	تہذیب الاخلاق جاری کرنا
203	اطمینان جوابات موصول ہونے		تہذیب الاخلاق اور لندن کے میگزین
204	کمیٹی خزانہ البضائع کا انعقاد	193	ٹیلر اور اسکینینر میں مناسبت
	کالج کے لیے کثرت رائے سے		تہذیب الاخلاق کے سب سے زیادہ
204	مقام علی گڑھ تجویز ہونا	194	سرگرم مضمون نگار
	لارڈ ناتھ بروک کا دس ہزار کا عطیہ	194	تہذیب الاخلاق کی مخالفت
	اور سرولیم میور اور مسٹر اسپنکی	194	لطیفہ
205	کی امداد		تہذیب الاخلاق کا اثر مسلمان

کالج میں اپنی یادگار قائم کیے جانے	کالج کی اسکیم مرتبہ سید محمود کا
252 سے سرسید کا انکار	گورنمنٹ میں بھیجنا اور اس کے
255 کالج کا انتظام تعلیم	متعلق مولویوں سے فتوے
256 کالج کلاس قائم ہونا	205 طلب کرنا
257 تفسیر القرآن	مولوی امداد العلی وغیرہ کی طرف
	206 سے مخالفت اور سرسید کا استقلال
چھٹا باب (1878ء - 1898ء)	چندہ کے لئے مختلف اضلاع میں سب
	کیٹیاں قائم کرنا اور سرسید کا دور
269 یسلیو کونسل کی ممبری	207 دراز شہروں میں دورہ کرنا
270 قانون نیلے چمک	206 لطیفہ
272 قانون تقرر قاضیان	209 ڈاکٹر ہنری کتاب پر ریویو
273 مسودہ قانون وقف خاندانی	ابتدائی اسکول علی گڑھ میں
	221 قائم ہونا
276 اسپیجس	مدرسہ قائم ہونے کی عجیب تاریخ
	کالج کے لیے زمین ملنے کی افسران
278 استعفا دینا	ضلع کی طرف سے مخالفت اور آخر کو
	222 چند شرطوں پر اس کا ملنا
	سرسید کا پیش لے کر
279 ممبری کونسل پر	224 علی گڑھ آنا
279 ایجوکیشن کمیشن میں شہادت	سرسید کی اسپتج کا ایک فقرہ رؤسائے
	225 ضلع علی گڑھ کے جواب میں
293 قائم کرنا	226 فونڈیشن اسٹون کا عالیشان جلسہ
296 محمدن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن	چندہ وصول کرنے کی عجیب عجیب
296 محمدن ایجوکیشنل کانفرنس	تدبیریں
305 پبلک سروس کمیشن کی ممبری	229 عمارات کالج
307 انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت	246

316	پٹیریا ٹک ایسوسی ایشن	349	کا اس واقعہ پر افسوس ظاہر کرنا
	بنگالی اخباروں کی ناراضی اور سرسید پر اعتراض کہ وہ اپنی قدیم رائے پر قائم نہیں رہے		مسلم پٹیریا ٹک لیگ واقعہ
317	ان کے اعتراض کا جواب	349	لندن کا اظہار ہمدردی
317	ان کا دوسرا اعتراض اور اس کا جواب	349	ٹائمز آف لندن کی رائے
320	کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب	350	پال مال گزٹ اور الموید کے ریمارکس
323	خطاب ملنے کی تقریب میں رؤسائے علی گڑھ کا ڈنر دینے کا ارادہ اور سرسید کا اس سے انکار	350	پاپونیر اور ٹائمز آف انڈیا کی رائے
327	ڈاکٹر آف لاز ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری	351	مسٹر پورٹر کلکٹر میرٹھ کی اسپتج
328	یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کی نسبت سرسید کی رائے	354	مسٹر آر نلڈ کی اسپتج لاہور میں
	ٹرمٹی بل پر اختلاف	357	بیشمار مرثیوں کا لکھا جانا
	کالج کے روپے میں غبن	358	ایک انگلش لیڈی کا مرہیہ
	سرسید کی وفات	330	سرسید کی وفات کے بعد مسلمانوں میں قوم کی بھلائی کا جوش اٹھنا
	وفات کی دو عمدہ تاریخیں	331	نواب لفٹیننٹ گورنر کا علی گڑھ آنا اور وائسرائے کی چشمی کا مع
	تعزیت کے ٹیلیگرام	337	چندہ میموریل فنڈ کے موصول ہونا
	نواب لفٹیننٹ گورنر کی طرف سے صاحب کلکٹر علی گڑھ کا جنازہ کی مشایعت اور دفن میں شریک ہونا	345	نواب لفٹیننٹ گورنر کی موجودگی
	ہندوستان اور ولایت کے اخباروں	347	میں 25 ہزار کا چندہ میموریل کے لیے لکھا جانا
349		349	

404	مستشار حسن کی رائے	366	سرسید کی ترقی کے اسباب
404	ہوم نیوز کی رائے	385	ملکی خدمات اور ان کے نتائج
405	برمنگھم ڈیلی گزٹ کی رائے		
405	سینٹ جیمس بجٹ کی رائے		سرکاری خدمات
406	کرئل گریہم کی رائے		
	رسالہ اسباب بغاوت کے	386	سرکاری ملازمت کی ابتدا
407	بعض نتائج	386	کام سیکھنے کا شوق
	پولٹیکل خدمات پر پالمال گزٹ	387	حسن خدمت
408	کا ریمارک	388	بے غرضی
408	آئندہ عنوان کی تمہید	389	دیانت داری
		390	آزادی
	ملکی و قوی خدمات	395	بے تعصبی اور انصاف
		397	وفاداری
410	ہمدردی کا مادہ	398	تجمنہ
410	خاندان کی محبت	399	استحقاق
411	وطن کی محبت		
411	عملی قوت		پولٹیکل خدمات
412	خارجی اسباب سے متاثر ہونا		
414	مدرسہ مراد آباد		مشرکین ممبر پارلیمنٹ کی
414	سرکاری طریقہ تعلیم پر اعتراض	401	رائے
414	بغاوت کے اصلی اسباب کا اظہار	401	مشرک کا قول
415	انتظام قحط اور قیہوں کی حفاظت		رسالہ اسباب بغاوت پر
415	رسالہ لائل محمد نر آف انڈیا	401	رائیں
416	شرح لفظ نصاریٰ	402	سرسید کی روایت
416	تفسیر بائبل	402	سر آکلنڈ کالون کی رائے

433	دسوزی کے پرائیویٹ خطوط	417	سائنٹفک سوسائٹی
438	مسلمانوں کی تعلیم کی تدبیریں	418	سوسائٹی کے بعض نتائج
438	ہندوستان کی تعلیم پر پمفلٹ	418	انجمنوں کا قائم ہونا
	انجمن خواستگار ترقی تعلیم	418	اخباروں کی اصلاح
439	مسلمانان	419	اردو، لٹریچر کی ترقی
440	تہذیب الاخلاق اور اس کے نتائج	420	اردو، ڈکشنری کا نمونہ
442	مدارس اسلامیہ کی کثرت	420	سوسائٹی کی ترقی میں کوشش
444	مولویوں کی راہوں میں انقلاب	421	غازی پور کا مدرسہ
	مسلمانوں کا سلف کی ترقیات سے	421	برٹش ایڈین ایسوسی ایشن
446	مطلع ہونا	422	ہومیوپیتھک علاج کی تائید
	عیسائی مورخوں کے الزامات	422	تعلیمی کمیٹیاں
447	رفع کرنے کا خیال پیدا ہونا	423	اردو، زبان کی حمایت
	تعصب، تقلید، توکل اور قناعت و		مسلمانوں اور انگریزوں میں میل
448	تقدیر کی مزاحمت کا کم ہونا	423	جول کا خیال
448	سیلف ہلپ کا خیال پیدا ہونا	423	رسالہ طعام اہل کتاب
450	قومیت کا خیال	424	مسٹر بلنٹ کی دعوت میں اسپتج
	اردو، لٹریچر میں انقلاب		اس اسپتج پر سربلفرڈ لائل کا
451	پیدا ہونا		تعب، اسپتج کے بعض اشارات
451	مذہبی لٹریچر میں آزادی	426	کی شرح
452	مذہبی مناظرہ کی اصلاح		نمائش آگرہ میں بعض یورپین
453	اردو، شاعری میں انقلاب	427	افسروں سے جھگڑا
	محمدن کالج کی عظمت کا	431	ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو
453	خیال پھیلنا		ولایت میں مسلمانوں کی خیر خواہی
	محمدن کالج اور اس کے نتائج	432	کے خیالات
	کی ہندوؤں	433	دسوزی کے آرٹکل

476	اطاعت کی عادت	454	میں تحریک ہونا
476	قوی لباس کا خیال		مسلمانوں میں ترقی تعلیم
480	کالج کی سوسائٹیاں	454	کے موافق
481	مذہبی تعلیم		1875ء تک مسلمانوں کی تعلیمی
483	یورپین اسٹاف	457	حالت کیا تھی؟
488	کالج پر مدبران سلطنت کی رائیں		محمدن کالج نے 19 سال میں مسلمانوں
488	سرجان اسٹریچی	457	کو کس قدر اعلیٰ تعلیم دی
489	ڈاکٹر ہنٹر		محمدن کالج کا اثر ملک کے دیگر
490	سرایلفرد لائسنس	458	حصوں پر
491	سر آکلنڈ کالون	459	تعلیم کی ابتدائی مشکلات
491	مشرکین ممبر پارلیمنٹ		شمال ہند میں عموماً "ولایت کی تعلیم
494	سرایٹونی مکڈاغل	460	کا زیادہ خیال پیدا ہونا
494	لارڈ ایگن		سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کی
495	مصنف کا ریمارک	463	تعداد کا بڑھنا
	سر سید کی دیگر تدبیریں متعلق بہ		کالج کے طلبہ کی تعداد
496	ترقی تعلیم	465	ملازمت میں
497	ہائی ایجوکیشن کی حمایت	467	محمدن کالج کی خصوصیات
497	پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت		تعلیم کے لحاظ سے کالج میں کسی
510	الہ آباد یونیورسٹی کی مخالفت	468	خصوصیت کے نہ ہونے کی وجہ
511	مصنف کا ریمارک	469	سامان تربیت
513	ٹیکنیکل ایجوکیشن کی مخالفت		بورڈنگ سسٹم سے کن فائدوں کی
515	محمدن ایجوکیشنل کانفرنس	470	توقع ہو سکتی ہے
516	سول سروس فنڈ اور سول سروس کلاس	471	قومیت کا خیال
516	کونسل کی ممبری	472	ریاضت جسمانی کے موافق
527	نیشنل کانگریس سے علیحدگی	475	پابندی وقت کی عادت

حیات جاوید

یہ ضخیم کتاب جو 1901ء میں سرسید کے انتقال کے بعد شائع ہوئی، حالی کی سات سال کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ وہ اسے کئی سال سے مرتب کر رہے تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی سرسید کو دکھائی اور نہ سرسید نے دیکھنے کی خواہش کی۔ جب سرسید کا انتقال ہو گیا تو حالی کو اس بات کا بڑا قلق ہوا کہ انہوں نے اس کا مسودہ سرسید کو کیوں نہ دکھایا تاکہ انہیں اندازہ ہوتا کہ ان کے بارے میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ سرسید کی وفات کے بعد حالی اور بھی تندی سے اس کی تکمیل میں مشغول ہو گئے تاکہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں ان کے محسن کی سیرت جلد سے جلد پہنچے اور اس سے سبق لے سکیں۔ لیکن وہ اتنی جلدی نہیں کرنا چاہتے تھے کہ کام خراب ہو جائے۔ اپنے ایک خط میں خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں: ”لوگ ہر طرف سے اصرار کر رہے ہیں کہ دو تین مہینے کے اندر اندر کتاب مکمل کر دو۔ مگر میں ہرگز کسی کی نہیں سنوں گا اور جب تک میرے حسب وخواہ سرسید کی لائف مکمل نہ ہوگی اس وقت تک اس کا شائع ہونا نہ چاہوں گا۔ عربی میں ایک مثل ہے کہ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ کام کتنی دیر میں ہوا بلکہ سب یہ دیکھتے ہیں کہ کام کیسا ہوا۔ لوگ اس بات کا لالچ دیتے ہیں کہ جس قدر جلد لائف تیار ہوگی اسی قدر کثرت سے فروخت ہوگی۔ مگر اس بات کی مجھے مطلق پرواہ نہیں۔ لائف عمدہ لکھی جائے اگرچہ اس کی ایک جلد بھی فروخت نہ ہو“ یہ ہے ایک سچے فن کار کا نقطہ نظر۔

یہ خط اپریل 1898ء کا ہے۔ دو سال بعد مارچ 1901ء میں حیات جاوید چھپ کر تیار ہوئی تو مولانا حالی نے اپنے بیٹے کو خط میں لکھا ”خدا کا شکر ہے کہ یہ فرض ادا ہو

گیا اور یہ کہنے کی کسی کو گنجائش نہ رہی کہ جس شخص نے قوم کی ایسی خدمات کیں قوم میں کسی کو اس کی لائف لکھنے کی توقع نہ ہوئی۔

اگرچہ اس سے پہلے حالی سیرت کی دو کتابیں لکھ چکے تھے۔ مگر اس کتاب کے لکھنے میں انہوں نے جو ڈھنگ اختیار کیا اور جو اصول ان کے پیش نظر تھے، ان کی تشریح کے لئے حیات جاوید کے دیباچے کا تھوڑا سا اقتباس پڑھئے۔

”ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں نہیں لکھنے دی لیکن اول تو ایسی بایو گرافی چاندی سونے کے ملمعے سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی، اس کے سوا وہ انہیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنہوں نے اس موج خیز اور پر آشوب دریا کی منجھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اترے، ان کو سب نے بھلا جانا کیوں کہ ان کو کسی کی برائی سے سروکار نہ تھا۔ وہ کہیں رستہ نہیں بھولے کیوں کہ انہوں نے اگلی بھیلوں کی لیکھ سے کہیں ادھر ادھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے، بڑے بڑے علما مفسرین کو لٹاڑا ہے، اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں۔ جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے۔ اور جس کو پالینکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے راست باز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جاسکتی ہے؟ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کمرہ پن ٹھونک بجا کر دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لڑچکر پر نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اس کی لائف سے اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیا جائے۔“

مرسید سے حالی کی عقیدت کی بڑی وجہ اس بلند مقصد اور قومی خدمت سے ان کی محبت تھی، جو مرسید کے پیش نظر تھا۔ حالی سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی رہ نمائی اور اصلاح کا جو حق مرسید نے ادا کیا اور جس طرح اپنی پوری زندگی قومی خدمت میں بسر کی وہ ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم مرسید کے عظیم الشان کاموں اور پر خلوص خدمات کو حقیقت اور صداقت کی روشنی میں دیکھے اور اس سے سبق لے اور قوی رہنا ان کی سیرت اور کارناموں سے سیکھیں کہ قوم کی خدمت کیسے کی جاتی ہے۔ لیکن ان کا منشا محض مرسید کے ”فضائل و مناقب“ بیان کرنا اور ”مدلل مداحی“ نہیں تھا۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے۔ بلکہ حالی نے پوری ایمان داری اور صداقت کے ساتھ مرسید کی خوبیاں اور کمزوریاں دکھائی ہیں اور ان کے کارناموں کو تنقیدی نظر سے پرکھا ہے، یہ ضرور ہے کہ انسان کو اپنے عزیز یا دوست کی کمزوریاں ذرا مدہم اور خوبیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس لیے اگر حیات جاوید میں مرسید کی تعریف کا پہلو ضرورت سے زیادہ بھاری معلوم ہوتا ہے تو مقام تعجب نہیں۔ جہاں تک عمداً ”مدلل مداحی“ کا سوال ہے، حالی کی تمام ادبی زندگی اور سیرت کی داخلی شہادت اس کے خلاف ہے۔ حالی نے علمی دنیا اور عملی دنیا اور عملی زندگی دونوں میں عمر بھر دیانت داری، انصاف پسندی اور صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس لیے یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ انہوں نے مرسید کے لیے جو کچھ لکھا اس میں حقیقت کی طرف پوری توجہ نہیں کی۔ دوسری طرف یہ بھی دیکھیے کہ حالی پچیس سال تک مرسید کے نہایت قریبی دوست رہے تھے اور انہوں نے ان کی سیرت اور شخصیت کو قریب سے دیکھا اور ان کے کاموں میں ان کا ساتھ دیا اور ہاتھ بٹایا تھا۔ مرسید کے مقاصد اور ان کی صفات اور ان کے نقطہ نظر کو جس طرح وہ سمجھ سکتے تھے دوسروں کے لئے مشکل تھا۔ کسی انسان کی خیریت اور کاموں کو ٹھیک ٹھیک وہی سمجھ سکتا ہے جس نے اس کے ساتھ کافی وقت گزارا ہو اور خلوت و جلوت میں اس کے ساتھ رہا ہو۔ حالی مرسید کے دوست، رفیق کار، معتقد اور دیرینہ ساتھی تھے،

اس لیے ان کی سیرت اور کارناموں سے قوم کو روشناس کرانے کا حق حالی سے زیادہ اور کس کو ہو سکتا ہے؟ چنانچہ انہوں نے حیات جاوید میں سرسید کی ایک مکمل اور جامع تصویر دکھائی اور مورخ و نقاد دونوں کے فرائض کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر انہوں نے فلسفیانہ نقطہ نظر سے سرسید کی زندگی اور کاموں کو دیکھا اور پرکھا ہے۔ اس کتاب میں سرسید کے ساتھ ساتھ قوم کی ذہنی زندگی کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے بقول آل احمد سرور ”اس میں صرف سرسید کی نہیں بلکہ پوری قوم کی ذہنی تاریخ آگئی ہے۔ حالی نے تمام مواد کو سمیٹنے اور مرتب کرنے میں بڑی قابلیت دکھائی ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ سرسید کے تمام کارناموں کا محرک مذہبی اصلاح کا جذبہ تھا“ بالکل صحیح ہے۔ اور انہوں نے سرسید‘ مذہبی خدمات پر بجا طور پر زور دیا ہے‘ سوانح عمری میں سب سے ضروری چیز وہ ہمدردی ہے جس کے بغیر سوانح نگار ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا۔ حالی کے ہاں یہ چیز موجود ہے اور اسی وجہ سے ان کی کتاب کو ”مدلل مداحی“ یا ”کتاب المناقب“ اور ایک رخی تصویر کہا گیا‘ حالاں کہ سوانح نگاری میں یہ سنگ راہ کا کام دیتی ہے۔“

حیات جاوید کی زبان اور طرز بیان بہت رواں اور سلجھا ہوا ہے باتوں باتوں میں بڑے بڑے مشکل مسائل پانی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کہیں ذہن اٹکتا ہے نہ دماغ ٹھوکر کھاتا ہے۔ ان کے ایک نقاد نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ”حیات جاوید میں تو انہوں نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے ہیں اور ہر لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے جو اپنی جگہ سے اٹھایا نہیں جاسکتا....“۔

لیکن ان سب خوبیوں کے باوجود اگرچہ ”حیات جاوید“ نے شہرت بہت پائی لیکن پھر بھی اسے اتنی مقبولیت نہ حاصل ہو سکی جتنی حالی کی بعض دوسری تصانیف کو ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ نظر آتی ہے کہ قوم کے ناشرین اور کتب فروشوں نے شروع سے اس سے بے اعتنائی برتی۔ اس قدر قابل قدر اور نتیجہ خیز کتاب کے مقابلے میں‘

جس کی قدر صرف صاحب ذوق اور علم دوست حضرات ہی کر سکتے تھے، انہوں نے زیادہ بکنے والی کتابوں کی اشاعت میں روپیہ لگانا پسند کیا اور اس لیے کتاب کی اتنی اشاعت نہ ہو سکی جتنی ہونی چاہیے تھی۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آج کل کا زمانہ تیز رفتاری کا ہے لوگوں کی مصروفیات حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں، ہر کام میں عجلت اور ہر چیز میں اختصار پسند کیا جانے لگا ہے۔ ناولوں کی جگہ مختصر افسانے نے لے لی ہے۔ کتابوں کی جگہ ان کے خلاصے پسند کیے جاتے ہیں.... اس لیے ہزار صفحے کی یہ ضخیم کتاب پڑھنا لوگوں کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔

شاید ایک اور وجہ یہ بھی ہو کہ سرسید کے بعد ان کی طرف سے غلط فہمیاں پھیل گئیں لوگ سرسید کے اصلی مقصد کو سمجھنے سے قاصر رہے اور ان کی شخصیت سے انہیں زیادہ دلچسپی نہ پیدا ہو سکی۔ اس لیے ان کی سیرت کو پڑھنے اور ان کے کارناموں کو سمجھنے کی زیادہ طلب نہ رہی۔ نئے زمانے میں ایک گروہ یعنی ترقی پسندوں نے سرسید کو انگریزی حکومت کا خیر خواہ اور ساتھی سمجھ کا ناقابل اعتنا جانا۔ دوسرے گروہ یعنی رجعت پسندوں نے ان کی وقتی مصلحت کو ان کا اصول زندگی قرار دے کر ان کی تصویر میں اپنے رنگ بھر دیے۔ یعنی ان کو پورا ابن الوقت بنا دیا۔ حالانکہ اگر ”حیات جاوید“ کا غور سے مطالعہ کیا جاتا تو ان دونوں فریقوں کی غلط فہمی دور ہو جاتی اور سرسید کا مقصد اور مشن آئینہ ہو جاتا۔ ہمارا خیال ہے کہ سرسید کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں ان کو دور کرنے کی ایک یہی صورت ہے کہ کوئی صاحب نظر مورخ اور ادیب ”حیات جاوید“ کا خلاصہ مرتب کر کے شائع کرے۔ اس طرح ایک طرف سرسید کی سیرت سے قوم روشناس ہو گی۔ دوسری طرف حالی کی یہ ادبی اور قوی محنت سوارت ہو گی اور یہ انمول کتاب جو آج کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہے قبولیت کا وہ درجہ پالے گی جس کی وہ حقدار ہے۔

یہاں ہم ”حیات جاوید“ کا ایک اقتباس دیتے ہیں جس میں حالی نے سرسید کی

ترقی کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔

”سرسید کی لائف میں جیسا کہ ان کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے بہت سی ایسی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن پر ان کی ترقیات کی بنیاد قائم کی جاسکتی ہے۔ قطع نظر ان جسمانی اور اخلاقی قابلیتوں کے جن کے بخشے میں قدرت نے بہت بڑی فیاضی کی تھی اور جن کے بغیر کوئی شخص بڑا آدمی نہیں ہو سکتا، اتفاقات حسنہ نے بھی ان کے ساتھ کچھ کم مساعدت نہیں کی۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں قدیم خاندان کی نیکیاں اور نئے خاندان کی اولوالعزمی اور ہمت مجتمع تھی۔ ان کی دوھیال سلطنت کے ایک قدیم متوسل گھرانے کی یادگار تھی اور ان کی انھیال ایک ایسے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی جس نے اپنی ذاتی لیاقت، حسین تدبیر اور علم و فضل سے اپنے اقران و امثال میں امتیاز حاصل کیا تھا اور اپنے تئیں زمانے کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ خوش قسمتی سے بچپن میں زیادہ تر اپنی انھیال ہی میں رہے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ انہوں نے اپنے نانا کا عہد اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے لائق ماموؤں کی صحبت برتی ان کی ماں ایک نیک نماؤ، سنجیدہ اور دانش مند بی بی تھیں، جن کی تعلیم و تادیب سرسید جیسے جوہر قابل کے لئے اکسیر کا حکم رکھی تھی۔ انہوں نے حسن اتفاق سے ایسی حالت میں نشوونما پائی کہ نہ ان کی حد سے زیادہ روک ٹوک ہوئی اور نہ ان کو بالکل مطلق العنان چھوڑا گیا۔ وہ پڑھتے لکھتے بھی تھے اور ہر قسم کے کھیل بھی کھیلتے تھے۔ مگر اپنے رشتے داروں کے سوا غیر جنس کے لڑکوں سے کبھی نہ ملنے پاتے تھے۔ نہ ان پر تعلیم کا ایسا بوجھ ڈالا گیا کہ قوائے جسمانی مضطرب ہو جائیں اور نہ ان کی ذور ایسی ڈھیلی چھوڑی گئی کہ جدھر منہ اٹھ گیا چل نکلے۔

ان کے والد ایک آزاد منش اور تعلقات دنیوی سے الگ تھلک رہنے والے آدمی تھے۔ گھر کے انتظام اور اولاد کی پرورش اور تربیت کا مدار زیادہ تر بالکل سرسید کی والدہ پر تھا جو باوجود فتنے اور رعب و داب کے نہایت متحمل اور بردبار تھیں۔ پس وہ بے جا تشدد اور سختی جو اولاد کی تعلیم و تربیت کے زمانے میں اکثر والدین

سے ظہور میں آتی ہے اور جس سے رفتہ رفتہ اولاد کے دل میں خود اپنی حقارت اور ذلت بیٹھ جاتی ہے سرسید پر کبھی نہیں گزری۔

جوانی کے آغاز میں سرسید کو بچپن کی نسبت کسی قدر زیادہ آزادی حاصل ہوئی وہ اکثر رتکین جلسوں میں شریک ہونے لگے اور شہر کے نوجوان-امیرزادوں سے ملنے جلنے لگے سوسائٹی کا پرچھاواں ان پر بھی پڑا اور پڑنا چاہیے تھا۔ مگر ہونہار نوجوانوں کی لغزشیں بھی ان کی اصلاح کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ ایک ٹھوکر کھا کر ایسے چوکنہ ہو جاتے ہیں کہ پھر عمر بھر ٹھوکر نہیں کھاتے۔ بھائی کی عبرت انگیز موت سے دل پر ایسی افسردگی چھائی کہ ہمیشہ کے لیے لہو و لعب سے دست بردار ہونا پڑا۔ مگر چونکہ طبیعت میں آتش گیر مادہ بھرا ہوا تھا وہ آخر کار مشتعل ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہی سودا جو عقوان شباب میں ہواد ہوس کی شکل میں ظاہر ہوا تھا بیس برس بعد حب قومی کے لباس میں جلوہ گر ہوا اور میر کا یہ شعر سرسید کے حال پر منطبق ہو گیا۔

دل عشق کا ہمیشہ حریف نہر تھا

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

جس حد تک کہ سرسید کی تعلیم ہوئی اس کو بھی ان کی ترقی کا مومہ سمجھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے جیسا کہ پہلے حصے میں بیان ہو چکا ہے 'قدیم یا جدید کسی طریقے میں پوری تعلیم حاصل نہیں کی۔ اگر وہ پرانے طریقے کی تعلیم پوری کر لیتے اور علوم قدیمہ کا رنگ ان پر پوری طرح چڑھ جاتا' پھر ممکن نہ تھا کہ کسی دوسرے رنگ کو قبول کرنے کی قابلیت ان میں باقی رہتی۔ وہ تقلید کی بندشوں میں جکڑ جاتے اور تعصب کے تویر تو پردے ان کی آنکھوں پر پڑ جاتے۔ نئے طریقے کی تعلیم بھی ان نتائج تک پہنچانے والی نہ تھی جو سرسید سے ظہور میں آئے۔ یورپ کی اعلیٰ درجے کی سویلریشن اور حیرت انگیز ترقیات جو ایک ہندوستانی طالب علم کے دل پر تعلیم کے ساتھ نقش ہوتی جاتی ہیں وہ آخر کار اس کو اپنے ملک کی ترقی سے مایوس کر دیتی ہیں 'یہاں تک کہ وہ ان کوششوں کو جو ہندوستانیوں کی ترقی اور اصلاح کے لیے کی جاتی ہیں' محض

بے سود اور لا حاصل جانے لگتا ہے۔ پس کہا جاسکتا ہے کہ سرسید کا پرانی تعلیم میں ادھورا رہنا اور نئی تعلیم سے آشنا ہونا منجملہ ان اتفاقات حسنہ کے تھا جنہوں نے قوم کی اصلاح کے عظیم الشان کام پر ہاتھ ڈالنے سے انہیں بچھکنے نہیں دیا۔“

(حیات جاوید)

حیات جاوید کی طرف سے اس وقت قوم نے جو بے توجہی برقی اس کا حالی کو بڑا قلق تھا۔ اس لیے نہیں کہ ان کی مجھے سات سالہ جاں کاہ محنت کا یہ ثمر ملا۔ اگرچہ اس کا افسوس ہوتا بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ لیکن حیات جاوید کا مصنف شہرت کا پرستار اور تحسین کا بھوکا نہ تھا۔ وہ کام کا اصلی انعام خود کام کو سمجھتا تھا۔ انہیں رنج اس بات کا تھا کہ انہوں نے اپنے نزدیک مسلمانوں کے محسن اور قوم کے ایک بے مثال فرزند کی یہ سیرت اس خیال سے لکھی تھی کہ قوم اس سے سبق حاصل کرے گی اور اپنی گرتی حالت کو سنبھالنے کی کوشش کرے گی۔ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی کو ایک خط میں کیسے دل شکستہ انداز میں لکھتے ہیں۔

”اگرچہ اس قلیل عرصے میں کتابیں توقع سے زیادہ فروخت ہو گئی ہیں مگر ایسی قدردانی سے وہی محض خوش ہو سکتا ہے جو تجارت کے سوا تصنیف و تالیف کا کوئی اور مقصد خیال نہیں کرتا۔ بلاشبہ میں نے کسی سے اشتہار یا ریویو وغیرہ کے لکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کہ مگر میرا یہ خواہش نہ کرنا اس بات کا ہرگز مقتضی نہ تھا کہ سرسید کا کوئی دوست کتاب کا بالکل نوٹس نہ لے۔ اور اخباروں کو جانے دیجئے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ جس کو سرسید کی یادگار کہا جاتا ہے.... اس میں ایک حرف نہیں لکھا گیا۔ اگرچہ میں صدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ سرسید کی لائف جیسی کہ چاہیے تھی ویسی مجھ سے نہیں لکھی گئی لیکن اسی کے ساتھ میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے باوجود اپنی ناقابلیت کے اس بارگراں کو اپنے ذمے لے کر سرسید کے تمام اصحاب اور حواریوں کو ایک فرض کفایہ سے سبک دوش کیا ہے۔۔۔“

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی بے وقعتی نے ہیرو

کی قدر بھی گھٹا دی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ آج بچپن برس بعد بھی اردو داں طبقے میں یہ احساس اور بیداری نہ پیدا ہو سکی کہ وہ اس قابل قدر کتاب کی اصلی خوبی اور بڑائی کو سمجھتی۔ حالی کی عظمت اور بڑائی حالی کی خدمات اور کارناموں کا تو ہم بہت کچھ اعتراف کرتے ہیں، لیکن حالی کی تصانیف کی طرف سے یہ بے اعتنائی برتتے ہیں! حالی اور سرسید دونوں کی ادبی، سیاسی اور سماجی خدمات کیا اس کی مقتضی نہیں ہیں کہ نہ صرف حیات جاوید بلکہ سرسید اور حالی کی کل تصانیف کو اہتمام، خوبی اور صحت کے ساتھ شائع کرایا جائے تاکہ آئندہ نسلیں ہم پر یہ الزام نہ لگا سکیں کہ ہم اپنے بہترین سپوتوں اور بہترین ادیبوں تک کے کارناموں سے بے پروائی برتتے رہے۔

صالحہ عابد حسین

پہلا باب :

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سر سید مرحوم کی لائف

پہلا حصہ

۱۸۱۷ء عیسوی سے ۱۸۳۸ء تک
۱۲۳۲ھ سے ۱۲۵۲ھ

تاریخ ولادت، خاندان بچپن، تعلیم اور عنفوان شباب

تاریخ ولادت اور خاندان

سید احمد خاں ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ باپ کی طرف سے حسینی سید ہیں اُن کا سلسلہ نسب ۳۶ واسطوں سے

سید مہدی قلی خاں وزیر فرخ سیرسہ اپنی ذریت کے ذمہ میں ترا بر بہرام خاں کے قریب ایک بڑی حویلی بنائی تھی جس میں دلیو نمانہ فیضان اور مصطل و غیرہ متعدد مکانات تھے اسکو سر سید کے ۱۲ خواجہ فرید الدین احمد سے خرید لیا تھا اور انک وہ خواجہ فرید کی حویلی کے نام سے مشہور ہے اسی حویلی کے ایک حصہ میں جو خواص پورہ کہلاتا تھا سید احمد خاں پیدا ہوئے تھے ۱۲

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے اور جیسا کہ شجرہ نسب مندرجہ خطبات احمدیہ سے پایا جاتا ہے اُن کے سلسلہ نسب میں سب سے اخیر امام حضرت امام محمد تقی ابن امام موسیٰ رضا علیہما السلام ہیں اور اسی لیے وہ اپنے تئیں تقوی سید کہتے تھے۔

جس زمانے میں کہ بنی فاطمہ کو بنی امیہ اور بنی عباس کے ظلم و ستم سے عرب اور عراق عرب میں رہنا دشوار ہو گیا تھا اور اس لیے اکثر سادات کے خاندان وطن مالوٹ چھوڑ کر دور دراز ملکوں میں جا رہے تھے اُسی پر آئوب زمانے میں کسی وقت سرسید کے اجداد بھی وامنان میں جو ایران کا قدیم مشہور شہر ہے، چلے آئے تھے اور آخر کار ہرات میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی غالباً اُن کے بزرگ مہندوستان میں پہلے ہی پہل شاہجہان کے عہد میں آنے ہیں اور اُس وقت سے اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک اُن کو اس سلسلہ علیہ کے ساتھ برابر کسی نہ کسی قدر تعلق رہا ہے۔

سید محمد دوست جو کہ سرسید پانچ پشت اوپر ہیں، دکن کی مہم میں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ تھے۔ وہ مع اپنی جمعیت کے ایک مورچہ پر متعین تھے جب اس مورچہ کو انھوں نے تنہا بلا شرکت کسی دوسرے افسر کے فتح کر لیا تو عالمگیر نے اُن کو یکم مہار کا خطاب دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن ہرات کو چلے گئے اور پھر ہندوستان میں واپس نہیں آئے، مگر لنگہٹے سید برہان نے وہاں سے آکر دلی میں سکونت اختیار کی۔ سید برہان کے بیٹے سید عماد اور اُن کے دو بیٹے سید ہادی اور سید مہدی تھے۔ سید ہادی جو کہ سرسید کے دادا تھے اُن کو عزیز الدین عالمگیر ثانی کے سہ جلوس مطابق سنہ ۱۰۰۰ ہجری میں خطاب جواد علی خاں اور منصب ہزاری ذات و پانصد سوار دو اسپہ دسہ اسپہ اور اُن کے بھائی سید مہدی کو بھی وہی منصب

اور قباد علی خاں کا خطاب ملا تھا۔ قباد علی خاں دکن چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ مگر جواد علی خاں بدستور دلی میں بادشاہ کے پاس رہے۔ جب عالمگیر ثانی کا زمانہ ختم ہوا اور شاہ عالم بادشاہ ہوئے تو سرسید کے دادا کے خطاب میں جواد الدولہ اور اضافہ کیا گیا اور عہدہ احتساب و کروڑ صوبہ شاہجہان آباد اور شانہ جلوس شاہ عالم مطابق ۱۸۸۸ء میں عہدہ قضائے لشکر عنایت ہوا اور ۱۸ شعبان سنہ ہجری کو انھوں نے دنیا سے رحلت کی۔ سرسید کہتے تھے کہ ”سید ہادی فارسی شعر کہتے تھے اور اُن کا پورا دیوان اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا جو غدر کے نہ مانے میں تلف ہو گیا۔“

سید ہادی کے بیٹے یعنی سرسید کے والد میر تقی ایک آزاد طبعت کے آدمی تھے، اگرچہ شاہ عالم کے زمانے میں اور ننگے بعد اکبر شاہ کے زمانے میں جو درجہ دربار عام اور دربار خاص میں اُن کے والد کا تھا وہی درجہ میر تقی کا بھی رہا مگر چونکہ بادشاہت صرف برائے نام رہ گئی تھی اور اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ جن لوگوں کو خطاب اور منصب و سانس کے لوازمات بھی دے سکے اس لیے جب سید ہادی کے بعد اُن کا خطاب اور منصب میر تقی کو دیا جانا تجویز ہوا تو انھوں نے اُس کو قبول کرنا مصلحت نہ سمجھا۔ مگر چونکہ اُن کو اکبر شاہ کے ساتھ شانہ ہزا دگی کے زمانے سے نہایت خلوص اور خصوصیت تھی اس لیے شاہ عالم کے انتقال کے بعد اُن کا رسوخ دربار میں پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ مٹمن برج سے پیوستہ جو مکان خوابگاہ کے نام سے مشہور تھا اور جہاں خاص خاص لوگوں کے سوا کوئی نہ جاسکتا تھا، میر تقی برابر وہاں جاتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ ”میں بار بار اپنے والد کے ساتھ اور نیز تنہا بھی اُس خاص دربار میں گیا ہوں۔“

میر تقی کے آبائی سلسلہ میں میر قطبی کے سوا جو مجذوب ہو گئے تھے اور

جن کے لوگ بہت معتقد تھے، اور کوئی باقی نہیں رہا تھا اور ان کی ننھیاں خواجہ میر درد کے خاندان سے علافہ رکھتی تھی۔ میر متقی کا موروثی مکان جامع مسجد کے قریب اس کے گوشہ جنوب مشرق کی طرف تھا جو کئی دفعہ مادر گروی اور مرثیہ گروی میں لٹ چکا تھا اور اس کے اکثر حصے منہدم ہو گئے تھے۔ دالان اور کچھ مکان جو باقی رہ گئے تھے، ان میں رہتے تھے اور دن کو جامع مسجد کے مشرقی دروازے پر جو مکانات ہیں، ان میں بیٹھتے تھے۔

اس زمانے میں شرفائے دہلی تیراکی اور تیراندازی کو ایک جوہر شرافت مانتے تھے۔ میر متقی کو ان دونوں فنوں میں کمال حاصل تھا۔ اکثر مرثیہ زادے اور شریف زادے ان دونوں فنوں میں ان کے شاگرد تھے۔ خود مر سید نے بھی تیراکی اور تیراندازی ان سے سیکھی تھی۔ مر سید کے ماموں نواب زین العابدین خاں جو قطع نظر تیراندازی کے تیر اور کانیں بنانے میں نہایت مشاق تھے، میر متقی ہی کے شاگرد تھے۔ میر متقی اپنی زندگی نہایت آزادی اور بے فکری سے بسر کرتے تھے جس کا اثر سرسید اور ان کی اولاد میں اتنا موجود تھا۔ ان کو حضرت شاہ غلام علیؒ سے جن کی خالقاہ دلی میں مشہور ہے، بیعت تھی اور شاہ صاحب ان پر پیرانہ شفقت رکھتے تھے۔ ہر روز بعد حلقہ کے ایک مرید جس کو حکم دے رکھا تھا، میر متقی کی زبانی ڈیوڑھی پہنا دیتا اور سب چھوٹے بڑوں کی خیر دعائیت پوچھ کر شاہ صاحب سے جا کر عرض کر دیتا اور جب میر متقی یا ان کے گھر میں کوئی اور بیمار ہو جاتا تو مرزا غفور بیگ صاحب خوجوی کو جو شاہ صاحب کے خلیفہ اور مریدان خاص میں سے تھے اور خود مرزا مظہر جان جاناں سے اکتساب کو چکے تھے، سلب مرض کے لیے ان کے مکان پر بھیجتے اور وہ ہمیشہ جب تک کہ بیمار کو صحت نہ ہوتی برابر آتے تھے۔

جو خاص عنایت شاہ صاحب کو میر تقی کے حال پر تھی اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب شاہ صاحب نے شدت مرض میں مرزا صاحب کی قبر کے پاس اپنے لیے قبر کھدوانے کا حکم دیا تو میر تقی نے عرض کیا کہ میر تقی آرزو یہ ہے کہ ٹھیک آپ کی بنتی میری قبر ہو۔ چنانچہ ان کے لیے بھی سروابہ تیار ہوا اور بعد انتقال کے جو ۱۵ رجب ۱۲۵۴ ہجری میں واقع ہوا، اُسی سروابہ میں شاہ صاحب کی پانسی مدفون ہوئے۔

میر تقی کے والد شہید ہادی اور خواجہ فرید الدین احمد سے جن کا ذکر عنقریب آئے گا بہت رسم و راہ تھی، میر تقی بھی والد کے انتقال کے بعد خواجہ فرید سے نہایت ادب کے ساتھ ملتے تھے اور خواجہ فرید بھی ان کے حال پر بہت مہربانی کرتے تھے۔ جب وہ ایران اور آوا کے سفر سے واپس آئے تو انھوں نے اپنی بیوی بیٹی عزیز النسا بیگم کی شادی میر تقی سے کر دی۔ اب میر تقی اپنے قدیم موروثی مکان سے اٹھ کر مہدی قلی خاں والی جلی میں جو خواجہ فرید نے خرید لی تھی آ رہے۔

میر تقی نہایت دمندار اور راست باز آدمی تھے۔ معین الدین اکبر شاہ کے ایک بھائی مرزا شمس الدین تھے جن کی طرف سے بادشاہ کے دل میں نہایت رنج اور کچھ توہمات متعلق یہ دعویٰ سلطنت تھے، اتفاق یہ کہ میر تقی کو مرزا شمس الدین سے بھی نہایت خلوص تھا اور وہ ان کے ہاں برابر آتے جاتے تھے۔ مرزا شمس الدین بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے، ان کو اپنی مسند کے برابر بٹھاتے تھے اور خاص اپنا جھنڈا پیئے کو عنایت کرتے تھے۔ اکبر شاہ نے لوگوں کی دراندازی سے ایک بار ان کو مرزا شمس الدین سے ملنے سے منع کیا، میر تقی نے ہاتھ باندھ کر کہا، کیا حضور کو فدوی کی جاں نثاری میں کچھ تردد ہوا ہے! بادشاہ نے

ہنسکر فرمایا نہیں نہیں میرے متقی نے عرض کیا تو پھر میں اپنے قدیم طریقہ کو چھوڑ کر
مفت میں کیوں رو سیاہی لوں۔ بادشاہ نے پھر کبھی اُن سے اس بات کا ذکر
نہیں کیا اور وہ بدستور مرزا شمس الدین سے ملتے رہے۔

اکبر شاہ کے اخیر زمانے میں وزارت کے اختیارات مرزا سلیم کے ہاتھ
میں جو بادشاہ کے چاہتے بیٹے تھے۔ چلے گئے تھے اور اس لیے راجہ سوہن لال
جو مرزا سلیم کی سرکار میں دیوان تھے۔ وزارت کا کام کرنے لگے تھے چونکہ میر متقی
کی راجہ سوہن لال سے موافقت نہ تھی اس لیے انھوں نے دربار کا جانا بہت
کم کر دیا تھا۔ اکثر ضروری موقعوں پر سرسید جا پا کرتے تھے۔ جب بہادر شاہ
نخست پر بیٹھے اور تمام سنبھاد دربار کی بدل گئی تو میر متقی کا دربار میں جانا بالکل موقوف
ہو گیا تھا۔ مگر جو تنخواہ قلعہ سے مقرر تھی وہ اور نور دہ کو بادشاہ کی طرف سے
سنہری روپیلی چھٹوں کے آنے کی رسم اور اسی قسم کی اور اعزازی رسمیں ان کی وفات
تک بدستور جاری رہیں۔

سرسید کی ننھیال

سرسید کی ننھیال کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ سیرت فریدیہ میں جو خود
سرسید نے اپنے نانا خواجہ فرید الدین احمد کے حالات میں لکھی ہے، مندرج
ہے یہاں ہم اُس کا خلاصہ ایک یادداشت سے جو سرسید نے سیرت فریدیہ
لکھنے سے پہلے لکھوائی تھی، اخذ کر کے لکھتے ہیں۔

سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد جو خواجہ محمد یوسف ہمدانی کی اولاد میں
ہیں اول اُن کے دادا خواجہ عبدالعزیز بعنوان تجارت دلی میں آئے تھے جو کشمیری
شال کی تجارت کرتے تھے اور انھوں نے یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اُن

کے بیٹے خواجہ اثرات تھے جن کے آٹھ بیٹے ہوئے ازاں جملہ دو شخصوں نے مختلف حیثیتوں سے بہت امتیاز حاصل کیا تھا اول خواجہ نجیب الدین جو نواح دہلی میں شاہ فدا حسین کے نام سے مشہور ہیں۔ سہروردی خاندان میں ایک نیا فرقہ رسول شاہ کے پیروں کا پیدا ہو گیا تھا۔ شاہ فدا حسین اس فرقہ میں ابتدائی عمر سے داخل ہو گئے تھے اور رسول شاہ کے جانشین مولوی محمد حنیف کے چیلے بن گئے تھے۔ شاہ فدا حسین نے تمام درسی کتابیں اپنے مرشد مولوی محمد حنیف سے پڑھیں اور جب تحصیل پوری ہو گئی تو مرشد کے حکم سے کتابیں کنویں میں ڈال دیں۔ وہ خاص کرتھاق و معارف میں بہت بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ قصوص الحکم، فتوحات مکیہ اور دیگر تصنیفات شیخ اکبر اور دیگر قائلین وحدت وجود کی بہت خوبی سے پڑھاتے تھے۔ مگر وضع یہ تھی کہ چار ابرو کا صفایا کیے ایک غرقی باندھے اور سارے بدن پر بھوت ملے بیٹھے رہتے تھے۔ جب حجرہ سے باہر نکلتے تو تہجد گھنٹوں تک پیٹ لینے اور سر پر ایک مثلث رد مال باندھ لیتے تھے ایک بار اکبر شاہ نے ان کے پاس آنا چاہا مگر انھوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ سر سید کہتے تھے کہ ”وہ نہایت خوش خلق اور خوش تقریر تھے جب میرے والد کا انتقال ہوا تو میری والدہ کو جوان کی بھتیجی تھیں اپنے پاس بلا کر ایسی عمدہ تقریر کی کہ اب تک اس کا لطف میرے دل سے نہیں بھولا۔ دلی میں ان کے دیکھنے والے اب تک موجود ہیں۔ وہ آخر عمر میں الور چلے گئے تھے اور ۱۲۵۹ھ میں وہیں انتقال کیا اور وہیں رسول شاہیوں کے تکیہ میں جو جمیلی باغ کہلاتا ہے۔ ان کا ڈھیر ہے۔“

دومرے مر سید کے حقیقی نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ جو اپنے خاندان میں سب سے زیادہ با اقبال لائق و انتمند صاحب علم و فضل اور خاص کر ریاضیات میں وحید عصر تھے۔ انھوں نے لکھنؤ

جا کر علامہ تفضل حسین خاں سے جب کہ اصناف الدولہ زندہ تھے ریاضی کی تحصیل تکمیل کی تھی خواجہ فرید ریاضی میں محض اور مسائل متوسطات جو ان کے نام سے مشہور ہیں، نہایت تحقیق سے پڑھاتے تھے اور زینچ اور آلات رصد کے علم میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ وہ خود آلات رصد کے بنانے اور رصد کرنے پر قادر تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے ریاضی کی تحصیل کی اور اس میں کمال بہم پہنچایا اور نامور ہوئے۔ انہیں جملہ مولوی کرامت علی مولوی رجب علی خاں، خواجہ محمد ناصر جان اور حکیم رستم علی خاں ان کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ خود ان کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین خاں جو فنون ریاضی میں طوید لی رکھتے تھے انھیں کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۲ء میں جب طالب علمی کے ارادے سے پہلی ہی بار میرا ولی جانا ہوا اس وقت زین العابدین خاں زندہ تھے۔ اور دلی میں ان کی ریاضی دانی اور فنون ریاضی میں سے خاص کر موسیقی کے علم و عمل کی بہت بھرت تھی۔

میرتید کہتے تھے کہ ”خواجہ فرید کے تصنیف کیے ہوئے چھوٹے چھوٹے متعدد رسالے علم ہیئت اور آلات رصد کے باب میں تھے جو ایام غدر میں ضائع ہو گئے مگر ان میں سے تین رسالے خود انھیں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خلیفہ سید محمد حسن خاں مرحوم وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کی عنایت سے دستیاب ہوئے ہیں جن کو مدرسۃ العلوم کے کتب خانہ میں داخل کر دیا ہے۔“ انھیں میں ایک

۱۔ یعنی مولوی کرامت علی خلیفہ مولوی حیات علی جو دلی کے مشہور عالم تھے اور اخیر کو حیدر آباد چلے گئے تھے۔ ۱۲۰

۲۔ یعنی اسطو جاہ مولوی سید رجب علی خاں جنھوں نے پنجاب گورنمنٹ میں نہایت رسوخ پایا تھا۔ ۱۲۰

۳۔ یہ حضرت خواجہ میر درد کے سجادہ نشین تھے۔ ۱۲

رسالہ ہے فوائد الافکار فی عمال الفرجاء اس کے دیباچہ میں انھوں نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے ان کی اعلیٰ درجہ کی ذہانت اور ریاضی کے ساتھ جو ان کو فطری مناسبت تھی اس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

خواجہ فرید لکھنؤ کے پہلے سفر میں دو تین برس وہاں رہ کر ریاضی کی تکمیل کے بعد دلی واپس چلے آئے تھے۔ یہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا تھا۔ ۱۲۱۲ھ میں وہ پھر لکھنؤ گئے۔ ان کے جانے کے بعد اسی سال آصف الدولہ نے قضا کی اور معاون علی خاں ان کے جانشین ہوئے۔ اسی زمانہ میں مدرسہ کلکتہ کے لیے جس کو انگریزوں نے قائم کیا تھا، ایک سپرنٹنڈنٹ کی ضرورت ہوئی اور لکھنؤ کے یورپین عہدہ داروں کی سفارش سے خواجہ فرید اس عہدہ پر مقرر ہوئے۔ ساتھ ساتھ سورہہ یا ہوار مقرر ہو کر کلکتہ چلے گئے۔

اس کے بعد مارکونس اوف ولزلی کو جو اس زمانہ میں گورنر جنرل تھے ایک خاص مقصد کے لیے جس کی تفصیل سیرت فریدیہ میں درج ہے، ایران میں سفارت بھیجنے کی ضرورت ہوئی۔ ۱۸۰۳ء میں مسٹر لوٹ کا اسٹون کے ساتھ خواجہ فرید کا بھیجا تجویز ہوا۔ مگر راہ میں مسٹر لوٹ بیمار ہو کر واپس چلے آئے اور گورنر جنرل کے حکم سے اکیلے خواجہ فرید بطور مستقل سفیر کے بوشہر مونتے ہوئے۔ طہران میں پہنچے اور فتح علی شاہ قاجار کے دربار میں حاضر ہوئے اور مقاصد سفارت کو جن میں سب سے زیادہ

۱۔ سیرت فریدیہ جس میں سر تید نے اپنے مانا خواجہ فرید کا حال لکھا ہے اس میں یہ دیباچہ بھی نقل کیا چونکہ اس کا معنوں و لہجے سے خالی نہیں ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خلاصہ اردو زبان میں اس مقام پر لکھ دیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "کتب ریاضی کے کسی حاشیہ میں سیرت فرید سے گزرتھا کہ آلات ریاضی میں سے ایک آلہ تھا جس کو پرکار تناسب کہتے تھے اس سے اکثر اعمال بخوبی اور بعض اسکاں ہندسی اور مسائل حسابی آسانی سے حل ہو جاتے تھے مگر چونکہ اب وہ آلہ مفقود ہے اس لیے اس کا علم اور عمل بھی باقی نہیں رہا۔"

اہم یہ امر تھا کہ ایران کی طرف سے ہندوستان میں بجائے حاجی خلیل خاں مقتول کے دوسرا سفیر بھیجا جائے، پنجابی انجام دیا، اور محمد نبی خاں کا ایران کی طرف سے بطور سفیر کے ہندوستان میں بھیجا جانا تجویز ہو گیا۔

اس کے بعد گورنمنٹ انگریزی نے خواجہ فرید کو آوا واقعہ برہما میں ایک پولیٹیکل معاملہ کے طے کرنے کو بطور ایجنٹ کے مقرر کر کے بھیجا۔ وہاں سے آئے کے بعد جب کہ ملک بند لکھنؤ فتح ہو چکا تھا پر گناہات اگاسی وغیرہ جواب ضلع باندہ میں شامل ہیں، مالگنداری وصول کرنے کے لیے عہدہ تحصیلداری پر مقرر ہوئے، اس زمانہ میں تحصیلداروں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی بلکہ کل زمانہ مالگنداری میں سے کچھ فیصدی حتیٰ التحقیل ملتا تھا جب یہ انتظام نہ رہا اور زمانہ حال کے موافق تحصیلدار مقرر ہونے لگے تو وہ اس عہدہ سے کنارہ کش ہو کر باقاعدہ تیرہ برس بعد آئی میں واپس آئے مگر چند روزہ کر پھر کلکتہ چلے گئے۔

۱۸۳۱ء ہجری میں اکبر شاہ ثانی نے ان کو کلکتہ سے بلا کر خلعت وزارت اور خطاب دربار الدولہ امین الملک مصلح جنگ عنایت کیا، انھوں نے ایام وزارت میں اس وجہ سے کہ بادشاہ بہت قرضدار ہو گئے تھے، قرضہ ادا کرنے اور آمدنی و خرچ برابر کرنے میں بہت کوشش کی، شاہزادوں اور بیگمات اور عہدہ شاہی کی تنخواہوں میں سے دس فیصدی تنخواہ کم کر دی، بڑا خاصہ اور چھوٹا خاصہ جن میں زر کثیر صرف ہوتا تھا اور بعضے اور غیر ضروری کارخانے یک قلم موقوف کر دیئے اس کے سوا

انے بڑا خاصہ وہ کھانا کھلاتا تھا جو تمام ملازموں، عہدیداروں، خواصوں اور باری داروں کو بادشاہ کی طرف سے ہر روز دونوں وقت دیا جاتا تھا، چھوٹا خاصہ وہ کھانا کھلاتا تھا جو ہر روز نیا ہو کر محل میں بھیجا جاتا تھا اور درباری امیر یا حکیم جو اپنی باری یا کسی اور ضرورت سے قلعہ میں رہ جاتے تھے ان کو محل سے بھیجا جاتا تھا ۱۲

دیوان عام کی تائبہ کی چھت جو شاہ عالم کے عہد میں بھاؤ مرہٹے نے سنہری ملمع کے سبب خالص سونے کی سمجھ کر اکھڑا ڈالی تھی اور وہ اُس وقت سے اکھڑی پڑی تھی اس کا سونا الگ اور تانبہ الگ کر کے جتنا تانبہ نکلا اُس کے شاہی نمکسالی میں پیسے بنوا ڈالے اور سونا فروخت کر دیا۔ ان تدبیروں سے کئی لاکھ روپیہ کا قرضہ ادا کیا گیا۔ اب آمدنی اور خرچ برابر ہو گیا اور سب کی تنخواہیں جو کئی کئی مہینے بعد ملتی تھیں ماہ بسا ملنے لگیں۔ لیکن قلعہ میں اُس سے عام ناراضی پھیل گئی اور آخر کار اُن کو عہدہ وزارت سے کنارہ کش ہونا پڑا اور وہ پھر کلکتہ چلے گئے۔

ایک بار پھر خواجہ فرید کو بادشاہ نے کلکتہ سے بلا کر عہدہ وزارت سپر ماسور کیا مگر اس دفعہ بھی چند وجوہات سے تین یا ساڑھے تین برس وزارت کا کام انجام دے کر یہ اصلاح جرنیل اختر لونی کے جوڈلی میں رنڈ پڑنٹ تھے آخر کار استعفا دیدیا۔ دوسری بار وزارت سے علیحدہ ہونے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے معقول سفر خرچ اور اپنا معتمد بھیج کر خواجہ فرید کو لاہور بلا دیا۔ مگر جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا وہ اپنی بڑی بیٹی یعنی سرسید کی والدہ کے سمجھانے سے لاہور نہیں گئے اور سفر خرچ واپس کر دیا اور پھر اخیر وقت تک باوجود کی قلعہ کی طرف سے ایک دفعہ پھر بلاؤ ہوئی انھوں نے کوئی تعلق اختیار نہیں کیا اور ۱۸۴۸ء میں انتقال کیا۔ ان کی تاریخ وفات اس جملہ سے کہ ”جایہ بہشت یافتہ“ بلکہ وکاست نکلتی ہے۔

دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد ایک حکیم مشرب یا صوفی منش آدمی تھے ایک زمانے میں وہ بھی اپنے بھائی شاہ فدا حسین کی طرح رسول شاہیوں میں داخل ہو گئے تھے اور مٹکا شاہ جو رسول شاہ کے ایک ممتاز پیلے تھے، اُن کے مرید ہو گئے تھے۔ چونکہ اس طریقہ میں یہ ضرور نہیں ہے کہ خواہ مخواہ چارابرو

کا صفایا کریں بلکہ دنیا دار اور متاہل لوگ بھی اس طریقہ میں داخل ہوتے ہیں اسلئے
دبیر الدولہ نے مرنے سے دو برس پہلے تک کبھی ڈاڑھی مونچھ نہیں منڈوائی مگر
مرنے سے دو برس پہلے ان کو یہ خیال ہوا کہ ایک دفعہ تو مرشد کی پوری پوری پیری
کرنی بھی چاہیے۔ آخر ایک دن چارہ ابرو کا صفایا کرادیا۔ شہر میں اس کا بڑا چرچا
ہوا اور لوگوں نے بہت کچھ طعن و تعریض کی مگر انھوں نے اُس کی کچھ پروا نہیں کی
لیکن ایک دفعہ کے سوا کچھ بھی ایسا نہیں کیا۔ سرسید کہتے تھے کہ، جب انتقال ہوا
تو ان کی ڈاڑھی کسی قدر بڑی ہو گئی تھی۔

دبیر الدولہ کے دربیٹے تھے جو سرسید کے ماموں ہوتے تھے۔ بڑے کا نام
وجید الدین خاں جو مرزا جہانگیر کے بیٹے تیمور شاہ کی سرکار میں مختار تھے۔ یہ بعد فتح
دہلی کے فوج کے کسی سپاہی کی گولی سے غاز پڑھتے ہوئے مارے گئے۔ دوسرے
نواب زین العابدین خاں جن کو ان کے والد کی وفات کے بعد دبیر الدولہ کا خطاب
بادشاہ نے دیا تھا۔ ان کو قدیم ریاضی میں اعلیٰ درجہ کی دنگاہ تھی یہ تمام آلات
رصد اپنے ہاتھ سے بناتے تھے۔ انھوں نے ایک بہت بڑے قطر کا برنجی گرہ
اور برنجی اصطراب نہایت عمدہ بنایا تھا۔ نیز بہت سے آلات جن کی تفصیل،
سیرت فرید میں مندرج ہے ان کے ہاتھ کے بنے ہوئے موجود تھے۔ ان میں ایجاد
و اختراع کا بڑا ملک تھا۔ انھوں نے پتنگ بنانے کے اصول وضع کیے تھے اور اس
باب میں ایک رسالہ لکھا تھا جو غدر میں ضائع ہو گیا۔

سرسید کی والدہ کا حال جو سیرت فرید یہ میں لکھا ہے یا ہم نے دلی میں سرسید
کے رشتہ داروں سے اور خود سرسید سے سنا ہے۔ چونکہ اُس کو سرسید کی تربیت
اور ان کے اخلاق و عادات بلکہ ان کے تمام واقعات زندگی میں بہت بڑا دخل
ہے، اس لیے ہم اس کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ سرسید کے والد

میر متقی جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، ایک نہایت آزاد منش آدمی تھے۔ حضور صاحب سے شاہ غلام علی صاحب کے مرید ہو گئے تھے ان کی طبیعت میں اور بھی زیادہ بے تعلقی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے اولاد کی تعلیم و تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرسید کی والدہ پر تھا۔ سرسید سے ایک دفعہ ان کے بچپن کے حالات پوچھے گئے تو انھوں نے یہ جواب دیا کہ میری تمام سرگزشت کے بیان کو یہ ایک شعر کافی ہے۔

۷ طفلی و دامانِ مادر خوش بہشتے بودہ است

چوں بپائے خود رواں گشتیم سرگر داں شمیم

سرسید کی والدہ خواجہ فرید کی بیویوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان میں قدرتی قابلیت معمولی عورتوں سے بہت زیادہ تھی، وہ صرف قرآن مجید پڑھی، زونہی تھی اور ابتدائی کچھ فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں مگر اولاد کی تربیت کا ان میں خدا راکھ تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ جب میں ان کو سبق سنا تا یا ان کے سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ ایک لکڑی جس میں سوت کی گندھی بوٹی تین لڑکیاں باندھ رکھی تھیں اپنے پاس رکھ لیتیں۔ وہ خفا تو اکثر ہوتی تھیں مگر ان سوت کی لڑکیوں سے کبھی مجھے مارا نہیں۔

سرسید لکھتے ہیں کہ ”جس زمانے میں میری عمر گیارہ بارہ برس تھی میں نے ایک نوکر کو جو بہت پُرانا اور بڑھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا، والدہ کو بھی خبر ہو گئی تھوڑی دیر بعد جب میں گھر میں آیا تو انھوں نے نہایت ناراض ہو کر کہا کہ اس کو گھر سے نکال دو۔ جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا، چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لا کر چھوڑ دیا۔ اسی وقت میری خالہ کے گھر سے جو بہت قریب تھا دوسری ماما نکلی اور خالہ کے پاس لیگئی انھوں نے کہا ”دیکھو آجی تم سے بہت

ناراض ہیں، میں تم کو کوٹھے پر ایک مکان میں چھپا دیتی ہوں وہاں سے باہر نہ نکلنا ورنہ وہ ہم سے بھی ناراض ہو جائیں گی۔ میں تین دن تک وہاں چھپا رہا۔ تیسرے دن خلد صاحبہ مجھے والدہ کے پاس لے گئیں تاکہ قصور معاف کرائیں۔ انھوں نے کہا اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے گا تو میں بھی معاف کر دوں گی۔ جب میں نے ڈیڑھ ہی میں نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تب قصور معاف ہوا۔

سرستید کی والدہ کی دانشمندی اور دوساندریشی ذیل کی حکایت سے بخوبی ظاہر ہوتی ہے سرستید کہتے تھے کہ ”جب دبیر الدولہ نے دہلی سے دوسری بار استعفا دیا تو کچھ دنوں بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنا محترمہ اور ایک معقول رقم سفر خرچ کے لیے اُن کے پاس بھیجی اصل لاہور بلایا۔ سلا کنبہا چاہتا تھا کہ وہ منظور کر لیں مگر اُن کی بڑی بیٹی یعنی میری والدہ نے کہا کہ خدا نے آپ کو اس قدر دیا ہے کہ جس طرح چاہیں آپ آرام سے بسر کر سکتے ہیں اور اس سے کچھ اور زیادہ ہو جائے تو بھی آپ کے آرام و آسائش میں کچھ زیادتی نہیں ہو سکتی۔ آپ کا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عملداری میں جانا اور اس سلطنت کے اختیارات لینے اور ہم سب کا انگریزی عملداری میں رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا میں تو ہرگز صلاح نہیں دیتی کہ اس صنیعی کے زمانے میں کہ آپ کی طبیعت بھی اکثر علیل رہتی ہے۔ آپ لاہور کا ارادہ کریں۔“ دبیر الدولہ کے دل پر اُن کے کہنے کا ایسا اثر ہوا کہ لاہور جانے سے انکار اور سفر خرچ واپس کر دیا اور پھر کبھی کوئی تعلق اختیار نہیں کیا۔

سرستید کا بیان ہے کہ ”میرے بڑے بھائی کے مرض الموت میں والدہ ہر وقت اُن کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ ایک مہینے تک یہی حال رہا۔ جب انکا انتقال ہو گیا سب لوگ گریہ و زاری کرنے لگے۔ والدہ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ اتنے میں صبح کی نماز کا وقت ہو گیا۔ انھوں نے وضو کر کے نماز پڑھی اور اشراق

ایک مہینے ہی پر بیٹھی رہیں، انھیں دنوں میں ایک رشتہ دار کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی، تمام سامان شادی کا ہو چکا تھا، صرف چار دن تاریخ عقد میں باقی رہے تھے۔ جب یہ حادثہ ہم پر گذرا تو اُن لوگوں نے دستور کے موافق شادی ملتوی کرنی چاہی، میری والدہ نے جب یہ سنا تو اس واقعہ کے تیسرے دن اُن کے گھر گئیں اور کہیں شادی میں آئی ہوں، ماتم تین دن سے زیادہ نہیں ہوتا اور شادی کے ملتوی کرنے سے تمہارا بڑا نقصان ہو گا جو خدا کو منظور تھا وہ ہو چکا تم شادی کو سرگز ملتوی مت کرو جب کہ میں خود تمہارے گھر آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں تو اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔

مرستید کہتے تھے کہ "جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اس میں سے پانچ فیصدی کے حساب سے میری والدہ ہمیشہ الگ رکھتی تھیں اور اس سرمایہ کو حسن انتظام کے ساتھ نیک کاموں میں صرف کرتی تھیں، کئی جوان لڑکیوں کا اُن کی امداد سے نکاح ہوا، اکثر پردہ نشین عورتیں جو معاش سے تنگ ہوتیں اُن کی پوشیدہ خبر گیری کرتیں، غریب خاندانوں کی جوان لڑکیاں جو بیوہ ہو جاتیں اُن کو دوسرا نکاح کرنے کی نصیحت کرتیں اور دوسرے نکاح کو بُرا سمجھنے والوں سے نفرت کرتیں غریب رشتہ داروں کے گھر جاتیں اور خفیہ یا کسی حیلہ سے اُن کی امداد کرتیں، بعض رشتہ دار مردوں نے ایسی عورتوں سے نکاح کر لیا تھا جن سے ملنا معیوب سمجھا جاتا تھا مگر وہ اُن کے گھر برابر جاتیں اور اُن کی اولاد کے ساتھ شفقت سے پیش آتیں۔"

مرستید کہتے تھے کہ "میری تمام نخیال کو شاہ عبدالعزیز اور اُن کے خاندان سے عقیدت تھی مگر میری والدہ کو شاہ غلام علی صاحب سے بیعت اور عقیدت تھی، شاہ صاحب کے ہاں سنت اور نذر و نیاز کا کہیں پتہ نہ تھا، اُن کی عادت تھی کہ جب کوئی اپنی حاجت لیجاتا تو سب حاضرین سے کہتے کہ دعا کرو خدا

اس کی حاجت پوری کرے، یہی عقیدہ میری والدہ کا تھا۔ انھوں نے خود کوئی
 منت یا نذر و نیاز کبھی نہیں مانی۔ تعویذ یا گنڈے پہاڑ اور تاریخوں یا دلوں کی سعادت
 و نحوست پر ان کو مطلق اعتقاد نہ تھا۔ لیکن اگر کوئی کرنا تو اس کو منع بھی نہ کرتی اور
 یہ کہتیں کہ اگر ان کو منع کیا جائے اور اتفاق سے وہی امر پیش آجائے جس کے خوف
 سے وہ ایسا کرتے ہیں تو ان کو یقین ہو جائے گا کہ ایسا نہ کرنے سے یہ ہوا اگر ایسا
 کیا جاتا تو نہ ہوتا۔ سرسید کا بیان ہے کہ ”میری نھیاں واسے اگر چہ عام تو بہات
 میں مبتلا نہ تھے مگر شاہ عبدالعزیز کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر سب اعتقاد رکھتے
 تھے۔ شاہ عبدالعزیز اور ان کے ہاں کے اور بزرگ بچوں کو ایک گنڈا دیا کرتے
 تھے اور اس کے ساتھ ایک تعویذ ہوتا تھا جس میں ایک ہندو سہیا حرف سفید مرغ
 کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس تجپہ کو دیا جاتا اس کو بارہ برس کی عمر تک اٹھایا
 مرغی کھانے کی ممانعت ہوتی تھی سید حامد اور سید محمود کو بھی ان کی نھیاں والوں
 نے وہ گنڈے پنملے تھے۔ باوجود اس کے میری والدہ جب کبھی وہ ان کے
 ساتھ کھانا کھاتے اور کھانے میں اٹھایا مرغی ہوتی تو وہ بے نائل ان کو کھلا دینیں
 سرسید کہتے تھے کہ ”اس زمانہ میں جب کہ میرے مذہبی خیالات اپنی ذاتی تحقیق
 پر مبنی ہیں۔ اب بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک
 یا بدعت کا اطلاق ہو سکے نہیں پاتا البتہ وہ یہ سمجھتی تھیں کہ قرآن پڑھ کر بخشنے کا
 یا فاتحہ دلا کر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مردہ کو پہنچتا ہے مگر میں ان دونوں باتوں
 کا قائل نہیں ہوں۔ عبادت بدنی میں تو میں نیابت کا مطلق قائل نہیں اور عبادت
 مالی میں بھی سو اس کے کہ متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کار خیر کے لیے کسی کے
 سپرد کر جانے اور کسی صورت میں نیابت کا قائل نہیں ہوں۔“

سرسید کا بیان ہے کہ ”جب میں دہلی میں منصف تھا تو میری والدہ کی یہ

نصیحت تھی کہ جہاں تم کو ہمیشہ جانا ضروری ہے وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ پا جایا کرو۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں، کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ، پس ایسی عادت رکھو کہ ہمیشہ کو نباہ سکو۔ چنانچہ میں نے جامع مسجد اور خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ رکھا تھا کہ اکثر پیدل اور کبھی کبھی سواری پر جاتا تھا۔

سرستید کی والدہ جیسی سمجھ دار اور دانشمند تھیں اُس سے زیادہ نیک دل اور پاک سرشت تھیں۔ سرستید کا بیان ہے کہ ”مسماتہ زمین ایک لا وارث یرثہا تھی میری والدہ اس کی خبر گیری کرتی تھیں جب میں دلی میں منصف تھا اتفاق سے میری والدہ اور زمین دونوں ایک ساتھ بیمار ہوئیں اور دونوں کی بیماری بھی ایک ہی سی تھی حکیم نے والدہ کے لیے کسی قدر افاقہ کے بعد ایک معجون کا نسخہ جو قیمتی تھا، تجویز کیا۔ مگر جس قدر تیار ہوا تھا وہ مقدار میں ایک ہی بیمار کی چند روزہ خوراک تھی۔ میں اُس معجون کو تیار کر کے والدہ کے پاس لے گیا اور اُن سے کہہ دیا کہ اتنے دنوں کی خوراک ہے۔ انھوں نے لے لی۔ مگر اس خیال سے کہ یہ زمین کو بھی مفید ہوگی۔ لیکن اُس کو کون ہوا کے دے گا، انھوں نے خود اُس معجون کو نہیں کھایا اور برابر زمین کو کھلاتی رہیں۔ زمین کو اُس سے بہت فائدہ ہوا، مگر والدہ بھی بغیر اُس معجون کے استعمال کے اچھی ہو گئیں۔ چند روز بعد میں نے کہا کہ معجون نے آپ کو بہت فائدہ کیا۔ وہ ہنسیں اور کہا کیا بغیر دوا کے خدا صحت نہیں دے سکتا؟ آخر معلوم ہوا کہ وہ ساری معجون زمین ہی نے کھائی مگر خدا نے دونوں کو صحت عنایت کی۔“

سرستید کہتے تھے کہ ”میرے بھائی سید محمد خاں اور حکیم غلام نجف خاں میں بہت دوستی تھی۔ ایک دوسرے کو بھائی بھائی کہتے تھے۔ میں بھی حکیم صاحب کو بڑے بھائی کے برابر سمجھتا تھا۔ مگر بھائی کے انتقال کے بعد ایک دفعہ حکیم صاحب

کچھ مجھ سے ناراض ہو گئے اور ہمارے ہاں آنا چھوڑ دیا مگر میں بدستور اُن کے ہاں جاتا رہا اور مدت تک میں نے کچھ خیال نہ کیا۔ لیکن آخر کو میں نے بھی اُن کے ہاں جانا بہت کم دیا۔ جب والدہ کو اس بات کی خبر ہوئی تو بہت افسوس کیا اور مجھ سے کہا کہ جس بات کو تم خود اچھا نہیں سمجھتے وہی بات آپ کرتے ہو۔ اگر وہ نہیں ملتے تو نہ ملیں مگر تم بدستور ملتے رہو۔“

سرشید نے ایک شخص کا ہم سے ذکر کیا کہ ”جب میں صدائین تھانوائس کے ساتھ میں نے کچھ سلوک کیا تھا اور اُس کو ایک سخت مواخذہ سے بچایا تھا مگر ایک ایک مدت کے بعد اُس نے درپردہ میرے ساتھ بُرائی کرنی شروع کی اور مدت تک میری شکایت کی گناہم عرضیاں صدر میں بھیجتا رہا۔ آخر تمام وجہ ثبوت جس سے اُسکو کافی سزا مل سکتی تھی میرے ہاتھ آگئی اور اتفاق سے اُس وقت مجسٹریٹ بھی وہ شخص تھا جو اُس کے پھانسنے کی فکر میں تھا۔ میرے نفس نے مجھ کو انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ کو جب میرا یہ ارادہ معلوم ہوا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ ”سب سے بہتر تو یہ ہے کہ دگر گرد کرو۔ اور اگر بدلا ہی لینا چاہتے ہو تو اُس دبدب دست حاکم کے انصاف پر چھوڑ دو جو ہر بدی کی پوری سزا دینے والا ہے۔ اپنے دشمنوں کو دنیا کے کمزور حاکموں سے بدلا دلانا بڑی نادانی کی بات ہے۔“ اُن کے اس کہنے کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ اُس دن سے آج تک مجھ کو کبھی کسی اپنے دشمن یا بدخواہ سے انتقام لینے کا خیال نہیں آیا اور اُمید ہے کہ کبھی نہ آئے گا۔ بلکہ انھیں کی نصیحت کی بدولت میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا اُس سے میرا بدلہ لے۔“

سرشید کی بہن صفیۃ النساء بیگم بھی جن کا انتقال دسمبر ۱۹۹۲ء میں جب کہ سرسید محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریب سے دلی میں موجود تھے کچھ کم وقتے برس کی عمر میں ہوا۔ عورتوں میں قتلہ اور قابل تھیں۔ اکثر مذہبی کتابیں اور کچھ حدیث

کی عربی کتابیں بھی مع ترجمہ کے پڑھی تھیں اور ان کے گھر میں کتبے کی اکثر لڑکیاں جمع ہوتیں اور ان سے پڑھتی تھیں۔

سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے صرف معمولی تعلیم پائی تھی مگر بہت زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ ان کو بھی شاہ غلام علی صاحب سے بیعت تھی مگر وضع اس کے غلام تھی۔ اکثر ان کے والد کے ملنے والے ان سے کہتے کہ بیٹے کو سمجھاؤ کہ اپنی وضع درست کرے اور ڈارھی نہ منڈایا کرے۔ وہ یہ جواب دیتے کہ عمر کا تقاضا ہے جو اس کا دل چاہے کر لینے دو کبھی نہ کبھی خود درست ہو جائیگا آخر ایک مدت کے بعد ان کا طریقہ خود بخود بدل گیا۔ ڈارھی رکھ لی اور نماز کے سخت پابند ہو گئے۔ یہاں تک کہ تہجد اور اشراق کی نماز بھی ترک نہ ہوتی تھی اور قرآن مجید کی تلاوت بہت کرنے لگے۔

وہ تہگام ضلع فتحپور میں منصف تھے۔ ۱۸۴۵ء میں سرسید فتحپور سیکری سے جہاں وہ خود منصف تھے اور سید محمد خاں تہگام سے وسپرہ کی تعطیل میں واپس آئے وہاں اس وقت سجاد کی فصل تھی۔ سید محمد خاں کو سجاد آنے لگا تعطیل کے بعد جب سرسید جانے لگے تو رخصت کے وقت ان کے بھائی نے ایسے کلمات کہے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اپنے زندہ رہنے کی امید نہیں ہے۔ اس کے بعد فی الواقع ان کا مرض بڑھنے لگا۔ وہ اسی حالت میں خواجہ باقی باللہ گئے اور وہاں اپنی قبر کے لیے خود جگہ تجویز کی۔ ہر چند لوگ کہتے تھے کہ ایسی بیماری نہیں ہے تم کہو ان خیال میں پڑے ہو۔ مگر ان کو مرنے کا یقین ہو گیا تھا جب قبر تیار ہو گئی تو سوار ہو کر وہاں پہنچے اور قبر میں اتر کر لیٹے اور قبر کو پسند کیا۔ وہاں سے آکر دوسرے دن کفن کے لیے کپڑا منگوایا اور اس کو سلوا کر پہنا اور بہت پسند کیا۔ اب مرض اور بھی زیادہ ہو گیا۔ ایک دن شاہ احمد سعید صاحب کہ جو اس وقت خانقاہ میں سجادہ

نشین تھے بلدیہ اور ان کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی اور تیسرے دن انتقال کیا۔
 مفتی صدر الدین خاں نے جو سرسید کو ان کی تعزیت کا خط بھیجا تھا تو اس میں یہ
 شعر لکھا تھا۔

” قسمت نگر کہ گشتہ شمشیر عشق یافت
 مر گے کہ زندگان بہ دعا آرزو کنند“

سرسید کے خاندان کا حال جس قدر کہ ہم نے لکھا ہے شاید ناظرین کتاب اس
 کو قدر ضرورت سے زیادہ خیال کریں لیکن بائوگرافی کا اصل مقصد جو ہیرو کے اخلاق
 و عادات و خیالات کا دنیا پر روشن کرنا ہے۔ وہ اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا
 جب تک یہ نہ دکھایا جائے کہ ہیرو میں یہ اخلاق و عادات و خیالات کہاں سے
 آئے؟ اور ان کی بنیاد اُس میں کیونکر پڑی؟ انسان میں کچھ خصلتیں جتنی ہوتی ہیں
 جو آبا و اجداد سے بطور میراث کے اُس کو پہنچتی ہیں اور زیادہ تر وہ اخلاق و
 عادات ہوتے ہیں جو بچپن میں نامعلوم طور پر وہ اپنے خاندان کی سوسائٹی سے
 اکتساب کرتا ہے اور جو رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچ جاتے ہیں جس کی نسبت
 حدیث میں آیا ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ملے لیکن آدمی اپنی جبلت سے
 نہیں ٹل سکتا۔ پس ہیرو کے خاندان کا حال جس میں وہ پیدا ہوا اور اُس سوسائٹی کا حال
 جس میں اُس نے نشوونما پائی و حقیقت ہیرو کے اخلاق و عادات پر ایک ایسی
 روشنی ڈالتا ہے جس کے بعد کس اور ثبوت کے پیش کرنے کی چنداں ضرورت
 باقی نہیں رہتی۔

سرسید کا بچپن

سرسید کے پیدا ہونے سے پہلے ان کی بہن صفیۃ النساء بیگم اور ان کے بھائی

سید محمد خاں پیدا ہو چکے تھے۔ سید محمد خاں کی ولادت کے بعد چھ برس تک اُن کے والدین کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا اس لیے سید احمد خاں کے پیدا ہونے کی اُن کو نہایت خوشی ہوئی۔ سرسید سے چند مہینے پہلے اُن کے ماموں ثواب زمین العابدین خاں کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جس کا نام حاتم علی خاں تھا سرسید کو اول حاتم علی خاں کی والدہ نے دودھ پلایا اور پھر خود سرسید کی والدہ نے۔ وہ اپنے خاندان کے اکثر بچوں کی نسبت زیادہ قوی اور توانا اور ہاتھ پاؤں سے تندہرست پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنی ماں کی زبانی بیان کرتے تھے کہ جب اُن کے نانا دوسری بار کلکتہ سے واپس آئے اور اُن کو پہلے ہی بار دیکھا تو یہ کہا کہ "یہ تو ہمارے گھر میں جاٹ پیدا ہوا ہے۔"

سرسید کے بیان سے مفہوم ہوتا تھا کہ اُن کے بچپن میں جسمانی صحت اور فزیکل قابلیت کے سوا کوئی ایسی خصوصیت جس سے اُن کے بچپن کو معمولی لڑکوں کے بچپن پر بے تکلف فوقیت دی جاسکے نہیں پائی جاتی تھی۔ یعنی جیسے کہ بعض بچے ابتدا میں نہایت ذکی اور طباع اور اپنے مجاہدوں میں سب سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں۔ سرسید میں کوئی اس قسم کا صریح امتیاز نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے قوائے ذہنیہ کو محض دماغی ریاضت اور لگاتار غور و فکر سے تدریج ترقی دی تھی اور اسی لیے اُن کی لائف کا آغاز معمولی آدمیوں کی زندگی سے کچھ زیادہ چمکدار معلوم نہیں ہوتا لیکن جس قدر آگے بڑھتے جاتے اُسی قدر اُس میں زیادہ عظمت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ میرد کو معمولی آدمیوں کی سطح سے بالاتر کر دیتی ہے۔ اسی لیے بعض حکماں کہتے ہیں کہ محنت سے آدمی جو چاہے سو ہو سکتا ہے۔

الغرض جب سرسید پیدا ہوئے تو اُن کے والد نے شاہ غلام علی صاحب

سے نام رکھنے کی درخواست کی۔ شاہ صاحب ہی نے بڑے بھائی کا نام محمد رکھا تھا اُن کا نام احمد رکھا۔ سرسید کے دادا اُن کے والد کی شادی ہونے سے پہلے قضا کر چکے تھے اور یہ اورین کے بہن بھائی شاہ صاحب ہی کو دادا حضرت کہا کرتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ ”شاہ صاحب کو بھی ہم سب سے ایسی ہی محبت تھی جیسی حقیقی دادا کو اپنے پوتوں سے ہوتی ہے۔ شاہ صاحب نے تاہل اختیار نہیں کیا تھا اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو خدا تعالیٰ نے مجھے اولاد کے جھگڑوں سے آزاد رکھا ہے لیکن تنقی کی اولاد کی محبت ایسی دیدی ہے کہ اس کے بچوں کی تکلیف یا بیماری مجھ کو بے چین کر دیتی ہے۔

سرسید کو مسماۃ مان بی بی نے جو ایک قدیم خیر خواہ خادمہ اُن کے گھر آنے کی تھی پالا تھا۔ اس لیے اُن کو مان بی بی سے نہایت محبت تھی۔ وہ پانچ برس کے تھے جب مان بی بی کا انتقال ہوا۔ اُن کا بیان ہے کہ ”مجھے خوب یاد ہے مان بی بی مرنے سے چند گھنٹے پہلے فالسہ کا شربت مجھ کو پلا رہی تھی۔ جب وہ مر گئی تو مجھے اُس کے مرنے کا نہایت رنج ہوا۔ میری والدہ نے مجھے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئی ہے۔ بہت اچھے مکان میں رہتی ہے۔ بہت سے فکر چاکر اُس کی خدمت کرتے ہیں اور اس کی بہت آرام سے گزر رہی ہے۔ تم کچھ رنج مت کرو۔ مجھ کو اُن کے کہنے سے پورا یقین تھا کہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔ مدت تک ہر جمعرات کو اس کی فاتحہ ہوا کرتی تھی اور کسی محتاج کو کھانا دیا جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب کھانا مان بی بی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اُس نے مرنے وقت کہا تھا کہ میرا تمام زیور سید کا ہے۔ مگر میری والدہ اُس کو خیرات میں دینا چاہتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر کہو تو یہ گہنا مان بی بی کے پاس بھیج دوں۔ میں نے کہا ہاں بھیج دو۔ والدہ نے وہ سب گہنا مختلف

طرح سے خیرات میں دیدیا۔

بچپن میں سرسید پر نہ تو ایسی قید تھی کہ کھیلنے کو دے لے کی بالکل بندی ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں کھیلنے کو دتے پھریں۔ ان کی بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ خود ان کے ماموں ان کی خالہ اور دیگر نزدیک رشتہ داروں کے چودہ پندرہ لڑکے ان کے ہم عمر تھے جو آپس میں کھیلنے کو دے لے کے بے کافی تھے اس لیے ان کو نوکروں اور اہل خانہ کے بچوں اور اشرافوں کے آوارہ لڑکوں سے ملنے کھیلنے اور ان کے ساتھ کھیلنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ان کے بزرگوں نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ جس کھیل کو تمہارا جی چاہے شوق سے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو۔ اس لیے سب لڑکے جو کھیل کھیتے تھے اپنے بڑوں کے سامنے کھیتے تھے۔ ان کے کھیلوں میں کوئی بات ایسی نہ ہوتی تھی جو اپنے بزرگوں کے سامنے نہ کر سکیں۔ خواجہ فرید کی حویلی جس میں وہ اور ان کے ہم عمر لڑکے رہتے تھے اس کا چوک اور اس کی چھتیں ہر قسم کی مہاگ دوڑ کے کھیلوں کے لیے کافی تھیں ابتدا میں وہ اکثر گیند بولا، کبڈی، گیتریاں، آٹکھ، پھول، چیل، چلو وغیرہ کھیتے تھے۔ اگرچہ گیتریاں کھیلنے کو اشراف معیوب جانتے تھے۔ مگر ان کے بزرگوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ آپس میں سب بھائی مل کر گیتریاں بھی کھیل سکیں۔ کچھ مضائقہ نہیں۔

سرسید کہتے تھے کہ "کھیل میں جب کچھ جھگڑا ہو جاتا تو بڑوں میں سے کوئی آکر تصفیہ کر دیتا اور جس کی طرف سے چنید معلوم ہوتی اس کو برا بھلا کہتا اور شرمندہ کرتا کہ چنید کرنا بے ایمانی کی بات ہے، کبھی چنید مت کرو اور جو چنید کرے اس کو ہرگز اپنے ساتھ مت کھیلنے دو۔"

ان کا بیان تھا کہ "باوجود اس قدر آزادی کے بچپن میں مجھے تنہا باہر

جانے کی اجازت نہ تھی جب میری والدہ نے اپنے رہنے کی جداحولی بنائی اور وہاں آ رہیں تو باوجودیکہ اس حولی میں اور نانا صاحب کی حولی میں صرف ایک سڑک درمیان تھی جب کبھی میں ان کی حولی میں جاتا تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا۔ اسی لیے بچپن میں مجھے گھر سے باہر جانے اور عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آواز پھرنے کا بالکل اتفاق نہیں ہوا۔

مرستہ اپنے کھیل کود کے زمانے میں بہت مستعد اور چالاک اور کسی قدر شوخ بھی تھے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اکثر شوخی کیا کرتے۔ وہ کہتے تھے کہ ”ایک بار میں نے اپنے ایک رشتہ دار بھائی کو جراتبخا کر ہاتھ چپکے چپکے اُس کے پیچھے جا کر چپت کر دیا۔ اس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ وہ پتھر لیکر مجھے مارنے کو دوڑا اور کئی پتھر پھینکے مگر میں پیچ بچ گیا۔ آخر سب بھائیوں نے پیچ بچاؤ کر کے صلح کرادی۔ اسی طرح ایک بار میں شطرنج کھیلتے میں ایک اپنے رشتہ دار بھائی سے لڑ پڑا میرے ٹکے سے اُس کے ہاتھ کی انگلی اتر گئی، اور کئی دن بعد اچھی ہوئی ہمیشہ یوں ہی لڑائی مچھڑائی مار کٹائی ہوتی تھی مگر آخر کو سب ایک ہو جاتے تھے۔“

مرستہ لکھتے ہیں کہ ”میرے نانا صبح کا کھانا اندر زمانے میں کھاتے تھے۔

ایک چوڑا چکلا دسترخوان بچھتا تھا۔ بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اور بیٹوں کی بیویاں سب اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں۔ نانا صاحب ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز کھاؤ گے جو کچھ وہ بتاتا وہی چیز چمچے میں لیکر اپنے ہاتھ سے اُس کی رکابی میں ڈال دیتے۔ تمام بچے بہت ادب اور صفائی سے اُن کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ سب کو خیال رہتا تھا کہ کوئی چیز گرنے نہ پائے، ہاتھ کھانے میں زیادہ نہ بھرے اور نوالا چبانے کی آواز منہ سے نہ نکلے۔ رات کا کھانا دارہ باہر دیوانخانے میں کھاتے

تھے۔ زمانہ ہو جاتا تھا۔ بیری والدہ اور بیری چھوٹی خالا کھانا کھلانے آتی تھیں۔ ہم سب لڑکے اُن کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ہم کو بڑی شکل پڑتی تھی۔ کسی کے پانوں کا دھبہ سفید چاندنی پر لگ جاتا تھا تو نہایت ناراض ہوتے تھے۔ روشنائی وغیرہ کا دھبہ کسی کے کپڑے پر ہوتا تھا اُس سے بھی ناخوش ہوتے تھے۔ شام کو چراغ جلنے کے بعد اُن کے پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے اور جن میں سے ایک میں بھی تھا، ان کو سبق سناتے جاتے تھے۔ جس کا سبق اچھا یاد ہوتا اُس کو کسی قسم کی عمدہ مٹھائی ملتی اور جس کو یاد نہ ہوتا اس کو کچھ نہ دیتے اور گھر ک دیتے۔

گرمی اور برسات کے موسم میں اب بھی دلی کے اکثر باشندے سدھپر کو جہنا پر جا کر پانی کی سیر دیکھتے ہیں اور تیرنے والے تیرتے ہیں۔ مگر پچاس برس پہلے وہاں اشرف تیرنے والوں کے بہت دلچسپ جلسے ہوتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ "میں نے اور بڑے مہائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک طرف دلی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا۔ جن میں مرزا مغل اور مرزا مغل بہت سربراہ اور وہ اور نامی تھے اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ موسیٰ شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودتے تھے اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی بائیں ٹمک یہ سارا گروہ تیرنا جاتا تھا۔ پھر جب ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے اُس زمانے میں بھی تیس چالیس آدمی والد کے ساتھ ہوتے تھے انھیں دنوں میں نواب اکبر خاں اور چند اور رئیس زادے بھی تیرنا سیکھتے تھے۔ زینۃ المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جہنا بہتی تھی۔ وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت سب تیراک زینۃ المساجد میں جمع ہو جاتے تھے اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے

اپنے گھر چلے آتے تھے۔ ہیں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا تیر اندازی کی صحبتیں بھی سرید کے ہاں نواب ذین العابدین خاں کے مکان پر ہوتی تھیں۔ وہ کہتے تھے کہ ”مجھے اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ دمانہ جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیر اندازی ہوتی تھی۔ یاد نہیں۔ مگر جب دوبارہ تیر اندازی کا چرچا ہوا وہ بخوبی یاد ہے۔ اُس زمانے میں دریا کا جانا موقوف ہو گیا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد تیر اندازی شروع ہوتی تھی۔ نواب فتح اللہ بیگ خاں، نواب سید عظمت اللہ خاں نواب براہیم علی خاں اور چند شاہزادے اور رئیس اور شوقین اس جلسہ میں شریک ہوتے تھے۔ نواب ٹمس الدین خاں رئیس فیروز پور بھر کہ جب دلی میں ہوتے تھے تو وہ بھی آتے تھے۔ میں نے بھی اس زمانے میں تیر اندازی سیکھی اور مجھ کو خاصی مشق ہو گئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا نشانہ جو توڑے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جا کر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے اور کہا ”مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے“ یہ جلسہ برسوں تک رہا پھر موقوف ہو گیا۔ اہل اللہ اور مقدس لوگوں کی عظمت کا خیال بچپن سے سرسید کے دل میں بٹھایا گیا تھا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ اکثر شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں جاتے تھے اور شاہ صاحب سے ان کی عقیدت کا رنگ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ”مرزا صاحب کے عرس میں شاہ صاحب ایک روپیہ ان کے سزار پر چڑھایا کرتے تھے اور اُس روپیہ کے لینے کا حق میرے والد کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ ایک دفعہ عرس کی تاریخ سے کچھ پہلے ایک مرید نے شاہ صاحب سے اجازت لے لی کہ اب کی بار تندرہ کا روپیہ مجھے عنایت ہو۔ میرے والد کو بھی خبر ہو گئی۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھانے کا ارادہ کیا تو والدہ نے عرض کی کہ حضرت ! میرے اور میری اولاد کے جتنے جی آپ نقد کا روپیہ لینے کی اوروں کو اجازت دیتے ہیں ! شاہ صاحب نے فرمایا نہیں نہیں تمہارے سوا کوئی نہیں لے سکتا۔ میں اس

وقت صغیر سن تھا جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھایا والد نے مجھ سے کہا جاؤ
روپیہ اٹھا لو میں نے آگے بڑھ کر روپیہ اٹھایا :

دلی سے سات کوس مغلیہ ریک جاؤں گا گانوہ ہے۔ وہاں سرسید کے والد
کی کچھ ملک بطور معافی کے تھی۔ اگر کبھی فصل کے موقع پر اُن کے والد مغلیہ جاتے
تو اُن کو بھی اکثر اپنے ساتھ لیجاتے اور ایک ایک ہفتہ گانوہ میں رہتے۔ سرسید
کہتے تھے کہ اس عمر میں گانوہ میں جا کر رہنا، جنگل میں پھرتا، عمدہ دودھ اور وہی
اور تازہ تازہ گھی اور جاتنیوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی باجڑ یا مکئی کی روٹیاں کھانا
نبہایت ہی مزہ دیتا تھا :

سرسید کے والد کو اکبر شاہ کے زمانے میں ہر سال تاریخ جلوس کے جشن پر
پانچ پارچہ اونٹین رقوم جو اہر خلعت عطا ہوتا تھا مگر اخیر میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا
گیا انھوں نے دربار کا جانا کم کر دیا تھا اور اپنا خلعت سرسید کو باوجودیکہ اُن
کی عمر کم تھی، دلوانا شروع کر دیا تھا۔

سرسید کہتے تھے کہ "ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا اتفاق ہوا کہ
والد بہت سویرے اٹھ کر قلعہ چلے گئے اور میں بہت دن چڑھے اٹھا۔ ہر چند
بہت جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا مگر پھر بھی دیر ہو گئی۔ جب لال پردہ
کے قریب پہنچا تو قاعدہ کے موافق اول دربار میں جا کر آداب بجالانے کا وقت
نہیں رہا تھا۔ دروغہ نے کہا کہ بس اب خلعت پہنکر ایک ہی دفعہ دربار میں جانا
جب خلعت پہنکر میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار پر غائب ہو چکا تھا اور
بادشاہ تخت پر سے اٹھ کر ہوا دار پر سوار ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے مجھے دیکھ کر
والد سے جو اُس وقت ہوا دار کے پاس ہی تھے، پوچھا کہ "تمہارا بیٹا ہے" انھوں
نے کہا "حضور کا خانہ زاد" بادشاہ چپکے ہو رہے لوگوں نے جانا کہ بس اب محل

میں چلے جائیں گے۔ مگر جب تسبیح خانہ میں پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے تسبیح خانہ میں بھی ایک چوبترا بنا ہوا تھا جہاں کبھی کبھی دربار کیا کرتے تھے۔ اُن چوبترے پر بیٹھ گئے اور جواہر خانے کے دروغہ کو کشتی جواہر حاضر کرنے کا حکم ہوا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بلایا اور کمال عنایت سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ دیر کیوں کی؟ حاضرین نے کہا۔ عرض کرو کہ تقصیر ہوئی۔ مگر میں چپکا کھڑا رہا۔ جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ سو گیا تھا۔ بادشاہ مسکرائے اور فرمایا بہت سویرے اٹھا کرو اور ہاتھ چھوڑ دینے لوگوں نے کہا آداب بجالاؤ۔ میں آداب بجالایا۔ بادشاہ نے جواہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پتھرائیں۔ میں نے نذر دی اور بادشاہ اٹھ کر غاصی ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی اس عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے۔ سرسید کہتے تھے کہ ”اس زمانہ میں میری عمر آٹھ نو برس کی ہوگی۔ تقریباً انھیں دنوں میں راجہ رام موہن رائے جو برہمن سماج کے بانی تھے۔ اُن کو اکبر شاہ نے کلکتہ سے بلایا تھا تاکہ اضافہ پنشن بادشاہی کے لیے اُن کو لندن بھیجا جائے چنانچہ وہ بادشاہ کی طرف سے لندن بھیجے گئے اور ۱۸۳۱ء میں وہاں پہنچے۔“ سرسید نے لندن جانے سے پہلے اُن کو متعدد دفعہ دربار شاہی میں دیکھا تھا۔

سرسید کی تعلیم

سرسید کہتے تھے کہ ”مجھ کو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے خصوصاً حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے مجھ کو لا کر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہٹا ہٹا سا ہو گیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے

فرمایا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمن الرحیم مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھا رہا انھوں نے اٹھا کر مجھے اپنی گود میں بیٹھایا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے اور بسم اللہ پڑھ کر افراد کی اول کی آیتیں مالمہ یعلّم تک پڑھیں میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ پڑھتا گیا۔ سرستید نے جب یہ ذکر کیا تو بطور فخر کے اپنا یہ فارسی شعر جو خاص اسی موقع کے لیے انھوں نے کبھی کہا تھا پڑھا۔

” بہ مکتب رفتم و آموختم اسرارہ یزدانی

رفیقش نقش بند وقت و جان جان جانانی “

سرستید کہتے تھے کہ ”شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے اِلّا ماشاء اللہ صرف میرے والد پر جو غایت درجہ کی شفقت تھی اس لیے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم بہ رخہ فرماتے تھے۔“

بسم اللہ ہونے کے بعد سرستید نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ اُن کی نگہیاں میں قدیم سے کوئی نہ کوئی استانی نوکر رہتی تھی سرستید نے استانی ہی سے جو ایک اثراوت گھر کی پردہ نشین بی بی تھی، سارا قرآن ناظران پڑھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ میرا قرآن ختم ہونے پر بدیہ کی مجلس جو زمانہ میں ہوئی تھی وہ اس قدر دلچسپ اور عجیب تھی کہ پھر کسی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی۔ ”قرآن پڑھنے کے بعد وہ باہر مکتب میں پڑھنے لگے۔ مولوی حمید الدین ایک ذی علم اور بزرگ آدمی اُن کے نانا کے ہاں نوکر تھے۔ جنھوں نے اُن کے مامووں کو پڑھایا تھا۔ اُن سے معمولی کتابیں کر میا خانقہ باری آمد نامہ وغیرہ پڑھیں، جب مولوی حمید الدین کا انتقال ہو گیا تو احمد لوگ پڑھانے پر لو کہہ رہے تھے۔ انھوں نے فارسی میں گلستاں، بوستاں اور ایسی ہی ایک آدھ اور کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا۔ پھر عربی پڑھنی شروع کی، عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب، یمذی، مختصر معانی اور سطول ما انا قلت

تک پڑھی مگر طالبعلموں کی طرح نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توجہی کے
 ساتھ۔ اس کے بعد اُن کو اپنے خاندانی علم یعنی ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا جس میں
 اُن کی تخیال کے لوگ دلی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ماموں نواب
 زین العابدین خاں سے حساب کی معمولی درسی کتابیں تحریر اقلیدس کے چند مقالے
 ہیئت میں شرح چغتائی تک اور ایک آدھ رسالہ متوسطات کا (جو مجبلی سے پہلے
 پڑھاٹے جاتے ہیں) پڑھا۔ مگر تمام رسالے متوسطات کے نہیں پڑھے اور نہ
 مجبلی کے پڑھنے کی نوبت پہنچی کیونکہ آلات رصد کا زیادہ شوق ہو گیا تھا۔ چنانچہ
 آلات رصد برجندی اور چند رسالے مثل اعمال کرہ، اعمالی اصطلاحات، رسالہ
 صنعت اصطلاحات، رابع عجیب، رابع منقظ، ہلزدن، جریب الساعۃ، پرکار
 تقسیم، پرکار متناسبہ اپنے ماموں سے پڑھے۔ اُسی زمانے میں طب پڑھنے کا شوق
 ہو گیا۔ حکیم غلام حیدر خاں سے جو ایک خاندانی حکیم تھے طب کی ابتدائی کتابیں مثل
 قانونچہ اور موجز وغیرہ پڑھنے کے بعد معالجات سرمدی، شرح اسباب اور
 نفیسی امراض عین تک پڑھی اور چند ماہ تک اُن کے پاس مطب بھی کیا۔ پھر
 پڑھنا چھوڑ دیا جب انھوں نے پڑھنا چھوڑا ہے اُس وقت اُن کی عمر اٹھارہ
 انیس برس کی تھی۔ اس کے بطور خود کتابوں کے مطالعہ کا برابر شوق رہا اور دلی میں
 جواہر علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے جیسے صہبائی، غالب اور آزد وغیرہ
 اُن سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔ ۱۸۴۷ء میں جب
 کہ وہ فتح پور سیکری سے بدل کر دلی کی منصفی پر آئے اُس وقت جیسا کہ آگے
 ذکر کیا جائے گا، انھوں نے کسی قدر تحصیل علم میں ترقی کی۔

عنقوان شباب

سرستید کا عنقوان شباب نہایت زندہ دل اور رنگین صحبتوں میں گزرتا تھا وہ راگ رنگ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ باغوں کی سیر کو دوستوں کے ساتھ جاتے تھے اور وہاں راگ رنگ اور دعوتوں کے جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔ ہولی کے جلسوں اور نمائشوں میں جاتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتے تھے اور وہاں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ دلی میں بسنت کے میلے جو موسم بہار کے آغاز میں درگاہوں پر ہوتے تھے وہاں جاتے تھے۔ خود اُن کے مانا خواجہ فرید کی قبر پر چونسٹھ کھبے میں جو بسنت کا میلہ ہوتا تھا اس میں وہ اپنے اور بھائیوں کے ساتھ منظم و مہتمم ہوتے تھے۔

اُس زمانے میں خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ ولی میں تھے۔ اُن کے گھر پر بسنت کا جلسہ ہوتا تھا۔ شہر کے خواص وہاں موسوم ہوتے تھے۔ نامی نامی طوائف زرد لباس پہنکر وہاں آتی تھیں۔ مکان میں بھی زرد فرش ہوتا تھا۔ دالان کے سلنے ایک چبوترہ تھا جس میں حوض تھا۔ اُس حوض میں زرد ہی پانی کے فوارے چھوٹتے تھے۔ صحن میں جو چین تھا اُس میں جھڑاں زرد پھول کھلے ہوئے ہوتے تھے اور طوائف باری باری بیٹھ کر گاتی تھیں۔ سرستید کہتے تھے کہ "میں ہمیشہ وہاں جاتا تھا اور اُس جلسے میں شریک ہوتا تھا۔"

خود سرستید کے ماموں نواب زین العابدین کے مکان پر بڑے بڑے نامی گویے دھڑیت اور خیال گانے والے جمع ہوتے تھے۔ میر ناصر احمد جو دلی میں مشہور بین بجائے والے تھے وہ آئے تھے۔ گانا نہ ہوتا تھا اور میں کبھی بھی اس طرح خواجہ میر درد کے سجادہ نشین ہر مہینے کی چوبیسویں کو مات کے وقت ایک

دویشمانہ جلسہ کیا کرتے تھے۔ اُس میں بھی بڑے بڑے نامی گویے آتے تھے۔ دھرت اور خیال گاتے تھے۔ اور میر ناصر احمد جو اسی خاندان میں بیعت تھے بین بجانے میں اپنا کمال دکھاتے تھے۔ ان سب جلسوں میں سرستید اکثر شریک ہوتے تھے۔

ایک اور جلسہ رائے پراں کشن کے مکان پر ہوتا تھا جو ایک معزز رئیس اور نہایت ومنعدار تھے جتنا نامی ایک طوائف نہایت خوش آواز دھرت اور خیال گاتے اندر بین بجانے میں مشہور تھی۔ وہ اپنا پیشہ چھوڑ کر راسخپران کشن کے گھر میں پڑ گئی تھی۔ اُس کی خاطر سے وہ برصغیر کی سترھویں کو ایک جلسہ کیا کرتے تھے۔ شہر کے رئیس جن سے اُن کی دوستی تھی، بلائے جاتے تھے۔ بڑے بڑے گویے، بہادر خاں متارن اور میر ناصر احمد سب جمع ہوتے تھے۔ سرستید کہتے تھے کہ "میرے ماموں نواب زین العابدین خاں ہمیشہ اس جلسہ میں جاتے تھے۔ میں بھی بلائے اُن کے ہمراہ گیا ہوں۔"

جب وہ نوکر ہو کر آگرہ گئے ہیں یہ وہ زمانہ ہے کہ صدر ولایت آگرہ میں موجود ہے اور وہاں منشی امیر علی خاں۔ مولوی غلام امام شہید، مولوی غلام جیلانی مولوی محمد شفیع اور اور بہت سے اشراف خاندانوں کے نامی و کیلیوں اور عہدیداروں کا مجمع ہے۔ یہ سب لوگ نہایت زندہ دل مرنج و سرنجان اور زندگی بے فکری و فارغ البالی کے ساتھ مہنسی اور خوشی میں گزارنے والے تھے۔ تاج گنج، اعتماد الدولہ اور نورافشاں میں وہ آئے دن عیش و نشاط کے جلسے کرتے تھے۔ سرستید نے بھی ان جلسوں کی کیفیتیں دیکھی تھیں اور اُن میں شریک ہوئے تھے۔

سرستید جیسے بڑھاپے میں بذلہ سنج تھے جوانی میں اُس سے بھی زیادہ

ظرافت اور حاضر جوابی اُن کی طبیعت میں تھی۔ دلی میں ایک مشہور طوائف شیریں جان نامی نہایت حسین تھی مگر مناسبے کہ اُس کی ماں بھدی اور سانوسے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لیے آئی تھی سرسید بھی موجود تھے اور وہیں اُن کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اُس کی ماں کو دیکھ کر بولے "مادرش لبہا تلخ ست" سرسید نے یہ مصرع پڑھا "گرچہ تلخ ست ولیکن بر شیریں وارد"۔

سرسید کا مذکورہ بالا جلسوں اور مصہبتوں میں شریک ہونا آخر کار رنگ لائے بغیر نہ رہا۔ اگرچہ اُس وقت تک دلی کے مسلمانوں میں قدیم سوسائٹی کی بہت سی خوبیل باقی تھیں لیکن چونکہ اُن کے اقبال کا خاتمہ ہو چکا تھا اس لیے اُن کی سوسائٹی میں اُن خرابیوں کی آہستہ آہستہ بنیاد پڑتی جاتی تھی جن کو تنزل اور ادب کا پیش خمیہ سمجھنا چاہیے۔ طبیعتیں عموماً عیش و نشاط اور راگ رنگ کی طرف مائل ہوتی جاتی تھیں بے فکر امیر زادے عباسی اور لہو و لعب کی مثالیں قائم کرتے جاتے تھے اور خربوزوں کو دیکھ کر خربوزے رنگ پکڑتے جاتے تھے۔ اگرچہ سرسید شرہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں متاہل ہو گئے تھے پھر بھی وہ اس متعدی مرض کے اثر سے اپنے تنہیں نہ بچا سکے۔ لیکن جیسا کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے۔ یا وجود غایت و لبثگی کے جو جنون سے کسی طرح کم نہ تھی سرسید نے جس حیرت انگیز طریقہ سے اپنے تنہیں اس دلدل سے نکالا وہ درحقیقت ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس کو اُن کی اخلاقی طاقت کا سب سے پہلا کرشمہ سمجھنا چاہیے۔ گویا یہ شعر اُس وقت اُن کے حسب حال تھا۔

ہزار و ام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں

جسے غور ہو آئے کرے شکار مجھے

مولانا جلال الدین رومی کے سامنے ایک ناپید کی اس طرح تعریف کی گئی کہ اُس نے تمام عمر میں کسی بُرے کام کا ارتکاب نہیں کیا۔ مولانا نے یہ سنکر فرمایا: کاش کر دے وگرنہ شے - یعنی یہ نسبت اس کے کہ آدمی عمر بھر کوئی بُرا کام نہ کرے اور ایک حالت پر ٹھہرا رہے۔ یہ بہت بہتر ہے کہ وہ بُرے کام کا ارتکاب کر کے حالت موجودہ سے ترقی کر جائے۔ مولانا کا یہ ارشاد جیسا سرسید کے حال پر منطبق ہوتا ہے اُس سے بہتر شاید ہی کوئی اُس کا مصداق ہو سکے۔

منجملہ دیگر اسباب کے جو اس تبدیلی حالت کے باعث ہوئے سب سے بڑا سبب سرسید کے بڑے بھائی کا قبل از وقت انتقال کرنا تھا۔ دونوں بھائیوں میں محبت اور اتحاد اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ٹہر میں اُس کی نفیر دی جاتی تھی سرسید کے بھائی کا یہ قول تھا کہ "کیسی ہی عیش و نشاط کی مجلس ہو اگر سپید وہاں نہ ہو تو مجھ کو وہ مجلس جہنم معلوم ہوتی ہے"۔ ایسا ہی حال سرسید کا اپنے بھائی کے ساتھ تھا۔ چنانچہ بھائی کے مرتے ہی ان کا دل رنگین صحبتوں سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ لباس اور وضع جو اس وقت بالکین سمجھا جاتا تھا ایک قلم ترک کر دیا۔ سر گھٹوایا۔ ڈاڑھی چھوڑ دی۔ پانچے منتشر کر لیے بکرتا پہن لیا۔ رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور روز بروز مولویت کا رنگ چڑھنے لگا کہ اُس وقت قوم میں یہی اعلیٰ درجہ ترقی انسانی کا سمجھا جاتا تھا اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اصلی ترقی تک پہنچنے کے لیے اس مرحلے کا طے کرنا نہایت ضرور ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔

حور و جنت جلوہ بر زانہ کند در راہ دوست

اندک اندک عشق در کار آورد و یگانہ را

سرسید نے بھی اپنی ایک تحریر میں اُس نوجوانی کی لغزش کی طرف اشارہ کیا

ہے وہ قوم کی غفلت و بدستی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے، ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں بد تھے اور کونسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فریاد سے بڑھ کر تھے جب زیادہ خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑتے تھے جو صوفی تھے تو رومی سے بڑتر تھے اور اپنی قوم کے غمخوار۔"

مگر سرسید کے بعض نہایت ثقہ رشتہ داروں سے سنا گیا ہے کہ انھوں نے جو کچھ اس غفلت کے زمانے میں کیا اُس سے معدودے چند کے سوا کوئی متنفس واقف نہیں ہوا۔ وہ خود اسی معاملہ کے متعلق اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں: وہ ایک عجیب قسم کا زمانہ تھا۔ اُس زمانے کے اشعارِ خاندانوں کے نوجوان جو کچھ کرتے تھے ایسی طرح پر کرتے تھے کہ کوئی اُس سے واقف نہ ہوتا تھا اور پردہ ڈھکا رہتا تھا۔ کوئی حرکت عام طور پر بر ملا ہونے نہیں پاتی تھی۔ اُس زمانے کے اشعارِ نوجوانوں کا عملہ آمد اس مقولہ پر تھا کہ "پنے جسم کے زخم کو ڈھانکے رکھو تاکہ لوگ اسے دیکھ کر نفرت نہ کریں۔" یہ ایک ایسی اچھی نصیحت ہے کہ گوا انسان سے کوئی بُرائی ہو مگر اُس بُرائی کا بُرا ہونا دل سے نہیں جانا اور انسان کے لیے یہی رستہ بُرائی سے نکلنے کا ہے۔

دوسرا باب

۱۸۳۸ء سے ۱۸۵۷ء تک

ملازمت، تالیف رسائل مذہبی تاریخی و علمی، خطاب بادشاہی ترتیب آثار
الصنادید، ترتیب تاریخ ضلع بجنور، تصحیح و تکمیل آئین اکبری

ملازمت

۱۸۳۸ء میں جب کہ سرسید کے والد کا انتقال ہوا ان کی عمر کچھ کم بائیس سال
کی تھی قلعہ سے ان کے والد کو کمی جگہ سے تنخواہ ملتی تھی۔ چونکہ ان کے والد اور راجہ
سوسن لال میں ان بن تھی اور ان کی زندگی میں ان کی تنخواہ میں کات پھانسی ہونے
لگی تھی اب انتقال کے بعد قلعہ کی آمدنی میں سے صرف کچھ قدر قلیل تو سرسید کی
والدہ کے نام جاری رہا باقی سب تنخواہیں بند ہو گئیں اور چند ملکین جو معافی کی
تھیں وہ بھی یہ سبب حین حیات ہونے کے ضبط ہو گئیں۔ اس لئے سرسید
کو گورنمنٹ کی نوکری کا خیال پیدا ہوا۔ ہر چند ان کے رشتہ دار قلعہ سے قطع تعلق
کرنے پر راضی نہ تھے مگر انھوں نے قلعہ کا سہارا یک قلم چھوڑ کر گورنمنٹ انگریزی
کی نوکری اختیار کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس وقت وہ عدالت کی کارروائیوں
اور انگریزی قوانین سے محض ناواقف تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے عدالت کی کارروائی
سے اطلاع حاصل کرنی چاہی۔ ان کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں اس وقت ولی
میں صدر امین تھے۔ ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی کچہری میں ان کو کام سیکھنے

کی اجازت دیں انھوں نے خوشی سے اجازت دیدی اور سرسید نے وہاں کام
 سیکھنا شروع کیا۔ چند مہینے اُن کو کام سیکھنے گزرے تھے کہ مولوی علیل اللہ نے
 اُن کو زنجاری کے خفیف مقدمات کا جو کہ فیصلہ کے لیے صدر امینی میں آتے تھے
 اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ سرسید کو اس کام پر کچھ بہت دن نہ گزرے
 تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن (جو آخر کو سر رابرٹ ہملٹن ہوئے) دلی میں جج ہو کر
 آئے۔ سرسید کو وہ پہلے سے جانتے تھے اس لیے یہ اُن سے ملنے کو گئے اور
 نوکری کی درخواست کی انھوں نے اُن کو عدالت سشن کا سررشتہ دار مقرر کرنا چاہا
 لیکن انھوں نے اُس کام کو مشکل جان کر انکار کیا۔ ہر چند صاحب جج نے بہت
 اصرار اور دلہی کی کہ کچھ تردد کی بات نہیں ہے ہم تم سے یہ سہولیت کام لیں گے
 اور سب ایک بات بناتے رہیں گے مگر سرسید نے کہا کہ جس کام کی میں اپنے میں قیادت
 نہیں پاتا اُس کو کیونکر قبول کر سکتا ہوں۔ غرض کہ بدستور صدر امینی میں کام کرتے
 رہے۔ اتفاق سے انھیں دونوں میں مسٹر ہملٹن آگرہ کے کمشنر ہو گئے اور چلتے
 وقت سرسید کو ایک چٹی کے ذریعہ سے اپنے جانشین مسٹر لینڈزی کے سپرد
 کر گئے۔ لیکن ابھی مسٹر لینڈزی سرسید کو کوئی عہدہ دینے نہیں پائے تھے کہ
 مسٹر رابرٹ ہملٹن نے اُن کو آگرہ میں بلا لیا اور فروری ۱۸۴۵ء میں کمشنری
 کے دفتر میں جو عہدہ نائب منشی کا خالی ہوا اُس پر مقرر کر دیا۔

یہاں سرسید نے بہت جلد قوانین مال سے واقفیت حاصل کر لی۔ اُس
 وقت کمشنری آگرہ کے ماتحت چند ضلعوں میں بندوبست کا کام جاری تھا اور
 بندوبست ہی کے متعلق بہت سا کام کمشنری میں تھا۔ سرسید نے ترتیب دفتر
 کا ایک دستور العمل بنایا جس کے موافق تمام دفتر کمشنری کا مرتب کیا گیا۔
 انھیں دلوں میں انھوں نے فارسی زبان میں ایک فہرست بعد نقشہ کے

مرتب کی تھی جس کا نام جام جم رکھا تھا اور جو ۱۸۴۲ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔
 اس میں امیر تمیور صاحب قرآن سے لے کر ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ تک مختلف
 خاندانوں کے ۴۳ بادشاہوں کا حال مختصر طور پر سترہ سترہ خانوں میں قلمبند کیا ہے
 اسی زمانہ میں انھوں نے قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا ایک خلاصہ
 اس غرض سے تیار کیا کہ وہ عہدہ منصفی ملنے کا ایک ذریعہ ہو۔ جب وہ خلاصہ
 تیار ہو چکا تو صاحب کشنہ نے اس کو گورنمنٹ میں پیش کیا اور سرسید کے
 لیے عہدہ منصفی کی سفارش کی۔ گورنمنٹ نے اس پر یہ حکم دیا کہ جہاں منصفی خالی
 ہو سید احمد خاں کو اس پر مقرر کیا جائے۔ لیکن ابھی ان کو یہ عہدہ ملنے نہ پایا تھا
 کہ عہدہ منصفی کے لیے قواعد امتحان جاری ہو گئے۔ صاحب کشنہ نے ان کو
 امتحان دینے کی ہدایت کی۔ انھوں نے خود بھی امتحان کی تیاری کی اور اپنے بڑے
 بھائی سید محمد خاں اور ماموں زاد بھائی قائم علی خاں کو بھی امتحان دینے پر آمادہ کیا
 سید محمد خاں نے پہلی دفعہ قانون کی طرف کم توجہ کی تھی اس لیے وہ دوسرے
 سال امتحان میں پاس ہوئے مگر سرسید اور قائم علی خاں نے پہلی ہی بار امتحان دیکر
 وٹیلو یا حاصل کر لیا۔

امتحان کے بعد سرسید نے وہ خلاصہ چھاپ دیا اور اپنے بھائی کا نام بھی
 اس میں شامل کر کے اس کا نام انتخاب الاخویین رکھا جس کو اس زمانے کے بعض
 ظریف دونوں بھائیوں کے اتحاد کی وجہ سے دم الاخویین کہتے تھے۔ خان بہادر
 نقی غلام نبی خاں اور میرے بھائی مرحومین کہتے تھے کہ یہ انتخاب منصفی کے
 امیدواروں کے لیے ایسا مفید نکلا کہ چند روز میں تمام صوبہ میں شائع ہو گیا۔ لوگوں
 کو اس سے بہت فائدہ پہنچا اور بہت سے امیدوار اسی کی بدولت منصف
 ہو گئے۔ ۱۸۴۴ء میں انجمن اسلامیہ لاہور نے جو سرسید کو ایڈریس دی تھی

اس میں بھی سرسید کے اس احسان کا ذکر کیا تھا۔

دسمبر ۱۸۴۱ء میں مین پوری کی منصفی خالی ہوئی اور ۲۲ دسمبر کو وہ مین پوری کے منصف مقرر ہو گئے مگر ۱۰ جنوری ۱۸۴۲ء کو مین پوری سے تبدیل ہو کر فتحپور سیکری میں آ گئے یہ آگرہ کے قریب ہندوستان کا ایک تاریخی شہر ہے جلال الدین کے مرشد شاہ سلیم چشتی اسی شہر میں رہتے تھے اور اسی وجہ سے مدت تک یہ شہر اکبر کا دارالسلطنت رہا ہے اور یہاں کی قدیم شاہی عمارتیں اب تک اُس زمانے کی یاد گار ہیں۔ سرسید اس شہر میں چار برس تک منصف رہے فتحپور میں جہاں اکبر کی خواہگاہ تھی حسن اتفاق سے وہی مالیشان مکان سرسید کو رہنے کے لیے ملا تھا۔ یہ چاروں برس اُسی مکان میں گزرے۔

رسائل مذہبی وغیرہ

- اس زمانہ میں سرسید نے تین رسالے تالیف یا طبع کرائے ہیں :
- ۱۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب مولفہ ۱۲۵۱ھ صریح مختصر رسالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، وفات، معجزات اور دیگر حالات کے بیان میں اس لیے لکھا تھا کہ مولود کی مجلسوں میں جتنے رسالے شائع تھے اُن میں صحیح روایتیں بہت کم تھیں۔ سرسید نے اس رسالہ میں اُس زمانہ کے خیالات کے موافق محض صحیح روایتوں پر اکتفا کیا تھا۔
 - ۲۔ تحفہ جنتی مولفہ ۱۲۶۰ھ یہ ترجمہ ہے تحفۃ اثناعشریہ کے باب دہم اور باب دواز دہم کا۔ باب دہم میں وہ مطاعن جو شیعہ صدیق اکبرؑ پر کرتے ہیں صح

نے اس ترجمہ کے سوا کبھی سرسید نے کوئی کتاب یا رسالہ یا آرٹیکل ایسا نہیں لکھا جس سے شیعوں پر

اعتراض کرنا یا اُنکے اعتراض کا جواب دینا مقصود ہو۔ ۱۲۔

اُن کے جوابات کے مذکور ہیں، اور باب و دوازدہم میں تو لا اور تنبرا کا بیان ہے۔
 ۳۔ تسہیل فی جرثقیل مطبوعہ ۱۸۴۲ء یہ اردو ترجمہ جسوعلی نام ایک عالم کے
 ترجمہ فارسی موسوم بہ معیار العقول کا جو ابو ذر یمنی کے عربی رسالہ سے فارسی میں
 ترجمہ کیا گیا تھا، اس رسالہ میں مصنف نے جرثقیل کے پانچ اصول بیان کیے
 ہیں۔ یعنی بھاری چیزوں کے اٹھانے، سخت چیزوں کے چیرنے اور جن چیزوں
 کا دھانا یا پھوڑنا دشوار ہو اُن کے دبانے یا پھوڑنے کے لیے پانچ کلیں بتائی ہیں۔
 اور اُن کے بنانے اور استعمال کرنے کا طریقہ اور مختلف ترکیبیں بیان کی ہیں۔

خطاب بادشاہی

اسی زمانے میں بہادر شاہ نے سرسید کو اُن کا موروثی خطاب عنایت
 کیا۔ ۱۸۴۲ء میں جب وہ بین پوری سے تبدیل ہو کر فتحپور میں آئے تو چند روز
 کے لیے تقریب رخصتہ با تعطیل دلی آئے تھے اُس زمانہ میں حکیم احسن اللہ
 خاں بادشاہ کے ہاں نہایت کام کرتے تھے انھوں نے بادشاہ سے سرسید
 کی تقریب کی کہ اُن کے دادا کا خطاب اُن کو ملنا چاہیے، بادشاہ نے منظور
 کر لیا، اگرچہ سرسید کے دادا کا خطاب صرف جواد الدولہ تھا اور یہی خطاب
 مکہ کر حکیم احسن اللہ خاں نے پیش کیا تھا، مگر بادشاہ نے اُس میں عارف جنگ
 کا لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر کے جواد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ کا
 خطاب سرسید کو عنایت کیا اور خطاب ملنے کی تمام رسمیں حسب قاعدہ ادا کی گئیں
 ۱۸۔ فروری ۱۸۴۵ء کو سرسید فتحپور سیکری سے دلی تبدیل ہو گئے انھیں
 دنوں میں اُن کے بڑے بھائی کا عین عالم شباب میں انتقال ہوا تھا اور اُن
 کی والدہ پر یہ صدمہ نہایت سخت گذرا تھا، اس لیے انھوں نے خود درخواست

کر کے اپنی بدلی کرائی تھی۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک جب تک کہ وہ مستقل
صدر امین مقرر نہیں ہوئے دلی ہی میں رہے۔ اس عرصہ میں صرف دو دفعہ
یعنی ایک بار ۱۸۵۵ء میں اور دوسری بار ۱۸۵۳ء میں قائم مقام صدر امین مقرر
ہو کر رہتک جانے کا اتفاق ہوا۔

جس وقت وہ فتحپور سے بد لکھ دلی میں آئے تھے اُس وقت اُن کی عمر اسی
بیس کی تھی۔ یہاں آکر اُن کو یہ خیال ہوا کہ جو کتابیں ابتدا میں نہایت کم تو جہی اور
بے پردائی سے پڑھی تھیں ادب بالکل نسیا نسیا ہو گئی تھیں اُن کو از سر نو غور
اور توجہ سے پڑھیے۔ مولوی نوازش علی مرحوم جو دلی میں مشہور واعظ تھے اور تمام
وہسی کتابیں پڑھاتے تھے اُن سے کچھ پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا اور کچھ فقہ میں مثل
قدوری، و شرح وقایہ اور اصول فقہ میں شاشی، نورالانوار اور ایک آدھ اور
کتاب پڑھی۔ مولوی فیض الحسن مرحوم سے مقامات حریمی کے چند مقالے اور
سبعہ معلقہ کے چند قصیدے پڑھے اور مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبدالعزیز
کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق تھے حدیث پڑھنی شروع کی۔
مشکوٰۃ اور ایک حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر اجزاء صحیح مسلم کے پڑھے اور
پھر قرآن مجید کی سندلی۔ بس اس سے زیادہ جیسا کہ سر سید خود اقرار کرتے تھے
استاد سے انھوں نے کچھ نہیں پڑھا۔

آثار الصنادید

اُسی زمانے میں جب کہ وہ دلی میں منصف تھے اُن کو عمارات شہر اور
نواح شہر کی تحقیقات کا خیال ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ ”میں اپنی کل تنخواہ والدہ کو دے
دیتا تھا۔ وہ اس میں سے صرف پانچ روپے مہینہ اوپر کے خرچ کے لیے مجھ

دیدتی تھیں۔ باقی میرے تمام اخراجات اُن کے ذمہ تھے جو کپڑا وہ بنا دیتی تھی
 مین لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلا دیتی تھیں کھا لیتا تھا: اس کا سبب یہ تھا کہ
 اُن کی آمدنی گھر کے اخراجات کو مشکل سے مکتفی ہوتی تھی۔ اُن کے بڑے
 بھائی کا انتقال ہو چکا تھا جس سے سو روپیہ ماہوار کی آمدنی کم ہو گئی تھی بلکہ
 کی تنخواہیں تقریباً کل بند ہو گئی تھیں۔ باپ کی ملک بھی بسبب جین حیات
 ہونے کے ضبط ہو گئی تھی۔ کرایہ کی آمدنی بہت قلیل تھی۔ صرف سرسید کی
 تنخواہ کے سو روپیہ ماہوار تھے اور سارے کہنے کا خرچ تھا۔ سرسید اب تدا
 سے نہایت فراخ حوصلہ اور کشادہ دل تھے۔ خرچ کی تنگی کے سبب اکثر منقبض
 رہتے تھے۔ لہذا ان کو یہ خیال ہوا کہ کسی تدبیر سے یہ تنگی رفع ہو۔ سید الاخبار جو
 اُن کے بھائی کا جاری کیا ہوا اخبار تھا کچھ تو اس کو ترقی دینی چاہی اور کچھ عمارات
 دہلی کے حالات ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔

سید الاخبار کا اہتمام اگرچہ برائے نام ایک اور شخص کے سپرد کر رکھا تھا مگر
 زیادہ تر سرسید خود اُس میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ لیکن یہ اخبار ایک مدت جاری
 رہ کر بند ہو گیا۔ مگر عمارتوں کی تحقیقات نہایت محنت اور مچھلت کے ساتھ
 برابر جاری رہی۔ سرسید ہمیشہ تعطیلوں میں عمارات بیرون شہر کی تحقیقات کے
 لیے شہر کے باہر جاتے تھے۔ اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو رات کو بھی اکثر
 باہر رہتے تھے۔ اُن کے ساتھ اکثر اُن کے دوست اور مہم مولانا امام بخش صہبائی
 مرحوم ہوتے تھے۔

باہر کی عمارتوں کی تحقیقات کرنی ایک نہایت مشکل کام تھا۔ بسیوں عمارتیں
 ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈ ہو گئی تھیں۔ اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھنے نہ جاتے تھے
 بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہو سکتے تھے۔ اکثر کتبے ایسے

خطوں میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ بعض قدیم عمارتوں کے ضروری حصے
معدوم ہو گئے تھے اور جو متفرق و پراگندہ اجزا باقی رہ گئے تھے ان سے
کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کیوں بنائی گئی تھی اور اُس سے کیا مقصود تھا
کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے تھے ان کا مفصل حال دریافت کرنے کے
لیے تاریخوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی۔ بعض علمی عمارتوں کی حالت
ایسی متغیر ہو گئی تھی کہ ان کی مابیت معلوم ہونی مشکل تھی۔ پھر اکثر عمارتوں
کے عرض و طول و ارتفاع کی پیمائش کرنی۔ ہر ایک عمارت کی صورت حال قلمبند
کر لی۔ کتبوں کے چربے اُتارنے اور ہر ایک کتبے کو بعینہ اُس کے اصلی خط میں دکھانا
ہر ٹوٹی بھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصور سے کھجوانا اور اس طرح کچھ اوپر
سوا سو عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ براہ ہونا، فی الحقیقت نہایت دشوار کام
تھا۔ سرسید کہتے تھے کہ ”قطب صاحب کی لاش کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند
ہونے کے سبب پڑھے نہ جاسکتے تھے ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں
کے زچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور
چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربا اُتارتا تھا جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو
مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے
ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔“ سرسید کی آئندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی
تھی اور ان کی یہ حالت بالکل الہو تمام کے اس شعر کی مصداق تھی۔

وَيَصْعَدُ سَخْتِي يَطْلُبُ الْوَمَزَى بَانَ لَهُ حَاجَةً فِي السَّمَاءِ

(یعنی وہ ایسے شوق سے اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں اُس کو آسمان پر کچھ کام ہے)
باوجود اس قدر مشکلات کے آثار الصنادید کا پہلا ڈیٹیشن ڈیڑھ برس
کے اندر اندہ چھپ کر تیار ہو گیا۔ اس ڈیٹیشن میں چار باب تھے۔ پہلا باب عمارات

بیرون شہر کے جہان میں دوسرا باب لال قلعہ اور اس کی عمارتوں کے بیان میں۔
 تیسرا باب خاص شہر شاہجہاں آباد کی عمارتوں وغیرہ کے بیان میں چونکہ باب
 دلی کے مشہور اور نامور لوگوں کے ذکر میں جو سرسید سے کچھ پہلے یا ان کے زمانہ
 میں موجود تھے۔ پہلے باب میں تقریباً ۱۳۰ عمارتوں کا بیان ہے جن میں ہندو
 اور مسلمان دونوں کی عمارتیں شامل ہیں اور چہند کے سوا باقی ہر عمارت کا کتبہ
 اور نقشہ اس کے ساتھ دیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ۳۲ عمارتوں کا بیان اور
 اس کے نقشے اور کتبے مندرج ہیں۔ تیسرے باب میں تقریباً ۷۰ حلیوں، مسجدوں
 مستدروں، بازاروں، ہاویوں، اور کتھوں وغیرہ کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں
 اول کسی قلعہ ان شہروں، قلعوں اور محلوں وغیرہ کا بیان ہے جو مسلمانوں کی طرف سے
 لے کر آخر تک وقتاً فوقتاً اس سرزمین میں آباد ہوئے۔ اس کے بعد یہاں کی آب
 و ہوا اور زبان اردو کا ذکر ہے۔ پھر مشاہیر اہل دہلی کا حال لکھا ہے جس میں ایک
 سو بیس مشائخ، علما، فقراء، مجاذیب، اطباء، قراء، شعرا، خوشنویس، مصنف، موسیقی
 دان وغیرہ کا بیان ہے۔ اگرچہ اس اڈیشن کی عبارت قدیم طرز کی رنگینی اور
 مبالغہ اور تکلفات باروہ کے سبب آج کل کے مذاق کے موافق بہت پھکی
 اور بے مزہ ہو گئی تھی اور اس کے سوا اس میں اور بھی بہت سی کسر ہے اور فرد
 گذشتہ رہ گئی تھیں مگر معنوں کے لحاظ سے نہایت عبرت خیز تھی۔ اول
 کے تین باب دیکھ کر سرزمین دہلی کی قدیم شان و شوکت اور عظمت کی تصویر
 آنکھوں کے آگے پھر جاتی ہے اور تھوڑی دیر کو دنیا سے دل سرد ہو جاتا ہے۔
 اور پچھلے باب سے دلی کا اخیر جھکڑ آنکھوں کے روبرو آ جاتا ہے اور تعجب ہوتا
 ہے کہ جس شہر میں بچا اس حاکم پر سے پہلے قوم کے اس قدر اہل اللہ اہل علم اور
 اہل ہنر موجود تھے آج وہاں چاروں طرف سناٹا نظر آتا ہے۔

الغرض یہ اڈیشن ۱۸۴۷ء میں چھپکر شائع ہوا۔ اُسی زمانے میں مسٹر رابرٹس
 کلکٹر و مجسٹریٹ شاہجہاں آباد ولایت جاتے تھے۔ وہ ایک نسخہ آثار الصنادید
 کا ساتھ لے گئے اور وہاں جا کر اُس کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ ممبران
 سوسائٹی نے اُس کو بہت پسند کیا اور کورٹ آف ڈائریکٹرز کے بعض ممبروں
 نے مسٹر رابرٹس سے کہا کہ اگر اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہو جائے تو بہت
 بہتر ہے۔ جب مسٹر رابرٹس ولایت سے واپس آئے تو انھوں نے سرسید کی
 شرکت سے اُس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہا۔ اس وقت سرسید کو یہ خیال ہوا
 کہ جو کسریں پہلے اڈیشن میں رہ گئی ہیں اُن کی درستی اور اصلاح کی جائے۔ چنانچہ
 انھوں نے کتاب پر نظر ثانی کر کے اس کو از سر نو مرتب کیا۔ جو کچھ ترمیم یا اصلاح
 یا اضافہ انھوں نے پہلے اڈیشن میں کیا ہے اُس کا مفصل ذکر طبع ثانی کے
 دیباچہ میں مندرج ہے۔ بڑی خوبی اس نئے اڈیشن میں یہ ہے کہ اس کی
 عبارت میں بہ نسبت پہلے اڈیشن کے نہایت سادگی ہے اور اس کا بیان
 ایشیائی مبالغوں اور تکلفات بارود سے بالکل پاک ہے۔ اس اڈیشن کے
 لیے سرسید نے نقشے بھی از سر نو کمال اہتمام سے نہایت عمدہ تیار کرائے تھے۔
 مگر ابھی چھپنے نہ پائے تھے کہ غدر ہو گیا اور وہ سب نقشے تلف ہو گئے۔ کچھ نقشے
 جواب ملے ہیں وہ محمد ن ایٹلو اور ٹیل کالج کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ البتہ چوتھا
 باب جس میں دلی کے مشاہیر کا حال لکھا گیا تھا وہ اس اڈیشن میں نہیں ہے اس
 ترمیم و اصلاح کے باعث دراصل مسٹر آڈورڈ ٹامس ہوئے تھے جو اُس وقت
 دلی میں سیشن جج تھے اُن کو پرانی چیزوں کی تحقیقات کا نہایت شوق تھا انھیں
 کے کہنے سے سرسید نے آثار الصنادید کو از سر نو مرتب کیا تھا۔
 یہ اڈیشن ۱۸۵۵ء میں چھپکر تیار ہو گیا تھا مگر نہ اس اڈیشن سے اس قدر

نہ پہلے اڈیشن سے سرسید کو جیسا کہ خیال تھا، کچھ فائدہ ہوا۔ دوسرے اڈیشن کے تقریباً تمام نسخے غدر میں تلف ہو گئے۔ اور پہلے اڈیشن میں بھی ایک شخص کی بد عہدی کے سبب جو اس کے چھاپنے کا ذمہ دار ہوا تھا، سراسر نقصان رہا۔

مسٹر رابرٹس کلکٹر و مجسٹریٹ دہلی نے سرسید کی شرکت سے اس کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا مگر ابھی بہت کچھ ترجمہ کرنا باقی تھا کہ مسٹر رابرٹس کی دلی سے تبدیلی ہو گئی۔ پھر معلوم نہیں کہ وہ ترجمہ پورا ہوا یا نہیں اور کسی نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا یا نہیں۔ لیکن فرانس کے مشہور اور فیڈلٹ موسیو گارساں دتاسی نے ۱۸۶۱ء میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کر کے مشہر کیا جس کی ایک جلد سرسید کو بھی بھیجی تھی۔ اسی ترجمہ کو دیکھ کہ لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو سوسائٹی نہ کو رسکا آنریری فیلو مقرر کیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۶۲ء میں ہول مسٹر برین ہولڈ راست سکریٹری سوسائٹی موصوف کی چھٹی مورخہ ۲۰ جون ۱۸۶۲ء سرسید کے نام اس معنون کی پہنچی کہ "یورپ میں آپ کی کتاب کی بہت قدر کی گئی ہے اور یہ اتفاق رائے چند ممبران سوسائٹی آپ اس سوسائٹی کے آنریری ممبر مقرر ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد جو ڈپلوما سوسائٹی نے سرسید کو بھیجا اس کا ترجمہ ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

لندن ۲ جولائی ۱۸۶۲ء

گریٹ برٹن اور آئرلینڈ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے دیرسر پرتی ہرموسٹ اگسٹٹ مجسٹری و کٹوریا آج کی تاریخ سید احمد خاں کو اس سوسائٹی کی آنریری ممبری کے ساتھ نامزد کیا جس کی سند میں یہ ڈپلوما ان کو ارسال کیا جاتا ہے۔

دستخط اڈورڈ کول ہروک پریسیڈنٹ

دستخط ایچ رالفن ڈائریکٹر

دستخط برین ہولڈ راست سکریٹری

رسائل مذہبی وغیرہ

اسی زمانے میں جب کہ وہ دہلی میں منصف تھے آثار الصنادید کے علاوہ انھوں نے اور بھی کئی رسالے لکھے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ فوائد الافکار فی اعمال الفرجارہ مترجمہ ۱۸۴۶ء یہ رسالہ ترجمہ ہے اُن فارسی مسودات کا جو سرستید کے نانائواب و پیرالدولہ نے پرکار متناسبہ کے اعمال پر (جو انھوں نے خود سوچ سوچ کر نکالے تھے) فارسی میں قلمبند کیے تھے۔ یہ مسودات سرستید کے ہاتھ آ گئے تھے۔ انھوں نے دو انگریزی عالموں کے کہنے سے ان مسودات کا ترجمہ اردو میں کیا اور اُس میں شاملیں اپنی طرف سے اضافہ کیں۔

۲۔ قول متین و البطلان حرکت زمین مؤرخہ ۱۸۴۵ء اس رسالہ میں قدیم خیالات کے موافق سرستید نے زمین کی حرکت کو جس کا اب تمام یورپ قائل ہے غلط ثابت کرنا چاہا تھا۔ لیکن اب مدت سے حرکت زمین کا انکار نہیں کرتے تھے بلکہ اُس کو یقینی جانتے تھے۔

۳۔ کلمۃ الحق مؤلفہ ۱۸۴۹ء یہ رسالہ پیری مریدی اور بیعت کے طریقہ مرحومہ کے برخلاف لکھا ہے۔

۴۔ راہ سنت و رد بدعت مؤلفہ ۱۸۵۰ء یہ رسالہ وہابیت کے جوش کے زمانہ میں اہل بدعت کے برخلاف متبعین سنت کی تائید میں لکھا ہے۔

۵۔ تمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ مرقومہ ۱۸۵۲ء۔ یہ رسالہ فارسی زبان میں بطور ایک فرضی یا واقعی مکتوب کے لکھا ہے جس میں تصور شیخ مصطلح مشائخ نقشبندیہ کو وسیلۂ محبت خدا و محبت رسول و انبویہ رحمت الہی بتایا ہے۔

۶۔ سلسلۃ الملوک مرتبہ ۱۸۵۴ء یہ ایک مختصر مگر مفید اور صحیح فہرست اُن

راجاؤں اور بادشاہوں کی ہے جو دہلی میں پانچھزار برس سے نوبت بہ نوبت فرمانروا ہوتے چلے آئے اُس میں راجہ یڈھشٹر سے لیکر ملکہ مغظمہ قیسر، ہند تک ۲۰۲ فرما نرواؤں کا نام، ہاپ کا نام، سنہ جلوس، دارالسلطنت اور یہ کہ اُس کا عہد کس زمانے میں تھا، نہایت تحقیق اور جانفشانی سے لکھا ہے۔ اصل میں یہ وہی فہرست ہے۔ جو آثار الصنادید کے دوسرے اڈیشن میں پہلے باب کے ساتھ اضافہ کی گئی ہے اسی کو کس قدر اصلاح کے بعد علیحدہ چھاپ کر اُس کا نام سلسلۃ الملوک رکھ دیا ہے۔

۷۔ آغازِ کیمیائے معلوت کے چند اسباق کا ترجمہ مرقومہ ۱۸۵۳ء۔ بس اس کے سوا دلی کی مصنفی کے زمانہ میں سرسید نے اور کوئی کتاب یا رسالہ نہیں لکھا۔

دلی سے بجنور کو تبدیل ہونا

سرسید دلی میں جب کہ آثار الصنادید کو ترتیب دے رہے تھے، درجہ اول کے منصف ہو گئے تھے اور اب اُن کا نمبر صدر امینی کا تھا۔ لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ اُس وقت دلی میں ہر قسم کے اہل کمال اور اہل علم موجود تھے اور مسلمانوں کی اس سوسائٹی میں کسی قدر جان باقی تھی اور کچھ عمارتوں کی تحقیقات کے ذوق و شوق میں وہ دلی سے باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے ایک آدھ بار جو اُن کو قائم مقام صدر امین مقرر کر کے کہیں باہر بھیجا چاہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ رہنمائی میں جو وہ قائم مقام صدر امین ہو کر گئے اس کا سبب یہ تھا کہ وہ چند روز کے لیے ایک خاص کام پر بھیجے گئے تھے۔ ۱۸۵۴ء میں جب کہ آثار الصنادید کا دوسرا اڈیشن بھی بلکال پچلے تھے، اتفاق سے مسٹر ڈورڈ ٹامس جو دلی میں چارہ چکے تھے اور جن کے ایسا ہے آثار الصنادید کی دوبارہ اصلاح کی گئی تھی کہیں سے آگرہ میں وارد ہوئے اور صدر بورڈ کے حکام سے ملنے کو بورڈ میں چلے گئے اُس وقت بجنور کی صدر امینی

خالی تھی اور صدر امینی کے امیدواروں کی فہرست بورڈ میں پیش تھی۔ طامس صاحب نے سرسید کا نام یاد دلایا۔ بورڈ کے ممبروں نے کہا کہ وہ دلی سے باہر جانا نہیں چاہتے اس لیے اُن کا نام امیدواروں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔ طامس صاحب نے کہا کہ وہ قدیم عمارت دہلی کی تحقیقات میں مصروف تھے سو وہ کام ختم ہو گیا ہے۔ اب اُن کو دلی سے باہر جانے میں کچھ عذر نہ ہو گا۔ اور ایک چھٹی سرسید کو لکھی کہ تم کو بجنور میں صدر امینی پر بھیجنے کی تجویز ہو گئی ہے اب تم ہرگز الکار نہ کرنا۔ اس لیے سرسید کو لاچار دلی چھوڑنی پڑی۔ چنانچہ ۱۳ جنوری ۱۸۵۵ء کو وہ مستقل صدر امین مقرر ہو کر دلی سے بجنور کو تبدیل ہو گئے۔ بجنور میں سوا دو مہس اُن کو گندے تھے کہ عذر ہو گیا۔ اس تھوڑے سے عرصہ میں انھوں نے اپنے فرائض منصبی کے علاوہ فرصت کے وقتوں میں دو کام نہایت سخت محنت کے کیے جو ذکر کے قابل ہیں۔ ایک ضلع بجنور کی تاریخ کا مرتب کرنا، دوسرے آئین اکبری کی تصحیح اور تکمیل

ضلع بجنور کی تاریخ

جس زمانے میں سرسید بجنور کو تبدیل ہو کر گئے انھیں دنوں میں ایک سرکلر محکمہ صدر بورڈ سے تمام صاحبان ضلع کے نام اس مضمون کا جاری ہوا تھا کہ جس ضلع کا بندوبست ختم ہو جائے اُس ضلع کی ایک مفصل تاریخ لکھواٹی جائے۔ یہ سرکلر پہلے سے صاحب کلکٹر کے دفتر میں آیا ہوا تھا مگر ابھی تک اُس پر کچھ عملدرآمد نہ ہوا تھا۔ ایک روز صاحب کلکٹر نے سرسید سے اُس کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا اس ضلع کی تاریخ میں لکھوں گا۔ صاحب کلکٹر مثبت خوش ہوئے اور محکمہ بندوبست میں حکم بھیج دیا کہ جس پر گز یا گانو کے کاغذات صدر امین صاحب طلب کریں فوراً ان کے پاس بھیج دیے جائیں اور اسی طرح تمام تحصیلداروں کو ہدایت کی گئی کہ

جس قانون کو یا پٹواری کو وہ بلائیں یا جو کاغذات وہ منگوائیں اُن کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ سرسید نے یہ تاریخ بھی اپنی جہلی عادت کے موافق نہایت تحقیق اور کاوش اور محنت کے ساتھ لکھی۔ اُن کا بیان ہے کہ ”گو اس تاریخ میں ضلع کے حالات کے سوا کوئی عام دلچسپی کی بات نہ تھی مگر اثنائے تحقیقات میں بعض قانون گویوں کے پاس اکبر اور عالمگیر کے زمانہ کے ایسے کاغذات ملے جن سے نہایت عمدہ نتیجے نکلتے تھے۔“ اُن سب کاغذات کی نقلیں اپنے اپنے موقع پر اس تاریخ میں درج تھیں۔ جب یہ تاریخ لکھی جا چکی تو صاحب کلکٹر نے اُس کو ملاحظہ کے لیے صدر بورڈ میں بھیج دیا۔ ابھی وہ بورڈ سے واپس نہ آئی تھی کہ غدر ہو گیا اور آگرہ میں تمام دفتر سرکاری کے ساتھ وہ بھی ضائع ہو گئی۔ مسٹر شکسپیر کلکٹر ضلع بجنور اسی تاریخ کی نسبت اپنی چٹھی مورخہ ۵ جون ۱۸۵۷ء میں لکھتے ہیں کہ ”سید احمد خاں اُن باتوں کی طرف بھی متوجہ ہوئے ہیں جو اُن کے خاص کام سے علاوہ نہیں رکھتیں۔ چنانچہ انھوں نے اس ضلع کی تاریخ بھی بہت محنت کے ساتھ تیار کی تھی کہ غدر سے چند روز پہلے ہم نے یہ کتاب گورنمنٹ میں بھیجی تھی۔ اگر وہ اس وقت یہاں میرے پاس موجود ہوتی تو بہت بکا رآمد ہوتی، مگر غالب ہے کہ آگرہ میں بیامٹ غدر کے تلف ہو گئی ہوگی۔“

اسی تاریخ میں سرسید نے ایک لمبی بحث سنہ فعلی کے متعلق لکھی تھی اور جو غلطی سنہ فعلی اور سنہ علی میں فرق نہ کرنے اور دونوں کو ایک سمجھنے سے سرکاری دفاتروں میں ہمیشہ سے چلی آتی تھی اُس کو نہایت وضاحت کے ساتھ گورنمنٹ پر ظاہر کیا تھا اور جو مشکلات کہ اُس غلطی سے لازم آتی تھیں اُن کو بخایا تھا۔ گو یقیناً نہیں کہا جاسکتا کہ گورنمنٹ نے سرسید کی اسی سخریہ پر لحاظ کر کے اس غلطی کی اصلاح کی کیونکہ وہ تاریخ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں تلف ہو گئی تھی۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ صدر بورڈ کا ایک سرکلر سنہ ۱۸۷۱ء میں اور دوسرا سنہ ۱۸۷۱ء میں منظوری گورنمنٹ جاری ہوا جس کی رو سے علاوہ سنہ فصلی اور سنہ حسابی کے ایک اور سنہ مالی کے نام سے مقرر کیا گیا جو بالکل سنہ عملی کے مطابق ہے اور جس سے وہ تمام مشکلات رفع ہو گئیں جو سرسید نے اپنی تاریخ میں جنائی تھیں۔ کچھ تعجب نہیں ہے۔ کہ جو کچھ سرسید نے تاریخ بجنور میں اس امر کے متعلق لکھا تھا وہ بورڈ کے کسی ممبر کے ذہن میں محفوظ رہا ہوا اور غدر کے دو تین برس بعد اسی بنا پر سنہ مالی مقرر کیا گیا ہو۔ سرسید نے اسی سنہ فصلی کے مضمون پر سنہ ۱۸۷۶ء میں ایک نہایت مفید اور مفصل لکچر سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ میں دیا تھا جو ۸- جون سنہ کے اخبار میں درج ہے۔ اس لکچر میں انھوں نے تقریباً وہ تمام خیالات ظاہر کیے ہیں جو سنہ فصلی کے متعلق تاریخ بجنور میں تحریر کیے تھے۔

آئین اکبری کی تصحیح

جب سرسید دہلی میں منصف تھے تو حاجی قطب الدین مرحوم نے جو دہلی کے ایک مشہور تاجر تھے ان سے درخواست کی تھی کہ اگر آپ آئین اکبری پر ایک تفصیلی نظر ڈالکر اس کی تصحیح اور درستی کر دیں تو میں اُس کو چھپوا دوں اور اُس کے معاوضہ میں آئین اکبری کے چھپے ہوئے نسخے قیمتی سولہ سو روپے کے آپ کی نقد کروں گا۔ سرسید نے منصفی دہلی کی حالت میں وہیں کے ایک تاجر سے ایسا معاہدہ کرنا جائز نہ سمجھا۔ مگر چونکہ ایسے مفید اور دشوار کاموں میں ان کا جی بہت لگتا تھا، بجنور ہینکراٹھوں نے یہ کام شروع کیا۔

آئین اکبری اول تو زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے ایک نئی طرح کی کتاب تھی دوسرے جس قسم کے مضامین اُس میں بیان کیے گئے ہیں۔ فارسی لٹریچر

میں کبھی اس قسم کے مضامین بیان نہیں ہوئے تھے اس لیے اس کے پڑھنے سے جی الجھتا تھا۔ پھر آئین اکبری کے نسخے کاتبوں کے سہو و غلط سے اکثر مسخ ہو گئے تھے اس لیے اس کا صحیح کرنا سخت دشوار تھا۔ سرسید نے اول جہاں تک مل سکے اس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے۔ اس میں ایک آدھ نسخہ صحیح بھی مل گیا اور اس طرح غلط اور صحیح نسخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے ایک نسخہ سب سے زیادہ صحیح تیار ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے اکثر غریب الفاظ کی شرح کی، جو اصطلاحیں اکبر کے زمانہ میں ہر ایک آئین کے متعلق مستعمل تھیں یا خود ابوالفضل نے اختراع کی تھیں ان کی جا بجا تشریح کی۔ اس زمانے کے اوزان اور نقود کی اس زمانہ کے اوزان و نقود سے مطابقت کی، جن جدولوں میں مصنف نے کچھ خانے خالی چھوڑ دیئے تھے اور تمام نسخوں میں وہ خانے خالی پائے گئے۔ ان کو ادر کتابوں سے تحقیق کر کے معمور کیا، کہیں کہیں جدولوں میں جو خود مصنف نے غلطی کی تھی اس کو بہت کوشش سے تحقیق کر کے صحیح کیا۔ بعض جدولوں میں ہندسوں کی جگہ حرف لکھے ہوئے تھے ان کی قیمت ہندسوں میں بھی ظاہر کر دی۔ بعض جدولیں جو تمام نسخوں میں مختلف پائی گئیں، وہ آئین کے انگریزی ترجمہ کے مطابق جس میں ہر جدول نہایت صحت کے ساتھ لکھی گئی تھی کتاب میں داخل کیں۔ اکثر جدولوں میں ایک خانہ اپنی طرف سے آخر میں اس لیے اضافہ کیا کہ اس سے پہلے خانے کا مفہوم ہر شخص آسانی سمجھ جائے۔ جہاں آئین میں سیکوں کا بیان ہے وہاں چند اوراق بطور حاشیہ کے اپنی طرف سے بڑھائے اور اکبر کے زمانے کے جس قدر سیکے ابوالفضل نے بیان کیے تھے ان میں سے ہر ایک سیکے کی دو دو تصویریں دے کر دونوں طرف جو عبارت یا الفاظ کندہ تھے ان کو دکھایا اور اکبر ہی کے زمانہ کے آٹھ سیکے سونے اور

چاندی کے ان کے علاوہ اور نشان دینے اس کے سوا اور بہت سی باتیں مفید امانہ کہیں۔
 پھر اصل آئین میں خال خال تصویریں تھیں، سرسید نے نہایت محنت و
 جانفشانی اور حسن اہتمام سے بے شمار تصویریں دلی کے لائق مصوروں سے کھچوا
 کہ کتاب میں اپنے اپنے موقع پر داخل کیں، مثلاً ٹکسال کے متعلق تقریباً پچاس
 پچپن تصویروں کے دو بڑے بڑے مرتعے کھچوانے جن میں مختلف کارگر اپنے
 اپنے آلات اور ظروف اور اوزار لیے ہوئے جدا جدا کام کر رہے ہیں۔ اسی
 طرح فلزات کے متعلق ترازوئے ہوائی و ترازوئے آبی کی تصویر، شکار اور پریش
 کے موقع پر خمیہ گاہ و بادشاہی کی تصویر، آئین چراغ خانہ کے متعلق اکبر کی آتش
 پرستی اور اس کے تمام لوازمات کی تصویر، آئین شکوہ سلطنت کے متعلق تمام
 سامان توڑک و خنڈی کی تصویریں، فیلیں اور ہاتھیوں کی پوشش اور ہاتھیوں
 کی کشتی کی تصویریں، علیٰ ہذا القیاس تمام پھلدار اور پھولدار درختوں کی اور ہر
 ایک درخت کے ساتھ اس کی شاخ اور برگ و ثمر یا پھول اور پتے کی تصویریں
 اور اق گنجدہ قدیم اور گنجدہ مختصرہ اکبر کی تصویریں اور تمام ہتھیاروں اور زیوروں
 کی تصویریں اور ان کے سوا اور بہت سی تصویریں کھچوا کر کتاب میں شامل کیں
 چنانچہ سٹرایچ بلاک مین پرنسپل گلکے کالج نے جو سٹیشن میں آئین کا از سر نو
 ترجمہ کر کے چھاپا ہے اس میں انہیں تصویروں کی نقل لی ہے جو سرسید نے فارسی
 آئین اکبری میں داخل کی تھیں۔

پہلی اور تیسری دو جلدیں اس طرح صحیح اور درست کہ کے مطبع میں چھپنے کو
 بھیج دی گئیں مگر دوسری جلد کی تصحیح میں یہ مشکل پیش آئی کہ ابوالفضل نے آئین
 خزائن کے متعلق جو تمام ہندوستان کا محاصل لکھا تھا وہ حصہ تمام نسخوں میں
 مختلف پایا گیا اور کوئی ذریعہ اس کی تصحیح کا نہ تھا، اتفاق سے دلی میں سرسید

کے نانائواب دبیر الدولہ کے وقت کی ایک کتاب تشکیل دی جس میں سلطنت مغلیہ کے کل بادشاہوں کے عہد کا محاصل نہایت مفصل اور صحیح طور پر واضح کیا اس کتاب سے تمام محاصل جو اکبر کے زمانہ کا تھا نقل کر کے دوسری جلد بھی مکمل کی گئی اور ایک مبادیہ چاہے جو گویا آئین اکبری پر ایک مفصل ریویو تھا، تحریر کر کے دوسری جلد کے ساتھ دلی میں چھپنے کو بھیجا لیکن افسوس ہے کہ یہ جلد ابھی چھپنے نہ پائی تھی کہ غدر ہو گیا اور اس کے جس قدر فرے چھپ چکے تھے وہ اتمام مسودہ اور دیرپا سب تلف ہو گئے۔ اب اس آئین اکبری کی جو سرسید نے صحیح کی تھی صرف پہلی اور تیسری دو جلدیں مطبوعہ ۱۲۷۲ ہجری کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔

دہلی کے جن نامور لوگوں کی تقریریں آثار الصنادید کے آخر میں درج ہیں انہوں نے آئین اکبری پر بھی نظم یا نثر میں تقریریں لکھی تھیں مگر آئین کے آخر میں صرف مولانا صہبائی کی تقریر چھپی ہے۔ مرزا غالب کی تقریر جو ایک چھوٹی سی فارسی ثنوی ہے وہ کلیات غالب میں موجود ہے مگر آئین اکبری میں سرسید نے اس کو قصداً نہیں چھپوایا۔ اس تقریر میں مرزا نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ابوالفضل کی کتاب اس قابل نہ تھی کہ اسکی تصحیح میں اس قدر کوشش کی جائے چنانچہ کہتے ہیں۔

مژدہ یاراں را کہ اس دیریں کتاب یافت از اقبال سید فتح باب دیدہ بیتا آمد و باز دوی کہنگی پوشید تشریف نوی دی کہ تصحیح آئین مائے اوست ننگ و عار بیت اللہ اوست

اس کے بعد بہت سے اشعار اس مضمون کے لکھے ہیں کہ تعریف کے قابل انگریزوں کے آئین و ایجاد و اختراع ہیں نہ کہ اکبر اور ابوالفضل کے۔ اور تمثیلاً انگریزوں کے بہت سے ایجادات بیان کیے ہیں۔ جب یہ تقریر مرزا نے سرسید کو بھیجی انہوں نے اس کو مرزا کے پاس واپس بھیج دیا اور لکھا کہ ایسی تقریر مجھے درکار نہیں۔ ایک عربی تقریر نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کی بھی ہے مگر وہ (حاشیہ محلہ صفحہ پر)

بھی شاید دیر میں پہنچنے کے سبب سمجھنے نہیں پائی۔ انھوں نے بھی اپنی تقریظ کے آخر میں ایک فارسی شعر ایسا لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں بھی آئین اکبری کی کچھ زیادہ وقعت نہ تھی۔

مگر اہل یورپ اس کتاب کو ہندوستان کی تارینچوں میں ایک بے نظیر کتاب سمجھتے ہیں۔ ۱۷۷۹ء سے اہل فرانس اور انگریز اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اس وقت سے ۱۸۷۹ء تک اس کے متعدد ترجمے اور خلاصے فریچ اور انگلش میں ہو چکے ہیں۔ سٹراپچ بلاک میں جنھوں نے ۱۸۷۳ء میں انگریزی میں نہایت احتیاط کے ساتھ اس کا ترجمہ کر کے شائع کیا تھا اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ یہ کتاب مسلمانوں کی تارینچوں میں جو ہندوستان میں لکھی گئی ہیں اپنا نظیر نہیں رکھتی یہ فی الواقع اس سلطنت کی جو ۱۵۹۰ء کے قریب تھی۔ ایک ایڈمنسٹریشن رپورٹ اور نقشبجات ہیں جن میں اکبر کے عہد کے وہ تمام حالات اور واقعات درج ہیں جن کے لیے ہم اس زمانے میں ایڈمنسٹریشن رپورٹیں نقوشوں اور گزٹیروں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

پس سرسید کا ایک ایسی نادرا وجود کتاب کی تصحیح و تہذیب میں کوشش

نے سرسید کہتے تھے کہ ”جب میں مراد آباد میں تھا اس وقت مرزا صاحب نواب یوسف علیاں مرحوم سے ملنے کو راہ پر گئے تھے ان کے جانکی تو مجھے خبر نہیں ہوئی مگر جب دلی کو واپس جاتے تھے میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرانے ہیں اس کو ٹھہرے ہیں میں فوراً سرانے میں پہنچا اور مرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمارے ہول کے اپنے مکان پر لے آیا ظاہر اُجب سے کہ سرسید نے تقریظ کے چھپنے سے انکار کیا تھا وہ مرزا سے اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے اور دونوں کو حجاب دامنگیز ہو گیا تھا اور اسی لیے مرزا نے مراد آباد میں آنے کی ان کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب مرزا سرانے سے سرسید کے مکان پر پہنچے اور بالائی سے اترے تو ایک بونل ان کے ہاتھ میں تھی انھوں نے اس کو مکان میں لا کر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی سرسید نے کسی وقت اس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھڑی میں رکھ دیا۔

بلیغ کر کے اس کو از سر نو زندہ کرنا صرف یہی نہیں کہ وہ کوئی فضول کام نہ تھا بلکہ فی
 الحقیقہ پسک پر ایک بہت بڑا احسان تھا اور مسلمانوں کے ایک نامور مصنف
 اور نامور بادشاہ کے کارنامہ کو دنیا کے سامنے ایک دلنشین صورت میں پیش کرنا تھا۔
 غدر سے پہلے صرف سوا دو برس سرسید کا بجنور میں رہنا ہوا اسی قلیل عرصہ
 میں مذکورہ بالا کاموں کے سوا اور اپنے فرائض منصبی کے علاوہ اور بھی چھوٹے
 چھوٹے مفید کام کرتے رہے۔ چونکہ اُن کی طبیعت کو تعمیر کے کام سے ایک خاص
 قسم کا رگڑا تھا اس لیے صاحب کلکٹر نے کیشی رنہ عام کا تمام کام اُن کے سپرد
 کر دیا تھا۔ وہی اُس کی رپورٹ لکھتے تھے اور وہی ضروری کاموں کے لیے روپیہ
 منگواتے تھے اور سب ایک کام کی نگرانی کرتے تھے منجملہ اور کاموں کے ایک مفید
 کام انھوں نے یہ کیا کہ بجنور کی آبادی کے متعل شائع عام کے بچوں بیچ مدت
 سے ایک نہایت چوڑا چکلا گرٹھا پڑا ہوا تھا۔ اسی رستے سے تمام گاڑیاں، گھوڑے
 پیدل اور سوار گزرتے تھے۔ بعض اوقات گاڑیاں اکٹ جاتی تھیں۔ بیلوں کو نقصان
 پہنچتے تھے۔ برسات میں پانی بھر جاتا تھا جس سے طرح طرح کی تکلیفیں لوگوں کو
 ہوتی تھیں۔ مدت سے یہ گرٹھا چلا آتا تھا مگر کسی کو کچھ خیال نہ تھا۔ سرسید نے
 خاص اپنے اہتمام سے وہاں ایک پُل بندھوایا اور بجنور سے دارائے تک ایک
 سڑک بنوادی جس سے مسافروں کو بہت آسانی ہو گئی۔

تیسرا باب

۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۸ء تک

”ایام غدر کی خدمات اور واقعات، مراد آباد کی تبدیلی اور تاریخ سرکشی بجنور کی اشاعت، مراد آباد میں مدرسہ قائم کرنا، رسالہ اسباب بغاوت لکھ کر اور چھپوا کر ولایت بھیجا۔ ملکہ معظمہ کے اشتہار کا شکریہ، ایک میگزین موسوم بہ ”دلائل محمد نرسا آف انڈیا“ اردو اور انگریزی میں نکالنا، تحقیق لفظ نصاریٰ پر ایک مختصر رسالہ لکھنا، انتظام قحط ضلع مراد آباد، تصحیح تاریخ فیروز شاہی تفسیر توریت و انجیل، بی بی کا انتقال، غازی پور کی تبدیلی، غازی پور ہی میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنا، غازی پور میں مدرسہ قائم کرنا، علیگڑھ کی تبدیلی، برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کرنا، اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیوں کا مقرر کرانا۔ سائنٹفک سوسائٹی اخبار کا علیگڑھ سے نکالنا، ورنیکلر یونیورسٹی کے لیے تحریک، بنارس کی تبدیلی، اردو زبان اور فارسی خط کی حمایت، رسالہ طعام اہل کتاب، رسالہ علاج ہیضہ بموجب اصول ہومیوپیتھک۔“

ایام غدر کا بیان

جس واقعہ نے ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کے نام پر ایک سیاہ

دھیابھ چھوڑا ہے اور جو ہندوستان کی قوموں کی قیمت کا فیصلہ کرنے والا اور سرسید کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنے والا تھا، وہ سرسید کو بجنور میں دیکھنا چاہتا، اُن کو اس ضلع میں دو برس اور چار مہینے گزرے تھے کہ اسی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں بغاوت ہوئی اور ۱۲۔ کو یہ خبر بجنور میں پہنچ گئی۔ وہاں اُس وقت بیس یورپین اور یوریشین عورتوں اور بچوں سمیت تھے۔ سرسید نے اس موقع پر اپنا پہلا فرض یہ قرار دے لیا تھا کہ جب تک دم میں دم باقی ہے ان بیس جانوں کے بچانے میں جہاں تک ممکن ہو کوشش کی جائے۔ جو واقعات اور مصائب وہاں پیش آئے وہ نہایت درد انگیز ہیں اور سرسید کی تاریخ سرکشی بجنور میں مفصل مذکور ہیں۔ اُن کی تفصیل دوبارہ لکھنی گویا اُن مصیبتوں کا پھر یاد دلانا اور رنج کو دوبالا کرنا ہے۔ ع مَصَائِبُ اخَوٰی وَذُكُورُكَ الْمَصَائِبُ

خلاصہ یہ ہے کہ سرسید نے اُس خطرناک موقع پر نہایت دلیری اور جوانمردی سے تمام مصیبت کے زمانے میں یورپین حاکموں کا جو وہاں موجود تھے، ساتھ دیا۔ ہر ایک نازک وقت میں اُن کے ساتھ شریک اور گورنمنٹ کی ولاداری اور خیر خواہی میں شب و روز مستعد اور سرگرم رہے۔ جو لوگ گورنمنٹ کے غیر خواہ تھے اپنی مستعدی اور سرگرمی سے اُن کے دل بڑھائے اور جن کی نیتوں میں نر نزل اور تندہی پایا اُن کو نیک صلاحیں دیں اور جہاں تک ممکن تھا اُن کے خیالات کی اصلاح کی۔ اور جیسا کہ اُس زمانے کے دیکھنے والے بیان کرتے ہیں اور جیسا کہ خود یورپین افسروں نے اقرار کیا ہے صرف سرسید ہی کی حسرت پر دانائی اور نیک دلی سے تمام یورپین اور عیسائی مرد اور عورتیں اور بچے صحیح و سالم وہاں سے نکل کر رُڑکی میں پہنچ گئے۔

سٹر شکسپیر جو اُس زمانے میں بجنور کے کلکٹر و مجسٹریٹ تھے جو کہ سرسید

کو باعتبار عہدے کے اُن سے کچھ تعلق نہ تھا مگر مسٹر شکسپیر سے اُن کی بہت راہ ورسم تھی جب بجنور میں بغاوت کے آثار نمودار ہونے لگے اور حالت خطرناک ہوئی تو مسٹر شکسپیر بہت گھبراہٹیں سرسید کو جب یہ حال معلوم ہوا تو جا کر ان کی تشفی کی اور کہا کہ ”جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کو ٹھی کے سامنے پڑی ہے اُس وقت گھبرانے کا سوائقہ نہیں“ مسٹر شکسپیر ہمیشہ سرسید کی اس شریفانہ تقریر کے شکر گزار رہے۔

سرسید کا یہ کہنا صرف زبانی نہ تھا بلکہ انھوں نے اپنے افعال سے اس قول کو سچ کر دکھایا تھا۔ وہ تمام رات سسلج مع اور ہندوستانی افسروں کے صاحب کلکٹر کی کوٹھی پر پہرہ دیتے تھے اور ہر طرح عورتوں اور بچوں کی ڈھارس بندھواتے تھے ساری رات کرسیوں پر بیٹھے یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے یا شہر میں گشت کرتے گذر جاتی تھی پلٹن نمبر ۲۹ تلنگوں کی ایک کمپنی سہانہ پور سے بطور بدلی کے مراد آباد کو جاتی تھی جب وہ بجنور میں پہنچی تو صوبہ دار اور کچھ تلنگے صاحب کلکٹر کی کوٹھی پر گئے سرسید سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ یہ کمپنی بگڑ کر آئی ہے اور کچھ تلنگے اور صوبہ دار امداد فساد کلکٹر کی کوٹھی پر گئے ہیں۔ سرسید کو یقین ہو گیا کہ انگریزوں کی خیر نہیں۔ وہ اسی وقت سسلج ہو کر کوٹھی کو روانہ ہو گئے۔ اوسا نے صغیر بن بھتے کو جو تنہا چچا کے پاس تھا۔ چلتے وقت اپنے آدمی کے سپرد کر گئے اور کہہ گئے کہ اگر میں مارا جاؤں تو لڑکے کو کسی امن کی جگہ پہنچا دیجیو۔ مگر کوٹھی پہنچ کر معلوم ہوا کہ کمپنی نہ کوہ بدلی پر مراد آباد جاتی تھی

وہ رات جبکہ کلکٹر کی کوٹھی میں تمام یورپین اور یوریشین مرد عورتیں اور بچے جمع تھے اور ایک جماعت کثیر جو بظاہر ان کی حفاظت کے لیے فراہم ہوئی تھی ان کی نیتیں گڑبگڑ گئی تھیں اور کچھ فوج اور توپخانہ باغیوں کا ان کی کمک کے لیے مراوا باد سے منقریب آنے والا تھا نہایت سختی تھی اس روز سب کے مارے جانے میں کچھ شبہ نہ تھا۔ ایسے نازک وقت میں سرسید تنہا اس خود سر جماعت کے مجمع میں گئے اور نواب محمود خاں سے جو ان کا سرغنہ تھا گفتگو کی اور کہا کہ چسند انگریزوں کے مار ڈالنے سے کیا ہاتھ آئے گا! بہتر یہ ہے کہ ان کو صحیح و سالم یہاں سے جانے دو۔ اور تم ملک کے مالک ہو جاؤ، ایسے ٹیڑھے وقت میں سرسید کے ہوش و حواس بالکل سجا اور درست رہے اور محمود خاں سے ایسی عمدہ گفتگو کی اور اس معاملہ کے متعلق تمام نشیب و فراز ایسی خوبی سے سمجھائے کہ اس نے فوراً منظور کر لیا اور سب انگریزوں کو اسی رات اس خوشخوار مجمع سے نکال کر رٹ کی روانہ کر دیا اس موقع پر کلکٹر کی طرف سے جو تحریر سرسید نے لکھ کر نواب محمود خاں کو دی تھی اگر وہ اس کے موافق عمل درآمد کرتا تو اس کو کسی طرح کا اندیشہ نہ تھا بلکہ انگریزی تسلط ہو جانے کے بعد ضرور اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جو اور خیر خواہوں کے ساتھ ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ اس نے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اس پر کچھ لحاظ نہ کیا انگریزوں کے رٹ کی روانہ ہو جانے کے بعد سرسید اور ان کے دوست میر نواب علی خاں جو اس زمانے میں بجنور میں تحصیلدار تھے اسی رات کو بستی کو ٹلے جو بجنور سے چھ سات کوس ہے چلے گئے مگر نواب نے سوار بھیج کر ان کو وہاں سے بلایا۔ مجبوراً ان کو پھر بجنور میں آنا اور نواب سے ملنا پڑا اور ڈپٹی رحمت خاں بھی ہلدور سے آ پہنچے۔ نواب کی خواہش تھی کہ یہ لوگ جب مجھ سے ملنے آئیں تو تندر میں پیش کریں۔ مگر انھوں نے تندر میں پیش نہیں کیں۔ نواب نے مکتدر ہو کر ان کو رخصت

کہ دیا اور کہا کہ بدستور بجنور میں اپنا اپنا کام کرو۔ سرستید نے ولیانی کا کام اسی طرح
 جس طرح کہ انگریزوں کے سامنے کرتے تھے کرنا شروع کیا جو رو بکاریاں اور لپوٹیں
 صاحب جج کے ہاں بھیجنے کے قابل ہوتی تھیں ان کی نسبت علی الاعلان کبھری میں
 یہ حکم تحریر کرتے رہے کہ بحضور صاحب جج بہادر بھیجی جائیں مطلب اس سے یہ
 تھا کہ عوام کو یہ خیال ہو کہ سرکار انگریزی کا تسلط اور عملداری بدستور قائم ہے۔ مگر
 محمود خاں کو یہ اسرنا گوار گذرتا تھا۔ محمود خاں نے پھر ایک روز رانتا کے وقت سرستید
 کو بلایا۔ اُس وقت نواب اور اس کا بھانجا جو اس کے مزاج پر بہت مادی تھا دونوں
 موجود تھے۔ انھوں نے سرستید سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں تم ہمارے ساتھ شریک
 ہو جاؤ۔ اور ہم سے اس بات پر حلف کر لو جو جاگیر چاہو نسل بعد نسل ہم سے ٹھیرا لو
 اور ہم سے حلف لے لو کہ ہم ہمیشہ وہ جاگیر بچاں رکھیں گے۔ سرستید کو اول تو جواب
 دینے میں تامل ہوا۔ مگر آخر کار ان سے صاف کہہ دیا کہ ”ہیں اس بات پر بلاشبہ حلف
 کر سکتا ہوں کہ میں ہر حال میں تمہارا خیر خواہ رہوں گا اور کسی وقت تمہاری بدخواہی
 نہ کروں گا۔ لیکن اگر تمہارا ارادہ ملک گیری کا اور انگریزوں سے لڑنے کا ہے
 تو میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہوں۔“ سرستید نے قسم یاد کر کے نواب سے
 کہا کہ ”میں صرف تمہاری خیر خواہی کے لیے کہتا ہوں آپ اس ارادہ کو دل سے
 نکال ڈالیں۔ انگریزوں کی عملداری ہرگز نہیں جانے کی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ تمام
 ہندوستان سے انگریز چلے جائیں گے تو میں انگریزوں کے سوا ہندوستان میں
 کوئی عملداری نہ کر سکے گا۔ آپ سرکار کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اگر بالفرض
 انگریز جانتے رہے تو آپ نواب بنے بنائے ہیں آپ کی نوابی کوئی نہیں چھینتا
 اور اگر میرا خیال صحیح ہے تو آپ خیر خواہ سرکار بنے رہیں گے اور سرکار آپ کی
 نہایت قدر کرے گی۔ اگر آپ مجھ کو انتظام میں شریک کرنا چاہتے ہیں تو صاحب

کلکٹر سے اجازت منگا لیجیے اور یہ اقرار کر لیجیے کہ کوئی کام جب تک کہ اُس کی منظوری صاحب کلکٹر سے نہ منگا لیں ہرگز نہ کریں گے۔ مگر نواب نے اُس کو منظور نہیں کیا۔ بلکہ وہ نالارض ہوا اور چین بہ چین ہو کر سرسید کو رخصت کیا اور ہر طرح اُن کی اور اُن کے ساتھیوں کی بُرائی کے واسطے ہو گیا۔ جس مکان میں سرسید رہتے تھے اس کو بہ جبر چھین لیا اور اپنی فوج کے افسروں کو دے دیا۔ جو اسباب سرسید کا اس میں بند تھا وہ سب فوج کے افسروں نے لے لیا۔ اسی طرح میر تراب علی کا گھوڑا بہ جبر چھین لیا۔

انھیں دنوں میں ایک شخص میر خاں نامی مع جمعیت چار سو آدمی کے ٹکینے سے بجنور میں آیا اور سرسید میر تراب علی، ڈپٹی رحمت خاں کے قتل کے واسطے ہوا اُن کو یہ جبر و تکلم طلب کیا اور کہلا بھیجا کہ اگر حاضر نہ ہو گئے تو بہتر نہ ہو گا۔ سرسید اور میر تراب علی اُس کے پاس گئے۔ منیر خاں نے سرسید سے مسئلہ جہاد کے بارے میں گفتگو کی۔ انھوں نے نہایت بخندگی سے اُس کو سمجھایا کہ شرع کے بموجب ہرگز جہاد نہیں ہے۔ اُس نے اُن کو تو رخصت کیا اور مولوی علیم اللہ رئیس بجنور کے پاس خود جا کر یہی مسئلہ پوچھا۔ انھوں نے بڑی دلیری سے اُس کے ساتھ گفتگو کی اور بہت سی دلیلوں سے اُس کو فائل کیا کہ مذہب کی رو سے جہاد نہیں ہے۔ اُس روز مولوی علیم اللہ قتل ہوتے ہوئے تھے۔ دوسرے دن منیر خاں وہاں سے واپس چلا گیا اور وہاں جا کر دوائی میں مارا گیا۔

سرسید برابر اس فکر میں تھے کہ کسی طرح بجنور سے نکل کر میرٹھ پہنچ جائیں مگر کوئی موقع نہ ملتا تھا اسی عرصہ میں ہلدور کے چودھریوں نے ایک انبوا کثیر جمع کر کے محمود خاں کی فوج پر حملہ کیا اور نواب شکست کھا کر بجنور سے نجیب آباد چلا گیا۔ سرسید نے اُس کی مفصل کیفیت اسپیشل کمشنر میرٹھ کو لکھ بھیجی وہاں

سے حکم آگیا کہ تم سرکار کی طرف سے صلح کا انتظام کرو اور ڈپٹی رحمت خاں اور میر
نواب علی کو اپنے ساتھ شریک کر لو۔ انھوں نے ایک مہینے تک بہت اچھا
انتظام رکھا۔ مگر باوجود سخت ممانعت اور روک تھام کے ہلدور کے چودھری
نے بگینے پر حملہ کر کے کچھ آدمی مار ڈالے اور کچھ محلے لوٹ لیے۔ اب نواب
محمود خاں کے گرد پھر ایک جمعیت کثیر جمع ہو گئی۔ نواب نے بیخبر پر حملہ کیا اور
چودھری شکست کھا کر بھاگے۔ چونکہ سرسید کو نواب کی طرف سے خدشہ تھا وہ
بھی ہلدور چلے گئے مگر نواب نے ہلدور پر بھی حملہ کیا اور چودھریوں کو شکست
دے کر ہلدور کے بہت سے مکانات جلا دیے۔ سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں
رات کو ہلدور سے پیادہ پا اس ارادہ سے نکلے کہ میرٹھ چلے جائیں۔ رستے میں
موضع پلانہ کی سرحد پر دو ہزار گنوار مسلح ان کے لوٹنے اور ارڈلنے کے ارادے
سے دوڑے۔ مگر بخشی نامی ایک پدھان نے ان کو بچایا۔ جب وہاں سے چاند
پور پہنچے تو کئی سزائے آدمیوں نے بند وقوں اور ہتھیاروں سے ان کو گھیر لیا۔ یہاں
تک کہ میر صادق علی خاں رئیس چاند پور وہاں پہنچے اور سرسید اور ڈپٹی رحمت
خاں کو اس انبوہ سے نکال کر اپنے مکان پر لے گئے۔ دوسرے روز میر صادق علی
نے خود ساتھ ہو کر ان کو موضع پھولہ تک پہنچا دیا۔ وہاں سے سرسید نے پچھڑاؤں
پہنچ کر بسبب علالت اور رستے کی کوفت کے چند روز مولوی محمود عالم کے مکان
پر جوآن کے دوست تھے، مقام کیا اور اپنی مفصل سرگزشت حکام انگریزی کو
لکھ بھیجی اور چند روز بعد خود بھی میرٹھ چلے گئے۔ جس وقت وہ میرٹھ ہی پہنچے ہیں
ان کے پاس چھ پیسے اور اس پھٹے ہوئے کُرنے کے سوا جو وہ پہنے ہوئے تھے۔
اور کچھ نہ تھا۔

میرٹھ میں ان کے پہنچنے اور بیمار ہونے کا حال سن کر مسٹر کری کرافٹ ولسن

جو کہ وہاں حج اور اسپیشل کمشنر تھے ان کے دیکھنے کو آنے اور سرسید سے کہا کہ
 ”تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ ایسے نازک وقت میں تم نے سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا
 باوجودیکہ ضلع بجنور میں ہندو مسلمانوں میں کمال عداوت تھی، مگر جب تم کو اور ڈپٹی
 رحمت خاں کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصیت اور اچھے چلن اور سرکار
 کی نہایت طرفداری کے سبب تمام ہندوؤں نے جو ضلع میں نامی چودھری اور بڑے
 رئیس تھے کمال خوشی اور آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے اوپر حاکم بننا قبول کیا
 بلکہ خود درخواست کی کہ تمہیں سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنا دے جاؤ۔ سرکار
 نے بھی تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد کے ساتھ ضلع کی حکومت
 تم کو سپرد کی اور تم اُسی طرح نمک حلال اور فادار سرکار کے رہے۔ اس کے منے
 میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشتا پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت
 اور فخر کے لیے رکھی جائے تو بھی کم ہے۔“

کچھ اوپر پانچ مہینے سرسید کو میرٹھ میں ٹھہرنا پڑا۔ میرٹھ میں ان کو معلوم ہوا
 کہ دلی میں سرکاری فوج کے سپاہیوں نے ان کا گھر اور تمام اسباب لوٹ لیا ہے۔
 جب دلی میں سرکاری فوج پھیلنی شروع ہوئی اور کشمیری دروازہ فتح ہو چکا تو شہر
 کے تمام زن و مرد شہر چھوڑ کر چل دیئے تھے اور سرسید کا کہنا بھی جب کہ
 اُن کے ماسوں وحسب الدین خاں اور ان کے ماموں نادر بھانی ہر ظم علی خاں سپاہیوں
 کے ہاتھ سے مارے گئے۔ سلطان نظام الدین چلا گیا تھا۔ مگر ان کی والدہ اور خالہ
 دلی ہی میں رہیں۔ لیکن جب ان کا گھر سارا ٹٹ گیا تو وہ حویلی کو چھوڑ کر جلو خانہ کی
 ایک کوٹھڑی میں جہاں زمین نامی ایک لادٹ بڑھیا رہتی تھی چلی آئیں اور آٹھ دن
 نہایت تکلیف سے اُس کو ٹھہری میں بسر کیے۔ اس عرصہ میں سرسید بھی وہاں
 پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ تین ان سے ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا کسی

قدّر گھوڑے کا دانہ مل گیا تھا اسی کو کھاتی رہیں۔ دو دن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا اور پیاس کی نہایت تکلیف تھی۔ سر سید کہتے تھے کہ ”جب میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی تو انھوں نے کوڑا کھوسے اور پہلا لفظ جواں کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ ”ہیں اتم یہاں کیوں چلے آئے! یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں تم چلے جاؤ۔ ہم پر جو گڈرے گی گڈر جائے گی۔“ میں نے کہا آپ خاطر جمع رکھیے میرے پاس حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں سے آؤ دلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔ تب اُن کی خاطر جمع ہوئی جب مجھے معلوم ہوا کہ دو دن سے پانی نہیں پیا تو پانی کی تلاش کو نکلا۔ کنتوں پر کوئی ایسی چیز نہ ملی جس سے پانی نکالا جاسکے اور چاروں طرف ستائے کا عالم تھا میں سید صاحب قلعہ میں گیا اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لے کر چلا۔ جب اپنے گھر کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہی زمین بڑھا بڑھا کر پریشانی ہے اور اُس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آبخورہ ہے اور کسی قدر بدحواس ہے۔ وہ بھی پانی کی تلاش میں نکلی تھی۔ بھڑکی دور چل کر بیٹھ گئی۔ پھر اٹھانہ گیا۔ میں نے اُس کے آبخورہ میں پانی دیا اور کہا کہ پانی پی لے۔ اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے آبخورہ کا پانی اپنی صراحی میں ڈالا اور کچھ گرا دیا اور گھر کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ مطلب یہ تھا کہ بیوی پیاسی ہیں اُن کے لیے پانی لیجاؤں گی اور اسی لیے صراحی میں پانی ڈالا تھا۔ میں نے کہا میرے پاس پانی بہت ہے تو پانی پی لے۔ پھر آبخورہ میں پانی دیا وہ پانی پی کر بیٹھ گئی۔ میں دھڑا بھاگ کر گھر کی طرف گیا اور والدہ اور خالہ کو تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ انھوں نے خدا کا شکر کیا۔ میں گھر سے نکلا کہ سواری کا بندوبست کروں اور والدہ اور خالہ کو میرے لہجوں بابر آکر کیا دیکھتا ہوں کہ زمین مری پڑی ہے۔ پھر سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کیے کہیں سواری نہ ملے۔ آخر قلعہ کے حکام

نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لیجاتی ہے وہ ان کو ملجائے ہیں وہ شکرم لے کر گھر آیا اور والدہ اور خالہ کو اُس میں بٹھا کر میرٹھ لے گیا۔
میرٹھ میں منشی الطاف حسین مرحوم سررشتہ دار کمشنری میرٹھ نے جو سرسید کے قدیم دوست تھے اُن کے رہنے کو ایک مکان خالی کر دیا۔ سرسید کی والدہ کو بھوک اور پیاس کی تکلیف سے صفا کاہیت غلبہ ہو گیا تھا۔ کوئی دوا یا غذا پختی نہ تھی۔ آخر کچھ دن بیمار رہ کر یکم ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ کو میرٹھ ہی میں انتقال کیا۔ سرسید کہتے تھے کہ "اُن کے انتقال سے چند روز پہلے تمام کہنے کی عورتیں اور مرد اور بچے جو مختلف مقامات میں تھے سب اُن کے پاس میرٹھ میں جمع ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ مرتے وقت بہت خوش تھیں۔"

الغرض ۱۶ فروری ۱۳۵۷ھ کو سکریٹری گورنمنٹ کی چٹھی مسٹر شکسپیر کے نام پہنچی کہ تم مع عملہ ضلع بجنور رٹ کی کو روانہ ہو جاؤ اور رٹ کی میں انتظام رہا کیجئے کے لیے فوج کے لام باندھنے کا حکم بھیجا گیا۔ چنانچہ مسٹر شکسپیر اس فوج کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ سرسید اور تمام عملہ جو وہاں موجود تھا اور چند رئیسان ضلع بجنور سب اُن کے ہمراہ گئے۔

بجنور سے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد جیسا کہ اوپر مذکور ہوا بہت لڑائیاں اور خانہ جنگیاں ہوئی تھیں۔ کبھی ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کیے اور کبھی مسلمانوں نے ہندوؤں پر اور آخر کو محمود خاں سب پر غالب آ گیا تھا۔ اس لیے کچھ ہندو رئیس نواب سے شکست کھا کر میرٹھ چلے آئے تھے اور کچھ نواب نے قید کر لیے تھے۔ پس جب انگریزی فوج رٹ کی میں پہنچ لی اور رہا کیجئے پر چڑھائی کرنے کو تیار ہوئی تو وہاں یہ بحث پیش آئی کہ ضلع بجنور میں جو کہ رہا کیجئے کا سب سے پہلا ضلع ہے اور جہاں سب سے پہلے فوج جانے والی ہے۔

کون لوگ باغی تصور کیے جائیں مسلمانوں کی نسبت اس وقت نہ تو حکام ضلع کا خیال اچھا تھا اور نہ افسران فوج کا اور ہندو رئیس جنھوں نے مسلمانوں سے شکست پائی تھی اور جو اپنی باہمی خانہ جنگیوں کو سرکار کی خیر خواہی کے لباس میں ظاہر کرنا چاہتے تھے اور ان میں سے کسی قدر وہاں موجود بھی تھے، وہ چاہتے تھے کہ جو لوگ مسلمانوں کے ان حملوں میں شریک تھے جو انھوں نے ہندو رئیسوں پر کیے وہ سب باغی قرار دیئے جائیں۔ اگر اس وقت یہی فیصلہ ہو جاتا تو ضلع بجنور خاک سیاہ اور مسلمانوں سے خالی ہو جاتا۔

سر سید نے مسٹر شکسپیئر اور بعض افسران فوج سے اس باب میں گفتگو کی اور کہا کہ "سرکار کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہیں جو اب سرکار سے مقابلہ کے ساتھ پیش آئیں۔ باقی جو لڑائیاں اور فسادات رعایا نے ایک دوسرے سے کیے قانون کی رو سے ان کی نسبت جو کچھ ہو ہو مگر ان کی وجہ سے کسی کو سرکار کے مقابلہ میں باغی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ میرے نزدیک ہر وقت داخل ہونے سرکاری فوج کے اگر کوئی مقابلہ نہ کرے اور سب لوگ مع نواب محمد و خاں کے حاضر ہو جائیں تو ضلع بجنور کے کسی شخص کو باغی قرار دینا نہیں چاہیے۔ اس پر بہت بحث ہوئی اور آخر یہ بات قرار پا گئی کہ جو لوگ سرکاری فوج کے مقابلہ میں آئیں وہی باغی قرار دیئے جائیں لیکن بد نصیبی سے آم سوت نجیب آباد اور نگینے پور احمد اللہ خاں اور مارٹے خاں وغیرہ نے خفیف مغفیف مقابلہ کر کے ہزاروں کو لڑائی میں قتل کرایا اور تمام ضلع کی طرف سے سرکاری افسروں کو بدظن کر دیا۔

اگرچہ جو لوگ ضلع بجنور میں اپنی بغاوت کا پورا پورا ثبوت دے چکے تھے اور سرکار سے کھلم کھلا بے وفائی کر چکے تھے۔ سر سید نے ان کی حمایت ہرگز نہیں

کی لیکن جو لوگ کسی مجبوری یا دباؤ کے سبب باغیوں کے ساتھ ہو گئے تھے اور اس لیے مجرم ٹھہر گئے تھے، یا جنہوں نے آپس کی خانہ جنگیوں میں کسی گروہ کا ساتھ دیا تھا مگر وہ کسی گروہ کو سرکار کے برخلاف نہیں سمجھتے تھے، یا جن لوگوں نے سرسید کو ذاتی طور پر تکلیف پہنچائی تھی اور سرکار کے برخلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ جہاں تک ممکن ہوا ان کی بریت میں کوشش کی اور ان کی صفائی کرائی۔ ایک تحریر میں جو نواب محسن الملک نے لکھوائی اور مولانا ذریعہ احمد لے جو خاص بجنور کے رئیس ہیں اپنے قلم سے لکھی اور جو کہ گویا ان دونوں نامور اور معزز شخصوں کے خیالات کا مجموعہ ہے اس میں سے ہم ذیل کا فقرہ نقل کرتے ہیں۔

”سید احمد خاں کو سرکار انگریزی کی طرف سے ضلع بجنور کا نظم و نسق سپرد تھا اور وہاں کے ہندو مسلمانوں کی خانہ جنگیاں یاد گار غم ہیں۔ اس عہد میں بے تمیزی میں خود سید احمد خاں کے ساتھ بھی لوگ نہایت درجہ کی گستاخی اور بے توقیری سے پیش آئے اور قریب تھا کہ ہلاک کریں عود تسلط کے بعد اس ضلع کے کے تمام باشندوں کی جان سید احمد خاں کی مٹھی میں تھی اگر ان کے سے اختیارات کسی دوسرے کو ہوتے تو بجنور کے حصہ میں قیامت آگئی ہوتی۔ مگر یہ معاملہ فہم منصف مزاج، نرم دل، نیک طبیعت آدمی اس وقت بھی فرق کرتا تھا بغاوت اور خانہ جنگیوں میں بغاوت

۱۔ آئینہ حجابی اسمعیل خاں نے ۱۸۵۷ء میں سرسید کی یادگار قائم کرنے کیلئے ایک خط نواب محسن الملک کے نام جید آباد بھیجا تھا اس زمانے میں محسن الملک بیمار تھے انہوں نے شمس العلامی مولوی ذریعہ احمد سے اس کا جواب لکھوا کر بھیجا تھا جو بلکہ گڑبڑ میں چھپ گیا تھا۔ اس تحریر میں سرسید کی نسبت دونوں

اور جہالت میں، حملہ اور حفاظت میں اور سید احمد خاں کی بدولت بجنوری ایک ضلع
تھا جو عواقب و تبعات غدر سے محفوظ رہا۔

سر سید کی رائے جو اُس وقت عام رہا اپنے ضلع بجنور کی نسبت تھی اور
جس پر حکام ضلع کو پورا بھروسہ تھا وہ تاریخ سرکشی بجنور میں انھوں نے صاف
صاف لکھ دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ضلع کے لوگوں کا میری رائے میں یہ
حال تھا کہ ان لڑائیوں میں نواب کے ساتھ ہو کر چودھریوں سے لڑنے کو سرکار
سے لڑنا یا برخلاف سرکار کے لڑائی کرنی نہیں سمجھتے تھے سب کے خیال میں
چودھریوں کا اور نواب کا مقابلہ تھا جس میں گویا سرکار کا بیج میں سے علیحدہ
تھی اور اس میں بھی شک نہیں کہ جو لوگ چودھری صاحبوں کے ساتھ ان
لڑائیوں میں شریک تھے وہ اپنے تئیں چودھری صاحبوں کا حامی سمجھتے تھے
سرکار انگریزی سب کے دلوں سے الگ تھی۔ سر سید ہی کی رائے کا یہ
نتیجہ تھا کہ امن ہو جانے کے بعد ضلع کے عام باشندے دل سے بہت کم مواخذہ
کیا گیا۔"

خدمات غدر کا صلہ

جو شخص سر سید کی طبیعت اور جبلت سے واقف ہو گا وہ اس بات کو
آسانی باور کرے گا کہ جو کچھ غدر کے زمانے میں گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری

لے عواقب و تبعات غدر سے وہ بہ نتائج فراہم جو اکثر اضلاع ہندوستان میں انگریزی تسلط کے بعد
باشندگان اضلاع کو بھگتے رہے کیونکہ بجنور میں سولان لوگوں کے جو باہم خانہ جنگیوں میں یا
سرکاری فوج کے مقابلہ میں مارے گئے، فتح کے بعد فدا بغاوت کے جرم میں سزا یا ب
ہوئے۔ پھر بہت ہی کم لوگوں سے تعرض کیا گیا۔ ۱۲۔

اُن سے ظہور میں آئی وہ کسی خلعت یا انعام وغیرہ کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ وہ بڑا انعام اپنی خدمت کا یہی سمجھتے تھے کہ اُس نازک وقت میں اُن سے کوئی امر اخلاق اور شرافت اور اسلام کی ہدایت کے خلاف سرزد نہیں ہوا مگر گورنمنٹ نے خود انکی خدمت کی قدر کی اور اُن کے صلہ میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ کا اور دو سو روپیہ مہوار کی پولیٹیکل پینشن دونوں تک مقرر کی۔

میر صادق علی اور میر ستم علی رئیسان چاند پورہ ضلع بجنورہ کا تعلق اس جرم میں کہ اُن کی عرضی بادشاہ دہلی کے دفتر سے برآمد ہوئی تھی، سرکار نے ضبط کر لیا تھا۔ اور جس طرح کہ دیگر غیر خواہان سرکار کو باغیوں کی ضبط شدہ جائدادیں دی گئی تھیں ہسٹر شکسپئر رپورٹ کرنی چاہتے تھے کہ منجملہ تعلقہ چاند پورہ کے ایک معقول جائداد سید احمد خاں کو بعض خدمات ایام غدر کے ملنی چاہیے۔ مگر جب انھوں نے سرسید سے اس بات میں استمراج لیا تو انھوں نے اُس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ ہسٹر شکسپئر نے اس قاعدے کے موافق کہ کسی کو اُس کی نصف تنخواہ سے زیادہ پینشن نہیں مل سکتی تھی ہسٹید سے کہا کہ نقد پینشن بہت قلیل مقرر ہوگی انھوں نے کہا جو کچھ سرکار عنایت کرے اس کا احسان ہے۔ مگر مجھ کو یہ جائداد یعنی ہرگز منظور نہیں۔ اس واقعہ کو اُسی تحریر میں جو نواب محسن الملک کی طرف سے مولانا نذیر احمد نے حیدرآباد میں لکھی تھی۔ اس طرح بیان کیا ہے کہ "سید احمد خاں کو جن خدمات غدر کے صلہ میں ضلع بجنورہ کے ایک بڑے مسلمان رئیس باغی کا بڑا بھاری علاقہ سرکار نے دینا منظور کیا تھا، مگر سید احمد خاں نے صرف اسی وجہ سے اُس کے لینے سے انکار کیا کہ ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی اُن کو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔"

خود سرسید نے بھی اپنے ایک لکچر میں جو ۲۸ نومبر ۱۸۸۹ء کو ایجوکیشنل

کانفرنس کے جلسہ میں بہ رستہ العلوم کے تاریخی حالات پر دیا تھا، اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "غدر میں جو حال انگریزوں اور ان کے بچوں اور عورتوں پر گزرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی نامی خاندان برباد و برباد ہوئے ان دونوں واقعات کا ذکر دل کو شوق کرنے والا ہے۔ غدر کے بعد نہ بھکوا پنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے، جو من اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد جو سارا تہ کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی مالا فاق و غیب میں نہ ہو گا کہ قوم پر تویہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دارینوں میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر ہینگلی اور کچھ عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڑھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے جب میں مراد آباد میں آیا جو ایک بڑا غمگنہ ہماری قوم کے ریشیوں کی بربادی کا تھا اس غم کو کسی قدر اترتی ہوئی۔ مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مردتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تنہا ہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشہء عامیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں! اس

کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اُس کے دور کرنے میں
سمت باندھنی تو می فرض ہے میں نے ارادہ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی
کو پسند کیا۔

مراد آباد کی تبدیلی

اپریل ۱۸۵۸ء میں وہ مجبور سے صدر الصدوری کے عہدہ پر ترقی پا کر مراد آباد
گئے اور ۱۸۵۹ء میں وہیں جب کہ باغیوں کی جائداد مضبوط کے متعلق غدر داریاں
ہونے لگیں اور اُن کی سماعت اور تحقیقات کے لیے ایک اسپیشل کمیشن بھیجا
اُس میں دو یورپین ممبر ایک کشنرہ سیکرٹری، دوسرے جج مراد آباد اور ایک ہندوستانی
ممبر یعنی سر سید مقرر ہوئے۔ چنانچہ دو برس تک وہ اپنے عہدہ کے علاوہ یہ کام
بھی انجام دیتے رہے۔

گورنمنٹ نے یہ نہایت داناتی کی تھی کہ اکثر اضلاع میں مضبوط جائداد کی
تحقیقات کے لیے جو اسپیشل کمیشن مقرر کیے گئے تھے اُن میں یورپین افسروں
کے ساتھ ایک ایک ہندوستانی ممبر بھی شامل کر دیا تھا کیونکہ جائداد میں اکثر ادنیٰ
ادنیٰ شبہ پر مضبوط ہو گئی تھیں اور اگر بڑی حکام نیچرل طور پر ہندوستانیوں کی طرف
سے عموماً بدگمان اور نہایت غیظ و غضب میں بھرے ہوئے تھے خصوصاً ضلع
مراد آباد پر گورنمنٹ کا سخت عتاب تھا اور اگر بڑا افسروں کا یہاں اعتدال پر
رہنا دشوار تھا۔ اگرچہ سر سید نے اپنی زبان سے کمیشن مذکور کی کارروائی کے متعلق
کبھی ہمارے سامنے کچھ بیان نہیں کیا لیکن مراد آباد کے معتبر اشخاص سے سنا
گیا ہے کہ سر سید کی شرکت کے سبب یہاں کے کمیشن نے غدر داریوں کی تحقیقات
نہایت اعتدال اور انصاف کے ساتھ کی اور صوبہ شمال مغرب میں ضبط شدہ

جائداد میں جس قدر ضلع مراد آباد میں واگناشت ہوئی ایسی کسی ضلع میں نہیں ہوئی
ایک بہت بڑا فائدہ سرسید کے مراد آباد میں ہونے سے خاص کر مسلمانوں
کو یہ پہنچا کہ مولانا عالم علی مرحوم رئیس مراد آباد، جو وہیلکھنڈ کے ایک مشہور
عالم اور طبیب اور نامور محدث تھے انھوں نے چند یورپین عورتوں اور بچوں
کو باغیوں کے ظلم سے بچانے کے لیے اپنے مکان میں چھپا لیا تھا۔ مگر اتفاق سے
باغی سپاہیوں کو خبر ہو گئی۔ اور انھوں نے مولوی صاحب کے مکان میں گھس
کر ان سب کو قتل کر ڈالا۔ مولانا موصوف اس خیال سے کہ یہ حادثہ عظیم ان کے
مکان میں گذرنا تھا اور ان کا کوئی عزیز یا رشتہ دار انہی منظوروں کے ساتھ نہیں
مارا گیا تھا۔ سرکاری تسلط کے وقت مراد آباد سے کہیں چلے گئے تھے اور حکام
ضلع کو ان کی تلاش ہمیشہ تھی۔ اور ان کی نسبت یہ گمان تھا کہ باغیوں کے ساتھ
ان کی ضرور سازش تھی ورنہ ان کے آدمی بھی مقتولوں کے ساتھ یقیناً مارے جاتے
مگر سرسید کو معلوم ہو گیا تھا کہ مولوی عالم علی محض بے قصور تھے اور انھوں نے
نہایت نیک نیتی سے یورپین عورتوں اور بچوں کو اپنے گھر میں رکھا تھا۔ وہ یہ
بھی جانتے تھے کہ باغیوں کو مولوی صاحب سے کوئی وجہ عداوت کی نہ تھی کہ وہ
ان کو یا ان کے رشتہ داروں کو بھی مار ڈالتے اور خود ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ باغی سپاہ
کا مقابلہ کرتے۔ چنانچہ سرسید نے مولوی صاحب کی بریت کے لیے صاحب
ضلع سے باوجود کہ وہ نہایت افرورختہ تھے۔ بڑی دلیری کے ساتھ گفتگو کی اور
یہ کہا کہ میں مولوی عالم علی کو آپ کے سامنے حاضر کر سکتا ہوں لیکن جب تک
کہ آپ یہ وعدہ نہ کریں کہ ان سے کچھ مواخذہ نہ کیا جائے گا اس وقت تک میں
ان کے بلانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ آخر صاحب ضلع نے ان سے یہ وعدہ کر
لیا کہ ہم صابطہ کی تحقیقات تو ضرور کریں گے۔ لیکن چونکہ تمہارے نزدیک وہ

بے قصور ہیں بعد مضابطہ کی کارروائی کے اُن کو بری کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ سرسید نے مولوی صاحب کو بلا کر عدالت میں پیش کر دیا اور مضابطہ کی کارروائی کے بعد وہ بالکل بری کر دیئے گئے۔

تاریخ سرکشی بجنور

مراد آباد ہی میں اگر سرسید نے تاریخ سرکشی بجنور چھاپکر شائع کی اس تاریخ میں مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اپریل ۱۸۵۸ء تک کے حالات اور واقعات غصہ جو ضلع بجنور میں گزرے بقیہ تاریخ نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ تمام خط کتابت جو کہ وہ حکام ضلع کے ساتھ رُڑکی میں کرتے تھے اور وہ تمام تحریریں جو انھوں نے نواب محمود خاں اور چودھریوں کے نام یا نواب اور چودھریوں نے اُن کے نام یا آپس میں ایک دوسرے کے نام بھیجیں اور اُس کے سوا اور بہت سی تحریرات جو اس معاملہ سے تعلق رکھتی تھیں، لفظ بہ لفظ اس کتاب میں درج ہیں۔ اُن میں سے بہت سی تحریریں اور اکثر باداشتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید ابتداء سے اخیر تک اس کتاب کے لیے میٹرل جمع کرتے رہے تھے ایسی حالت میں جب کہ جانوں کے لالے پٹے ہوئے تھے۔ انگریزی عملداری بالکل اٹھ گئی تھی۔ لوگوں کے گھر بار لٹ رہے تھے اور خود سرسید نہایت خوف و ہراس کی حالت میں تھے۔ وہ ان کاغذات اور باداشتوں کو بحفاظت رکھتے جاتے تھے۔ اس سے دو باتیں بخوبی ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ انگریزی عملداری کے پھر قائم ہو جانے کا اُن کو کامل یقین تھا۔ دوسرے یہ کہ ضلع کی اُس خوفناک حالت میں بدحواسی یا خوف و ہراس نے اُن کی طبیعت میں مطلق راہ نہیں پائی۔ اس کتاب میں غصہ کے زمانے کے حالات جو ضلع بجنور سے متعلق تھے۔

بلارو، ورعایت اور بیکم وکاست کھٹے گئے ہیں جن مسلمانوں نے باوجود متواتر
 فہمائشوں اور نصیحتوں اور تمام تشذیب و فرائض سمجھانے کے اور باوجود گورنمنٹ
 کے احکامات کے سرکار سے بیوفائی کی تھی اور اس سے مقابلہ کے ساتھ پیش
 آئے تھے ان کے حالات جوں کے توں بیان کر دیئے ہیں اور باوجودیکہ ہندو
 چودھریوں یا ان کے ساتھیوں کی طرف سے مسلمانوں پر سخت ظلم اور زیادتیاں
 ہوتی تھیں، اس پر بھی چونکہ وہ فی الواقع بغاوت کے الزام سے بری تھے اس لیے
 اس الزام سے ان کی تربیت کی ہے مگر جو کچھ انھوں نے مسلمانوں پر تشدد اور سختیاں
 کی تھیں، ان کو بھی اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے۔ غرض کہ واقعات کے بیان کرنے میں
 مذہبی یا قومی تعصبات کو مطلق دخل نہیں دیا۔

مدرسہ مراد آباد

اس کے بعد انھوں نے ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی مدرسہ مراد آباد میں قائم
 کیا جہاں اس سے پہلے کوئی مدرسہ نہ تھا، کچھ دنوں یہ مدرسہ بدستور اپنی حالت
 پر رہا مگر جب کہ اسٹریٹیجی صاحب وہاں کلکٹر ہو کر آئے اور انھوں نے ایک
 تحصیل مدرسہ قائم کیا اسی تحصیل مدرسہ میں اس فارسی مدرسہ کے طلبہ بھی داخل ہو گئے

رائے در باب تعلیم

انھیں دنوں میں انھوں نے ایک رائے تعلیم کے باب میں اردو اور انگریزی
 دونوں زبانوں میں لکھ کر شائع کی جس میں گورنمنٹ کے منسلک سکولوں پر سخت
 اعتراض تھا اور ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دینے کا سرکار کو مشورہ دیا
 تھا۔ ہم اس مضمون میں سے دو تین فقرے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

”گزشتہ چند سالوں سے گورنمنٹ نے جو انتظام رعایا کے لئے
ہندوستان کی تعلیم کا کیا ہے سب سے اول اس میں یہ بات قابل
ملاحظہ ہے کہ آیا فی نفسہ وہ انتظام ایسا ہے نہیں؛ کہ رعایا کا اس
سے ناراض ہونا اور خواہ مخواہ بدگمانی کرنا ضرور ہو۔ ہماری رائے یہ
ہے کہ بلاشبہ ایسا ہی ہے۔ گورنمنٹ نے یہ خیال کیا کہ جب
کسی قوم کی تربیت کا ارادہ کیا جائے۔ تو جو اس قوم کی زبان ہے اس
میں اس کی تربیت ہو تو بہت آسان ہوگی اور دوسری زبان کے
لغت اور محاورے سیکھنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے وہ بچے
گا۔ بظاہر اس کی نظیریں بھی موجود تھیں کہیونکہ تمام اہل یورپ اور اہل
عرب نے اپنی ہی زبانوں میں علم سیکھے ہیں۔ مگر یہ رائے غلط تھی۔ کل
زبانوں پر البتہ خیال کر لینا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ہم کو چاہیے کہ اس بات
پر بھی غور کریں کہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم چاہتے ہیں آیا اس زبان
کی حالت ایسی ہے یا نہیں کہ اس زبان میں تعلیم کا ہونا ممکن ہو۔“

”ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملک اور
اس کی عقل اور ذہن میں ایک جوہر پیدا ہو تاکہ جو امور پیش آئیں
ان کے سمجھنے کی۔ بُرائی بھلائی جاننے کی اور عجائب قدرت الہی پر فکر
کرنے کی اس کو طاقت ہو اس کے اخلاق درست ہوں، معاملات
معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دے اور امور معاشرہ پر غور کرے
گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ ”ہم کو اس قدر تربیت سے کچھ علافہ نہیں۔ بلکہ ہم
اُسی قدر تعلیم کے خواہاں ہیں جو امور معاش سے علافہ رکھتی ہے اور جو ختم
ہے صرف جغرافیہ، حساب اور ہندسہ پر۔ نہایت بیجا ہے۔“

”سررشتہ تعلیم جو چھ سال سے جاری ہے وہ تربیت کے

یہ ناکافی ہی نہیں بلکہ خراب کرنے والا تربیت اہل ہند کا ہے
اردو زبان جس کے وسیلہ سے اکثر جگہ تعلیم جاری ہے اُس

کی حالت ایسی نہیں ہے جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو کیونکہ جس زبان
میں ہم کسی قوم کی تعلیم کا ارادہ رکھتے ہیں اُس زبان کی نسبت ہم کو اتل
بہ دیکھنا چاہیے کہ اُس میں علمی کتابیں کافی موجود ہیں یا نہیں؟ کیونکہ
اگر یہ نہ ہو تو تعلیم ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ زبان فی نفسہ اس
قابل ہے یا نہیں کہ اُس میں علمی کتابیں تصنیف ہو سکیں؟ کیونکہ پہلی
بات کا تو علاج ہو سکتا ہے مگر دوسری بات لا علاج ہے بتیسرے
یہ کہ آیا وہ ایسی زبان ہے یا نہیں کہ اُس میں علوم پڑھنے سے جو دت
طبع حدت ذہن، سلامت فکر، ملکہ عالی قوت، ناطقہ، شجستگی، تقریر اور
ترتیب دلائل کا سلیقہ پیدا ہو سکے؟ ان تینوں باتوں میں سے اردو
زبان میں کوئی بات نہیں۔ پس گورنمنٹ پر واجب ہے کہ اس طریقہ
تعلیم کو جو درحقیقت تربیت انسان کو خراب کرنے والا اور خود
بخود لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے والا ہے۔ بالکل بدل
دے اور اُس زبان میں تربیت جاری کرے جس سے تربیت کا
جو اصل نتیجہ ہے وہ حاصل ہو۔

دوسری صاف رائے ہے کہ اگر گورنمنٹ اپنی شرکت ویسی

زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھا دے اور صرف انگریزی مدرسہ
اور اسکول جاری رکھے تو بلاشبہ یہ بدگمانی جو رعایا کو گورنمنٹ کی طرف
سے ہے جاتی رہے۔ صاف صاف لوگ جان لیں کہ سرکار انگریزی

زبان کے وسیلے سے تربیت کرتی ہے اور انگریزی زبان بلاشبہ ایسی
 ہے کہ انسان کی ہر قسم کی علمی ترقی اس میں ہو سکتی ہے۔

یہاں ان مفقودوں کے نقل کرنے سے بجا ماصرمت یہ مدعا ہے کہ لوگوں کو معلوم
 ہو کہ انگریزی زبان کی تعلیم کو دسی زبان کی تعلیم پر ترجیح دینے کی نسبت جو کچھ
 سرسید کی رائے اس زمانے میں تھی یہی رائے اب سے ۳۶ برس پہلے تھی۔ مگر
 ۳۶ برس کے تجربے سے ان کو اس قدر ضرور معلوم ہوا ہو گا کہ انگریزی زبان میں بھی
 ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو دسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکتہ فصول اور عملی بیانت
 پیدا کرنے سے قاصر ہو۔

رسالہ اسباب بغاوت ہندوستان

مراد آباد ہی میں سرسید نے گورنمنٹ کی ملک کی اور خاص کر اپنی قوم کی
 وہ جلیل القدر خدمت انجام دی جو ان کے اور بڑے بڑے کاموں کی طرح ہمیشہ
 یادگار رہے گی۔ وہ بجنور میں مسلمانوں کی تباہی اپنی آنکھ سے دیکھ کر آئے تھے
 جب مراد آباد میں پہنچے تو ان کی تباہی ویرانی کا اور بھی زیادہ عبرت انگیز نقشہ
 ان کی نظر سے گذرا جس سے ایک اور چوٹ ان کے دل پر لگی۔ گورنمنٹ کا غم
 خاص کر مسلمانوں کے حال پر بدستور چلا جاتا تھا۔ ہندوستانی خیر خواہی سرکار کی آڑ
 میں مسلمانوں سے دل کھول کھول کر بدلے سہتھے اور اگلے پچھلے بغض نکال
 رہے تھے۔ مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لیے کوئی ثبوت نہ کار نہ تھا۔ ان کا
 مسلمان ہونا ہی ان کے مجرم ٹھہرانے کے لیے کافی تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ
 بے قاعدہ رعایت یا عہد دی کو نا سرکاری عہدیداروں کی قدرت سے باہر تھا۔
 اس لیے سرسید اپنے منصب کے لحاظ سے کوئی سلوک ان کے ساتھ نہیں

کر سکتے تھے۔ اگرچہ ان کے مراد آباد میں آنے سے کسی قدر ان ناگفتہ بہ بے اعتمادیوں کا اندازہ ہوا جو خاص مراد آباد میں بعض ناخدا ترس لوگ سرکار کی خیر خواہی کے پردے میں کرتے تھے کیونکہ حسن اتفاق سے انھیں دنوں میں اسٹریچی صاحب مراد آباد کے کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر ہو گئے تھے اور ان کو سرسید کی رائے اور مشورہ پر پورا اعتماد تھا۔ مگر سرسید اسی پر قانع نہ تھے بلکہ وہ اس فکر میں تھے کہ انگریزوں کے دل میں جو غلطی سے ایک عام بدگمانی تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے پیدا ہو گئی ہے وہ کس طرح رفع کی جائے۔

زمانہ نہایت نازک تھا۔ خیالات ظاہر کرنے کی آزادی مطلق نہ تھی۔ مارشل لا کا دور دورہ تھا اور حاکموں کی زبان ہی قانون تھی۔ جو شخص گورنمنٹ کا خیر خواہ اور وفادار تسلیم کر لیا گیا ہو اس کو ایسا کام کرنا جس سے اچھے دل نہ رہے ہوں اور بھی زیادہ دشوار تھا۔ گورنمنٹ نے مسلمانوں کو اپنا مخالف خیال کر لیا تھا اور ایسا خیال کرنے کے اسباب پہلے ہی سے موجود تھے۔ انگریز ہندوستانیوں کی فادت۔ طبیعت اور طرز خیالات سے ناواقف تھے۔ ملک کی حکومت انھوں نے مسلمانوں سے لی تھی اور انھیں کو وہ اپنا حریف اور سلطنت کا مدعی سمجھتے تھے اور بدقسمتی سے بقول سرسید کے جس بھری ہوئی مردہ کھال دلی میں موجود تھی۔ مسلمانوں کے مذہبی تعصبات کی شہرت تھی اور ان تمام باتوں کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ وہ انگریزوں کی غلط فہمی کے شکار ہو جائیں۔

سرسید کو اس بات کا دل سے یقین تھا کہ انگریزوں نے بغاوت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ انگریزوں کا یہ سمجھنا کہ غدار ایک ملکی بغاوت تھی اور اس کی بنیاد انگلش گورنمنٹ کی حکومت اٹھا دینے کے لیے کسی سادشس پر تھی۔ محض غلط ہے۔ اور اسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ وہ ملک کے

ساتھ اس طرح پیش آئے کہ جیسے باغی ملک کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔ ان کے نزدیک نہ یہ ملکی بغاوت تھی نہ کسی قسم کی سازش بلکہ صرف سپاہیوں کی عدول حکمی تھی وہ بھی نہ یہ ارادۂ بغاوت کے بلکہ بسبب جہالت اور مذہبی توہمات کے۔ چنانچہ سرولیم کے نے بھی جو غصہ کے بعد انڈیا آفس میں انڈر سکرٹری تھے۔ نہایت انصاف سے اس ہنگامہ کو ”سپاٹے وار“ سے تعبیر کیا ہے۔ نہ ملکی بغاوت سے اور لارڈ لارنس نے بھی آخر کو نہیں فیصلہ کیا کہ صرف کارٹوس کے سبب سے سپاہیوں کا ایک ہنگامہ تھا نہ کوئی عام سازش تھی نہ ملکی بغاوت۔

اسی بنا پر انھوں نے مراد آباد میں آکر اسباب بغاوت ہند پر ایک رسالہ لکھا جس میں رعایائے ہندوستان کو اور خاص کر مسلمانوں کو تین پر سارا پھوڑا انگریزوں کی بدگمانی کا تھا بغاوت کے الزام سے بری کیا ہے۔ اور اس خطرناک اور نازک وقت میں وہ تمام الزامات جو لوگوں کے خیال میں گورنمنٹ پر عائد ہوتے تھے نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ پوست کندہ بیان کیے ہیں۔ اور جو اسباب کو عموماً انگریزوں کے ذہن میں جاگزیں تھے ان کی تردید کی ہے اور ان کو غلط بتایا ہے۔

یہ رسالہ غالباً انھوں نے مراد آباد میں پہنچتے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ختم ہونے کے بعد بغیر اس کے کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کر لیا اور وہاں اس کو مطبع مصلیٹ گزٹ آگرہ میں چھپنے کو بھیجا اور ۱۸۵۹ء میں اس کی پان سو جلدیں چھپ کر ان کے پاس پہنچ گئیں جب سرسید نے ان کو پارلیمنٹ اور گورنمنٹ انڈیا میں بھیجنے کا ارادہ کیا تو ان کے دوست مانع آئے اور ماسٹر راجندر کے چھوٹے بھائی رائے سنگھ واس جو اس وقت مراد آباد میں منصف اور سرسید کے جہالت دوست تھے۔ انھوں نے کہا کہ ان تمام کتابوں کو جلا دواؤ۔ ہرگز اپنی جان کو معرض خطر میں نہ ڈالو۔ سرسید نے کہا ”میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں“

پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔ مائے شکر واس نے جب سرستید کی آمادگی بدرجہ غایت دیکھی اور ان کے سمجھانے کا کچھ اثر نہ ہوا تو وہ آبدیدہ ہو کر خاموش رہے۔ سرستید نے اول تو دو رکعتیں بطور نفل کے ادا کیں اور دعا مانگی اور اسی وقت کچھ کم پانسو جلدوں کا ایک پائل ولایت کو روانہ کیا اور ایک جلد گورنمنٹ انڈیا میں بھیج دی اور کچھ جلدیں اپنے پاس رکھ لیں۔

گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور سر بارٹر فریئر نے جو کونسل میں ممبر تھے اس کے مضمون کو محض خیر خواہی پر محمول کیا۔ مگر سٹر سسل بیڈن نے جو اس وقت فارن سکریٹری تھے اس کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی اور یہ طے ظاہر کی کہ "اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے، اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے۔" لیکن چونکہ اور کوئی ممبر ان کا ہم طے نہ تھا اس لیے ان کی اسپیچ سے کوئی منفی نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔ مگر ۱۸۷۱ء میں جب کہ لارڈ کیننگ نے فرخ آباد میں دربار کیا اور سرستید بھی اس دربار میں بلائے گئے تو وہاں ایک موقع پر سٹر سسل بیڈن فارن سکریٹری گورنمنٹ انڈیا سے بڑھ کر ہو گئی جب ان کو معلوم ہوا کہ سید احمد خاں یہی شخص ہے اور اسی نے اسباب بغاوت پر وہ مضمون لکھا ہے تو سرستید دوسرے روز علیحدہ مل کر اپنی نہایت رنجش ظاہر کی اور بہت دیر تک تلخ گفتگو ہوتی رہی۔ انھوں نے کہا کہ "اگر تم گورنمنٹ کی خیر خواہی کے لیے یہ مضمون لکھتے تو ہرگز اس کو چھپو اگر ملک میں شائع نہ کرتے بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے یا رعایا کے خیالات ظاہر کرتے۔" سرستید نے کہا "میں نے اس کتاب کی کل پانسو جلدیں چھپوائی تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں

اور ایک گورنمنٹ میں بھیجا ہے اور کچھ کم پانسو جلدیں ولایت روانہ کی ہیں جن کی رسید میرے پاس موجود ہے میں جانتا تھا کہ آج کل بسبب غیظ و غضب کے حاکموں کی رائے صائب نہیں رہی اور اس لیے وہ سیدھی باتوں کو بھی الٹی سمجھتے ہیں۔ اس لیے جس طرح میں نے اُس کو ہندوستان میں شائع نہیں کیا اسی طرح انگریزوں کو بھی نہیں دکھایا۔ صرف ایک کتاب گورنمنٹ میں بھیجا ہے۔ اگر اس کے سوا ایک جلد بھی کہیں ہندوستان میں ملجائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دوں گا۔ مسٹر بیڈن کو اس بات کا یقین نہ آیا اور انھوں نے کئی بار سرسید سے پوچھا کہ کیا فی الواقع اُس کا کوئی نسخہ ہندوستان میں شائع نہیں ہوا؟ جب اُن کا اطمینان ہو گیا پھر انھوں نے اُس کا کچھ ذکر نہیں کیا۔ اور اُس کے بعد ہمیشہ سرسید کے دوست اور حامی دہلوی گارے۔

اس کتاب کے سرکاری طور پر متعدد ترجمے ہوئے۔ انڈیا آفس میں اس کا ترجمہ ہوا اور اُس پر متعدد دفعہ بحثیں ہوئیں۔ گورنمنٹ انڈیا میں بھی اُس کا ترجمہ کرایا گیا پارلیمنٹ کے بعض ممبروں نے بھی اس کا ترجمہ کیا۔ مگر کوئی ترجمہ پبلک میں شائع نہیں کیا گیا۔ لیکن اُسی زمانے میں ایک مذہب حاکم نے اشاعت کی نظر سے اُس کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا جس کو کزل گریم نے جو سرسید کے بڑے دوست ہیں، لپٹا لیا اور سنڈے میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس کتاب کی نسبت مذہب ان سلطنت وغیرہ کی رائیں اور جو نتائج اُس سے پیدا ہونے وہ دوسرے حصہ میں لکھے جائیں گے۔ چونکہ یہ رسالہ آج تک عام طور پر شائع نہیں ہوا اور نہ اُمید ہے کہ آئندہ شائع ہو اس لیے ہم نے رسالہ کو بحسنہ بطور تنبیہ کے کتاب کے آخر میں ملحق کر دیا ہے کیونکہ جس قدر اس تحریر سے

سرسید کا ایک عمدہ مذہب سلطنت اور ملک اور گورنمنٹ کا خیر خواہ ہونا ثابت ہوتا ہے اُس سے زیادہ گورنمنٹ کی حق پسندی، انصاف اور فراخ صوابی کا ثبوت ملتا ہے جس نے اُس غیظ و غضب اور ناراضی کے زمانے میں نہایت ٹھنڈے دل

سے شکایتوں کو سنا، اُن پر غور کیا اور جو شکایتیں ادا اعتراض صحیح معلوم ہوئے اُن کا فوراً تدارک کیا۔

ملکہ معظمہ کے اشتہار کا شکریہ ادا کرنا

سر سید ابھی اپنی کتاب اسباب بقاءت ختم کرنے نہیں پائے تھے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار معافی اور امن و امان کا مشتہر ہوا۔ اس اشتہار کے مشتہر ہونے پر سر سید نے مراد آباد کے مسلمانوں کو مطلع کیا کہ ملکہ معظمہ کی اس عنایت و مہربانی کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے۔ تمام مسلمانوں نے بہت خوشی سے قبول کیا اور اس غرض کے لیے سب کا ایک جگہ جمع ہونا قرار پایا۔ شہر کے متصل ایک مشہور درگاہ شاہ بلاتی صاحب کی ہے اس کام کے لیے وہ جگہ تجویز ہوئی۔ شہر کے مسلمانوں نے آپس میں چپ نہ کیا اور ۱۸ جولائی ۱۸۵۹ء کو قریب پندرہ ہزار مسلمانوں کے وہاں جمع ہونے غریبوں اور مسکینوں کو عمدہ کھانا تقسیم کیا گیا۔ عصر کے وقت سب لوگوں نے شاہ بلاتی صاحب کی مسجد میں نماز پڑھی۔ نمازیوں کی اس قدر کثرت تھی کہ مسجد کے باہر میدان تک جماعتیں کھڑی ہوئی تھیں۔

خانہ کے بعد سر سید نے صحن مسجد میں ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر اردو زبان میں ایک مناجات پڑھی جس میں نہ شاندار الفاظ ہیں نہ رنگین ہے نہ تفسیح ہے۔ محض سیدھے سادے الفاظ اور بے ساختہ جملے ہیں۔ مگر اُس کے ہر جملے اور ہر فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی نے اس شخص کے دل میں ایک عجیب بے چینی پیدا کر رکھی تھی جو کسی طرح کم نہ ہوتی تھی بلکہ روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی اور گویا اس بات کی خبر دیتی تھی کہ وہ سر سید کو اخیر دم تک اس چھٹک سے خالی نہ رہنے دے گی۔ ہم کو مناسب معلوم ہوتا

ہے کہ اُس مناجات کو بجنسہ اس مقام پر نقل کر دیا کیونکہ اُس کے الفاظ سے مسیحا کے دل کی اصلی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔

مناجات

”اے خدا تو ہمارا حقیقی پروردگار ہے۔ اے خدا اصلی بادشاہ
اور حقیقی سلطنت تجھی کو سزاوار ہے۔ اے خدا مالک الملک تو ہی ہے
جس کو تو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو تو چاہتا ہے دولت دیتا ہے
اے خدا سارا عالم اور تمام مخلوقات کی جانیں اور سب آدمیوں کے دل
تیرے ہاتھ میں ہیں جس طرف تو چاہتا ہے اُن کو پھیرتا ہے اور جو
چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ تیرا کوئی کام حکمت اور رحمت سے خالی نہیں
تیرے کام میں کسی کو چون و چرا کی قدرت نہیں۔ اے خدا ہم تیرے
عاجز بندے سراسر تیرے گنہگار ہیں۔ اے خدا ہماری شامت اعمال
نے ہم کو گناہ کے دریا میں سرتک ڈبو دیا ہے اے خدا ہم تیرے ہر
وقت تقصیر وار ہیں۔ جب تک تیری مدد نہ ہو ایک دم گناہ سے پاک
نہیں رہ سکتے۔ اے خدا تیرے سوا کوئی ہمارے گناہ بخشے والا نہیں
اے خدا تیرے سوا ہم گناہ کے دریا میں ڈوبے ہوؤں کا کوئی ترانے
والا نہیں۔ ہم نہایت عاجزی اور کمال انکسار سے اپنے گناہوں کی معافی
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے تجھ سے چاہتے ہیں،
اے خدا تیرے غضب سے تیری رحمت سبقت لے گئی ہے اپنی
رحمت کاملہ سے ہمارے گناہ معاف کر۔ اے خدا جس طرح تیری حکمت
سے میلا کپڑا میل سے پاک ہوتا ہے اسی طرح ہم کو ہمارے گناہوں کی

ناپاکی سے پاک کر اے خدا اپنی بے انتہا رحمت سے ہمارے دل کو
تمام بُرائیوں اور تمام ناپاک چیزوں سے جو دل کو ناپاک کرتی ہیں صاف
کر۔ اے خدا ہمارے دل کے گناہوں کو مٹا اور ہماری روح کو روح القدس
کی تائید سے قوی کر تیرے سوا ہمارا حقیقی ماما اور اصلی ملجا اور کوئی
نہیں آمین !

آلہی ہمارے گناہ حد سے زیادہ ہو گئے تھے۔ الہی ہماری شامت
اعمال کی کچھ انتہا نہیں رہی تھی۔ اگرچہ ہم یقین کرتے ہیں کہ ہر ایک
کے اعمال کی سزا اللہ جزا کا ایک دن بیشک آنے والا ہے جس کا تو
نے اپنے پیچھے نبیوں کی کتابوں میں وعدہ کیا ہے اور اُس دن تیری رحمت
اور تیرے فضل کے سوا کسی کا چھٹکارا نہیں کیونکہ تیرے آگے سب
گنہگار ہیں، مگر ان پچھلے دوسروں میں جو تیری نگاہِ قہر آلود تیرے عاجز
بندوں کی طرف ہوتی وہ بیشک ہماری شامت اعمال کا ظاہری نتیجہ
تھا۔ آلہی ہم اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ آلہی اپنے گناہوں کی
بتحہ سے معافی چاہتے ہیں۔ آلہی تو ہمارے گناہ سب معاف کر آمین !
آلہی یہ پچھلا زمانہ تیری مخلوقات پر ایسا گذرا کہ انسان اور حیوان
تمام چیزند و پرند بلکہ شجر و حجر کسی کو چین اور آرام نہ تھا۔ کوئی شخص اپنی
جان و مال و آبرو پر مطمئن نہ تھا ان پچھلے فسادوں نے زمین و آسمان
کو گویا الٹ پلٹ کر دیا تھا۔ آلہی تو نے اپنے فضل و کرم سے ان
تمام فسادوں اور آفتوں کو دور کیا۔ آلہی تو نے پھر اپنے عاجز
بندوں پر رحم کیا اور جو امن و آسائش ان بد سجت برسوں سے پہلے
تو نے اپنے بندوں کو دی تھی پھر وہی امن و آسائش تو نے اپنے

بندوں کو نصیب کی۔ آہی تیرے اس رحم کا ہم دل سے شکر ادا کرتے
ہیں، آہی تو ہمارے اس شکرانہ کو جو تیری درگاہ کے لائق نہیں ہے
اپنے فضل و کرم سے قبول کر۔ آمین !

آہی تیرا ایک بہت بڑا احسان اپنے بندوں پر یہ ہے کہ اپنے
بندوں کو عادل اور منصف حاکموں کے سپرد کرے۔ سو برس تک
تو نے اپنے ان بندوں کو جن کو تو نے خطہ ہندوستان میں جگہ دی ہے
اسی طرح عادل اور منصف حاکموں کے ہاتھ میں ڈالا۔ پچھلے کم نجات
برسوں میں جو بسبب نہ ہونے ان حاکموں کے ہماری شامت اعمال
ہمارے پیش آئی اب تو نے اس کا عوض کیا اور پھر وہی عادل اور منصف
حاکم ہم پر مسلط کیے تیرے اس احسان کا ہم دل سے شکر ادا کرتے
ہیں۔ تو اپنے فضل و کرم سے اس کو قبول کر آمین !

آہی جو بھلائی کہ تیرے بندے کو کسی تیرے بندے سے پہنچتی
ہے وہ درحقیقت تیری ہی طرف سے ہے اور اس تیرے بندے
کا شکر ادا کرنا درحقیقت تیرا ہی شکر ادا کرنا ہے۔ سب کے دلوں
کا حال تجھ پر روشن ہے کیونکہ تو دانا شے نہاں و آشکارا ہے۔ اہل ہند
جو اس اتفاقیہ آفت میں گرفتار ہو گئے تھے ان پر رحم کرنا تو نے ہی
ہمارے حکام کے دل میں ڈالا۔ تیرے ہی القاسے کوٹن و کٹوریہ دام
سلطنت ہانے پر رحم اشتهار معافی جاری کیا۔ ہم دل سے شکر ادا کرتے
ہیں اور اپنی جان سے ملکہ کو دعا دیتے ہیں۔ آہی تو ہماری اس دعا کو
قبول کر آمین ! آہی ہماری ملکہ و کٹوریہ ہوا۔ اور جہان ہو۔ تمام اہل ہند
ناظم کشور ہند و السرائے لارڈ کیننگ دام اقبالہ کا یہ رحم اور احسان

کبھی دل سے نہ بھولیں گے جس نے تمام اصل حالات فساد پر غور کر کے اس پر رحم اشتہار کے جاری ہونے کی صلاح دی۔ اس کی مستحکم رائے کسی طرح اس معاملے میں منہیں ڈگمگائی جس سے تمام رعایا نے امن پایا۔ تمام اہل ہند اُس کے اس احسان کے بندے اور دل و جان سے اُس کو دعا دیتے ہیں۔ الٹی تو ہماری دعا قبول کر۔ آمین! الٹی دنیا ہو اور ہمارا واسعہ لارڈ کینگ ہو۔

الٹی اہل ہند رحم کے اُس سے بہت زیادہ خواہشمند ہیں جتنا ایک پیاسا نہایت گرمی کی شدت اور آفتاب کی تیزی اور دھوپ کی تپش اور ریتے کے جنگل میں پانی کی آرزو رکھتا ہے جس حاکم کو دیکھتے ہیں کہ اُس کی رحم کی نظر ہے اُس کو دل سے پسند کرتے ہیں اور اُس کا دل سے شکر ادا کرتے ہیں۔ تمام اہل ہند جانتے ہیں کہ اصل حالات فساد پر غور کر کے نہایت رحم کی نگاہ سے اہل ہند کو مسٹر ریڈ ممبر بورڈ نے دیکھا ہے۔ اس لیے اُن کا شکر ادا کرتے ہیں اور دل سے اُن کو دعا دیتے ہیں۔ الٹی تو ہماری اس دعا کو قبول کر۔ ہمارا مسٹر ریڈ ہمیشہ سلامت رہے۔

اب ہماری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے فضل و کرم سے امن و امان اور چین چان اور تمام رعایا سے ہند کو اطاعت گو نمٹ سے سرخروئی دے اور ہمارے حکام اپنی رعایا اور خدا کے بندوں پر مہربان رہیں۔ آمین :

صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین
وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

رسائل موسوم بہ لائل محمد نواف انڈیا

مراد آباد ہی میں سرسید نے خاصکر مسلمانوں کی بھلائی کے لیے ایک اور مفید کام کی بنیاد ڈالی۔ رسالہ اسباب بغاوت جیسا کہ اوپر مذکور ہوا انھوں نے محض گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ کی اطلاع کے لیے لکھا تھا۔ چنانچہ ایک مدت تک اس کے مضامین سے ہندوستان کے حکام اور افسر اور خود ہندوستان کے باشندے کیا ہندو اور کیا مسلمان مطلع نہیں ہوئے اور چونکہ اس پر مرتب ہوئے وہ پارلیمنٹ کے مباحثوں کے بعد آہستہ آہستہ بتدریج ظاہر ہوتے رہے اس لیے سرسید کے دل کی بے چینی اور درد میں کچھ افاقہ نہ ہوا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ بغاوت پر جتنے آرٹیکل، رسالے اور کتابیں انگریز لکھتے تھے ان میں سے اکثر میں مسلمانوں کے بر خلاف رائیں ظاہر کی جاتی تھیں ان کی بے چینی اور زیادہ ہوتی تھی۔ مسلمانوں پر کہیں یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ ان کو بالذات اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں سے عداوت ہے۔ کوئی یہ لکھتا تھا کہ شاہ نعمت اللہ علی کی پیشین گوئی سے تمام مسلمانوں کو یقین تھا کہ اب عیسائیوں کی عملداری نہیں رہنے کی۔ اور سب سے بڑا اور عام الزام جو ان پر عائد کیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہب کی رو سے انگریزوں پر جہاد کرنا واجب تھا اور اسی لیے مسلمان سب سے زیادہ بغاوت کے مرتکب ہوئے۔

برخلاف اس کے سرسید نے نہایت تحقیقات اور چھان بین سے بے شمار شہادتیں اس بات کی بہم پہنچائی تھیں کہ جس قدر گورنمنٹ کی خیر خواہی میں جانہاری اور جہاں نشاری کے کام مسلمانوں سے ظہور میں آئے وہ تمام ملک میں کسی قوم سے ظہور میں نہیں آئے۔ اور مذکورہ بالا نہیں الزام جو مسلمانوں پر لگائے جاتے تھے وہ

فی الواقع انگریزوں کی غلط فہمی پر مبنی تھے۔ اسی بنا پر انھوں نے ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جو پارہ پارہ کر کے وقتاً فوقتاً اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپوائی جائے اور ہندوستان اور انگلستان دونوں ملکوں میں شائع کی جائے۔

اس کتاب کا موضوع یہ قرار دیا تھا کہ اطراف ہندوستان میں جس قدر مسلمانوں نے گورنمنٹ کی خیر خواہیاں اور انگریزوں کی حمایت کے لیے جانباڑیاں کی ہیں ان میں سے ہر شخص کا حال مفصل اور مشرع نہایت صحت کے ساتھ قلمبند کیا جائے اور ہر شخص کے متعلق گورنمنٹ، حکام اور افسروں کی تمام چٹھیاں اور سرٹیفکیٹ بہم پہنچا کر اس کی سرگذشت کی ذیل میں نقل کی جائیں اور جو کچھ ان کی خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ نے جاگیر یا پنشن یا انعام یا خلعت وغیرہ عنایت کیا ہو وہ سب بیان کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ ایسی کتاب لکھنے کے لیے بے انتہا سامان اور میٹریل درکار تھا جس کا جمع کرنا وقت سے خالی نہ تھا۔ پھر اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اجرت بھی اس زمانے میں نہایت گراں تھی اور ٹائپ کے چھاپہ کا خرچ بھی بہ نسبت پتھر کے چھاپہ کے بہت زیادہ تھا۔ اس لیے سرستید نے یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ جس خیر خواہ مسلمان کا حال جتنے صفحوں پر چھپے اس قدر صفحوں کے چھاپہ وغیرہ کی لاگت وہی شخص ادا کرے۔ مگر افسوس ہے کہ معدودے چند کے سوا کسی نے اس تدبیر کے پورا کرنے کی طرف توجہ نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف تین غیر بغلہ ۲۷۳ صفحہ کے چھپ کر رہ گئے ۱۸۶۶ء میں یہ رسالہ جاری ہوا اور ۱۸۶۱ء میں بند ہو گیا۔

پہلے نمبر کو انھوں نے اس طرح شروع کیا ہے۔ "سیح ہے انقلاب زمانہ ایک ایسا بڑا حادثہ ہے کہ آدمی کو نہایت زہروں و مہماندہ کر دیتا ہے۔ ایسے وقت

میں انسان کا فضل و کمال، عقل و مہر علم و عمل کچھ کام نہیں آتا۔ یہی وہ حادثہ ہے جس سے انسان کا باپٹ ہو جاتا ہے۔ کوئی کام اُس کا اعتبار کے لائق نہیں رہتا کسی شخص کو اس کی قدر و منزلت کا خیال نہیں رہتا جو کام انسان سے بڑا سرزد ہوتا ہے وہ تو بُرا ہی ہے مگر اس بخت و فتنے کا مقتضایہ ہوتا ہے کہ اُس کا اچھا کام بھی بُرائی اور ظاہر داری پر محمول ہوتا ہے۔ ہر ایک قوم میں اچھے بُرے سب قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ یہ ایک مثل مشہور ہے کہ ”ایک پھلی سارے جل کو گندا کرے“ یہ خالص ایسے ہی بُرے وقت کے لیے کہی گئی ہے۔ اس کم بخت و فتنے کا یہ خاصہ ہے کہ اگر ایک آدمی بھی بُرا کام کرے تو ساری قوم کی قوم رسوا و بدنام ہو جاتی ہے گو اُس قوم میں صد ہا آدمیوں نے اچھے کام کیے ہوں مگر اُن خودیوں پر کسی کو خیال نہیں ہوتا۔

”ہر خلافت اس کے جن لوگوں پر یہ بد بختی کے دن نہیں ہوتے اُن کا بُرا کام بھی آنکھوں میں نہیں کھٹکتا۔ اُن میں سے ہزاروں نے کیسے ہی بُرے کام کیے ہوں مگر اُن کی بُرائی پر کسی کو دھیان نہیں ہوتا یہ بد بختی کا زمانہ وہ ہے جو ۵۵۵ء و ۵۵۶ء میں ہندوستان کے مسلمانوں پر گذرا۔ کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اُس زمانے میں نہ ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی۔ گو وہ رام دین اور ناتا دین ہی نے کی ہو۔ کوئی بلا آسمان پر سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے، مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔

ہر بلائے گز آسماں آید گر چہ بردگہرے قضا باشد
بر زمین نار سیدہ می پُرسد خانہ مسلمان کجا باشد

”اس گزشتہ زمانے کے حالات پر میں نے بھی بہت غور کیا اور جو اصلی حالات مجھ کو معلوم ہوئے ہیں اُن پر میں یقین رکھتا ہوں اور اسی سبب سے میرا دل خوش ہے کہ بالفضل جو ایک غوغا مسلمانوں کی بُرائی اور مفسدہ اور بد ذاتی

کا چاروں طرف پھیل رہا ہے یہ بالکل مٹ جائے گا۔ اگرچہ کچھ کچھ حالات فساد کے کھلتے چلے ہیں مگر روز بروز اور زیادہ کھلتے جائیں گے اور جب اصلی حال بالکل روشن ہو جائے گا تو جن لوگوں کی زبانیں مسلمانوں کی نسبت دراز ہو رہی ہیں سب بند ہو جائیں گی اور تحقیق ہو جائے گا کہ ہندوستان میں اگر کوئی قوم مذہب کی رو سے عیسائیوں سے محبت اور اخلاص اور ارتباط اور یکسانیت کر سکتی ہے تو مسلمان ہی کر سکتے ہیں اور کوئی نہیں۔ مگر ان دنوں میں جو میری نگاہ سے انگریزی اخبارات کثرت سے گزرے اور جو کتابیں اس ہنگامہ کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں تو ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بد ذات کوئی نہیں مگر مسلمان! مسلمان! مسلمان! کوئی کاشتوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اُس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بولہ نہیں اٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھا یا تھا۔ مگر میں اُس کے برخلاف سمجھتا ہوں۔ میں ضعیف دیکھتا کہ مسلمانوں کے سوا ایسا اور کوئی مرد جس نے خاص سرکار کی خیر خواہی میں اپنی جان، مال، عزت، آبرو، کھوئی ہو۔ زبانی بات چیت کی خیر خواہیاں ملادینے اور جھوٹے پتے ایک دو پرچے لکھ بھیجنے بہت آسان ہیں مگر مسلمانوں کے سوا وہ کون شخص ہے جس نے صرف سرکار کی خیر خواہی میں اپنی اور اپنے کنبے کی جان دی ہو اور ہر وقت ہاتھ پاؤں اور دل و جان سے جاں نثاری کو حاضر رہا ہو؟

”وہ جن مسلمانوں نے سرکار کی نیک حرامی اور بدخواہی کی ہیں ان کا طرفدار نہیں ہوں میں ان سے بہت زیادہ ناراض ہوں اور ان کو حد سے زیادہ برا بھلا بتاؤں کیونکہ یہ ہنگامہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کی بموجب عیسائیوں کے ساتھ رہنا چاہیے تھا جو اہل کتاب اور ہمارے مذہبی بھائی بند ہیں۔ انہیں پر

ایمان لائے ہیں، خدا کے دیئے ہوئے احکام اور خدا کی دی ہوئی کتاب اپنے پاس رکھتے ہیں جس کا تصدیق کرنا اور جس پر ایمان لانا ہمارا عین ایمان ہے۔ پس اس ہنگامے میں جہاں عیسائیوں کا خون گرتا وہیں مسلمانوں کا بھی خون گرتا چاہیے۔
 تھا۔ پھر جس نے ایسا نہیں کیا اُس نے علاوہ نمک حرامی اور گورنمنٹ کی ناشکری کے جو کسی حال میں رعیت کو جائز نہ تھی، اپنے مذہب کے بھی بدخلق کیا۔ اس لیے بلاشبہ وہ اس لائق ہیں کہ زیادہ اُن سے ناراض رہا جائے مگر عموماً اخباروں اور بغاوت کی کتابوں میں جو رائے اُن کی نسبت چھاپی جاتی ہے اُس میں اور میری رائے میں اتنا فرق ہے کہ جو تمہید اور جو بتا اور جو منشا کہ وہ لوگ اُن کی نسبت لگاتے ہیں میں اُن کو قبول نہیں کرتا اور کچھ شک نہیں کہ میں اپنی رائے کو بہت دسترس اور انصاف سے کام میں لایا ہوں۔

”اگرچہ چاروں طرف سے مسلمانوں پر یہ شور و غل مچ رہا ہے مگر مسلمانوں کو کسی طرح رنجیدہ خاطر ہونا نہیں چاہیے کیونکہ ہماری نہایت منصف اعلیٰ گورنمنٹ مسلمانوں کی طرف سے ہماری گورنمنٹ نے اصلی حالات و مناسبات پر بخوبی غور کیا ہے اور یقین ہے کہ ہماری گورنمنٹ کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے جو تم اخباروں یا بغاوت کی کتابوں میں دیکھتے ہو۔ پس جب کہ مسلمانوں کی طرف خود گورنمنٹ ہے تو پھر اس شور و غوغا کا اُن کو کیا غم ہے۔

۵ نمیکویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من

بہار از یار و باغ از یار و گل از یار از من

”وہم جو یہ بات لکھتے ہیں کہ ہماری منصف گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ

ہے اس کی بہت روشن دلیل یہ ہے کہ ہماری قدر و ان گورنمنٹ نے خیر خواہ مسلمانوں کی کیسی قدر و منزلت اور عزت اور آبرو کی، انعام و اکرام اور جاگیر

اور نیشن سے نہال کر دیا ہے، ترقی عہدہ اور افزائی مراتب سے سرفراز کیا ہے
پھر کیا یہ ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان نازاں ہوں اور دل و جان سے اپنی گورنمنٹ
کے شکر گزار و ثنا خواں رہیں ؟

” مگر میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں نے جو خیر خواہیاں کیں ان کا ذکر اخباروں
میں بہت کم چھپتا ہے اور بغاوت کی جو کتابیں چھپی ہیں ان میں تو اس کا ذکر ہی نہیں
اس لیے میں نے ارادہ کیا ہے کہ مسلمان خیر خواہوں کا تذکرہ اس رسالہ میں لکھنا
شروع کروں اور جن مسلمانوں نے علی الخصوص مسلمان ملازمان گورنمنٹ نے
جو جو خیر خواہیاں گورنمنٹ کی کی ہیں ان کا بیان جہاں تک مجھ کو معلوم ہے لکھوں
اور جو انعام و اکرام ہماری منصف و قدر دان گورنمنٹ نے بعض اس کے مسلمانوں
کو دیے وہ سب بیان کروں تاکہ گورنمنٹ کی سخاوت اور منصفی اور قدر دانی
زیادہ تر مشہور ہو اور تمام رعایا اپنے ہم قوموں کے ساتھ گورنمنٹ کی مروت اور
سلوک اور رعایت اور قدر دانی دیکھ کر اس کی دل سے شکر گزار ہو، اور ہر ایک
کو یہ حوصلہ پیدا ہو کہ جس طرح ہمارے ہم قوموں نے گورنمنٹ کی رفاقت سے
عزت اور نیک نامی حاصل کی اسی طرح ہم بھی حاصل کریں اور یہ سبھی جان لیں کہ ہماری
گورنمنٹ ہمیشہ اپنی مطیع رعایا پر دل سے مہربان اور ان کی قدر و منزلت کرنے
کو تیار ہے ۔“

” مگر چونکہ مسلمان خیر خواہ بہت کثرت سے ہیں اور ان کی رپورٹیں بھی بہت
لمبی لمبی ہیں اس لیے ان سب کا ایک کتاب میں جمع کرنا اور چھاپنا خالی از وقت
نہ تھا اس واسطے یہ نتیجہ نیک کی ہے کہ مناسب مناسب وقت پر چند لوگوں کا
حال مختصر مختصر رسالوں میں چھاپا جائے ۔“

” جو لوگ بسبب تعصب یا عدم واقفیت کے حالات ملکی سے یا جو

اصول سیاستِ مذہب کے ہیں اُن پر صحیح رائے نہ پہنچنے کے سبب میری رائے کے برخلاف ہیں وہ لوگ میری اس رائے کو دیکھ کر حسبِ الوطنی کا الزام مجھ پر لگائیں گے۔ ہاں یہ بات تو مجبوری کی ہے کہ میری پیدائش ہندوستان میں ہوئی اور میں بلاشبہ مسلمان ہوں اور مسلمانوں ہی کا ذکر خیر اس کتاب میں لکھتا ہوں پھر نامنصفی سے جو کوئی چاہے یہ الزام مجھ پر لگائے۔ مگر جو لوگ انصاف دوست ہیں وہ خیال کر چکے کہ ان حالات و واقعات کی تحریر میں میں نے کسی جگہ انصاف کو ہاتھ سے نہیں دیا جس مسلمان کی خیر خواہی کا ذکر لکھا ہے اس کے ساتھ بجنسہ حکام متعہد کی رپورٹیں جو ان کے حق میں ہوئیں اور سارٹیفکیٹ جو ان کو دیئے گئے اور گورنمنٹ سے جو اتعام و اکرام اُن کو ملے۔ وہ سب لفظ بہ لفظ اس میں مندرج ہیں جو میری اس تحریر پر گواہِ عادل ہیں اور تمام منعصبوں کو الزام لگانے سے بند کرتے ہیں۔

اس کے بعد سرسید نے اول اس بات کا اقرار کیا ہے کہ میری خدمات بمقابلہ بڑے بڑے غیر خواہ مسلمانوں کے کچھ حقیقت نہیں رکھتیں اور اس لیے وہ ذکر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ مگر صرف اس اُمید پر کہ جو انگریز مسلمانوں سے بدگمان ہیں۔ وہ مولف کو گورنمنٹ کا خیر خواہ سمجھ کر ان تحریرات کو توجہ کے قابل سمجھیں سب سے پہلے اپنا اور میرا رتبہ علی اور ڈپٹی رحمت خاں کا حال لکھا ہے اور تینوں رتبوں میں تقریباً سترہ یا اٹھارہ شخصوں کا نہایت مفصل حال درج کیا ہے جن میں سے بعضے خود بھی مدے گئے اور اُن کے ساتھ دس دس بارہ آدمی اُن کے کہنے کے بھی یا غیروں کے ہاتھ سے قتل ہوئے دوسرے رسالہ میں خیر خواہان سرکار کے ذکر کے علاوہ ایک لمبی بحث اُن تینوں الزاموں کے منقطع بھی کی ہے جو عموماً مسلمانوں اور اُن کے مذہب پر لگائے جاتے تھے اور قرآنِ حدیث اور فقہ کے حوالوں سے نہایت صفائی کے ساتھ ان کو غلط اور محض بے اصل و بے بنیاد ثابت کیا ہے۔

تفسیر رسالہ میں لانس لٹ اڈلین نام ایک قدیم عیسائی مصنف کی کتاب سے جو
اُس نے ۱۷۹۰ء میں اسلام کے ابتدائی حالات پر لکھی تھی، ایک عہد نامہ نقل کیا ہے۔
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں کے ساتھ جو
عہد و پیمان کیا تھا اُس میں ان کی قوم کو تقریباً مسلمانوں ہی کی برابر حقوق دیئے
تھے اور مسلمانوں کو تاکید کی تھی کہ اُس پر ہمیشہ کاربند رہیں ورنہ وہ خدا سے
منحرف سمجھے جائیں گے۔

افسوس ہے کہ یہ رسالہ مسلمانوں کی معمولی بے پروائی اور کم مہمتی سے صرف
تین نمبروں سے آگے نہ چل سکے، اگر یہ تذکرہ مکمل ہو جاتا تو مسلمانوں کے حق میں ایک
نہایت مفید اور بکار آمد چیز ہوتی اور ان دعویٰ کا ایک عملی اور قطعی ثبوت ہوتا
جن کے ثابت کرنے کے لیے اصول اسلام کے موافق دلیلیں اور شہادیں پیش
کرنے کی ضرورت ہوتی۔

تحقیق لفظ نصاریٰ

سرستید مراد آباد ہی میں تھے کہ ان کو معلوم ہوا کہ بعض اصلا ح میں مسلمانوں
کی بعض تحریروں آیام غدر کی ایسی پیش ہوتی ہیں جن میں انگریزوں کو لفظ نصاریٰ سے
تعبیر کیا تھا، حکام نے اس لفظ کو بھی بغاوت کا لفظ سمجھا اور ان کے لکھنے والوں
کو وہ سزائیں دی گئیں جو ان کی قسمت میں لکھی تھیں، اس وقت جیسا کہ سرستید
نے لکھا ہے، مسلمانوں کی ہر ایک بات بُرے پہلو پر ڈھالی جاتی تھی، انگریزوں

۱۷۹۰ء کے چند سال بعد دہلی میں بھی ایک اسی قسم کا اشتباہ پیدا ہوا تھا، دہلی کالج کے ایک مسلمان پروفیسر
کے ایک ایڈریس کے مسودہ میں عیسائی کی جگہ ترسا کا لفظ لکھ دیا تھا جو فارسی میں رابب یعنی ملنگ
کو کہتے ہیں کالج کے ایک یورپین افسر نے اس کو مختارٹ کا لفظ سمجھا اور نہایت ناراضی ظاہر کی اور
اس لفظ کو مسودہ میں سے کٹوا دیا۔ ۱۳۔

نے جو بعض مسلمانوں کی تحریروں میں اپنی نسبت نصاریٰ کا لفظ دیکھا تو انھوں نے یہ خیال کیا کہ جس طرح میری حضرت عیسیٰ کو وحدت سے نامری (یعنی قریب ناصرہ کا رب بنے والا) کہتے تھے اسی طرح مسلمانوں نے انگریزوں کو نصاریٰ کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

سر سید نے اس غلطی کے رفع کرنے کو فوراً ایک مختصر رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ میں لکھا اور اُس کو اردو اور انگریزی میں چھپوا کر حکام اور گورنمنٹ کو اُس کے مضمون سے مطلع کیا۔ ہم کو اس کتاب کے لکھنے وقت وہ رسالہ دستیاب نہیں ہوا مگر جو کچھ سر سید نے زبانی بیان کیا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ نصاریٰ کا لفظ ناصرہ سے مشتق نہیں بلکہ نصر سے مشتق ہے اور مسلمان اس وجہ سے کہ قرآن سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ اُس کو نصر سے مشتق سمجھتے ہیں نہ ناصرہ سے کیونکہ قرآن میں صاف آیا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ نے کہا "من انصاری الی اللہ" تو حواریوں نے کہا "نحن انصار اللہ" اور اسی لیے حواریوں کی پیروی کرنے والوں اور عیسیٰ پر ایمان لانے والوں کو اُسی صفت کے ساتھ جس کو حواریوں نے ہامی بھری تھی، موصوف کہا گیا ہے اور ان پر نصاریٰ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ قرآن میں کہیں قریب ناصرہ کا ذکر نہیں آیا اور نہ کہیں حضرت عیسیٰ کو نصاریٰ کہا گیا ہے اس کے سوا قرآن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائی انحضرت کے زمانے میں خود اپنے نہیں نصاریٰ کہتے تھے جیسا کہ سورہ مائدہ کی اس آیت میں بیان ہوا ہے وَلَيَتَذَكَّرُ اُولَٰئِكَ لَمَّا دَخَلُوا مِنْ اِلَيْهِمْ اَمْ نَبْلِغُهُمْ رُوحًا مِّنْ رَّبِّهِمْ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ (یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو بانیے گا اہل کتاب میں سب سے زیادہ مسلمانوں کو دوست اُن کو جن کا قول ہے کہ ہم نصاریٰ ہیں) جہاں تک کہ معلوم ہوا ہے اس رسالہ کی اشاعت کے بعد پھر کسی سے اس لفظ پر مواخذہ نہیں ہوا۔ ہم نے سنا ہے کہ جب یہ رسالہ شائع ہوا تو کسی انگریزی اخبار میں یہ لکھا گیا تھا کہ سید احمد خاں کا بیان غلط ہے کیونکہ کسی شخص کو نصاریٰ کا لفظ کہنے

پر سزا نہیں ہوئی۔ اس پر ایک معزز یورپین افسر نے اُس کا جواب دیا اور یہ لکھا کہ خود ہمارے سامنے ایک شخص کو اسی جرم میں کانپور میں پھانسی دی گئی۔

انتظام قحط ضلع مراد آباد

۱۸۶۰ء میں جب کہ اضلاع شمال مغرب میں ایک عام قحط پڑا تھا اُس وقت سرستید مراد آباد ہی میں صدر الصدور تھے۔ مسٹر جان اسٹریچی نے جو اُس وقت وہاں کلکٹر تھے، اپنے ضلع کے قحط کا انتظام سرستید کے سپرد کر دیا تھا۔ اس موقع پر قطع نظریات اور سلیقہ انتظام کے جو انسانی ہمدردی سرستید سے ظہور میں آئی وہ ہندوستانیوں کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔ سرستید کے ایک قدیم دوست خود مراد آباد کے رہنے والے جو اُس وقت وہاں ملازم تھے اُن کا خیال ہے کہ سید احمد خاں کو جو اس قدر عزت اور نیکنامی تمام ہندوستان میں حاصل ہوئی۔ یہ اسی بھلائی اور نیکی کا ثمرہ ہے جو قحط کے انتظام میں اُن سے ظاہر ہوئی۔

محتاج خانہ کے حین انتظام کا یہ حال تھا کہ چودہ ہزار محتاجوں کو گھنٹہ بھر میں کھانا تقسیم ہو جاتا تھا۔ بیماروں کے لیے شفا خانہ اور ڈاکٹر موجود تھا۔ بیماروں کو پریسیری کھانا ملتا تھا۔ نہ چاؤں اور شیر خوار بچوں کو دودھ یا کھیر ملتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے مسلمان اور ہندوؤں کے لیے ہندو کھانا پکاتے تھے جو ہندو اپنے سوا کسی کے ہاتھ کا پکا ہوا نہیں کھاتے تھے اُن کے لیے علیحدہ چوکے بنے ہوئے تھے۔ شہر کی سپردہ نشین اور عزت دار عورتیں جو محتاج خانہ میں نہیں آ سکتی تھیں اُن کے پاس سوت کاتنے کے لیے آٹھ آٹھ آنہ فی اسم اور ایک ایک پاری روٹی کے گالوں کی میسر محلوں کی معرفت بھیج دی جاتی تھی جب سوت کٹ کر آ جاتا تھا اور روٹی اور کاتنے کی اجرت بھیج دیتے تھے۔ سرستید کے مراد آبادی دوست بیان کرتے ہیں کہ اُس زمانے کی عورتیں

جو ان تک جلتی ہیں وہ سید احمد خاں کو اب تک دعا میں دیتی ہیں۔

سرسید صبح شام دونوں وقت بلا ناغہ محتاج خانہ میں خود جاتے تھے، ایک ایک بیمار کو دیکھتے تھے جن کنگلوں کی صورت اور حالت آنکھ سے دیکھی نہ جاسکتی تھی، جن کے دست جاری ہوتے تھے اور کپڑے بول و ہلار میں لتھڑے ہوئے ہوتے تھے، ان کو سرسید خود اپنی گود میں اٹھا کر دوسری صاف جگہ احتیاط سے جا کر ٹاڈیتے تھے۔ ان کے کپڑے بدلواتے تھے ہر منڈواتے تھے، ہاتھ منہ دھلواتے تھے۔ دوا پلاتے تھے اور نہایت شفقت سے ان کے ساتھ پیش آتے تھے۔ راجہ جیکشن داس صاحب سی۔ ایس۔ آئی کی جو آخر کو سرسید کے نہایت گہرے دوست ہو گئے۔ اُس وقت تک ان سے ملاقات نہ تھی، ان کا بیان ہے کہ ”جب سرسید نے رسالہ ”لائل محمد نزو اف انڈیا“ نکالنا شروع

کیا تو اس کے بعض فقروں سے مجھے خیال ہوا کہ سید احمد خاں نہایت متعصب آدمی ہیں اور ہندوؤں سے ان کو کچھ ہمدردی نہیں ہے، اُس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ اسی طرح ایک رسالہ ہندو خیر خواہوں کے تذکرہ میں نکالا جائے۔ انھیں دنوں میں میرا سراو آباد جانا ہوا۔ محتاج خانہ راہ میں پڑتا تھا۔ وہاں سرسید سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ میں نے ان فقروں کا ذکر کیا جن سے ان کے تعصب کا خیال پیدا ہوا تھا۔ انھوں نے معذرت کی اور اپنی قلم کی لغزش کا اقرار کیا خیر

یہ تو ایک اخلاقی جواب تھا، مگر جس شفقت اور ہمدردی سے وہ اُس وقت ہر مذہب اور ہر قوم کے محتاجوں کے ساتھ پیش آرہے۔ تھے اُس کو دیکھ کر میرا دل بالکل صاف ہو گیا اور مجھے حیرت ہو گئی کہ یہ شخص کیسی پاک طبیعت کا آدمی ہے! وہ دن ہے اور آج

کا دن اُن کے ساتھ میری محبت روز بروز بڑھتی گئی اور اب جو کچھ
میرا اور اُن کا معاملہ ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔

محتاج خانہ میں شام کا کھانا سب محتاجوں کو دن چھینے سے پہلے بٹ جاتا تھا
مگر جو بھیلے مانس علانیہ محتاج خانہ میں آئے سے شرماتے تھے اُن کو عام اجازت
تھی کہ رات کو اندھیرے میں آکر کھانا کھا جایا کریں۔ محتاجوں کے کھانے کے لیے
ہر ایک جنس عمدہ اول درجہ کی منگوائی جاتی تھی کھانے کے سوا ان کے لیے ضروری
کچھ بھی تیار کرایا جاتا تھا۔

باوجود ایسے اُچھے انتظام کے جس قدر کم روپیہ ضلع مراد آباد میں خرچ ہوا ایسا کسی ضلع میں
نہیں ہوا۔ سبب یہ تھا کہ جتنے آدمی عدالت اور مرد محتاج خانہ میں کام کے لائق تھے سب کام
لیا جاتا تھا۔ بان اور رستیاں بنتے تھے، سوت کاتتے تھے ہشکروں پر کام کرتے
تھے اور طرح طرح کے کام جو اُن سے ہو سکتے تھے کرتے تھے اور اس طرح اُن
کے کام کی اجرت سے ہر روز ایک رقم کثیر جمع ہو جاتی تھی جو محتاج خانہ میں
صرف ہوتی تھی۔

محتاج خانہ کے علاوہ خود سرستید اپنی ذات سے اور نیز اُن کی نیک بی بی
جو اُن سے بھی زیادہ خدائرس تھیں۔ غریبوں اور محتاجوں کی خبر گیری کرتے
نھے۔ اُن کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن کی اور روٹیاں محتاجوں کو
تقسیم ہوتی تھیں۔

جب اس محتاج خانہ کی رپورٹ اسٹریچی صاحب نے گورنمنٹ میں بھیجی تو
یہ انتظام ایسا پسند آیا کہ اور اصلاح کے حکام کو بھی ایسا ہی انتظام کرنے کی ہدایت
ہوئی۔ اور اسٹریچی صاحب کا نہایت شکریہ ادا تعریف کی گئی مگر اسٹریچی صاحب
نے صاف لکھ بھیجا کہ یہ تمام کارروائی سید احمد خاں سبج سنے کی ہے۔ اگر

شکریہ اور تعریف کا مستحق ہے تو سید احمد خاں ہے۔

سرسید کو جب اسٹریچی صاحب نے قحط کا انتظام سپرد کیا تھا تو سرسید نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں اس شرط پر انتظام کرتا ہوں کہ جتنے لاوارث بچے آئیں ان میں جتنے مسلمان ہوں گے وہ مسلمانوں کو اور جتنے ہندو ہوں گے وہ ہندوؤں کو سپرد کے جائیں گے چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ جتنے لاوارث بچے آئے وہ ہندو مسلمانوں کے سوا کسی مشنری کو نہیں لینے دیتے۔ مگر حسب ہدایت اسٹریچی صاحب کے جو بچہ جس کے سپرد کرتے تھے اُس سے ایک اقرار نامہ لکھوا لیتے تھے۔ کہ ہم اس کو لونڈی یا غلام نہیں بنانے کے، ہو شاید ہونے کے بعد جہاں اس کا جی چاہے رہے اور جہاں چاہے چلا جائے۔

لیکن ہنوز قحط کا انتظام ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ جان اسٹریچی سراو آباد سے بدل گئے اور مسٹر پاہدان کی جگہ آنے مشنریوں نے اسٹریچی صاحب کے سامنے تو دم نہیں مارا مگر ان کے جاننے ہی مسٹر پاہد سے سرسید کی شکایت کی اور یہ چاہا کہ تمام لاوارث بچے جو ہندو مسلمانوں کو دیئے گئے ہیں وہ واپس لیے جائیں اس زمانے میں مسٹر الگزینڈر شکلیئر جو سرسید کے نہایت دوست تھے سراو آباد میں حج تھے انھوں نے سرسید کو ہر چند سمجھایا کہ جتنے لڑکے اور لڑکیاں خاص تمھارے سپرد کی گئی ہیں وہ تم سے نہیں لیجائیں گی مگر اور لوگوں پر اعتماد نہیں ہو سکتا کہ وہ ان کو لونڈی یا غلام نہ بنائیں گے۔ مگر سرسید نے ہرگز نہ مانا اور یہ کہا کہ ”میں نے اسی شرط پر قحط کا انتظام اپنے ذمہ لیا تھا کہ لاوارث بچے مشنریوں کو نہیں دینے جائیں گے اور اسٹریچی صاحب کو رنٹ میں رپورٹ کر چکے ہیں کہ لاوارث بچوں کا اس طرح بندوبست کیا گیا ہے۔ پس اس کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے۔ مجھے جس طرح یہ گوارہ نہیں کہ ایک سید کا بچہ مشنریوں کو دیا

جانے اسی طرح یہ بھی گوارا نہیں کہ ایک چمار کا بچہ اُن کو دیا جائے۔

مسٹر پاور کو جب سرسید کی ناراضی کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اس معاملہ پر غور کرنے کے لیے انگریزوں اور ہندوستان کی ایک کمیٹی مقرر کی چونکہ اُس زمانہ میں ہندوستانی عدسے زیادہ ڈرتے ہوئے اور سہے ہوئے تھے اور انگریزوں کے خلاف کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ سرسید اور ایک دو اور ممبروں کے سوا تمام کمیٹی کا اتفاق ہو گیا کہ جتنے بچے ہندو مسلمانوں کے سپرد کیے گئے ہیں۔ وہ واپس لیے جائیں کیونکہ اُن پر ہرگز اعتماد نہیں کہ وہ اُن کو لونڈی غلام نہ بنائیں گے۔ آخر کلر کمیٹی کی یہ رپورٹ منظور ہو گئی اور تمام لاوارث بچے ہندو مسلمانوں سے واپس لیکر مشنریوں کو دلا دیئے گئے سرسید کے ہاں بھی پانچ چار لڑکے اور لڑکیاں رہتی تھیں۔ اور اُن کی بی بی ان کو کمال شفقت سے رکھتی تھیں جس سبب نے پہلے اس کے کوئی ان سے مانگنے آئے فوراً اُن کو کلکٹر کے پاس بھیج دیا جاتے ہوئے وہ بچے نار و قطار روٹے تھے اور ہرگز جانا نہیں چاہتے تھے مگر مجبور اُن کو بھیجا پڑا۔

سرسید کہتے تھے کہ اُس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ جب کبھی موقع ملے تمام ہندو مسلمانوں سے چندہ کر کے صدر مقام میں ایک بہت بڑا یتیم خانہ قائم کیا جائے جہاں ہندوستان کے لاوارث بچوں کی پرورش ہو اور اُن کو تسلیم دیا جائے۔ لیکن آخر کو یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہوگی ان خرابیوں کا کلی انسداد کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

تصحیح تاریخ فیروز شاہی

مراد آباد ہی میں انھوں نے تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی کی تصحیح کی۔

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کو اس نایاب کتاب کا چھاپنا منظور تھا۔ اس نے سر سید سے تاریخ مذکور کا ایک صحیح نسخہ نقل کے واسطے طلب کیا تھا۔ انھوں نے بہت جستجو سے اس کا ایک نسخہ اسی غرض کے لیے خریدا اور سوسائٹی سے وعدہ کر لیا کہ میں اپنا نسخہ صحیح کر کے بھیجوں گا۔ چنانچہ اس کی تصحیح کے لیے ایک نسخہ کتب خانہ شاہ دہلی، دوسرا وہ نسخہ جو مسٹر الیٹ نے تاریخ ہندوستان لکھتے وقت بہم پہنچایا تھا، تیسرا نسخہ مسٹر ڈورڈ ٹامس سے اور چوتھا بنارس سے بڑی تلاش اور تجسس سے بہم پہنچا کر اپنی کتاب صحیح کی جس سے یہ تاریخ ۱۸۶۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی نے چھاپ کر شائع کی۔

یہ ایک نہایت معتبر اور مستند تاریخ ہے جس کا مصنف ضیاء الدین برن (یعنی بلند شہر) کا سنہی والا مہنت بڑا فاضل اور راست بیانی میں مزب المثل ہے۔ سر سید نے اس کی تصحیح کے وقت اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا تھا جس میں ان تمام تاریخوں کا جو شاہان ہند کے حال میں اس تاریخ سے پہلے اور خاص فیروز شاہ کے حال میں اس کے بعد لکھی گئی ہیں اور نیز ضیاء الدین برنی کا حال درج ہے۔ یہ دیباچہ سائنٹفک سوسائٹی اخبار کی پہلی جلد میں چھپا ہوا موجود ہے۔

تبیین الکلام

۱۸۵۷ء سے پہلے جب کہ دہلی و آگرہ وغیرہ میں مشنریوں کے کاروبار زیادہ پھیلنے لگے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے جا بجا مباحثے ہونے لگے، اس وقت سر سید کو بھی یہ خیال ہوا تھا کہ اسلام کی حمایت میں مشنریوں کے اعتراضات کے جواب لکھے جائیں، چنانچہ غدر سے پہلے بجنور میں انھوں نے کچھ کچھ بطور بادداشت کے لکھا بھی تھا اور اپنے بھتیجے سید احمد خاں کو جو اس وقت صغیر سن

تھے جو کچھ لکھتے تھے بطور سبق کے پڑھاتے جاتے تھے۔

دفعۃً غدر ہو گیا اور وہ تمام یادداشتیں جاتی رہیں۔ غدر کے بعد جب اطمینان ہوا تو اس خیال نے دوسری صورت میں ظہور کیا جس کا ذکر دوسرے حصے میں کیا جائے گا۔ مگر ساتھ ہی یہ ذہن میں آیا کہ اس کام کے لیے اول عیسائی مذہب اور بائبل کی حقیقت اور اس کی تاریخ سے اور جو کچھ بائبل پر موافق یا مخالف لکھا گیا ہے اُس سے واقفیت حاصل کرنی ضرور ہے۔ اُن کو یہ بھی خیال تھا کہ اب تک جس قدر مباحثے یا مناظرے ہندوستان میں پادریوں کے ساتھ ہوئے ہیں وہ بغیر ان تمام باتوں کی واقفیت کے ہوئے ہیں۔ اعجاز عیسوی وغیرہ میں جو شریف لفظی ہونے کا دعویٰ کیا گیا تھا اس سے سرستید کو اختلاف تھا۔ نسخ کے متعلق جو مسلمانوں اور عیسائیوں میں نزاع تھا اُس کو وہ محض نزاع لفظی سمجھتے تھے۔ بہت سی باتیں جو عیسائی لوگ بائبل سے اصول اسلام کے خلاف نکالتے تھے اُن کو سرستید عیسائیوں کی غلط فہمی سے منسوب کرتے تھے۔

لیکن ان تمام باتوں کی تحقیقات اور تصفیہ کے لیے بہت کچھ سامان درکار تھا۔ اتفاق سے انھیں دنوں میں غدر کے زمانہ کی چھڑھی ہوئی تنخواہوں کا اور جو اسباب بجنوری میں لٹ گیا تھا اُس کے معاوضہ کا، بہت سارے روپیہ سرستید کو سرکار سے ملا۔ اول انھوں نے عیسائی مذہب کی تمام ضروری کتابیں، بائبل کی تفسیریں اور یونیٹیرین مذہب کی کتابیں خریدیں، اور تیز لا مذہبوں کی کتابیں جو بائبل کے خلاف لکھی گئی تھیں وہ بھی بہم پہنچائیں۔ ایک انگریزی خواں کو جو ان کتابوں کے ضروری مقالات ترجمہ کر کے سناتا تھا اور کتب احادیث و تفسیر وغیرہ سے سند یہ بہم پہنچانے کے لیے ایک عربی دان عالم کو نوکر رکھا اور بائبل کے متعلق جو عام واقفیت اور اطلاع مذکورہ بالا ذریعوں سے حاصل ہوئی

اُس کو اول دس مقدموں اور دو تہمتوں میں بیان کیا۔ اس کے بعد بائبل کی تفسیر لکھنے اور قرآن و حدیث سے اُس کی تطبیق کرنے کا ارادہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ اصول اسلام اور اصول اہل کتاب میں جہاں تک ممکن ہو مطابقت ثابت کی جائے اور جہاں جہاں اختلاف پایا جائے وہاں اختلاف کی وجہ بیان کی جائے۔ اسلام کی نسبت جو بدگمانیاں عیسائیوں کو ہیں وہ رفع کی جائیں اور مسلمان جو موجودہ بائبل کو مطلقاً استناد کے قابل نہیں سمجھتے اور اُس میں تحریف لفظی کے قائل ہیں اس غلطی کو دور کیا جائے۔ اُن کو بائبل اور اُس کی تفسیروں وغیرہ کے مطالعہ سے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ بائبل کی تفسیر بالکل حدیث اور قرآن کے مطابق ہو سکتی ہے۔

یہ کام نہایت مشکل تھا اور سلف میں کسی نے کبھی ایسا ارادہ نہیں کیا تھا۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ کسی کو پہلے اس زمانے کبھی ضرورت نہیں آئی تھیں اور نہ اگلے زمانے میں آج کل کا سامان اور میٹرل میسر آ سکتا تھا یا اینہم یہ کام دشواریوں سے خالی نہ تھا۔ انھوں نے صرف اس تفسیر کے چھاپنے کو کئی ہزار روپیہ کا پیرس رٹرک سے منگوا یا اور اردو ٹائپ کے علاوہ عبرانی اور انگریزی ٹائپ کے حروف بھی منگوائے۔ ابھی کام شروع ہونے نہیں پایا تھا کہ اُن کی بدلی غازی پور کی گئی۔ وہ تمام سامان اپنے ساتھ غازی پور لے گئے اور وہاں اس کام میں نہایت سرگرمی اور توجہ کے ساتھ مصروف ہوئے۔

غازی پور میں انھوں نے سالم نام ایک یہودی کو نوکر رکھا اور اُس سے عبرانی پڑھنی شروع کی۔ غازی پور کے ضلع میں جو مولوی عنایت رسول صاحب چڑیا کوٹی ایک بہت بڑے عالم عربی اور عبرانی کے ہیں اُن کی اعانت سے سرشید کے ارادے کو اور بھی زیادہ تقویت ہوئی۔ الغرض عہد عتیق میں سے

کتاب پیدائش کے گیارھویں باب تک اور عہد جدید میں سے انجیل منی کے پانچویں باب تک تفسیر اُسی التزام کے ساتھ جس کا انھوں نے ارادہ کیا تھا۔ لکھی گئی اور ساتھ کے ساتھ چھپتی بھی گئی جو کچھ سرسید لکھتے تھے اس کا ترجمہ انگریزی میں ایک یورپین جس کو سورہ وپیہ مامور تھا دیتے تھے، ہر روز دو گھنٹے کرتا تھا۔ وہ ترجمہ بھی اردو کے ساتھ چھپتا تھا۔ ایک کالم میں عبرانی تورات کی عبارت عبری خط میں اور اُس کا ترجمہ اردو اور انگریزی ترجمہ اُس کے نیچے لکھا جاتا تھا دوسرے کالم میں اُسی مضمون کی کوئی آیت قرآنی یا حدیث اور اس کا ترجمہ اردو اور انگریزی اُس کے نیچے لکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد تفسیر لکھی جاتی تھی۔ اس کتاب میں تفسیر شروع کرنے سے پہلے سرسید نے دس مقدمے جن میں سے اکثر بہت طولانی ہیں، بڑی محنت اور تحقیق اور تلاش سے لکھے ہیں جن میں مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے لیے نہایت عمدہ اور قیمتی اطلاعیں مندرج ہیں۔ یہ مقدمے درحقیقت تمہید ہیں اُس مذہبی تنافر کے دور کرنے کی جو دونوں قوموں کے تعصب لاعلمی اور ایک دوسرے کے مذہب سے ناواقفیت کے سبب طرفین کے دلوں میں روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور منزلہ بنیاد کے ہیں ایک ایسی تفسیر کے لیے جو بائبل پر اصول اسلام کے موافق لکھی جائے۔

ان مقدموں میں دکھایا گیا ہے کہ اہل اسلام کے نزدیک بھی انبیاء کا مبعوث ہونا ولیا ہی ضروری ہے جیسا اہل کتاب کے نزدیک ضروری ہے اور اہل اسلام بھی تمام اگلے نبیوں اور ان کی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان لانا ولیا ہی ضروریات دین سے سمجھتے ہیں جیسے اہل کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ جن اگلی کتابوں اور صحیفوں کا ذکر قرآن میں آیا ہے یہی کتابیں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھیں۔ اور آج ان کتابوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کا عقلی معیار مسلمانوں کے نزدیک بھی وہی امر قرار پاسکتا ہے جو عیسائیوں کے ہاں قرار پایا ہے۔ نیز محققین و اکابر اہل اسلام مثل امام اسماعیل بخاری امام فخر الدین رازی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہ کے اقوال سے یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ جس طرح عیسائی کتب مقدسہ میں تحریف لفظی کے قائل نہیں ہیں اسی طرح محققین اہل اسلام بھی اس کے قائل نہیں ہیں اور جس قسم کی تحریف کو عیسائی محققوں نے تسلیم کیا ہے صرف اسی قسم کی تحریف آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے کتب مقدسہ میں پائی جاتی ہے پھر جس قدر کوششیں یہودی اور عیسائی عالموں اور بزرگوں نے عہد عتیق اور عہد جدید کی حفاظت، تنقید اور تصحیح میں ابتدا سے آج تک کی ہیں ان کی تمام سہٹری اور جوشائخ ان کوششوں پر مرتب ہوئے وہ مفصل بیان کیے ہیں۔ پھر ترجموں کا حال اور یہ کہ اختلاف تراجم سے اصل بائبل کا محرف ہونا لازم نہیں آتا نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔ پھر نسخہ کی بابت جو نزاع مسلمانوں اور عیسائیوں میں تھا اس کو محض نزاع لفظی پر محمول کیا ہے اور اس طرح اس بون بعید کو جو علمائے فریقین کے تعصب یا لاعلمی و ناواقفیت سے اسلام اور اصلی عیسائیت کے اصول میں پایا جاتا تھا اس کو بہت کچھ رفع کیا ہے۔ اس کے بعد ایک دیباچہ عہد عتیق پر اور دوسرا کتاب پیدائش پر لکھا ہے پھر تفسیر شروع کی ہے۔

یہ تفسیر اس لحاظ سے کہ اس میں تحریف لفظی کا انکار کیا گیا تھا اور نیز اس لیے کہ سرسید سے پہلے کسی مسلمان نے اس کے کھنڈے پر توجہ نہیں کی، موجودہ علمائے اسلام کے خلاف تھی اور اس وجہ سے کہ وہ اسلام اور خالص عیسائیت میں اتحاد ثابت کرتی تھی اور موجودہ عیسائیت کو جس

کی بنیاد تثلیث، کفارہ اور تکذیب خاتم النبیین پر ہے غلط تعبیراتی ہے۔ عیسائیوں کے برخلاف تھی، نیز اس کے لکھنے، ترتیب دینے اور چھپوانے میں بکانتہ محنت اور مدد پیر صرف ہوتا تھا اور کتاب کے لکھنے کی بالکل امید نہ تھی۔ ان وجوہات سے وہ آگے نہ چل سکی۔ اگرچہ اس بات کا افسوس ہے کہ یہ تفسیر پوری نہ ہو سکی اور سرسید کا ایک نہایت مفید اور ضروری کام اذھورا رہ گیا مگر جو مقاصد اس تفسیر کے ذریعے سے بیان کرنے منظور تھے ان میں سے بعض اہم اور ضروری مقصد خطبات احمدیہ میں کمال شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو گئے ہیں، جیسے انبیائے سابقین کی پیشین گوئیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یا مسئلہ فزواج یا مسئلہ طلاق وغیرہ۔

عیسائیوں کے ساتھ زبانی یا تحریری مباحثہ کرنے کا مختصمانہ طریقہ جو مسلمانوں میں غدر سے پہلے جاری تھا، اُس کا نتیجہ اگرچہ ایک لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں بہت اچھا ہوا کہ مسلمان اور قوموں کی طرح مشنریوں کے زیادہ شکار نہیں ہوئے۔ مگر عیسائیوں کے دل میں اسلام کی طرف سے کوئی عمدہ خیال پیدا نہ ہوا۔ وہ اسلام کو بدستور ظلم، خونریزی، تعصب اور دیگر برائیوں کا سرچشمہ سمجھتے رہے اور مسلمانوں کو عیسائیوں کا دشمن اور عیسائی قوم کی حکومت کا بدخواہ خیال کرتے رہے۔ پس جس طرح مسلمانوں کو مشن کی زد سے بچانے کے لیے مناظرہ کا طریقہ جاری رکھنا ضروری تھا اسی طرح یہ بھی ضروری تھا کہ مناظرہ کے مختصمانہ طریقہ کو چھوڑ کر راستی اور مصالحت کا طریقہ اختیار کیا جائے اور عیسائیوں کو دکھایا جائے کہ دنیا میں اگر کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے اور پس ظاہر ہے کہ اس مطلب کے حاصل ہونے کے لیے کوئی طریقہ اس سے بہتر نہ تھا کہ

توہیت اور انجیل کی تفسیر ایک مسلمان کے ہاتھ سے لکھی جائے اور جو امور
فی الواقع دونوں مذہبوں میں مابہ الاجتماع یا مابہ الافراق ہیں ان کو اپنی اپنی جگہ
صاف طور پر بیان کیا جائے اور اس طرح اس بیگانگی اور وحشت کو جو دونوں
قوموں کی غلط فہمی سے پیدا ہو گئی ہے رفع کیا جائے۔ سید احمد خاں پہلے
شخص ہیں جن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا مگر چونکہ اس کا پورا کرنا بغیر قوم کی
تائید کے ان کی طاقت اور بولتے سے باہر تھا۔ اس لیے وہ اپنے منصوبے
کو پورا نہ کر سکے۔ مگر جو نمونہ ان کے زبردست ہاتھوں سے تیار ہو گیا ہے اس
کے موافق اس تفسیر کا پورا کرنا اب ویسا مشکل نہیں رہا جیسا ابتدا میں نظر آتا تھا
جان میولسن آرنلڈ نے اپنی کتاب قرآن اینڈ بائبل مطبوعہ ۱۸۹۷ء میں
سربید کی ایک چھٹی چھاپی ہے جو انھوں نے اپنی تفسیر کی پہلی جلد کے متعلق
مصنف موصوف کی مچھی کے جواب میں ان کے پاس بھیجی تھی۔ چونکہ اس چھٹی
سے تفسیر مذکور کے لکھنے کا اصل منشا اور اس کی نسبت مسلمانوں اور عیسائیوں
کے خیالات جو اس وقت تھے اور خود سربید کا اپنے ارادہ پر ثابت قدم رہنا
اور لوگوں کی مخالفت کا کچھ خیال نہ کرنا، بخوبی واضح ہوتا ہے اس لیے یہاں
اس کا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

وہ جان میولسن آرنلڈ کو لکھتے ہیں کہ ”بے شک آپ کا خیال صحیح ہے کہ
کسی مسلمان نے آج تک بائبل مقدس کی تفسیر نہیں لکھی۔ خواہ کچھ ہی وجوہ
ہوں جن کی وجہ سے ہمارے آبا و اجداد نے اس کام کو نہیں اٹھایا مگر جو اس کے
موجودہ زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کو اس کام سے مانع رہا ہے اور بہت
کچھ مانع رہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ ایک بیکار
اور لغو اور جھوٹ قصوں کا مجموعہ سمجھتے اور یقین کرتے رہے ہیں اور ان کے

اس مضر یقین کو اکثر اوقات بعض پادریوں کی ناعاقبت اندیشی اور بے سمجھی کے
دلائل سے بہت قوت اور مدد ملی ہے ان دلائل سے بجز اس کے کہ جانہیں ہیں
ناپسندیدہ جھگڑا اور تعصب اور مخالفت اور دشمنی پیدا ہو اور دونوں کے دل
بڑے ہوں اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا ۔

و جب کہ فریقین کی یہ حالت ہو تو آپ آسانی خیال کر سکتے ہیں اور نتیجہ نکال
سکتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان ایسی تصنیف کرے جس کا مقصد انجیل مقدس کی تفسیر
لکھنا، اُس کی تائید کرنا اور اس کو آسانی کو آسان ماننا ہو تو اس کی حالت اور منزلت
اُس کے ہم مذہب لوگوں میں کیا ہوگی ؛ بلاشبہ اُس سے سب لوگ متنفر ہوں گے
اور اُس کو برا کہیں گے یہی حالت میری ہوئی۔ اس کام کے شروع میں میرے
ساتھ بھی یہی بڑتاؤ ہوا۔ مگر میں نے اُن کی بے جا تضحیک، بے بنیاد دھمکیوں
اور اسی قسم کی زیادتیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اور اُس بات کے کہنے
میں جس کو میں حق سمجھتا تھا، کسی چیز سے اندیشہ نہیں کیا جو انعام کہ مجھ کو عیسائیوں
سے میرے کام کے آغاز میں ملا وہ بھی اس سے کم نہ تھا جو میرے ہم مذہبوں نے
مجھ کو دیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میری تفسیر کا اول حصہ چھپنے کے بعد مسلمانوں
کو معلوم ہو گیا کہ جو کچھ میں انجیل کی تائید میں لکھتا تھا وہ خود قرآن پاک اور دیگر
مستند کتابوں کی بنا پر تھا۔ بہت سے میری تعریف کرنے لگے اور انجیل مقدس
پر اعتقاد رکھنے اور اُس کا ادب کرنے میں میرے ہم خیال ہو گئے۔ اور بہت سے
توسعات اور خیالات فاسدہ جو ان کو انجیل کی بابت مدتوں سے تھے کم ہو گئے
جیسا کہ آپ کو ذیل کے فقرات سے معلوم ہو گا جن کو میں ایک بڑے مولوی نے

کے خط سے جو میرے نام تھا، نقل کرتا ہوں" میں نے آپ کی تفسیر کو بڑھاؤ میں بر ملا اقرار کرتا ہوں کہ بلا شک وہ بے مثل کتاب ہے اور مذہب اسلام کی تائید اور حمایت کرتی ہے۔ خدا کا شکر ہے اور بے حد شکر ہے کہ اس زمانے میں آپ ایک ایسے شخص میں جو راہِ راست کی رہنمائی کرتے ہیں آپ کی تصنیف ہر سہ تشبہ کو ٹپھتی جاتی ہے اور اس کے قابل تعریف فقروں کو ٹپھنے سے خدا کا شکر اور آپ کے واسطے دعا دل سے نکلتی ہے۔

"بائبل مقدس میں بعض مقامات ایسے ہیں جن کی وجہ سے مسلمان اس سے بہت بد اعتقاد ہو گئے ہیں۔ مثلاً ابراہیم علیہ السلام کی طرف مصر میں جھوٹ بولنے کی نسبت کرنا، عیسائی مفسروں نے ان مقامات کی پوری تفسیر نہیں لکھی لیکن میں برخلاف ان کے کہتا ہوں کہ خود بائبل سے ان فقروں کے یہ معنی نہیں نکلتے جو عموماً مانے جاتے ہیں اس بنا پر مجھ کو امید ہے کہ سیری تفسیر کا دوسرا حصہ پچھنے کے بعد مسلمانوں کا تعصب بائبل کے ساتھ بہت کم ہو جائے گا۔"

"با اینہم مجھ کو یقین ہے کہ میری زندگی میں تمام مسلمانوں کی گلابیوں اور نفرت سے مجھے نجات ملے گی۔ عیسائی بھی میری تفسیر سے خوش نہیں ہو سکتے کیونکہ جس طرح میں انجیل کی تعلیم کو صحیح اور درست سمجھتا ہوں اسی طرح تثلیث کے مسئلہ کا قائل نہیں ہوں اس لیے کہ میں انجیل میں اس مسئلہ کی تائید یا وجود نہیں پاتا ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ مذہب اسلام صحیح ہے اور اس کی صحت اور وجود دونوں انجیل سے ثابت ہیں۔ اس لیے مجھے کچھ پروا نہیں کہ میں کسی گروہ کے لوگوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی خوش کروں۔ میں حق پر ہوں

۱۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو کام سرسید نے تفسیر کھنہ کے بعد عام مسلمانوں کے خیالات کے برخلاف کیے۔ وہ سب نے پہلے ہی سے ان کے غمون خاطر تھے۔ ۱۲۔

اور اُس خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں جس کے روبرو سب کو ایک دن جاننا ہے۔ البتہ میری یہ خواہش یہی ہے کہ مسلمان اور عیسائیوں میں محبت پیدا ہو کیونکہ قرآن مجید کے موافق اگر کوئی فرقہ ہمارا دوست ہو سکتا ہے تو وہ عیسائی ہیں۔ میری یہ خواہش اُن چند سالوں کے پڑھنے سے آپ پر بخوبی ظاہر ہو جائے گی جو میں نے اس باب میں لکھے ہیں اور جن کو اب آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ میں نے آپ کے نام اپنی تفسیر کا پہلا حصہ بھی روانہ کیا ہے جس کا قبول کرنا میری عزت افزائی کا باعث ہو گا۔ دوسرا حصہ جب تیار ہو جائے گا آپ کی خدمت میں ارسال ہو گا۔

”یقیناً میں بھی بائبل کا اتنا ہی طرقدار اور متوہد ہوں جس قدر کہ آپ ہیں۔ میرا قصہ ہے کہ میں ڈاکٹر کلنز کے اعترافات کا اپنی تفسیر کے مناسب حصوں میں سب اُن کا موقع آئے جواب دوں۔“

جان میولسن آرنلڈ سرسید کی یہ چٹھی اپنی کتاب میں نقل کر کے اُس پر یہ ریمارک کرتے ہیں کہ ”اگر یہ خیالات عام ہو جائیں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیلے جاتے ہیں تو اُن کی وجہ سے وہ نہ صرف وفادار ہو جائیں گے بلکہ رفتہ رفتہ وہ دشمنی جو اسلام کے پھیلنے سے قوموں میں ہو گئی ہے، دور ہو جائے گی یہ تفسیر جو انجیل کو بجائے لغو سمجھنے کے، جیسا کہ اب تک خیال تھا واجب التعلیم بیان کرتی ہے۔ اور اُس کا ثبوت خود قرآن سے دیتی ہے۔ اس قابل ہے کہ اس کا ترجمہ مسلمانوں کی ہر زبان میں اور بالخصوص عربی میں ہو کیونکہ مسلمانوں کے واسطے اس سے زیادہ مفید اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ انجیل کو اُسی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں جس نگاہ سے کہ وہ قرآن پاک کو دیکھتے ہیں۔“

اس کے بعد جان میلسن آرٹلڈ نے ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جس پر بے اختیار مہنسی آتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اگر یہ کام مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے ہو جائے تو پھر عیسائیوں کو یہ ثابت کرنا کچھ دشوار نہ ہوگا کہ اگر انجیل صحیح ہے تو (نعوذ باللہ) قرآن ضرور جھوٹ ہے۔" معلوم نہیں کہ یہ نتیجہ انھوں نے کہا سے نکالا؛ اگر وہ ذرا غور اور اسان نظر کو کام فرماتے تو یہ نتیجہ ہرگز نہ نکالتے بلکہ یہ کہتے کہ اگر انجیل اور قرآن میں مطابقت ثابت ہوگئی تو مسلمانوں کو یہ ثابت کرنا دشوار نہ ہوگا کہ اگر انجیل صحیح ہے تو موجودہ عیسائی مذہب بالکل غلط اور انجیل کے برخلاف ہے۔ سولہ برس کا عرصہ ہوا کہ مصر میں ایک عیسائی عالم نے جس کا نام کرسٹوفر جیبارہ ہے اور جدوہاں کے مشہور عیسائی اخبار شہادۃ الحق کا ایڈیٹر ہے، مذاہب ثلاثہ یعنی یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی آسمانی کتابوں پر غور کر کے یہ رائے قرار دی تھی کہ فی الحقیقت تینوں مذہبوں اور تینوں کتابوں کی توفیق اور تطبیق ہو سکتی ہے اور ان میں کوئی اصلی اور حقیقی اختلاف نہیں ہے چنانچہ اس نے اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام وحدۃ

الادیان و وحدۃ الایمان فی التورۃ والانجیل والقرآن ہے۔ اس کتاب میں اس نے تینوں فرقوں کے مذہبی عقائد میں توفیق و تطبیق کی ہے اور اس کی رائے ہے کہ عموماً اختلاف غلط فہمی سے ہوا ہے۔ اس نے اس کتاب میں بھی لکھا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ بائبل میں کہیں نہیں ہے، اس لیے عیسائیوں کی برٹ و ہرمی ہے کہ مسلمانوں کے عمدہ عقیدہ توحید کو نہ مانیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن اور بائبل کی مطابقت کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ عیسائی مذہب کا جس کی بنیاد تثلیث پر ہے بالکل خاتمہ ہو جائے۔

آج کل ایک اور اخبار موسوم بہ اتحاد اسلام موسیو کلافل ایک فرینچ

بیرسٹرنے مصر میں جاری کیا ہے جس کا ایک کالم عربی میں اور دوسرا اسی مضمون کا
فرینچ میں ہوتا ہے اور جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ عیسائیوں اور مسلمانوں میں جو
مذہبی اور پولیٹیکل غلط فہمیاں مدت سے چلی آتی ہیں اور جنہوں نے ان کے سوشل
اور پولیٹیکل تعلقات میں تلخی پیدا کر دی ہے ان کو رفع کیا جانے اور اسی پیمائش
نے اخبار مذکور ایسی دوزبانوں میں شائع کیا ہے جو تقریباً دنیا کے تمام حصوں میں
کم و بیش بولی یا سمجھی جاتی ہیں۔ پس جو ضرورت کہ اس فرانسیسی عالم کو اب محسوس
ہوئی ہے اس کو سرسید نے اب سے ۳۵ برس پہلے بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا۔ اور
یہ بات ایک ہندوستانی مسلمان نے جس نے ایک قدیم اسلامی دارالافتاء
کی سوسائٹی میں نشوونما اور پیرانے اسکول میں تعلیم پائی ہو، کچھ کم تعجب انگیز نہیں۔
فرانس کا مشہور اور نیشنلسٹ گارساں دناسی جس نے اردو لٹریچر کی تحقیقات
میں عمر صرف کی تھی، وہ ۱۸۸۳ء کے لکچر میں سرسید کی اس تفسیر کی نسبت لکھتا
ہے۔ "ایک نئی کتاب جس کی طرف میں توجہ دلاتا ہوں وہ سید احمد خاں کی
تصنیف ہے جو زمانہ حال کے ہندوستانی مصنفوں میں سب سے زیادہ
مشہور مصنف ہے۔ یہی وہ مصنف ہے جس کی کتاب آثار الصنادید کا میں نے
پیرس کے ایشیاٹک جرنل میں ترجمہ کیا تھا۔ میں نے اس کتاب (یعنی تہذیب الکلام)
کے عنقریب چھپنے کے پہلے خبر دی تھی اور اب میں خوشی سے اطلاع دیتا
ہوں کہ اس کا پہلا حصہ چھپ گیا ہے جس کا ایک کاپی میرے پاس موجود ہے
جو مصنف نے مہربانی کر کے مجھے ہدیہ بھیجی ہے۔ اس کتاب سے صرف
یہی نہیں پایا جاتا کہ سید احمد خاں کو قرآن شریف اور سہاری کتب مقدمہ کا
پورا پورا علم ہے بلکہ بہت سی ایشیائی تصنیفات اور طرقہ تدریس کہ بہت سی
یورڈ چین تہذیب سے ان کو پوری پوری واقفیت ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔

کہ ان سب کو انھوں نے غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کیا ہے مگر تعجب کی بات ہے کہ اس قدر یورپ کی تصانیف تک ان کو کس طرح رسائی حاصل ہوئی حقیقت میں یہ کتاب وسیع علم کا نتیجہ ہے اور میں اپنے تئیں مبارکباد دیتا ہوں کہ یہ کتاب اس زبان میں لکھی گئی ہے جس کا سکھانا میرا فرض ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ پہلا ہی موقع ہے کہ کسی مسلمان نے نہ صرف اردو میں بلکہ ایشیا کی کسی زبان میں اس موضوع پر ایسی مبسوط اور مکمل بحث کی ہو۔

بی بی کا انتقال

۱۳۷۸ھ ہجری مطابق ۱۸۶۱ء میں سرسید کی بی بی کا انتقال ہوا آباد ہی میں ہو گیا جنھوں نے سید عابد اور سید محمود دو بیٹے اور ایک بیٹی صغیر سن چھوٹی تھی۔ اس وقت سرسید کی عمر چوبیس برس کی تھی اور قوائے جسمانی نہایت عمدہ تھے۔ ان کے دوست نہایت اصرار کرتے تھے کہ دوسری شادی کہ لواؤز زینر تقاضائے سن بھی یہی تھا مگر جو تعلق کہ ان کو بی بی کے ساتھ ان کی زندگی میں تھا اس کے نباہ کا خیال اور صغیر سن اولاد کی پرورش کا خیال اور سب سے زیادہ وہ بڑے بڑے ارادے جن کی دھن اس زمانے میں ان کو لگی ہوئی تھی اس امر سے مانع رہے اور اپنی تمام باقی زندگی محض تہجد میں کمالِ محنت و پار سائی کے ساتھ گزار دی اور اپنے تمام قوائے اور اپنی عمر کا افضل ترین حصہ قومی خدمات کے لیے وقف کر دیا۔

غانہ پور کی بدلی اور اول و ہاں سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنا

۱۲ مئی ۱۸۶۳ء کو سرسید کی تبدیلی مراد آباد سے غانہ پور کو ہو گئی ہم اوپر لکھ رہے ہیں پیرس کی یونیورسٹی میں اردو لٹریچر کا پروفیسر تھا اور ہمیشہ اس سبکدشت پر کھڑا کرتا تھا۔

آئے ہیں کہ انتظام قحط کے بعد ان کو ایک بہت بڑا یتیم خانہ کھولنے کا خیال ہوا تھا اور قحط سے پہلے وہ متعدد تدبیریں ملک اور قوم کی بھلائی کی کر چکے تھے مگر بہت جلد یہ سب خیالات ان کے دل سے محو ہو گئے، ان کو سخت یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں عام طور پر علم کی روشنی نہ پھیلے گی اس وقت تک ہندوستانیوں کی بھلائی کی تمام تدبیریں بیکار اور فضول ہیں، باوجودیکہ وہ غانہ پیورہ میں سرکاری کاموں کے علاوہ بہت سا وقت تبیین الکلام کی ترتیب اور اس کے چھپوانے کے اہتمام میں جو نہایت سخت کام تھا صرف کرتے تھے۔ اسی حالت میں انھوں نے ایک اور تدبیر اپنے ہموطنوں کی بھلائی کی سوچی، انھوں نے خیال کیا کہ ملک میں علوم جدیدہ کی عام اشاعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ علمی کتابیں ویسی زبان میں ترجمہ نہ کی جائیں انھوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا، کیونکہ مسلمان انگریزی پڑھنے کو گناہ سمجھتے تھے اور مسلمانوں کے سوا اور قوموں کے لیے بھی کوئی ایسی ترغیب نہ تھی جس سے وہ انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوں۔ تمام عدالتوں میں ویسی زبان مروج تھی، اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں کے لیے جو اس وقت تک ہندوستانیوں کو مل سکتے تھے مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی جن اعلیٰ عہدوں کے لیے انگریزی تعلیم کی ضرورت تھی اگرچہ ملک معظمہ کے اشتہار میں ان کے ملنے کی ہندوستانیوں کو امید دلائی گئی تھی مگر ابھی تک عملی طور پر ان وعدوں کا چرندال ظہور نہ ہوا تھا۔

سر سید کو یہ خیال ہوا کہ مسلمان جو انگریزی تعلیم سے نفرت اور دشت

کرتے ہیں اور ہندو جو انگریزی تعلیم کو محض لوکری کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ دونوں کے دل میں انگریزی تعلیم کا نقش جما نے کے لیے ضروری ہے کہ کچھ علمی اور تائیدی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرانی جائیں تاکہ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی وقعت اُن کے دل میں پیدا ہو۔ اس کے علاوہ اُن کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں میل جول اور رابطہ و اتحاد پیدا ہو جس کا نہ ہونا انگریزوں اور ہندوستانیوں کے حق میں نہایت مضر ثابت ہو چکا تھا اور یہ تمام مقصد بغیر اس کے کہ ایک علمی سوسائٹی قائم کی جائے جس کے ممبر انگریز اور ہندوستانی ہوں اور جو سائنس اور انگلش لٹریچر کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرا سکے، کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔

۱۸۹۳ء میں انھوں نے ایک تحریر اس عنوان سے کہ "اتحاد سنجہ مست ساکنان ہندوستان و باب ترقی تعلیم اہل ہند" چھاپ کر مشہر کی جس کا خلاصہ مضمون یہ تھا کہ ہندوستان میں علم کے پھیلا نے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو اپنے قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مضید کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے چھاپے۔ اس کے بعد وہ عملی طور پر لوگوں کو ادھر مائل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ غرض کہ اسی سبب میں سائنٹفک سوسائٹی غازیپور میں قائم ہو گئی، تمام قواعد منضبط کیے گئے۔ ڈیوک آف آرگائل جہاں اس وقت وزیر ہند تھے انھوں نے سوسائٹی کا پیشین ہونا منظور کیا اور ڈیرینڈ صاحب لفٹنٹ گورنر شمال مغرب اور مکلوڈ صاحب لفٹنٹ گورنر پنجاب وایس پیشین قرار پاسے، اور دوسرا دراز صولوں کے بہت سے رئیس اور ذمی عزت ہند و اور مسلمانوں نے اُس کی ممبری قبول کی اور غازیپور میں ترجمہ کا کام باقاعدہ طور پر شروع ہو گیا۔

سرسید نے جو اس سوسائٹی کے آمریری سکرٹری قرار پائے تھے اور حقیقت
وہی اس کا ہیولی اور وہی اُس کی صورت تھے، سوسائٹی کے اعراض اور مقاصد مشہر
کرنے اور اس کے ساتھ پبلک کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کلکتہ کا سفر اختیار
کیا اور ۶ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو مجلس مذاکرۃ علیہ میں ایک لمبا لکچر فارسی زبان میں سوسائٹی
کے مقاصد پر دیا جو ان کی اردو اسپچوں اور لکچروں کے ساتھ چھپ گیا ہے اور
کلکتہ سے آتے جاتے جس شہر میں ان کا گزر ہوا وہاں سوسائٹی کا چہرہ چا گیا۔

غازی پور میں مدرسہ قائم کرنا

اسی سنہ میں انھوں نے غازی پور میں ایک مدرسہ قائم کرنے کی فکر کی، اگرچہ
ضلع غازی پور کے اکثر ہندو مسلمان رئیسوں کی خود یہ خواہش تھی کہ غازی پور
میں ایک مدرسہ قائم ہو، لیکن اول تو کوئی شخص ایسا نہ تھا کہ مدرسہ کے انتظام
اور حفاظت زچہ بندہ کی طرف سے لوگوں کو مطمئن کرے دوسرے مسلمانوں
عموماً انگریزی کے نام سے بد کہتے تھے سرسید نے ان دونوں مشکوں کو حل کیا
اور تھوڑا تھوڑا چندہ جمع ہونے لگا۔ اس مدرسہ کی عمارت اور اس کے قیام
کے لیے اسی خزانہ کا تخمینہ ہوا تھا جب چندہ کی مقدار سترہ ہزار تک پہنچ گئی تو
اول مدرسہ کے لیے ایک مکان بننا تجویز ہوا اور ۱۸۶۳ء میں ایک عام مجمع میں
جس میں ہندوستانی اور تمام ضلع کے حکام شریک تھے، اس کی بنیاد کا پتھر رکھا
گیا اور تعمیر شروع ہو گئی۔

اس موقع پر سرسید نے ایک لمبی اسپچ دی تھی جو ان کی اسپچوں اور
لکچروں کے ساتھ چھپ گئی ہے یہاں ہم صرف وہ جملے جو بنیاد کا پتھر رکھے
جانے کے بعد ان کی زبان سے نکلے تھے نقل کرتے ہیں۔ "اے خدا کے

بند و خدا کی مناجات کرو۔ خدا کے نام کی مدح کرو۔ خدا کا نام اس دم سے لبتک مبارک ہوئے۔ آفتاب کے مطلع سے لے کر اس کے مغرب تک خدا کا نام ممدوح ہو۔ ہمارا خدا غریبوں کو خاک سے اٹھاتا ہے۔ محتاجوں کو کوڑے پر سے اٹھا کر بلند کرتا ہے۔ ہم کو اپنے خدا سے محبت رکھنی چاہیئے۔ اس نے ہماری آواز سنی۔ اُس نے ہماری غریبی اور درماندگی پر نظر کی سو جب تک ہم جیتے ہیں ہمارا بدن اور ہماری جان اور ہمارا دل اور مرنے کے بعد ہماری روح خدا کی ستائش کرے گی۔

”اے خدا ہم میں روز بروز علم کی کمی اور جہالت کی تاریکی کی ترقی ہوتی جاتی تھی۔ تو نے ہمارے دلوں کو پھیرا کہ ہم علم کی روشنی پھیلانے پر مستعد ہوئے بے شک سب کے دل تیری انگلیوں میں ہیں جس طرف تو چاہتا ہے پھیرتا ہے ہم سب تیرا شکر کرتے ہیں کہ تو نے ہمارے دلوں کو ایسے کاموں کی طرف پھیرا جو صرف ہمارے ہی لیے مفید نہیں بلکہ ہمارے بعد جو بہت سی نسلیں آنے والی ہیں اُن کے لیے ایک روشنی ہے۔ تیرے سوا کسی کا مقدر نہ تھا کہ ہمارے دلوں کو جو تمام تر گنہوں اور بُرائیوں میں پھنسے ہوئے ہیں ایسے نیک کام کی طرف پھیرتا اے خدا تو خوب جانتا ہے کہ یہ مدرسہ جس کا پتھر آج ہم نے تیرے نام پر رکھا ہے۔ تیری غریب مخلوق کے فائدے کے لیے رکھا ہے۔ تو اپنے فضل سے اپنے نام پر اس کو قبول کر اور جیسا کہ تو نے خوبی سے اس کا آغاز کیا ہے اسی طرح بخیر اس کا انجام کر۔ و بنا تقبل منا انک انت السميع العلیو۔

یہ مدرسہ بھی مثل مدرسۃ العلوم کے محض قومی چندہ سے سیلف ہیلتھ کے اصول پر قائم کیا گیا تھا اور اُس کی ابتدا ڈاکٹر وائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ایک بڑا کالج بنانے کا ارادہ تھا۔ راجہ ہر دیو نرائن سنگھ اُس کے میٹرن

اور وزیر قرار دیئے گئے تھے۔ متعدد کمیٹیاں اُس کے انتظام کے لیے قرار پائی تھیں۔ انگریزی، اردو، فارسی، عربی اور سنسکرت پانچ زبانوں کی تعلیم کا اس میں انتظام کیا گیا تھا۔ اگر سرسید کا چند سال وہاں اور قیام ہوتا تو کچھ عجیب نہیں کہ وہ کالج کے درجہ تک پہنچ جاتا۔ مگر اسی سال یعنی ۱۸۶۲ء ہی میں اُن کی تبدیلی علیگڑھ کی ہو گئی یا اینہد اُس کی بنیاد ایسے مستحکم اصول پر رکھی گئی تھی کہ وہ مدرسہ آج تک وکٹوریہ اسکول کے نام سے غازی پور میں جاری ہے اور ہائی اسکول تک کی پڑھائی اُسی میں برابر ہوتی ہے۔

غازی پور سے علیگڑھ تبدیل ہونا

۱۸۶۴ء میں سرسید غازی پور سے تبدیل ہو کر علیگڑھ میں جس کی عزت اور شہرت خدا تعالیٰ نے ان کی وفات سے وابستہ کی تھی، آگئے۔ چونکہ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کا ان کی غیبت میں چلنا ناممکن تھا۔ اس لیے سوسائٹی کا تمام سامان اور اثاثات وہ اپنے ساتھ علیگڑھ میں لے آئے اور مسٹر ولیم جنکس بریلی جو اُس زمانہ میں علیگڑھ کے جج تھے سوسائٹی کے پریسڈنٹ قرار پائے۔ اُن کی توجہ سے سوسائٹی کے کاروبار کو نہایت ترقی ہوئی، ہندوستانی اور یورپین ممبروں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور سوسائٹی کے لیے ایک مستقل مکان بننے کی تجویز ہوئی جو اس وقت تک ایک عالیشان عمارت و لکشاچن اور وسیع احاطہ کی صورت میں موجود ہے اور تقریباً تین ہزار کی لاگت سے خاص سرسید کے اہتمام اور نگرانی میں تیار ہوا ہے۔ اس کی بنیاد کا پتھر آرمیبل ڈائمنڈ لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب کے ہاتھ سے رکھوایا گیا تھا چنانچہ دو کہتے ہزار آرمیبل مسٹر بریلی جج علیگڑھ کے نام کے اُس کے سب سے بڑے

ہال میں اب تک لگے ہوئے ہیں۔

۱۲ فروری ۱۸۶۶ء کو مسٹر ولیمس کسٹنر قیمت میرٹھ کے ہاتھ سے اُس کے افتتاح کی رسم ادا ہوئی۔ صاحب فمدوح نے افتتاح کے وقت جو تقریر کی تھی اُس کے چند جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں انھوں نے کہا کہ "سید احمد خاں کے اس کام کی عظمت میں مبالغہ کرنا فضول ہے۔ تم سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ یہ انھیں کا کام ہے اور وہی اس جلسہ کے بڑی ترقی دینے والے ہیں اور اس عمدہ عمارت کے جس کے کھولنے کے لیے ہم سب جمع ہوئے ہیں وہی بانی ہیں..... اخیر کلام میرا یہ ہے کہ سید احمد خاں نے جو محبت لوگوں کے ساتھ ظاہر کی ہے سب کے دلوں پر اُس کا اثر ضرور ہوگا۔ خدا کرے کہ یہ انسٹیٹیوٹ اس بات کا سبب ہو کہ ہم سب ہندوستانی اور انگریز ایسے بھلے کاموں میں دل سے شریک ہوا کریں اور یہی سید احمد خاں کی بڑی خواہش ہے۔ پس آؤ ہم سب اُن کی مدد کریں اور اُن کا شکر بھی ادا کریں اے خدا! اس انسٹیٹیوٹ کو سرسبز کر۔" اس مکان میں ہر مہینے متعدد جلسے ہوتے تھے اور مختلف مضامین پر جن سے لوگوں کو نئی نئی اطلاعات حاصل ہوتی تھیں، پکچر دیے جاتے تھے، ڈاکٹر کلکلی ہر مہینے ایک لکچر نیچرل سائنس پر دیتے تھے اور علمی آلات سے جو کہ سوسائٹی میں موجود تھے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے، مترجم، سرکاری، پریسین چپراسی اور مالی وغیرہ تقریباً پانسو روپیہ ماہوار کے تنخواہ دار سوسائٹی میں ملازم تھے۔ چند برس کے عرصہ میں بہت مفید کتابیں سوسائٹی نے انگریزی سے ترجمہ کر کے چھاپیں مثلاً الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان، رولن کی تاریخ مصر قدیم، تاریخ

۱۔ عمدہ ترجمہ ۲۲۵ روپیہ ماہوار اور عمدہ مطبع ۲۲۵ روپیہ ماہوار پاتا تھا اور رستی و انتظام مکان سوسائٹی

کیلے ۱۰ روپیہ ماہوار مقرر تھا۔ سوسائٹی اخبار مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۸۶۶ء جلد ۱۲

یونان قدیم، اسکاٹ برن کا رسالہ علم قلاحت، بلیئر کا رسالہ سیاست مدن، ہرجان میلکم کی تاریخ ایران، ریورنڈ اکیسوس کی تاریخ چین کا فارسی ترجمہ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے سوا اخبار بھی مدت تک بہت کثرت سے اس سوسائٹی میں آتے رہے چنانچہ ۱۸۶۶ء میں ۱۸ اخبار اور میگزین، انگریزی اور ۲۶ اخبار اردو، فارسی، عربی، اور سنسکرت کے ہندوستان اور ملک غیر سے میاں آتے تھے۔

سر سید نے قطع نظر اپنی ذاتی کوشش اور محنت کے جس پر فی الحقیقہ سوسائٹی کا دار و مدار تھا اور علاوہ ڈونیشن اور سالانہ چندہ کے اور طرح طرح سے سوسائٹی کو فائدہ پہنچایا۔ اپنا ذاتی پرس جو انھوں نے آٹھ ہزار روپیہ خرچ کر کے تبیین الکلام کے چھاپنے کو خرید لیا تھا اور سوسائٹی کی تمام روٹیاں اور تمام انگریزی اور اردو کاغذات اب اسے اسی پرس میں چھپتے تھے، جب تبیین الکلام کی چھپائی موقوف ہو گئی تو کل سامان پرس کا ایک عام جلسہ میں سوسائٹی کو مفت دیدیا۔ چنانچہ جارج ہنری لارنس نے جو اس جلسہ میں چئیرمین تھے سر سید کی نسبت یہ الفاظ کہے کہ "اگرچہ سوسائٹی سید احمد خاں کی فیاضی کی پہلے ہی سے مقروض ہے مگر اب اس احسان کو اس عالیشان عیقے نے اور زیادہ کر دیا ہے۔" نواب سکندر یگم صاحبہ مرحومہ رمیہ بھوپال نے جب یہ سنا کہ سید احمد خاں کی کوشش سے ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوئی ہے تو جون ۱۸۶۶ء میں انھوں نے بطور اظہارِ نحوہ شنودی کے ایک الماس کی انگوٹھی قیمت ایک ہزار روپیہ خاص سر سید کے واسطے بھیجی، سر سید نے جلسہ عام میں وہ انگوٹھی سوسائٹی کے اخراجات کے لیے سوسائٹی کو دیدی۔ اس کے سوا انھوں نے محض سوسائٹی کی امداد کے لیے فوجداری اور کلکٹری کے محنتوں کو قانون پر کچر دینا اختیار کیا اور جو نہیں ان سے وصول ہوتی رہی وہ سوسائٹی

کی نذر کرتے رہے۔

۳۰ دسمبر ۱۸۶۵ء کو انھوں نے سوسائٹی کی طرف سے گورنمنٹ شمال مغرب میں یہ درخواست بھیجی کہ سوسائٹی کا اضافہ ہے کہ اضلاع شمال مغرب کے طریقہ رشتکاری پر کتابیں تالیف کرے۔ اگر گورنمنٹ کچھ سالانہ امداد کرتی رہے تو سوسائٹی اس کے معاوضہ میں کتابیں دیا کرے گی اور کتابوں کا تالیف کرنے والے سرسید نے خود اپنے ذمے لیا۔ چنانچہ گورنمنٹ نے اگست ۱۸۶۶ء میں سوسائٹی سے پانسو روپیہ سالانہ کی کتابیں خریدنی منظور کر لیں۔ مگر یہ کتابیں لکھی نہیں گئیں۔ صرف مضامین کی طواری فہرست جو سرسید نے سوسائٹی میں پیش کی تھی وہ سوسائٹی اخبار کے پرچہ نمبر ۴۲ جلد اول میں درج ہے۔ اس فہرست کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت مشکل کام تھا اور اگر سرسید اس کے سرانجام دینے میں مصروف ہو جاتے تو ان کو مدت تک کسی اور کام کی فرصت نہ ملتی۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن

۱۔ مئی ۱۸۶۶ء کو سرسید کی تحریک سے بہت سے رئیس ضلع علیگڑھ اور اُس کے نواح کے اور چند یوروپین افسر سوسائٹی کے مکان میں جمع ہوئے اور سرسید نے ایک لمبی اسپچ کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ ”ہندوستانیوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عداوت میں ٹبری وقت ہندوستان کو یہ تھی کہ اُس کے تقریباً تمام معاملات صرف کورٹ اور دفاتر کٹریک پہنچتے تھے اور پارلیمنٹ سے بہت ہی کم تصفیہ پاتے تھے۔ مگر اب حکومت ہندوستان

کی ملکہ معظمہ نے اپنے ہاتھ میں لی ہے اور اب ہندوستان کے امورات کو زیادہ تر پارلیمنٹ سے تعلق رہے گا۔ پس اس غرض کے لیے کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہمارے حالات اور محاللات سے بخوبی واقفیت حاصل کریں۔ ہم کو ایسی تدبیر کرنی چاہیے جس سے ہم اپنے صحیح حالات اور مناسب خواہشوں سے ان کو مطلع کر سکیں اور جس طرح ان انگریزوں نے جو ہندوستان میں رہتے ہیں ایک ایوسی ایشن انگلستان میں قائم کرنی چاہی ہے اسی طرح ہم بھی تمام اضلاع شمال مغرب کی طرف سے ایک ایوسی ایشن اپنے ملک میں قائم کریں اور اس کے ذریعے سے اپنے تمام مطالب اور مقاصد کو گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچائیں۔

اس تجویز کو تمام حاضرین نے پسند کیا اور اسی وقت نو معزز ہندو اور مسلمان اس کے ممبر مقرر ہوئے اور اس جماعت کا نام ”علیگزہڈ برٹش انڈین ایوسی ایشن رکھا گیا۔“

اس ایوسی ایشن نے چند مفید کام جب تک کہ سرسید علیگزہڈ میں رہے انجام دیے۔ مدت تک اس کی خطوط کتابت انگلستان کی ایٹ انڈیا ایوسی ایشن کے ساتھ رہی۔ اس نے گورنمنٹ ہند کو ایک نہایت مفصل عرضداشت بھیج کر مسافران ریل کی اُن تکلیفوں کے تدارک کی طرف متوجہ کیا جو ابتدا میں اُن کو حسد سے زیادہ اٹھانی پڑتی تھیں۔ چنانچہ اس عرضداشت پر بہت سی شکایتیں رفع کی گئیں۔ نیز اس نے گورنمنٹ کو اس طرف توجہ دلائی کہ جس قانون کی رو سے کتابوں کی روانگی کا محصول دو چاند کیا گیا ہے اس سے ہندوستان کی علمی ترقی کو صد مہ پہنچتا ہے اس لیے ایک آدھ فی دس تولہ محصول جو بک پیکٹوں پر بیا جاتا ہے بجائے اس کے آدھ آدھ فی دس تولہ مقرر کیا جانے۔ اسی طرح

اور بعض مفید تحریکیں اُس کی طرف سے ہوئیں مگر ۱۸۶۷ء میں جب سرسید کی تبدیلی بنارس کو ہو گئی اسی وقت اس الیوسی ایشن کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں قائم ہوتی

۱۸۶۷ء ہی میں سرسید کی تحریک سے زمینداران علیگر ٹھہ نے ایک درخواست گورنمنٹ میں بھیجی کہ جب کہ علاوہ جمع مالگناری کے ایک روپیہ واسطے خرچ تعلیم کے ہم سے یا جاتا ہے تو قرین انصاف یہ ہے کہ انتظام اور نگرانی اور اخراجات میں ہم لوگوں کو بھی دخل دیا جائے اور ہر ضلع میں ایک تعلیمی کمیٹی قائم ہو جس میں حکام ضلع اور افسران سررشتہ تعلیم کے علاوہ ضلع کے رئیس اور زمیندار بھی شامل ہوں۔ نواب لفٹنٹ گورنر نے اول امتیاز ضلع علیگر ٹھہ اور اٹارہ میں تعلیمی کمیٹیوں کا مقرر ہونا منظور کیا اور آخر کار تمام اضلاع شمال مغرب میں تعلیمی کمیٹیاں مقرر ہو گئیں۔

پھر جب معلوم ہوا کہ کمیٹیوں میں ہندوستانی ممبروں کا عدم اور وجود برابر ہے اور یورپین حاکموں اور افسروں کے سامنے وہ آزادی اور دلیوری سے کہیں ان کے خلاف دم نہیں مار سکتے تو ۱۸۶۷ء میں سرسید نے ایک یادداشت لکھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ”جس غرض سے کمیٹیاں قائم ہوئی تھیں وہ اُن کے قیام سے پوری نہیں ہوئی کیونکہ یورپین ممبر ہندوستانی ممبروں کو ایک مخالف فریق سمجھتے ہیں جن کو شکست دینا وہ اپنا قدرتی حق جانتے ہیں اور ہندوستانی ممبر کمیٹی میں اُن موم کی صورتوں کی مانند معلوم ہوتے ہیں جو میٹم ٹساد کی نمائش گاہ میں تھیں۔“

اگرچہ ۱۸۶۷ء میں ایجوکیشنل کمیٹیوں کے قواعد مرتب ہو کر اُس سال جاری

کیے گئے مگر چونکہ اُن سے بھی ہندوستانیوں کی مداخلت کو کچھ وسعت نہ ہوئی تو سرسید نے ۱۸۸۶ء میں ایجوکیشن کمیشن کے سامنے اُن شکایتوں کا پتھر اُٹھایا اور کہا کہ جن مقاصد کے واسطے کمیٹیوں کے تقرر کی ضرورت تھی وہ حاصل نہ ہوئی اور اپنی رائے کے موافق کمیشن میں بہت سی ایسی اصلاحیں پیش کیں جن سے وزیر تعلیم کے موجودہ انتظام کی اصلاح کی جائے۔

سائنٹفک سوسائٹی سے اخبار نکالنا

۱۸۶۶ء ہی میں سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی سے اخبار نکالا جو آخر کو علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے اُن کے آخر دم تک جاری رہا۔ یہ اخبار پہلے ہفتہ وار نکلتا تھا پھر ہفتہ میں دو بار نکلتے لگا۔ اس اخبار کا اڈیٹوریل انتظام ابتدا سے آخر تک سوائے اُن ایام کے جب کہ سرسید علیگڑھ میں نہیں رہے انھیں کے ہاتھ میں رہا۔ گو ایک مدت سے بسبب اس کے کہ مدرسہ کا کام حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا اور سرسید کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اُن کو اس میں کسی بڑے آرٹیکل کے لکھنے کا موقع کم ملتا تھا۔ مگر تعلیم کے متعلق یا خاص اپنے کالج کے متعلق یا جب کبھی ملک یا قوم میں کوئی مہتمم بالشان واقعہ پیش آتا تھا وہ ہمیشہ اس میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔

اولیٰ اول سرسید زیادہ تر اس میں پوٹیکل معاملات پر مضمین اور نوٹ لکھتے تھے اس لیے اس کی ابتدائی جلدوں کو اُن کے پوٹیکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ اس اخبار کی تیری خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے اس لیے اس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں

فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پورے شکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ اُس کی ابتدائی جلدوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی لباس میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کر کے دونوں قوموں کو ملنا چاہتا ہے۔ اگر سہارا قیاس غلط نہ ہو تو آج تک کوئی پرچہ ہندوستان میں اس اخبہ کے سوا ایسا نہیں نکلا جس سے یہ دونوں مقصد پورے ہو سکیں۔

اس میں سوشل، اخلاقی، علمی اور پولیٹیکل ہر قسم کے مضامین برابر چھپتے تھے۔ جب تک سرسید کی توجہ دوسری جانب مائل نہیں ہوئی علاوہ اُن لیڈنگ آرٹیکلوں کے جو وہ خود لکھتے تھے، انگریزی اخباروں سے عمدہ عمدہ آرٹیکل جو معاملات ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے برابر ترجمہ ہو کر اس میں چھاپے جاتے تھے۔ ہندوستان کے طریق معاشرت، یا تعلیم، یا کسی علمی یا تاریخی تحقیقات کے متعلق جتنے لکچر سوشلسٹ میں دیئے جاتے تھے وہ سب اس کے ذریعے سے شائع ہوتے تھے۔

اگرچہ یہ اخبار ملک کی سوشل اصلاح کا ہمیشہ ایک عمدہ آلہ رہا ہے اور اول اول کئی سال تک جس قدر زمانہ حال کی نئی اطلاعات اس کی بدولت ہندوستانیوں کو حاصل ہوتی ہیں اُن کے لحاظ سے یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اسی پرچہ کے اجرا سے شروع ہوئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی پولیٹیکل معاملات میں جو وقعت اور اعتبار اس پرچے نے گورنمنٹ اور حکام کی نظر میں حاصل کیا وہ آج تک

کسی ویسی اخبار نے حاصل نہیں کیا۔

جو ٹائٹلس نے اپنے لیے اختیار کیا تھا اُس کو ہمیشہ نصب العین رکھا۔ وہ ہمیشہ رعیت کو آزادی اور اطاعت سکھاتا تھا اور اُن کی خیر خواہی اور وفاداری کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر کرتا تھا۔ اُس کی آواز ہمارے عام ویسی اخباروں کی طرح کوئی معمولی آواز نہ تھی، بلکہ جن معاملات پر وہ بحث کرتا تھا اور دخل دیتا تھا ہمیشہ اُس کی آواز پر کان لگائے جاتے تھے اور اُس کو غور سے سُنا جاتا تھا۔ اور اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اُس کا لکھنے والا اور انتہام کرنے والا سید احمد خاں تھا۔ گورنمنٹ اور حکام اس بات کو تسلیم کیے ہوئے تھے کہ علیگرھ کا اخبار تمام ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور سمجھ دار مسلمانوں کے خیالات کا ارگن ہے۔ کتاب "پریز اوپ دی انڈین اسپائر" کا مصنف اپنی کتاب میں ایک خاص موقع پر لکھتا ہے کہ "علیگرھ انسٹیٹیوٹ گزٹ سے جو مسلمانوں کا خاص آلہ ہے اگر پچھلے دو سال کے مضامین جمع کیے جائیں تو ہندوستان کے قابل اور معزز مسلمانوں کی رائے کا اگرچہ وہ تعداد میں کم ہیں، ایک عجیب اور مفید مجموعہ نسبت جنگ روم و روس اور روس و افغانستان اور روس و ہندوستان کے بنجائے گا۔" اسی کتاب میں علیگرھ گزٹ کی وقعت اور اغیار کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ "علیگرھ گزٹ جس کے ایڈیٹر سید احمد خاں تھے اور اب بھی وہی معلوم ہوتے ہیں، شمالی ہندوستان میں سب سے عمدہ اخبار ہے۔" اس کے بعد اخبار کے بعض مضامین کا خلاصہ لکھ کر خاص ملکی معاملات پر مسلمانوں کی رائے کا موازنہ کیا ہے۔

جس قدر مضامین ۱۸۶۶ء سے اخیر تک اس اخبار میں خاص سرسید کے قلم سے لکھے ہوئے نکلے اگر اُن کو ایک جگہ قلم ہم کیا جائے تو بلا مبالغہ چند ضخیم

جلد میں مرتب ہو سکتی ہیں۔

ایک خاص وصف جو اس اخبار کے ساتھ مخصوص تھا اور جو اس کو ہندوستانیوں کے عام انگریزی اور ویسی اخباروں سے ممتاز بھیراتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ اُس نے اپنی طرز تحریر میں یہ خلافت اپنے تمام ہمعصروں کے کبھی کسی قوم یا فرقہ یا کسی خاص شخص کی دلالتی نہ رہا نہیں رکھی۔ اُس نے اپنے گاہکوں کو خوش کرنے کے لیے جو ہمیشہ نوک جھوک اور چھٹیر چھاڑ سے خوش ہوتے ہیں، سنجیدگی اور نشت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اُس نے ہندوستان کی کسی قوم کی نسبت دوستی اور خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا کبھی کسی غیر قوم کے عہدہ دار کی ترقی سے ناراضگی یا ناخوشی ظاہر نہیں کی۔ کبھی کسی ہندو یا مسلمان ریاست یا اُس کے اہل کاروں پر زہر نہیں اگلا۔ ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے وہ ہمیشہ بے تعلق رہا اور اگر کبھی کچھ بولا تو دونوں کو صلح و آشتی کی نصیحت کی۔ وہ جس طرح اپنی قوم کے اکابر اور نامور لوگوں کے مرنے پر فوس کرتا رہا اسی طرح غیر قوموں کے مشہور اور نامور لوگوں کی وفات پر ہمیشہ اُس میں درد ناگ اور افسوسناک مضمون نکلتے رہے۔ باوجودیکہ وہ گورنمنٹ اور اُس کے مدبروں پر کٹر نکتہ چینی کرتا تھا مگر اعتدال اور ادب اور تعظیم کو جو ایک محکوم قوم کا زیور ہے اُس نے ہمیشہ ملحوظ رکھا اُس نے یہ خلافت اپنے ہمعصروں کے جن کی زبان درازی سے اول لارڈ لٹن کے زمانے میں اور اب لارڈ ایلگن کے عہد میں اُن کی آزادی چھین لی گئی، اپنے معتدل رویہ سے سب پر ظاہر کر دیا کہ سچی آزادی اپنی آزادی کو ہمیشہ کے لیے برقرار رکھنا ہے نہ اپنی بے اعتدالیوں کی بدولت اُس کو اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھنا۔

ایک اور خصوصیت اس اخبار کی اس کی باقاعدگی جو اکثر ویسی اخباروں

میں مفقود ہے اور اُس کی خبروں کا نہایت معتبر ذریعوں سے پایا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ بے اصل قصوں اور بے سرو پا خبروں سے متراویکھا گیا۔ اُس کی خبروں کا ماخذ ہمیشہ معتبر اور مستند انگریزی اخبار رہے۔ کبھی کوئی خبر کسی نامعتبر کاغذ سے (الامشاہ اللہ) اُس میں نہیں لی گئی۔ دنیا کے ہر ایک بڑے واقعہ کی نسبت شروع سے اخیر تک اس میں تمام خبریں مسلسل اور ترتیب وار درج ہوتی تھیں۔ جن سے اُس واقعہ کی ایک مختصر ہٹری بقید تاریخ مرتب ہو سکتی تھی۔ اُس کی باقاعدگی کا یہ حال تھا کہ وہ بتیس برس برابر جاری رہا اس عرصہ میں شاید ہی کوئی غیر ایسا ہو گا جو اپنی تاریخ متعین پر نہ ٹکلا ہو۔ باوجودیکہ چنبدہ کی آمدنی سوسائٹی میں مدت سے بالکل نہیں رہی تھی اور اس لیے کچھ برسوں میں وہ کئی ہزار کی مقدار میں ہو گئی تھی۔ مگر سرسید نے جس طرح ہوسکا اخبار کو کبھی بند ہونے نہیں دیا۔

بنارس کی تبدیلی

۱۵ اگست ۱۸۵۷ء کو سرسید عہدہ جج سال کاڈ کورٹ پر ترقی پا کر علیگڑھ سے بنارس چلے گئے یہاں سے چلتے وقت وہ تمام کاروبار سوسائٹی کے راجہ جیکشن واس سی۔ ایس۔ آئی کو جو کہ وہ اُس وقت علیگڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے، سپرد کر گئے۔ انھوں نے نہایت توجہ اور دلسوزی سے سوسائٹی کے کام انجام دیئے اور سوسائٹی کی جو عمارتیں سرسید کے زمانے میں پوری نہیں ہوئی تھیں ان کو پورا کیا۔

سرسید بنارس میں بھی سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ کو برابر تفویض دیتے رہے اور ان کے مفید آرٹیکل اور مضامین اسی طرح سوسائٹی کے

اخیر میں برابر چھپتے رہے۔ اگرچہ سرسید کا تعلق ملازمت کے اخیر زمانہ یعنی جولائی ۱۸۶۷ء تک بنارس کے ساتھ رہا لیکن چونکہ وہ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے ولایت چلے گئے تھے، اس لیے پہلی بار بنارس میں ان کا قیام ایک برس اور ساڑھے سات مہینے سے زیادہ نہیں ہوا۔ ان کے اس قلیل زمانے کے بھی چند کام ذکر کے قابل ہیں۔

دنیو یورسٹی کے لیے تحریک

یکم اگست ۱۸۶۷ء کو جب کہ سرسید علیگڑھ ہی میں تھے انھوں نے ایک درخواست برٹش انڈین ایسوسی ایشن اضلاع شمال مغرب کی طرف سے دائر کی وگورنر جنرل کشور بھند کی خدمت میں بھیجی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا۔

۱۔ یہ کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں برٹش بڑے علوم و فنون کی تعلیم ویسی زبان میں ہوا کرے۔

۲۔ یہ کہ ویسی زبان میں انھیں مضمونوں کا سالانہ امتحان ہوا کرے جس میں کہ اب طلبہ ملکتہ یونیورسٹی میں انگریزی میں امتحان دیتے ہیں۔

۳۔ جو سندیں انگریزی خواں طلبہ کو اب علم کی مختلف شاخوں میں بجلدوی تحصیل لیاقت عطا ہوتی ہیں وہی سندیں ان طلبہ کو عطا ہوا کریں جو انھیں مضمونوں کا ویسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں۔

۴۔ یہ کہ یا تو ایک اُردو فیکلٹی ملکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے یا شمال مغربی اضلاع میں ایک جدا یونیورسٹی ویسی زبان کی قائم ہو۔ اس درخواست میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس غرض کے لیے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کا کام جہاں تک ممکن ہو گا سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ انجام دے گی۔

اس درخواست پر گورنمنٹ ہند نے بڑی توجہ ظاہر کی چنانچہ جو چٹھی سکریٹری گورنمنٹ ہند کی مورخہ ۵ ستمبر ۱۸۵۷ء سرسید کے نام بمقام بندر سوسول ہوئی اس میں لکھا تھا کہ "نواب گورنر جنرل اہم تمام لوکل گورنمنٹیں نہایت خوشی سے اُن تمام کوششوں کی قدر کریں گے جو ایسی سوسائٹیاں جیسی کہ آپ کی سوسائٹی ہے یا خاص خاص آدمی اُن مقصد یعنی انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے اور ترقی دینے کے لیے کریں گے جو آپ کی سوسائٹی کا اور گورنمنٹ کو برابر منظور نظر ہے۔" اس چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ "ہمارا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ فقط یونیورسٹی کے کورس کی کتابیں ویسی زبان میں ترجمہ ہو جائیں بلکہ علوم و فنون کے وسیع دائرہ میں طلبہ کو مستعد اور تیار کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ اس مطلب کے لیے کافی ذخیرہ ویسی زبان میں اب تک موجود نہیں ہے اس لیے کچھ عرصہ تک ہندوستان کے باشندوں کو انگریزی زبان کے ذریعہ سے یہ بات حاصل کرنی ہوگی۔" اسی چٹھی میں یہ بھی لکھا تھا کہ "نواب گورنر جنرل بہادر یہ اجلاس کونسل اُن تدبیروں سے خاص رضامندی ظاہر کرتے ہیں جو علیگڑھ کی سائنٹفک سوسائٹی نے یورپ کے علوم و فنون کو ویسی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے اختیار کی ہیں۔"

اس چٹھی کے آنے سے بڑے بڑے لائق تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے ترجمہ کرنے کی ہامی بھری تھی جن میں تین نامور آدمی دلی کے بھی تھے، ماسٹر پیارے لال، سولوی ذکاء اللہ اور شہت دھرم نرائن، اور جب ان لوگوں کی آمادگی گورنمنٹ ہند کو معلوم ہوئی تو اس نے اس بات پر اپنی رضامندی ظاہر کی، اس کے بعد وزیر ہند کی چٹھی مورخہ ۲۱ جنوری ۱۸۵۷ء بنام گورنر جنرل کشور ہند صادر ہوئی جس میں ایسوسی ایشن کی تجویزوں سے پسندیدگی ظاہر کی گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس یونیورسٹی کا چرچا شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ

گروہ میں بہت پھیل گیا تھا اور وہ لوگ اُس کو بہت پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۱۱ء میں اسی یونیورسٹی کے متعلق دہلی سوسائٹی میں جبکہ ڈائریکٹر سر رشتہ تعلیم پنجاب بھی وہاں موجود تھے ایک مباحثہ ہوا اور گورنمنٹ پنجاب میں اس مسنون کا ایک سمینر مل بھیجا گیا کہ ”یہ یونیورسٹی لاہور میں اور ترجمہ کرنے اور کتابیں بنانے کے لیے ایک کمیٹی دہلی میں قائم کی جائے اور اگر دونوں صوبوں کے لیے ایک یونیورسٹی قائم کی جائے تو اس کا مقام دلی ہونا چاہیے۔“

اول اول سر سید بہت سرگرمی کے ساتھ اپنی عادت کے موافق اس یونیورسٹی کے قیام کی تدبیروں میں مصروف رہے۔ گورنمنٹ ہند میں انہوں نے اطلاع دی کہ ”ترجمہ کا بوجھ سوسائٹی اپنے اوپر گوارا کرتی ہے مگر گورنمنٹ سے یہ درخواست کرنی ہے کہ جو روپیہ وہ اشاعت تعلیم کی غرض سے ہندوستان میں خرچ کرتی ہے، اُس میں سے اگر کسی قدر مناسب ہوا کرے تو سوسائٹی کی اعانت اور تقویت کرے۔“ یہ بھی لکھا کہ ”سوسائٹی صرف یونیورسٹی کے کورس کا ترجمہ کرنا نہیں بلکہ علوم و فنون کے دائرہ کو قراخ کرنا چاہتی ہے اور امیدوار ہے کہ اگر کاپی رائٹ کا ایکٹ ۲۰-۱۸۶۷ء سوسائٹی کے مقصد میں خارج ہوا تو اُس قانون کی ترمیم کی جائے اور اگر نہ ہونو اُس کی تشریح کی جائے۔“

مگر معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا ارادہ کلکتہ یونیورسٹی توڑ کر اُس کی جگہ ڈینکلر یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا اور انگریزی کو صرف بطور سکنڈ لینگویج کے تعلیم میں رکھنا چاہتی تھی چنانچہ سر سید نے بنارس انسٹیٹیوٹ کے ایک جلسہ میں جو اسی معاملہ پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا یہ تقریر کی تھی کہ ”سنٹر کمین (ڈائریکٹر سر رشتہ تعلیم اضلاع شمال مغرب) نے ایسوسی ایشن کا مطلب غلط سمجھا ہے۔ ایسوسی ایشن کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے کہ انگریزی صرف بطور ایک زبان

کے سکھائی جائے اور اُس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کا ذریعہ نہ گردانا جائے بلکہ اُس کی یہ خواہش ہے کہ انگریزی تعلیم کا طریقہ بدستور جاری رہے مگر اُس کے ساتھ ایک اور سریشٹہ قائم کیا جائے جس سے انگریزی علوم و فنون اور خیالات و سی زبان کے ذریعہ سے بہ کثرت عام ہندوستانیوں میں پھیلائے جائیں۔ پس یا تو کلکتہ یونیورسٹی میں ایک شعبہ قائم ہو یا ایک جداگانہ ورنیکلر یونیورسٹی خاص ان اضلاع میں قائم ہو۔ اس کے بعد اپریل ۱۸۶۵ء میں جبکہ نواب لکھنؤ گورنر بھی بنارس انسٹیٹیوٹ میں موجود تھے سرسید نے پھر اسی تقریر کا اعادہ کیا اور کہا کہ "مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی کے حامی انگریزی تعلیم کا تنزل ہرگز نہیں چاہتے بلکہ اس بات کی فکر ہے کہ ہند کے کروہی آدمیوں کو تعلیم کا فائدہ کیونکر پہنچے۔"

غالباً زیادہ تر اسی وجہ سے کہ گورنمنٹ کا ارادہ انگریزی تعلیم کو گھٹا دینے کا تھا سرسید نے ورنیکلر یونیورسٹی کا خیال چھوڑ دیا ہو گا۔ مگر اس کے سوا خود ورنیکلر یونیورسٹی کے قائم کرنے میں بعض مشکلات ایسی تھیں جن کا حل کرنا نہایت دشوار تھا۔ چنانچہ سرسید نے اسی باب میں جب سٹریپرین انسپکٹر مدارس حلقہ راولپنڈی سے ملائے دریافت کی تو انھوں نے اُس کے جواب میں ایک مفصل تحریر بھیجی جس میں ترجمہ کرنے کی اصلی اور حقیقی مشکلات نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کی تھیں۔ اس تحریر سے بھی ضرور اُن کے ارادوں میں تزلزل واقع ہوا ہو گا پھر انھیں دنوں میں اُن کو سفر انگلستان کا خیال پیدا ہو گیا جس میں طرح طرح کی مشکلات حامل تھیں اور اُن کا حل کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا کام تھا۔ ان وجوہ سے سرسید اور اُن کے ساتھ جتنے آئین کہنے والے تھے سب ورنیکلر یونیورسٹی کے خیال سے دست بردار ہو گئے جو موانع اس یونیورسٹی کے قائم ہونے میں پیش آئے اگر اُن میں سے کوئی اس پریش نہ آتا تو بھی یہ بیل منڈ سے چڑھتی نظر

نہیں آتی تھی، ہندوستانیوں کے اختلافات ضرور اس میں رخنہ ڈالتے وہلی سوسائٹی کے ممبر یہ چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کا مقام دلی ہو ناچاہیے اور سائنٹفک سوسائٹی اور بنارس انسٹیٹیوٹ کی ضروریہ خواہش ہوتی کہ اُس کا مقام شمال مغربی اضلاع کا کوئی شہر ہو۔ اس کے سوا اور دو زبان کے مقالوں نے اخباروں میں اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی کہ اس یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے اردو زبان اور ہندوؤں کے لیے ہندی زبان مخصوص کی جائے۔ اور باوجود تسلیم کرتے اس بات کے کہ ہندی زبان سر و ست ترجمہ کی قابلیت نہیں رکھتی اس امر پر زور دیا جاتا تھا کہ اُس کی ترقی میں کوشش کر کے اُس کو ترجمہ کے لائق بنایا جائے۔ اگر یہ اصرار زیادہ بڑھتا اور ضرور بڑھتا تو گورنمنٹ آخر کار یہ فیصلہ کرتی کہ کیوں اندھانہ نیوٹا اور کیوں دو بلائے۔

سوسائٹی کی امداد کی ایک خاص تدبیر

۱۸۶۷ء ہی میں سر تپتھتھریہ تعطیل و سہرہ بنارس سے علیگزہ میں آئے اور ضلع علیگزہ کے اکثر زمینداروں پر اس بات کو ظاہر کیا کہ اب تک سوسائٹی کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ اُس کی آمدنی مستقل ہو جائے۔ بہت سے زمینداروں نے یہ تجویز کی کہ اس ضلع کے تمام دیہات سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ عہدہ کے لیے سوسائٹی کے قیام کے واسطے مقرر کیا جائے اور اس کی شرائط واجب العہدہ میں برداشت بندوبست کے درج ہو جائیں، تاکہ فلاح بعد نسبتاً ہمارے وارثوں میں سے کوئی کچھ عذر نہ کرنے پائے چنانچہ ۱۲- اکتوبر ۱۸۶۷ء کو سوسائٹی کے جلسہ میں سر تپتھ نے یہ تجویز پیش کی اور ایک فہرست زمینداران درخواست دہندہ کی

مح ان کی سررضیوں کے اور مع تفصیل ۱۳۳ دیہات کے جارج ہنری لائرس کلکٹر ضلع علیگڑھ کی خدمت میں اپنی چٹھی کے ذریعہ سے بھیج دی تاکہ وہ اس کی تصدیق کر کے گورنمنٹ میں رپوسٹ کر دے اور صاحب کلکٹر نے وہ تمام کاغذات گورنمنٹ میں اپنی رپوسٹ کے ذریعہ سے روانہ کر دیے۔ اس کا نتیجہ سوا اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہوا کہ اس کے جواب میں جو چٹھی سپرائیوٹ سکرٹری گورنمنٹ ایڈیا سورجہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۷۷ء بنام سر سید کے موصول ہوئی اس میں حضورہ وائسرائے کی طرف سے رمانندی ظاہر کی گئی تھی۔

ہومیوپیتھک علاج کی حمایت

غالباً بنارس ہی میں پہنچ کر ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہومیوپیتھک علاج کے طریقہ سے بہتر کوئی طریقہ علاج کا عمدہ اور بے خطر نہیں ہے۔ اور جیسا کہ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ جو بات یا جو کام یا جو شخص ملک کے لیے مفید سمجھی اس کے پورا کرنے میں ہمت نہ مصروف ہو گئے، انھوں نے ہومیوپیتھک علاج کی حمایت کرنے اور تقویت دینے کا ارادہ کیا۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے ایک کمیشن قائم کی جس کا مقصد ہومیوپیتھک طبابت کا ہندوستان میں پھیلانا اور سندھ و تانوں کو اس کی طرف مائل کرنا تھا۔ اس کمیشن کے پریریڈنٹ مہاراجہ بنارس اور سکرٹری سر سید قرار پائے اور کمیشن کی تجویز سے ۲۵ ستمبر ۱۸۷۷ء کو بنارس میں ایک شفاخانہ بنام ”ہومیوپیتھک ڈسپنسری اینڈ ہسپتال“ کھولا گیا۔ سر سید نے ہر طریقہ سے جو ان کے اختیار میں تھا لوگوں کو اس کی طرف توجہ دلائی۔ انھوں نے بعض اپنے دوستوں کو جو کسی مریض میں مبتلا تھے بنارس میں بلانے کے لیے خط لکھے اور جو وہاں نہ پہنچ سکے ان کے لیے دوائیں بھیجوائیں۔ اس

طرح اس شفاخانہ کا چرچا چند روز میں ہندو ایک و دور ہو گیا۔ پالیو نیر کے پرچہ مورخہ ۴ دسمبر ۱۸۶۷ء میں اس شفاخانہ کی نسبت یہ چھپا تھا کہ "پہلے ہی مہینے میں پاتسو سولہ بیمار معالجہ کے لیے ہسپتال میں آئے، حالانکہ اس سے پہلے کوئی اس طریقہ علاج سے مطلق واقف نہ تھا" ۱۷۔ دسمبر ۱۸۶۷ء کو سر سید نے ایک طول طویل لکچر ہو میو پیٹھیک طبابت کی تاریخ اور اس کے اصول پر اس بات پرکہ یہ طریقہ علاج تمام طریقہ سے زیادہ مفید اور بے خطر ہے کمیٹی کے عام جلسہ میں دیا اور ۱۸۶۸ء میں ایک رسالہ ہیفیہ کے علاج پر بموجب اصول ہو میو پیٹھیک کے لکھا۔ یہ لکچر اور یہ رسالہ سوسائٹی اخبار کی جلدوں میں چھپا ہوا موجود ہے۔

اُردو زبان اور فارسی خط کی حمایت

سر سید ہمیشہ سے جیسا کہ ان کی مذکورہ بالا ملکی خدمات سے ظاہر ہوتا ہے اس اصول کے پابند تھے کہ ہندوستان کی بھلائی بغیر اس کے کہ ہندو مسلمان بطور ایک قوم کے بل جُمل کر رہیں کسی طرح ممکن نہیں چنانچہ ان کے تمام پچھلے کاموں میں اس اصول کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے، مگر بد قسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ دونوں قوموں کا متفق رہنا ممکن نہ تھا۔ انگریزی مدارس کی تعلیم میں جس سے زیادہ تر ہندو استفادہ ہوتے تھے تاریخ ہندوستان کی وہ کتابیں یا ان کے ترجمے داخل تھے جو نہایت تعصب آمیز طریقہ پر لکھی گئی تھیں اور جن میں مسلمانوں کی بُرائیاں اور ظالمانہ کاروائیاں دانستہ یا نادانستہ نہایت تفصیل کے ساتھ درج کی گئی تھیں۔ اس تعلیم کا ضروری نتیجہ یہ تھا کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت اور ناگواری کا تخم جم جائے اور وہ رفتہ رفتہ ایک نہایت گھنا اور عظیم الشان درخت

موجہ جانی چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو روابط دوستی اور اتحاد بلکہ یگانگت کے قدیم ہندو مسلمانوں میں تھے وہ تسلیم یافتہ ہندوؤں میں بالکل باقی نہ رہے اور اس کا ظہور آج ہر شخص علانیہ تمام ہندوستان میں اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔

اس کے سوا مسلمانوں کا وقار جو ہندوستان کی قوموں کے دل میں مدت سے چلا آتا تھا وہ باقی نہ رہا تھا اور نہ رہ سکتا تھا جو عزت اور جاہ و منصب اور امور سلطنت میں شرکت تعلیم کی بدولت ہندوؤں نے حاصل کی تھی مسلمان اپنے غرور اور تعصب یا غفلت و بے پروائی یا افلاس کے سبب اس سے محروم تھے، اور واقعہً عینہ نے ان کو اور بھی مٹا دیا تھا۔ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ غالب پارٹی اپنے نئے اقتدار کا جو اس نے مدت کے بعد حاصل کیا تھا اور جس میں بہت کچھ جاؤ اور منگلیں بھری ہوئی تھیں مغلوب پارٹی پر امتحان کرے اور اگر کوئی اور جیلہ ہاتھ نہ آئے تو اسی بہانے سے کہ دریا میں خاک کیوں اُڑاتے ہو اس سے دست و گریبان ہو جائے، اردو زبان جو درحقیقت ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور جس میں عربی و فارسی کے صرف کسی قدر اسما اس سے زیادہ شامل نہیں ہیں جتنا کہ آٹے میں نمک ہوتا ہے اس کو ہمارے مہوطن بھائیوں نے صرف اس بنا پر مٹانا چاہا کہ اس کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی۔

چنانچہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربراہ آوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

سرستید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو

مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ "انھیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شکسپیئر سے جو اُس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے، اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے میں نے کہا اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم بے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انھوں نے کہا اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"

غرض کہ ہندوؤں کی ایک قومی مجلس میں جو اُس وقت باہر فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم تھی اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جا بجا اُس کے لیے کمیٹیاں، مجالس اور سبھاؤں مختلف ناموں سے قائم ہوئیں اور ایک صدر مجلس آہ آہ میں قائم کی گئی جس کے ماتحت تمام مذکورہ بالا مجالس اور سبھاؤں تھیں یہاں یہ فکریں ہو رہی تھیں کہ انھیں دنوں میں لٹنٹ گورنر بنگال بھاگلپور کی سائنٹفک سوسائٹی میں آئے اور سوسائٹی کی طرف سے اُن کو لٹریس ایسی اے دو میں دیا گیا جس میں مہارت آرائی کی غرض سے عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے کئے گئے تھے اور اس کا سمجھنا ایک ایسے یورپین حاکم کو جو ہمیشہ بنگال میں رہا ہوا انسان نہ تھا۔ مہار کے تعلیم یافتہ ہندو پہلے ہی سے تحریک کر رہے تھے کہ جس

طرح ہنگامہ میں ہنگامہ زبان اور بنگلہ خط عدالتوں میں جاری ہو گیا ہے اسی طرح
صوبہ بہار میں بہاری زبان اور کیتی حرف جاری کیے جائیں۔ چونکہ ہیرا نرائڈ ریس کے
مہبت ہی کم الفاظ سمجھے تھے، انھوں نے کہا کہ جس زبان میں یہ ایڈریس پڑھا گیا
ہے یہ ہرگز ملکی زبان نہیں ہے اور یہ زبان بہار میں جاری نہیں رہ سکتی چنانچہ
انھوں نے چند روز بعد حکم دیدیا کہ بہار کی تمام عدالتوں میں کیتی حرف اور
جو زبان کیتی حرفوں میں لکھی جاتی ہے جاری ہو۔ ہر چند مسلمانوں نے اور بہت
سے قدیم وضع کے ہندوؤں نے بھی کوشش کی کہ وہ حکم ملتوی نہ کر کچھ فائدہ نہ ہوا
اس واقعہ سے شمال مغربی اضلاع کے ہندوؤں کا زیادہ حوصلہ بڑھا اور
ان کی کوششیں زیادہ تیزی کے ساتھ ہونے لگیں۔ آلہ آباد کی صدر مجلس میں
چند جلسے اس مسئلہ کی تحریک کے لیے منعقد ہوئے اور آخر کار مجلس کے
سکرٹری بابو سردار پرشاد سنڈیاں نے اس باب میں سرسید سے خط و کتابت
شروع کی۔ سکرٹری کی متعدد چٹیاں آئیں اور سرسید بطور اختلاف رائے کے
ہر ایک کا جواب دیتے رہے اور یہ مباحثہ اخباروں میں مشہور ہوتا رہا۔ آخر
سرسید نے اس کمیٹی کی صریح مخالفت کی اور سو سائٹی اخبار میں متعدد آرٹیکل
شائع کیے۔ آلہ آباد کمیٹی نے بھی کئی درخواستیں اور بڑے بڑے محضر جن پر ہندو
ہندوؤں کے دستخط تھے گورنمنٹ میں بھیجی۔ سنایا گیا ہے کہ مسٹر کمین ڈائرکٹر
سررشتہ تعلیم نے بھی اس کمیٹی کی تائید کی مگر کمیٹی کو کامیابی نہ ہوئی۔ اور
غالباً سر جان اسٹریچی کی گورنمنٹ میں یہ تحریک اس بنا پر نامنظور ہو گئی کہ فارسی
خط اور اردو زبان کی اشاعت بہ نسبت ناگری اور بھاشا کے بہت زیادہ تھی۔
۱۸۸۲ء میں جبکہ سرسید وائسرائے کی نیسیلٹو کونسل میں ممبر تھے ایجوکیشن
کیشن میں ہندوؤں کو اردو کی مخالفت کا پھر موقع ملا۔ اس دفعہ پہلے سے بھی

زیادہ زور شور کے ساتھ شمال مغربی اضلاع اور پنجاب کے ہندوؤں نے اردو زبان اور فارسی خط کی مخالفت میں کوشش کی تھی۔ دونوں صوبوں میں بے شمار سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے طوفانی محضر اور میموریل کمیشن میں پیش کیے گئے۔ چنانچہ سرسید کے بعض مسلمان دوستوں نے بھی پنجاب میں انجمن حمایت اردو قائم کی اور میموریل اور محضر کمیشن میں بھیجے۔ مگر کمیشن نے دونوں پارٹیوں کی درخواست پر کچھ رائے نہیں دی۔ ہم نے سنا ہے کہ سرسید نے ایک باقاعدہ طریقہ سے کمیشن پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ یہ مسئلہ ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا۔ بلکہ ایک بہت بڑا پولٹیکل مسئلہ ہے جس کے ساتھ گورنمنٹ کے مصالح ملکی وابستہ ہیں۔ پس اس کی بحث ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔

اس کے بعد مارچ ۱۸۷۷ء میں جس کی ستائیسویں کو سرسید نے دنیا سے رحلت کی۔ حضرت سرانیٹونی مکڈائل لفٹنٹ گورنر اضلاع شمال مغرب وادوہ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے معزز اہل سرسید اور وہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس غرض سے گزارا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اردو زبان اور فارسی خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ اگرچہ سرسید پر اس زمانہ میں ہجوم رنج و الم کے سبب ایسا سکتا کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے مگر اسی حالت میں انھوں نے اس مضمون پر ایک آرٹیکل لکھا جو ۱۹ مارچ کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا۔ اور جو کمپنی مسلمانوں نے الہ آباد میں اردو کی حمایت کے لیے قائم کی تھی اس کو اس باب میں بذریعہ تخریر کے کچھ مشورے دیے اور لکھا کہ اگرچہ مجھ سے اب کچھ نہیں ہو سکتا لیکن جہاں تک ممکن ہو گا میں ہر قسم کی مدد دینے کو موجود ہوں۔ اُن کو یقین ہو گیا

تھا کہ ہندوؤں کا یہ کام درحقیقت محض قومی تعصب پر مبنی ہے اس لیے وہ اپنے
ہندو دوستوں کی ناماضی کی مطلق پرواہ نہ کرتے تھے۔ جس طرح وہ ہندوستانیوں
کے انگریزی لباس اور انگریزی طرز معیشت پر انگریزوں کے اعتراضات کو
ہمیشہ اُن کی تنگدلی اور غرور پر مھول کرتے تھے اور کبھی اُن کے اعتراضوں کا
جواب دینے سے نہ چوکتے تھے، اسی طرح انھوں نے اردو زبان کی مخالفت
پر کبھی سکوت اختیار نہیں کیا یہاں تک کہ مرتے مرتے بھی وہ اس ڈیوٹی کو ادا
کیے بغیر نہیں رہے۔ وہ اپنے آرٹیکل کے شروع میں لکھتے ہیں کہ ”غالباً اس
وقت اُن کے (یعنی ہندوؤں کے) اس جوش کے اُٹھنے کا سبب یہ ہے کہ اس
صوبہ کے ہزار لکھنٹ گورنر مہاراجہ اس زمانہ میں جب کہ صوبہ بہار میں کیتیہ حوت
اور بہاری زبان بھوٹن اردو زبان اور فارسی خط کے جاری ہوتی تھی، کلاٹر و
مجسٹریٹ اور معاون اس تجویز کے تھے۔ پس ان صوبوں میں بھی ہندی و ناگری
حروف جاری ہونے میں تاہل نہ فرمائیں گے۔ اور شاید یہ غلط خیال بھی اس
پُرانے مردہ مضمون کے اُٹھانے کا باعث ہوا ہو کہ ان دنوں میں گورنمنٹ
کی نظر عنایت مسلمانوں کی نسبت کم ہے اور وہ اُن کو ناشکر سمجھتی ہے۔“
اس کے بعد انھوں نے سیوریل کے خلاف اردو زبان اور فارسی خط کی ترمیم
پر دلیلیں پیش کیں ہیں۔ اگرچہ اس وقت ہزار نے کمرٹ کی زبان میں کسی تبدیلی
کی ضرورت نہیں سمجھی مگر جو کچھ انھوں نے سیوریل کے جواب میں فرمایا اُس سے
صاف پایا جاتا ہے کہ آئندہ ایسی تبدیلی ہونی ممکن ہے۔

اس بات کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں کوئی زبان اردو
سے بڑھ کر عام زبان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اگرچہ ملک کے بعض
حصوں میں یہ نسبت بعض کے کم بولی جاتی ہے مگر ایسا کوئی حصہ نہیں جہاں

اُردو کے بولنے اور سمجھنے والے نہ ہوں۔ خود گورنمنٹ اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان اُردو ہے اور اسی بنا پر ۱۸۴۵ء میں سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی زبان اُردو قرار دی گئی۔ اگر اور صوبوں کی نسبت کسی کو کچھ نا اہل بھی ہو تو شمال مغربی اضلاع کی نسبت کسی کو بھی نا اہل نہیں ہو سکتا کہ میاں کی قومی زبان اُردو ہے۔ یہ صوبہ اُن دو شہروں سے گھرا ہوا ہے جو اُردو زبان کے سرچشمے سمجھے جاتے ہیں، یعنی دلی اور لکھنؤ۔ اس صوبہ کے ہندو عموماً اُردو سے ایسے ہی مانوس ہیں جیسے مسلمان۔ مگر حضرت تعصب وہ ذات شریف ہیں جن کا مقولہ ہے کہ ”من لجنہم لیکن نغنتہ یاراں تباہ“ مگر وہ فرانس کے مشہور اور فیلسفٹ گارساں و تاسی جنہوں نے اُردو زبان کی تحقیقات میں اپنی عمر صرف کی ہے وہ اسی متنازع فیہ مسئلہ کی نسبت اپنے ایک کچھ نہیں لکھتے ہیں کہ ”ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاجم ہوتے ہیں جو اُن کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔“ اسپین والوں نے بھی مسلمانوں کے زوال سلطنت کے بعد اسی طرح مسلمانوں کی نشانیاں مٹائی تھیں مگر انہوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ایسا کیا تھا اور ہمارے جموطن بھائی محکوم ہونے کی حالت میں ایسے ارادے رکھتے ہیں۔ لیکن ہم کو اطمینان رکھنا چاہیے کیونکہ جس تعلیم نے ہمارے ہندو نوجوانوں کو مسلمانوں سے تعصب اور نفرت کرتا سکھایا ہے وہی آگے چل کر اُن کو یہ سبق دے گی کہ جب تک ہندو مسلمان مل جل کر نہ رہیں گے اور ایک دوسرے کے مصالح کو ملحوظ نہ رکھیں گے تب تک برٹش انڈیا میں اصلی عزت حاصل نہیں کر سکتے۔

رسالہ احکام طعام اہل کتاب

۱۸۹۶ء میں سرسید کے پاس ایک سوال بطور استفتاء کے آیا تھا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ بشرطیکہ کھانے پر کوئی حرام چیز نہ ہو کھانا پینا درست ہے یا نہیں؟ سرسید نے اُس کا جواب آیات و احادیث کے حوالہ سے لکھ دیا کہ جائز ہے۔ اور ہندوستان کے سوا تمام دنیا کے مسلمان انگریزوں کے ساتھ برابر کھاتے پیتے ہیں۔ یہ جواب ۱۴ ستمبر ۱۸۹۶ء کے سوسانچی کے اخبار میں چھپا۔ اُس پر ایک سید صاحب نے اڈیٹر کے نام لکھو سے ایک چٹھی لکھی اور سرسید کے جواب پر نہایت خوشی ظاہر کی اور لکھا کہ ”میں اُس دن کے دیکھنے کا نہایت مشتاق ہوں جب یہ سنوں کہ سید احمد خاں نے اپنے قول کے موافق عمل بھی کیا۔“ اس کے جواب میں سرسید نے لکھا کہ ”میں نے اسلام کو ماں باپ کی تقلید سے نہیں بلکہ بقدرہ اپنی طاقت کے خود تحقیق کر کے تمام مذاہب معلوم سے اعلیٰ اور عمدہ اور سچا یقین کیا ہے۔ اور اسی سچے مذہب کے مجھے سکھایا ہے سچ کہنا اور سچ کرتا۔ نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ ہو کر تاکچھ ہو۔ اور اُس سے بھی زیادہ کمینہ وہ شخص ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن و طعن کے ڈر سے اُس کے کرنے میں تاثر کرے۔ اسی لیے میں کسی انگریز کے ساتھ کھانے پینے میں بشرطیکہ شراب اور سوسریا اور کوئی حرام چیز نہ ہو، کچھ تاثر نہیں کرتا میرے انگریز دوست سیرے ہاں مہمان ہوتے ہیں اور میں اُن کے ہاں مہمان ہوتا ہوں اور ہم اور وہ ایک میز اور ایک دسترخوان پر کھاتے ہیں جس چیر میں ہم کو خدا سے شرم نہیں اُس میں دنیا کے لوگوں سے کیا ڈر ہے؟“

معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے بہت پہلے سرسید نے انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کا پرہیز چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ”بجنور فتح ہونے کے بعد میں اور مسٹر پامر محشریٹ منلع بجنور نجیب آباد سے بجنور کو آتے تھے رستے میں ایک جگہ ہم دونوں اترے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ مسٹر پامر نے مجھ سے پوچھا کہ چائے پیو گے؟ میں نے کہا یہاں چائے کہاں؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے ساتھ بنی ہوئی بوتلیں میں موجود ہے۔ میں نے کہا بہت بہتر غرض کہ ہم نے چائے پی اور ایک آدھ توں کھایا۔ وہاں سے چکر لگنے میں مقام ہوا۔ عصر کے وقت سب لوگ جماعت سے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں بھی جا کر جماعت میں شریک ہو گیا۔ نماز کے بعد لوگوں نے مولوی قادر علی تحصیلدار سے جو نماز میں شریک تھے، پوچھا کہ صدر امین نے تو انگریز کے ہاں کی بنی ہوئی چائے پی ہے اور توں کھائے ہیں پھر یہ نماز میں کیونکر شریک ہوئے؟ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے اُن کو سمجھایا کہ قرآن مجید کی رو سے انگریزوں کے ہاں کا کھانا اور اُن کے ساتھ کھانا درست ہے۔ اُن لوگوں نے میری اس روشنی کی تقریر کو نہایت تعجب سے سنا۔ پھر ایک روز بجنور میں رات کو مسٹر پامر کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ کھانے پر جانے والے تھے انھوں نے کہا کہ تم بھی کھانا پیہیں کھاؤ۔ اور خانساں کو اشارہ کیا کہ میرے سامنے بھی رکابی رکھا دے۔ خانساں کو اس بات سے ایسا تعجب ہوا کہ کئی دفعہ اشارہ کرنے پر بھی نہ سمجھا کہ آج مسلمان انگریز کے ساتھ کھانا کھائے گا۔“

اگرچہ سرسید انگریزوں کے ساتھ مدت سے کھانے پینے لگے تھے۔ لیکن ابھی تک اُن کو مسلمانوں میں اس خیال کے زیادہ پھیلنے کا کچھ خیال نہیں تھا۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ رسم و سواج کی قیدیں ایک آدمی کے

اٹھا دینے سے نہیں اٹھتیں اور مسلمانوں کا انگریزوں سے خوف اور وحشت کرنا اور انگریزوں کا مسلمانوں سے بدگمان اور متنفر رہنا اُس وقت تک موقوف نہ ہو گا جب تک کہ دونوں قوموں میں میل جول اور ربط و ربط نہ ہو اور ہر ایک قوم کو دوسری قوم کے اصلی خیالات بلا واسطہ معلوم کرنے کا معلوم نہ ملے، اس لیے انھوں نے ایک مبسوط اور مفصل تحریر ۱۸۶۸ء میں بنام ”رسالہ احکام طعام اہل کتاب“ بنا جس میں کچھ کرشائع کی جس میں آیات قرآنی اور احادیث نبوی اور روایات معتبری سے اور خاص کر شاہ عبدالعزیز کے فتوے سے جس پر تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو اعتبار ہے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاں خود اُن کے ساتھ انھیں کے ساتھ کالپکا ہوا انھیں کے تبرنوں میں اور انھیں کا ذبیحہ جس طرح کہ انھوں نے کیا ہو کھانا درست ہے، صرف سوہ اور شراب اور حرام چیزوں سے پرہیز کرنا لازم ہے۔

اس رسالہ میں اُن تمام شبہات کا جواب جو ہندوستان کے علمائے اسلام مواکلت اہل کتاب پر کرتے تھے اور جن شبہات کی وجہ سے مسلمانوں کو انگریزوں کے ہاں کی ہر ایک کھانے پینے کی چیز اور اُن کے ساتھ کھانا کھانے سے اجتناب تھا، نہایت شافی طور پر جو ایک منصف مزاج آدمی کی تسلی کیلئے کافی دوائی ہے کھا ہے۔ جب یہ رسالہ چھپا تو اول اول بہت شہر و غل ہوا، سرسید کو کر شان کہا گیا، اُن کے ساتھ کھانا کھانے سے احتراز کیا گیا اُن کے رسالہ کے جواب لکھے گئے، بعضوں نے اس باب میں کوشش کی کہ سرسید کے ساتھ سب مسلمان کھانا پینا چھوڑ دیں مگر قبول سرسید کے وہ سب باتیں ایسی تھیں جیسے آندھی کا ایک گولہ اٹھا اور خاک اڑا کر چلا گیا پھر مطلع صاف ہو گیا، اب وہی لوگ جو سخت معترض تھے خود انگریزوں کے ہاں جا کر اور اُن کو اپنے ہاں بلا کر ساتھ کھانے کو اپنا فخر سمجھتے ہیں، البتہ جن لوگوں کی انگریزوں تک رسائی نہیں وہ اپنے تہوے اور طہارت پر بدستور قائم ہیں۔

چوتھا باب

۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۰ء تک

”و سفر انگلستان، سفر نامہ، لندن کے عائد سے ملنا، جلسہ سمنوین
 سوسائٹی آف سول انجینئرس میں شریک ہونا، سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب
 اور تمغہ ملنا، ملکہ معظہ کی لوی میں شریک ہونا، پرنس آف ویلز کی
 لوی میں بلایا جانا، ایٹھینیم کلب کی ممبری، کیمبرج یونیورسٹی میں جا کر
 وہاں کے طریقہ تعلیم و تربیت پر غور کرنا، تعلیم ہندوستان پر پمفلٹ
 لکھنا، خطبات احمدیہ لکھ کر شائع کرنا، جان ڈیون پورٹ کی کتاب
 چھپوا کر شائع کرنا“

سر سید نے غرضتہ کے بعد جن دو باتوں کو مسلمانوں کی آئندہ بہبودی کے
 لیے ضروری سمجھا تھا ان کے لیے انگلستان کا سفر کرنا نہایت ضروری تھا ان کا یہ خیال تھا
 کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اور جب تک مسلمانوں اور انگریزوں
 میں موائست اور میل جول پیدا نہ ہوگا اس وقت تک مسلمانوں کا پینپنا اور ہندوستان
 میں عزت سے رہنا دشوار ہے۔ گو وہ اب تک ان دو تدبیروں میں برابر سرگرم رہے
 مگر جس حد تک وہ اپنا منصوبہ پورا کرنا چاہتے تھے اس کے لحاظ سے ان کو ولایت
 کا سفر کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اس کے علاوہ سر ولیم میور کی کتاب ”لائف آف
 محمدؐ“ کا جواب لکھنے کے لیے جس کا ان کو حسد سے زیادہ خیال تھا، بہت سی

ایسی کتابوں اور نوشتوں کی ضرورت تھی جو ہندوستان میں نایاب تھیں اور صرف برٹش میوزیم یا انڈیا آفس کے کتب خانوں میں مل سکتی ہیں۔

مگر اُس وقت ولایت جانا آسان نہ تھا۔ اول تو ایک ایسا شخص جس کی آمدنی ہمیشہ خرچے سے شرمندہ رہے۔ اس کو ولایت جانا اور وہاں جا کر اپنے تمام مفاد پر سے کرنے کے لیے ایک مدت تک قیام کرنا سخت مشکل تھا۔ پھر جیسا کہ آج کل ہندوستانی مسافروں کا انگلستان تک برابر تاشا بندھا ہوا ہے اُس زمانے میں یہ حال نہ تھا۔ ہندوستانی اس دور و دراز سفر سے ہچکچاتے تھے۔ اور بمبئی و بنگال کے متعدد آدمیوں کے سوا کسی نے یہ سفر اختیار نہیں کیا تھا۔ حسن اتفاق سے انھیں دنوں میں گورنمنٹ ہند نے ہندوستانیوں کو تعلیم کی غرض سے ولایت بھیجنے کے لیے علاوہ تین ہزار روپیہ خرچ آمد و رفت کے چھ چھ ہزار سالانہ کی نو سالہ شپیں چند صوبوں کے واسطے منظور کی تھیں۔ خوش قسمتی سے گورنمنٹ اضلاع شمال مغرب نے اپنے صوبہ کی سکالرشپ کے سید محمود کو انتخاب کیا۔ اگرچہ یہ روپیہ صرف سید محمود کے بھیجنے کے لیے بھی کافی نہ تھا۔ مگر گورنمنٹ کی اس امداد سے سرتید کے اسادہ کو بہت تفویض ہوئی۔ انھوں نے فوراً ولایت جانے کی دل میں ٹھان لی۔ جس نیت اور جس ارادہ سے انھوں نے سید محمود کے ساتھ خود ولایت جانے کا ارادہ کیا تھا وہ کسی قدر ان کی درخواستِ رخصت سے جو ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کے سوسائٹی اخبار میں چھپی تھی، معلوم ہوتی ہے۔ درخواست کا مضمون یہ ہے۔

”یہ استنجوبی میرے ذہن نشین ہے کہ ہندوستان کی غلامی و بہبودی کو کامل ترقی دینے اور گورنمنٹ انگریزی کے مطالب کو جس کی ملازمت کا فخر مجھ کو حاصل ہے بخوبی انتہا کام و پابندی

بجٹنے کے واسطے اس کے سرا اور کسی اسر کی ضرورت نہیں ہے کہ
اہل یورپ اور ہندوستان کے درمیان رابطہ و ضبط کو ترقی دے جائے
پس اس مقصد کی تکمیل کے واسطے ہندوستانیوں کو میری رائے میں
یورپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہیے تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شانستگی
کے عجیب و غریب نتیجوں اور اس کی ترقی کو بحیثیت خود مشاہدہ
کریں اور اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ انگلستان کے لوگ کیسے
دولتمند، طاقت ور اور دانا ہیں اور ان مفید اور عمدہ باتوں کو
ہندوستان کی بھلائی کے واسطے سیکھیں جو اس امر کے نتیجے ہیں کہ
تجارت کے باب میں انگلستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں
اور کارخانوں اور کاشتکاری اور شفاخانوں اور خیرات اور اس
کے شہروں کی صفائی اور اس کی دولت اور علم سے روز بروز زیادہ
کام لیا جاتا ہے۔

”پس اس خواہش سے میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان
جا کر اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک نظیر قائم کروں۔ مجھ کو یقین ہے
کہ صرف مجھ کو ہی اس سفر سے فائدہ نہ ہوگا بلکہ امید ہے کہ
اپنے سفر کے نتیجوں سے ان کو مطلع کر کے ان کو بھی فائدہ پہنچا
سکوں اور اس طرح پر جو عمدہ باتیں میں نے سیکھی ہیں ان کو بھی
سکھاؤں اور ان کو بھی اپنی پیروی کی ترغیب دوں۔“

مولوی سید مہدی علی خاں اپنی ایک تخریر میں لکھتے ہیں کہ ”جب سید احمد خاں
لندن جانے کو تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو
اس ارادہ کو پورا نہ کر سکتا۔ انھوں نے اپنے کتب خانہ کو بیچا، گھر اور کوٹھی کو

رہیں رکھا اور سفر کی تیاری کی انہوں نے بارہا مجھ سے اس بارہ میں پیشتر ذکر کیا تھا کہ میرا مقصود پورا نہیں ہو سکتا جب تک میں ہدایت خود اصول و طرز تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کر لوں۔“

الغرض یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ بنارس سے ولایت کو روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ دونوں بیٹے سید حامد مرحوم اور سید محمود اور تیسرے مرزا خداداد بیگ اور چوتھا اُن کا قدیم خدمتگار جھو بیچلہ آدمی تھے۔ بنارس سے لندن تک پہنچنے کے حالات انہوں نے بطور ایک سفرنامہ کے نہایت عمدگی سے بیان کیے ہیں جو سوسائٹی اخبار اور تہذیب الاخلاق میں چھپ گئے ہیں۔

سفرنامہ

اس سفرنامہ میں ہر ایک دلچسپ حال جو اشنائے راہ میں اُن کو پیش آیا ہے۔ قلبند کیا ہے اور سفر کی ضروریات جو ہر مسافر کو پیش آتی ہیں مفصل بیان کی ہیں اور وقتاً فوقتاً جو خیالات اپنے خاص مقصد یعنی وطن کی بھلائی کے اُن کے دل میں گذرے ہیں اُن کو ہر موقع پر ظاہر کیا ہے۔ جابجا ایشیا اور یورپ کی سوشل اور مورل حالتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ یورپ کے عجائبات ایسے طور پر بیان کیے ہیں جس سے پڑھنے والوں کو یورپ کے سفر کی ترغیب ہو۔

جس دھن میں سرستبد نے یہ سفر اختیار کیا تھا اُس کا ثبوت اس سفرنامہ میں نہایت وضاحت کے ساتھ ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سفرنامہ لکھنے والا وطن اور قوم کی خیر خواہی اور سہمدردی میں شور بور ہے بمبئی میں پہنچ کر کہیں وہ میمنہد مسلمانوں کے اخلاق، نام و نمود پر مرنے، جھوٹی شہنجا کرنے، مفید تعلیم پر متوجہ نہ ہونے اور گھروں پر مدرس تو کر رکھنے پر افسوس کرتا ہے اور

پارسیوں کی عمدہ حالت سے اُن کا مقابلہ کرتا ہے۔ کہیں پارسیوں کے صاف اُردو لہجے پر حیران ہوتا ہے اور اُن لوگوں پر تعجب کرتا ہے جو اُردو کو ہندوستان کی قومی زبان نہیں مانتے۔ کہیں گجراتی زبان کی کچھ عبارت نقل کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اُس میں بھی فارسی اور عربی الفاظ ملے ہوئے ہیں اور پھر سوال کرتا ہے کہ اگر آباد الیوسٹیشن کون کون سی زبان سے فارسی و عربی الفاظ نکال کر قدیم جہاں جاری کرے گی؟ مصر کی ریل کی تعریف کر کے افسوس کرتا ہے کہ ریل کا تمام سامان فرانس اور انگلستان کا بنا ہوا ہے، مصریوں کی چیز بنائی ہوئی نہیں۔ مسٹر وینس فٹز پیٹرک سے جہاز میں ملتا ہے اور پنجاب کی طرز حکومت کے ذکر میں اُس کو ایک ڈسپاک گورنمنٹ کا نمونہ بتلاتا ہے اور دلی کو قانونی اصلاح میں سے نکال کر پنجاب میں داخل کرنے کو صدر کی سنزائوں میں سے ایک سنزاق قرار دیتا ہے۔ فرانس کے نامور انجینیر ایم۔ دی سپس سے جس نے نہر سوئز نکالی ہے۔ جہاز میں ملنے پر بے انتہا خوشی اور فخر ظاہر کرتا ہے اور اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ جب انگریزوں نے اس کو ایڈمرالس دیتے وقت کہا کہ اس نہر کا نام نہر سپس رکھنا ضرور ہے تو ایم۔ دی سپس نے جواب دیا کہ میرا فخر اس میں ہے کہ اس کا نام نہر فرانس رکھا جائے۔ وہاں اُس کی وطن پرستی پر ہزار ہزار آفریں کرتا ہے اور اپنی قوم پر تفریق کہ اُن کا کام سوائے حسد، بغض، تشخص اور چھوٹی شجی کرنے کے کچھ نہیں اور اسی لیے وہ بد بختی اور ذلت میں گرفتار ہیں۔ اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ جس آبنائے پر محب وطن "گیری بالڈی" کا گھر ہے وہاں سے جہاز رات کو گذرا اور اُس پھونس کے جھونپڑے کی جو شہنشاہوں کے محلوں سے زیادہ ادب اور تعظیم کے قابل ہے۔ زیارت میسر نہ آئی۔ پیرس کی عمارتوں کی خوبی کا ذکر کرتے وقت

روضہ تاج گنج اور قطب کی لاٹ کو یاد کرتا اور اُس پر فخر کرتا ہے۔ وارسیل کے شہنشاہی محل میں حوض اور نہریں اور فوارے اور درختوں کی سوز و نیت دیکھ کر قلعہ دہلی کی نہر مارچنگ اور منہاب باغ کا حوض جس کے کناروں سے کبھی تین سو ساٹھ فوارے چھوڑتے تھے اور ساون بھاؤں کی کیفیت یاد کرتا ہے وارسیل میں تصویروں کا عالم دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ مگر الجزائر اثر کے محاربات کی تصویروں میں ایک سترقع دیکھ کر اس کے دل پر سخت چوٹ لگتی ہے جس کی وجہ سے وہ فرانس اور اُس کی بہادری و سولیزیشن کو قابلِ نفیر سمجھتا ہے۔ اُس نے ایک تصویر دیکھی ہے کہ سید عبدالقادر جزائری کی عورتیں گرفتار ہیں۔ فرانسیسی سپاہیوں نے اُن کے اونٹ بٹھا کر کباہہ کو گرا دیا ہے اور عورتیں اُس میں سے نکل پڑی ہیں اور اُن کے بدن پر سے کپڑا ہٹ گیا ہے۔ سپاہی سنگینیں اٹھائے ہوئے اور اُن کی نوکیں عورتوں کی طرف کیے ہوئے کہ گویا اب ماریں گے۔ ارد گرد کھڑے ہیں۔ اس تصویر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک غیرت مند مسلمان کے لیے اُن عورتوں کا ایسی بیکسی کے عالم میں دیکھنا، آنکھوں سے خون ٹپکانے کے لیے کافی ہے اور کہتا ہے کہ اس تصویر کو فرنچ سپاہ کی بہادری کی یادگار سمجھنا اور عورت کا کپڑا تصویر میں بدن پر سے ہٹا ہونا، فرانس کے لیے قابلِ شرم ہے اور اُس کی شائستگی کو دھبا لگاتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ "اس تصویر سے امام عبدالقادر کی حقارت نہیں ہوتی بلکہ اُس کی ویسی ہی عزت و دل میں پیدا ہوتی ہے جیسی الجزائر کی بادشاہت کے زمانہ میں تھی۔ وہ بیس برس تک تنہا فرانس جیسی سلطنت سے نہایت بہادری اور سچائی سے بغیر دغا اور فریب کے لڑتا رہا اور شکست کے بعد جن شرطوں پر صلح کی اُن کو اخیر عمر تک نباہ دیا۔" پھر ایک دوسرے موقع کی تصویر

دیکھتا ہے جس میں نپولین امام عبدالقادر کو قید سے چھوڑ رہا ہے اور اس کی ماں سے جو باہر پھرنے کا پورا پردہ دار لباس پہنے کھڑی ہے، مصافحہ کر رہا ہے۔ اس تصویر کو دیکھ کر نپولین کی فیاضی، دانائی اور سمیت کی تعریف کرتا ہے اس کے بعد وہ لندن پہنچتا ہے اور اپنے سفر نامہ کے خاتمہ پر ہندوستان کے تمام سنی شیعہ اور ہندوؤں کو آگاہ کرتا ہے کہ سب ہندوستانی اپنے اپنے مذہب کی پابندی کے ساتھ یہ سفر طے کر سکتے ہیں، پھر اپنے جان پہچان انگریزوں کی ملاقات کا ذکر کرنے کے بعد کلفٹن کے ٹکڑوں پر لے جانے کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ جو مدت سے ناتمام پڑا تھا اور جس کو سول انجینئرس انسٹیٹیوٹ کے ممبروں نے ایک ممبر کی بدنامی کے خیال سے یا ہم اتفاق کر کے اپنی فیاضی سے بنادیا۔ پھر اپنے ہم وطنوں کی طرف مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے ہم وطنو! بتاؤ کہ انسان یہ لوگ ہیں یا ہم جو حیوانوں کی طرح اپنی خود غرضیوں میں مبتلا ہیں اور اپنے ہر ایک کام کا بندوبست گورنمنٹ سے چاہتے ہیں کہ ہمارے لوگوں کو بھی وہی پڑھائے ہماری مذہبی تعلیم کا بھی وہی انتظام کرے۔ پھر ایک رصد گاہ کا ذکر لکھ کر کہ ایک عورت اس کا تمام کام انجام دیتی ہے اپنے ملک کے مدعیان علم و فلسفہ و منطق کو شرمندہ کرتا ہے۔

یہ سفر نامہ نہایت دلچسپ طریقہ سے لکھا شروع ہوا تھا، مگر جب اس کے کچھ حصے ہندوستان میں شائع ہوئے تو مسلمانوں کی طرف سے اس پر اعتراضوں کی بوجھاڑ پڑنی شروع ہوئی اور سرسید کو بھی لندن ہی میں لوگوں کی مخالفت کا حال معلوم ہوا۔ ابھی حضرت کے کان ایسی مخالف صدوں سے زیادہ آشنانہ تھے۔ اس لیے انھوں نے ناراض ہو کر سفر نامہ لکھا سو تو

کمر دیا۔ مگر زمانہ بہ آواز بلند کہہ رہا تھا۔
 ابتلائے عشق ہے تو ما ہے کیا آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا

لندن کے عمائد سے ملنا

انغرض سرسید بمبئی سے چوبیس دن میں لندن پہنچے اور میکین برگ اسکوائر
 میں ایک مکان کرایہ پر لے کر ٹھہرے اور اپنے تمام دوستوں اور آشناؤں سے
 ملے۔ لارڈ لارنس سب سے زیادہ مہربانی مروت اور خلق سے اُن کے ساتھ
 پیش آئے، جیسے کہ وہ ہمیشہ ہندوستان کے مسافروں کے ساتھ پیش آتے
 تھے۔ وہ ہندوستان میں سرسید اور اُن کے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے۔
 اور اُن کی خدمات سے آگاہ تھے۔ لندن میں وہ اکثر ان کو اپنے گھر ڈنر پر بلاتے
 تھے اور مہینے میں ایک بار ہمیشہ اُن سے ملنے کو آتے تھے۔ انہوں نے ہی سرسید
 کو لندن کے اکثر امرا و مشاہیر سے ملوایا تھا، لارڈ اسٹینلی اورن ایڈمرلی
 جو قسطنطنینہ میں بطور سفیر انگریزی کے رہتے تھے وہ بھی جب لندن میں آئے
 تھے تو سرسید سے ملتے رہتے تھے۔ سر جان دلیم کے انڈسکریٹری وزیر ہند
 کے ساتھ بھی سرسید کو زیادہ خصوصیت ہو گئی تھی۔ ملکہ وکٹوریہ کے سہ ماہی ڈیوک
 آرن آرگائل جو اُس وقت وزیر ہند تھے اور سائمنٹاک سوسائٹی علی گڑھ
 کے پٹرن بھی تھے وہ بھی سرسید سے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ
 ملتے رہے اور اپنے بیٹے مارک کوئس اورن سے بھی جو ملکہ وکٹوریہ کے داماد
 ہیں اُن کو ملایا۔

جلسہ سول انجینئرس سوسائٹی میں شریک ہونا

سر سید نے پورے سترہ مہینے لندن میں قیام کیا اور شب و روز اُن کاموں میں جمے کہ یہ سفر اختیار کیا تھا مصروف رہے۔ ہا اینہہ اُن کو اکثر خاص خاص تقریبوں میں بلایا جاتا تھا اور اُن کی عزت افزائی کیجاتی تھی۔ ۲۳ جون ۱۸۶۹ء کو وہ لارڈ لارنس کے ہاں ایک بہت بڑے ڈنر پر بلائے گئے اور ۱۳ جولائی کو سمٹوئین سوسائٹی اور سول انجینئرس کے ایک عظیم الشان جلسہ میں اور اُس کے بعد جو اُسی کے متعلق گریچ میں ڈنر ہوا اس میں شریک ہوئے۔ اس جلسہ کی کیفیت ڈیلی نیوز مورخہ ۲۱ جولائی میں مفصل درج ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسٹر پین نے جو سوسائٹی مذکورہ کے پریسیڈنٹ تھے، سر سید کو اس جلسہ میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا تھا اور لکھا تھا کہ آپ وقت متعین پر میرے اسٹیمر میں جو پارلیمنٹ ہوس کے سامنے موجود ہو گا آئیں۔ مگر خود لارڈ لارنس سر سید کے مکان پر آئے اور اُن کو اپنے ساتھ سوار کرا کے لے گئے۔ سید حامد اور سید محمود بھی ساتھ تھے اسٹیمر میں جا کر حاضری کھائی اور ٹیمز کے کنارے پر جو بڑے بڑے کارخانے تھے دیکھے۔ پھر خاص اجازت سے ایک جگہ جہانہ اور اس میں توپیں بھرنے اور چلانے کا تماشا دیکھا۔ وہاں سے گریچ میں جا کر ڈنر کھایا۔ اس ڈنر میں کئی ڈیوک اور بہت سے لارڈ اور بڑے بڑے انجینئرس شریک تھے۔ کھانے میں طرفہ بات جیسا کہ ڈنر مذکور کی مینیولہ

لے مینیولہ ایک خوبصورت چھاپا ہوا کاغذ ہوتا ہے جس پر ڈنر کے تمام کھانوں کی تفصیل ہوتی ہے اور کھانے کے وقت ہر ایک مہمان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس ڈنر کا مینیو سر سید کے کاغذات میں اب تک موجود ہے جس میں تیس کھانوں کے نام لکھے ہیں ۱۲۔

میں مندرج ہے۔ یہ تھی کہ تیس طرح کے کھانے صرف دریائی پیداوار اور دریائی جانوروں سے تیار کیے ہوئے تھے؛ خشکی کی پیداوار سے کوئی چیز میسر نہ تھی تمام انجینیروں نے جو اس جلسہ میں شریک تھے کھانے کے بعد سمجھیں دیں اور سال گذشتہ کی مختلف ترقیات کا اجرا انجینرنگ میں ہوئیں ذکر کیا۔ سب کے بعد پریسیڈنٹ نے سپیچ دی اور آخر میں لارڈ لارنس اور سر سید کا ذکر کر کے ان کے شامل ہونے پر فخر ظاہر کیا اس کے شکریہ میں لارڈ لارنس نے تقریر کی اور سر سید کے پاس ایک ترجمان کو اس غرض سے بٹھا دیا تھا کہ جلسہ کی تمام کارروائی کو ان کو اردو میں سمجھاتا جائے، لارڈ لارنس کے بعد سر سید اٹھے۔ ایک ایسے جلسے میں جہاں انگلستان کے نامور انجینر جمع ہوں اور جلسہ کا موضوع انجینرنگ کے سوا اور کوئی مضمون نہ ہو، سر سید کو گفتگو کرنا نہایت دشوار تھا۔ باوجود اس کے ڈیلی نیوز نے اسی زمانہ میں لکھا تھا کہ سید احمد خاں کی اسپیچ شاندار اور دلچسپ تھی۔ پریسیڈنٹ نے لارڈ لارنس کو سیویر آف انڈیا کہا تھا، سر سید نے ان کو فائو آف انڈیا کہہ کر یاد کیا۔ سر سید کی اسپیچ کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا رعب و داب اور دبدبہ پیدا ہونے کے بہت سے فواید ہیں۔ مثلاً تعلیم، ہتھیار اور عدل و انصاف وغیرہ، مگر یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن سے صرف انہیں لوگوں کے دل میں اس کی وقعت پیدا ہوتی ہے جن کو ان سے کام پٹا ہے یا جن کو ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ لیکن وہ چیز جس نے خاص و عام سب کے دل میں انگلش گورنمنٹ کی عظمت پیدا کی ہے وہ فن انجینری کے نتائج ہیں۔ جیسے ریل۔ بڑے بڑے دریاؤں کے پل، نہریں اور بڑے بڑے پہاڑی چھتے جن میں سے ریل گذرتی ہے۔ ان چیزوں کو ہر شخص دیکھتا ہے اور اس کے دل میں خود بخود انگریزی

سلطنت کا رعب و داب اور اُس کی بڑائی پیدا ہوتی ہے۔ اس پر جلسہ میں نہایت زور سے چیر زوی گئیں اور جب لارڈ لارنس نے اُس کو انگریزی میں ترجمہ کر کے سنایا تو پہلے سے بھی زیادہ چیر ز کا غل ہوا۔ سرسید کہتے ہیں کہ میرا ارادہ اسپیچ کرنے کا پہلے سے نہ تھا مگر چونکہ میری نسبت ایسے الفاظ کہے گئے تھے جن کا شکریہ ادا کرنا ضرور تھا اس لیے مجھ کو بھی کھڑا ہونا پڑا۔

خطاب اور تمغہ ملنا

۲۸ اگست ۱۸۶۹ء کو انڈیا اوفس میں ڈیوک آف ارگائل کے ہاتھ سے اُن کو سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب اور تمغہ ملا۔ اُس کی تحریک لارڈ لارنس نے کی تھی۔ تاریخ معین پر سرسید انڈیا آفس میں گئے، وہاں سر جان ڈبلیو کے انڈر سکرٹری وزیر ہند آئے اور سرسید سے ہاتھ ملا کر اُن کو اپنے ہمراہ اُس کمرے میں لے گئے جہاں ڈیوک آف ارگائل اُن کے منتظر تھے۔ ڈیوک کھڑے ہو کر چہنہ قدم آگے بڑھے اور سرسید سے ہاتھ ملا کر پھر اپنے بیٹے مارکونس آف لارن سے ملاقات کرائی اور تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد تمغہ اپنے ہاتھ سے پہنچایا اور مبارک باد کہہ کر سرسید کو رخصت کیا، اُسی روز چار اور شخصوں کو بھی یہی تمغہ ملنے والا تھا، جب سب کو تمغے مل چکے تو ڈیوک موصوف نے سرسید کو کھانے پر بلایا جہاں بہت سے معزز لوگ اور پارلیمنٹ کے ممبر آئے تھے۔ سرسید کو اس موقع پر ڈیوک کے برابر بائیں جانب جگہ دی گئی تھی۔ لطیفہ جس زمانہ میں سرسید کو ولایت میں سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اُس کے کچھ دنوں بعد راجہ جیکین داس صاحب کو یہی خطاب ہندوستان میں بمقام علیگڑھ ملا تھا اور اس کے تمام مراسم سوسائٹی کے بڑے ہال میں آئے تھے۔

جب جلسہ برخواست ہوا اور راجہ صاحب کے تمام دوست اُن کو مبارکباد دینے لگے، سو سائٹی کا ایک ملازم ہر ایک کی زبان سے سی۔ ایس۔ آئی کا لفظ سننا تنہا اور نہایت تعجب کرتا تھا۔ باہر آکر اور نوکروں سے کہنے لگا ارے یارو عجب تماشا ہے سید احمد خاں تو خیر! لندن گئے تھے وہاں جا کر عیسائی ہوئے کسی نے جانا کس نے نہ جانا، ان راجہ صاحب کو کیا ہوا تھا۔ کہ یہ ہندوستان ہی میں بھرے جلسہ کے اندر عیسائی بن گئے۔ لوگوں کی زبان سے جو بار بار سی۔ ایس۔ آئی کا لفظ نکلتا تھا وہ اس کو عیسائی سمجھتا تھا۔

ملکہ معظمہ کی لوی وغیرہ میں بلایا جانا

۶ نومبر ۱۹۶۹ء کو ملکہ معظمہ کے ہاتھ سے بلیک فرائزر ریم ج، ہا بھورن اور ایڈکٹ کے افتتاح کا جلسہ ہونے والا تھا، جلسہ کی انتظامی کمیٹی نے سرسید کو بھی خاص طور پر وہاں مدعو کیا تھا۔ سرسید کہتے ہیں کہ یہ جلسہ نہایت شان و شوکت کا تھا۔

پھر ۱۱ مارچ ۱۹۷۰ء کو ملکہ معظمہ کی لوی میں اُن کو بلایا گیا۔ سرسید کہتے ہیں کہ حسب معمول لوی کے محل میں مجھ کو اور درباریوں کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا۔ جب ملکہ معظمہ تشریف لائیں تو میں نے بھی مثل تمام درباریوں کے اپنے نمبر پر سامنے جا کر سلام کیا۔ سلام کرنے کا دستور یہ ہے کہ ملکہ معظمہ سے ہاتھ ملا کر اور بایاں گھٹنا ٹیک کر حضور ممدوحہ کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہیں۔ جب تک تمام درباریوں کا اس طرح سلام نہیں ہو لیتا اُس وقت تک ملکہ کھڑی رہتی ہیں۔

پرنس آف ویلز کی لوی میں بلایا جانا

اس کے بعد شہنشاہ کو پرنس آف ویلز کی لوی میں اُن کو شریک کیا گیا۔ یہ لوی صرف فوجی افسروں کے لیے تھی، کسی سویلین کو اُس میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی، مگر چونکہ سر سید ولایت سے جلد واپس آنے والے تھے اور ممکن تھا کہ اُن کو پھر پرنس آف ویلز کی کسی لوی میں شریک ہونے کا موقع ملے۔ اس لیے اُن کو خاص اجازت لوی میں شریک ہونے کی مل گئی تھی۔

اتھینیم کلب کی ممبری

لندن کی علمی مجلسوں میں بھی سر سید شریک ہوتے رہے۔ لندن جانے سے پہلے جیسا کہ دوسرے باب میں ذکر ہو چکا ہے وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے فیلو مقرر ہو چکے تھے۔ جب لندن میں گئے تو اس کے کئی اجلاسوں میں شریک ہوئے وہ کہتے ہیں کہ چارلس ڈکنس کی آخری ریڈنگ پر بھی میں وہاں موجود تھا، لیکن سب سے بڑا امتیاز جو اُن کو لندن میں ایک علمی حیثیت سے ملا وہ اتھینیم کلب کا آئریری ممبر مقرر ہونا تھا۔ یہ کلب لندن میں سب سے زیادہ نامی اور معزز ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی کلب مغرر نہ خیال نہیں کیا جاتا۔ کوئی شخص جو مشہور مصنف یا کسی دوسرے کمال علمی میں ممتاز نہ ہو وہ اس کلب میں ممبر نہیں ہو سکتا۔ اس کے ممبروں کی تعداد بارہ سو تک محدود ہے۔ سیکڑوں آدمی درخواستیں دے دیکر یہاں کی ممبری کے امیدوار رہتے ہیں سر سید کہتے تھے کہ شاید میں جب کہ میں وہاں موجود تھا تین ہزار سے زیادہ امیدواروں کا نام درج رجسٹر تھا اور دس دس بارہ بارہ برس امیدواری پر

گندہ گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جو شخص اس کلب کا ممبر مقرر ہوتا ہے اُس کے دوست اس کو مبارکباد کی چٹھیاں لکھتے ہیں اور اس کو ایسا فخر ہوتا ہے کہ ویسا فخر اکثر خطابوں کے ملنے پر بھی نہیں ہوتا۔

غرض کہ سرسید خاص قاعدے سے جو نامور مشہور باکمال لوگوں کے لیے مقرر ہے دو دفعہ ایچیفیم کلب کے آنریری ممبر مقرر ہوئے اور جب تک لندن میں رہے اُس کے ممبر رہے اس کلب کی ممبری کی تحریک مسٹر اڈورڈ ٹامس نے کی تھی جو سرسید کی منفی کے زمانہ میں دلی کے جج تھے اور جنہوں نے اُن کو آثار الصنادید کے دوبارہ لکھنے اور ترسیم کرنے کی صلاح دی تھی۔

کیمبرج یونیورسٹی میں جانا

آثار الصنادید کا مترجم گارساں و تاسی جو فرانس کے مشہور مستشرقین میں سے تھا وہ بھی لندن ہی میں سرسید سے خط کتابت اور شوق ملاقات رکھتا تھا۔ مگر یہ تمام اعزاز و اقیانہ اور خاطر و مدارات جن کا ہندوستان سے چلتے وقت سرسید کو سان گمان بھی نہ تھا۔ یہ سب ضمنی اور غیر متوقع امور تھے۔ اُن کے اصلی مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقہ تعلیم کو دیکھنا اور اُس پر غور کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس غرض سے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا اور ٹری سے ٹری اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر جو یونیورسٹی سے علاقہ رکھتی تھی غور کی اور اس کا تمام نقشہ ذہن نشین کر لیا۔ پھر ملک کی عام تعلیمی حالت کا اندازہ کیا، تعلیم نسواں کو غور کی نگاہ سے دیکھا اور تعلیم کے مختلف

طریقوں میں سے جو طریقہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کے مناسب سمجھا
اُس کو نگاہ میں رکھا۔ اگرچہ انگریزی زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے ضرور ہے کہ
اُن کو ہر ایک بات کے سمجھنے اور دریافت کرنے میں سخت دقتیں اٹھانی
پڑی ہوگی، اور شاید اُن کو پوری واقفیت حاصل نہ ہو سکی ہو، مگر جو نتیجے اس
ادھوری واقفیت سے ہندوستان میں ظاہر ہوئے وہ بلکہ اُن کا عشر عشر
آج تک اُن ہندوستانیوں کی پوری واقفیت سے بھی ظہور میں نہیں آیا جو
ولایت سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم پا کر آئے ہیں۔

انگلستان کی تعلیم و ترقی پر غور کرنا

انگلستان کے طریقہ تعلیم پر غور کرنے کے بعد سرسید نے لندن ہی
میں ایک پمفلٹ انگریزی میں شائع کیا جس میں ہندوستان کے طریقہ تعلیم کے
نقصانات تفصیل کے ساتھ ظاہر کیے تھے۔ تعلیم کے سوا یورپ کی عام شائستگی
اور طرز تمدن اور حسن معاشرت اور ہر قسم کی ترقیات کے اسباب جیسا کہ اُن
کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیے اور جہاں تک ممکن تھا اپنی
معلومات کو وسعت دی۔ یورپ کے طریق معاشرت کو دیکھا۔ وہاں کے
اسرا کے محل اور مکانات اور طرز ماند و بود پر نظر کی۔ عجائب خانوں اور کتب
خانوں میں علوم اور تحقیقات کے ذخیرے ملاحظہ کیے۔ انجینیری کے عجائبات
جہازوں کی تیاری، توپوں کا ڈھلنا، سمندری تار کا بٹنا، انجینروں اور عالموں کی
سوسائٹیاں، عام کارگیروں اور اہل حرفہ کے کام اور عموماً اہل انگلستان
کے علمی ذوق و شوق اور علمی ترقیات کو دیکھا جس سرگرمی کے ساتھ
اہل مذہب مذہب کی حمایت کرتے ہیں اور باوجود اس کے نہایت سبب تعصبی

سے غیر مذہب والوں کے ساتھ پیش آتے ہیں اور جو اخلاق کہ وہ بڑے وسیعوں اور مہانوں کے ساتھ برتتے ہیں، یہ سب کچھ دیکھا۔ اُن کے عیبوں سے قطع نظر کی اور ان کی خوبیوں کو چُنا اور یہ سب کچھ ایک تماشائی کی طرح سیر تماشے اور دل لگی کے طور پر نہیں بلکہ ایک وطن دوست کی طرح دلسوزی، غیرت اور ہجرت کی نگاہ سے دیکھا اور انگلستان کی حالت کو اپنے ملک کی حالت سے مقابلہ کر کے اپنے درد دل کو بڑھایا اور اُس درد کو دوسروں کے دلوں میں درد پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بنایا۔ وہ مولوی سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں ولایت سے لکھتے ہیں "میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسہ میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے کئی سو مرد اور لپیڈیاں خوبصورت، خوش کلام اور قابلِ جمع تھیں، پوچھا کہ "کہو لندن بہشت ہے۔ اور حوروں کا ہونا پسند ہے یا نہیں؟ مگر ہماری قسمت میں وہی جلتا ہے یہاں کا حال دیکھ دیکھ اپنے ملک اور قوم کی حماقت، بیجا تعصب، موجودہ تناسل اور آئندہ ذلت کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہوطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔"

اُن کا ارادہ تھا کہ انگلستان اور ہندوستان کی حالت میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے اُس کو اپنے سفر نامہ میں مفصل بیان کر کے اہل وطن کو خبردار کریں مگر اہل وطن نے اُس کو براہِ داشت نہ کیا۔ وہ اپنی پستی کی درد انگیز داستان نہ سن سکے اور اس لیے جو سلسلہ سرسید نے اپنے سفر کے حالات کا لکھنا شروع کیا تھا، وہ منقطع ہو گیا۔ بالینہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے سفر کے حینِ جتنہ حالات لکھنے سے دست بردار نہیں ہوئے اور جب کبھی موقع ملا انھوں نے کوئی نہ کوئی بات اہل وطن کے کان میں ڈال دی۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو انھوں نے ایک لمبی نثریہ سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجی جس میں چھ مہینے کے حالات مختصر طور پر بیان کیے تھے اور یورپ کی ترقی اور اپنے ملک کے ادوار اور منزل کی مثالیں پیش کر کے اہل وطن کو غیرت دلائی تھی جب اس نثریہ کا نتیجہ بھی سوا اس کے کہ لوگ برا فروختہ ہوں اور برا بھلا کہیں، کچھ حاصل نہ ہوا تو ۲۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو ایک دوسری تحریر بعنوان "عذرا ز طرف گنہگار سید احمد" ہندوستان میں بھیجی۔ پھر ایک اور تحریر بعنوان "عرضداشت سید احمد بخدمت اہل وطن" اخبار میں چھپنے کے لیے روانہ کی۔ ان تمام تحریروں کے دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس زمانے میں سر سید کو اہل وطن کی بھلائی کا کس قدر خیال تھا۔ گو ان تحریروں سے قوم و ملک کے کان پر جوں نہیں چلی، مگر درحقیقت یہ سب تمہیدیں تھیں اُن کارروائیوں کی جو آخر کار ہندوستان میں پہنچ کر سر سید کے ہاتھ سے ظہور میں آنے والی تھیں۔

خطبات احمدیہ کا لکھنا اور چھپوانا

ان سب باتوں کے سوا سر سید کا سب سے زیادہ ضروری اور اہم مقصد ولایت کے سفر سے ایک ایسی کتاب کا لکھنا اور انگریزی میں اُس کا ترجمہ کرنا تھا جس سے اسلام کی اصلیت عیسائی قوموں پر ظاہر ہو اور جو غلطیاں اکثر عیسائی مصنفوں نے اور خاص کر سر ولیم میور نے اپنی کتاب "لائف اوف محمد" میں اسلام کی حقیقت اور بانی اسلام کے کیر کفر ظاہر کرنے میں دانستہ یا نادانستہ کی ہیں اُن کو رفع کیا جائے۔ سر ولیم میور کی کتاب کی نسبت اکثر انگریزوں کا یہ خیال تھا کہ اسلام کے متعلق

جو ٹھیک اطلاق سرورلیم نے اہل پور پ کو دی ہیں وہ پہلے کسی دوسرے ذریعہ سے اُن کو حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ مگر درحقیقت یہ کتاب صرف عیسائیوں ہی کو اسلام اور بانی اسلام کی طرف سے گمراہ کرنے والی نہ تھی بلکہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف سے شک میں ڈالنے والی تھی۔

اس کتاب کے مضامین کی تفصیل اور جو وقتیں سرسید کو اس کے لکھنے اور چھپوانے میں پیش آئیں اور جس جوش اور اُسٹک سے انھوں نے یہ کتاب لکھی اور جو رائیں انگریزوں نے اُس پر دیں، یہ سب امور ہم دوسرے حصہ میں بیان کریں گے۔ یہاں صرف اس قدر کہتے ہیں کہ ولایت میں سرسید نے کتاب کی لاگت بڑھ جانے کے خوف سے صرف اپنی یادداشتوں کا خلاصہ انگریزی میں ترجمہ کہہ کے چھپوایا تھا مگر ہندوستان میں پہنچنے کے بہت بعد انھوں نے اُس کو اردو میں بھی اپنی پوری یادداشتوں سے از سر نو مرتب کر کے تصانیف احمدیہ کے ساتھ بڑی تفصیل پر شایع میں چھپوایا تھا جس میں ہر ایک مضمون بہ نسبت انگریزی کے زیادہ وسعت کے ساتھ بیان ہوا ہے مگر چونکہ اس کی جلدیں بہت ہی کم چھپوائی گئی تھیں اس لیے اُس کی زیادہ اشاعت نہیں ہو سکی۔ خطبات احمدیہ لکھنے کے سوا انھوں نے ولایت ہی میں اور بھی اسلام کی بعض خدمتیں انجام دی ہیں جن کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائے گا۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرسید نے جس تحریر کے ذریعہ سے ولایت جانے کے لیے گورنمنٹ سے اجازت چاہی تھی، جو کچھ اس تحریر میں لکھا تھا، اُس سے بہت زیادہ اپنے ارادوں کو پورا کر کے دکھایا۔ وہ لندن سے نہایت

قیمتی اطلاعاتیں سیکر ہندوستان میں آئے جہاں سے انھوں نے ملک اور قوم کو
 بے انتہا فائدہ پہنچایا۔ شمالی ہندوستان میں ان سے پہلے ظاہر کسی ہندو یا مسلمان
 نے اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے ولایت نہیں بھیجا تھا۔ غالباً سید محمود شمالی
 ہندوستان میں پہلے شخص ہیں جو ولایت سے بیرسٹری کا ڈپلوما لے کر آئے
 محض انھیں کی ریس سے اس ملک کے ہندو مسلمانوں کو اپنی اولاد کے ولایت
 بھیجنے کا حوصلہ پیدا ہوا اور انھیں کی دیکھا دیکھی ولایت جانے والے ویسی
 طالب علموں کا ہندوستان سے انگلستان تک تانتا بندھ گیا۔ جس زمانہ
 میں سرسید ولایت گئے ہیں انھیں دنوں میں سائنٹفک سوسائٹی اخبار علیگرھ
 میں چھپا تھا کہ "سید احمد خاں کے ولایت جانے سے ہندوستانیوں کے واسطے
 ایک عمدہ مثال قابل تقلید قائم ہو گئی ہے چنانچہ کلکتہ کے ایک نوجوان
 مسلمان سید امیر علی (جواب آنریبل سید امیر علی سی۔ ایس آئی بیرسٹریٹ لا
 اور جج ہائی کورٹ کلکتہ ہیں) لندن روانہ ہوئے ہیں اور بہت سے ولایت
 جانے کو تیار ہو رہے ہیں۔" سید امیر علی نے صرف ولایت کا سفر کرنے
 ہی میں سرسید کی تقلید نہیں کی بلکہ اسلام کی خدمت کرنے میں احساس کی
 عموماً یورپین قوموں پر ظاہر کرنے میں بھی انھوں نے سرسید کا پورا پورا
 اتباع کیا ہے۔ ان کی دو با وقعت کتابیں "لائف اوف محمد" اور "اسپرٹ
 اوف اسلام" جو انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں اس دعوے کی شاہد ہیں۔
 نواب حسن الملک اپنی ایک نثر میں آنریبل حاجی اسماعیل خاں کو لکھتے
 ہیں کہ "سید احمد خاں ولایت گئے، مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے
 اُس قوم کو جو اس وقت تمام اقوام روٹے بین پر شرف رکھتی ہے انھیں
 کے گھروں میں اور انھیں کے ملک میں دیکھیں اور جو کچھ وہاں دیکھا ہے۔"

واپس آکر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت میں جا کر تماشا گاہ، تھیٹر، پارک میوزیم اور عمارات کی سیر کرتے ہیں۔ اور یہ حامی دین اسلام کتب خانہ میں بیٹھا ہوا خطبات احمدیہ کی تصنیف میں منہمک تھا اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا، رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے۔

الغرض سرسید ایک سال اور پانچ مہینے لندن میں قیام کرنے کے بعد ۴ ستمبر ۱۸۵۹ء کو مع سید حامد مرحوم کے لندن سے ہندوستان کو روانہ ہوئے۔ ان کی روانگی کے بعد ایک سلبا مضمون ہندوستان کے ایک مسلمان مقیم لندن سید عبداللہ نام نے اخبار ہوم ورڈ میل مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۸۵۹ء میں سرسید کی نسبت چھپوایا تھا جو سوسائٹی اخبار مورخہ ۱۱ نومبر ۱۸۵۹ء میں بھی نقل کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں سے چند فقرے مختلف مقامات سے سے میاں لکھے جاتے ہیں ”جن انگریزوں سے میاں یعنی انگلستان میں ان کی ملاقات ہوئی ان پر ان کی عام بیباقت کا اور اس بات کا کہ جن شخصوں نے ان سے ہندوستان کی بابت گفتگو کی ان سب کو ہر ایک امر سے بخوبی آگاہ کر دیا، بہت عمدہ اثر ہوا، میاں کے بہت سے مدیران سلطنت کی رائے ہے کہ، اگر ہم ایک ایسے لائق اور واقف کار ہندوستانی مسلمان سے جیسے کہ سید احمد خاں ہیں، نہ ملتے تو ہندوستانیوں کی بیباقت کی نسبت ہماری رائے ہمیشہ ضعیف اور لودھی (پورا) ہوتی۔“ اس مضمون کے لکھنے سے میری یہ غرض ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جو ہندوستانی تربیت یافتہ اور مہذب ہوتا ہے اس کی اہل یورپ کیسی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں.... سید احمد خاں

کی بدولت اس بات کا ثبوت حاصل ہونے سے بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اس ملک میں ہندوستان کے ایک شریف آدمی کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے اور اعلیٰ درجہ کے انگریز اس سے بڑی محبت اور تواضع اور تکریم سے پیش آتے ہیں۔“

پانچواں باب

۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۸ء تک

ولایت سے واپس آنا۔ تہذیب الاخلاق جاری کرنا۔ کمیٹی
خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان۔ کمیٹی خزانہ البضاعة ڈاکٹر ہنٹر کی
کتاب پر ریویو۔ ابتدائی مدرسہ علیگڑھ میں قائم کرنا۔ کالج فوڈلین
سٹون۔ چندہ وصول کرنیکی تدبیریں۔ عمارات کالج۔ کالج کلاس قائم
ہونی۔ تفسیر القرآن۔

ولایت سے ہندوستان میں واپس آنا

۲ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو سر سید مع سید حامد مرحوم کے ولایت سے بعثتی پہنچے
اور اسی مہینے میں بنارس پہنچ کر اپنے عہدہ کا چارج لیا۔ یہاں آنے ہی انھوں
نے اس بڑے کام کی بنیاد ڈالنی شروع کی جس کے لیے درحقیقت ولایت کا
سفر اختیار کیا تھا۔ مسلمانوں کی تعلیم کا منصوبہ جو انھوں نے ولایت جانے سے
بہت پہلے باندھا تھا اس کے پورا کرنے میں ظاہراً ان کو دوست مزاحمتیں نظر
آتی تھیں۔ اول مسلمانوں کے مذہبی اوہام، انگریزی تعلیم سے ان کی نفرت اور کجوشی
کے مفہوم سے ناواقفیت۔ اس مزاحمت کے دور کرنے کے لیے انھوں نے
ولایت پہنچتے ہی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی۔ سفر کے حالات اور متعدد ڈرائیکل

جو انھوں نے لندن سے لکھکر بھیجے اور سوسائٹی اخبار میں شائع ہوئے اُن میں طرح طرح سے مسلمانوں کو غیرت لائی تھی اور جا بجا اُن کے تنزل پر افسوس ظاہر کیا تھا اور انگریزی تعلیم کی ضرورت بیان کی تھی لیکن ان تحریروں کا اثر مسلمانوں پر کچھ نہیں ہوا۔ دوسری مزاحمت اُن کو یہ معلوم ہوتی تھی کہ اُن کا ارادہ جیسا کہ آگے مفصل بیان کیا جائے گا کافی مواقع ہندوستان میں پہنچ کر ایک محمدن یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا، کیونکہ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم سے ہندوستانیوں میں حقیقی بباقت پیدا ہونے کی اُن کو ہرگز امید نہ تھی۔ اس لیے ضرور تھا کہ گورنمنٹ کے طریقہ تعلیم کو مسلمانوں کے لیے ناکافی اور ہندوستان کے ایجوکیشنل سسٹم کو غیر مفید قرار دیا جائے۔ چنانچہ اسی بنا پر انھوں نے ولایت میں ایک پمفلٹ انگریزی زبان میں شائع کیا تھا جس کا عنوان ”ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیمی پر اعتراضات تھا مگر چونکہ اُس میں سرستید نے اپنا ذاتی رائے لکھی تھی اس لیے اُس سے بھی کسی نتیجہ کے پیدا ہونے کی امید نہ تھی۔ ان دونوں رکاوٹوں کے دور کرنے کے لیے انھوں نے ہندوستان میں پہنچ کر دوبارہ بڑے کام ایک ساتھ شروع کیے۔

تہذیب الاخلاق

اول مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح اور اُن کو ترقی کی طرف مائل کرنے کے لیے پرچہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ انھوں نے اس پرچہ کے نکالنے کا ارادہ ولایت ہی میں کر لیا تھا کیونکہ تہذیب الاخلاق کی پیشانی پر جو اس کا نام اور بیل چھپتی تھی اُس کا ٹائپ وہ لندن سے ہوا کر اپنے

ساتھ لائے تھے۔ الغرض سرسید اور اُن کے دوستوں کی ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کے ہر ایک ممبر سے تہذیب الاخلاق کے اخراجات کے لیے ساڑھے دو سو روپیہ سالانہ اور عام خریداریوں سے ساڑھے چار سو روپیہ سالانہ لینا قرار پایا تھا۔ یکم شوال ۱۲۸۶ھ ہجری مطابق ۲۲ دسمبر ۱۸۶۸ء کو اس کا اول نمبر شائع ہوا اور پہلی بار شوال ۱۲۸۷ھ سے رمضان ۱۲۹۳ھ یعنی پورے چھ برس تک ہر نمبر نکلتا رہا اور ہمیشہ اُس کے اڈیٹر اور منیجر خود سرسید رہے چونکہ یہ پرچہ کوئی منجھاتی اخبار نہ تھا بلکہ محض قوم کی بھلائی کے لیے جاری کیا گیا تھا، اس لیے جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ اُسی کی ترقی میں صرف کی جاتی تھی۔ اُس کی اخیر جلدوں میں ہر نمبر کی پیشانی پر بطور مالو کے یہ عربی فقرہ لکھا جاتا تھا: **لَا تَحِبُّوا الْفَقْرَ مِنْ اِلٰہِیْکُمْ فَمَنْ یَسَّحْ فِیْ اَعْزَاقِہِمْ اِنَّمَا یَسْعٰ فِیْ اَعْزَازِہِمْ سَبْحًا**۔

تہذیب الاخلاق ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے تقریباً ویسا ہی پرچہ تھا جیسے اسٹیل اور اولین نے دو میگزین یعنی ٹینکر اور اسپیکٹیر نوٹ بہ نوبت لندن میں نکالے تھے اور ۱۸۴۰ء سے ۱۸۵۰ء تک جاری رہے۔ ان دونوں پرچوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُن سے انگریزوں کے اخلاق عادات، رسم و رواج اور قومی خیالات پر بہت بڑا اثر ہوا تھا۔ اگرچہ اُس وقت انگلستان کی حالت کیا باغبار علوم و فنون اور کیا باغبار اخلاق و معاشرت کے آج کل کی حالت سے کچھ نسبت نہ رکھتی تھی مگر مذہبی خیالات اس عام رفتار پیش کی بدولت جو لو قصور اور کالون نے کی، بہت کچھ اصلاح پا چکے تھے۔ اس لیے ان دونوں پرچوں میں مذہبی چھیڑ چھاڑ بہت کم ہوتی تھی اور اسی وجہ سے وہاں ان پرچوں کی کچھ مخالفت نہیں ہوئی۔ لیکن تہذیب الاخلاق کا حال ایسا نہ تھا اس میں مذہبی بحث کرنی لازم آ پڑی تھی، کیونکہ جو باتیں مسلمانوں کی دنیوی ترقی کی مانع تھیں وہ زیادہ تر مذہبی خیالات پر مبنی تھیں، اگرچہ اس پرچہ

میں مضمون لکھنے والے بہت سے لوگ تھے مگر سب سے زیادہ سرگرم خود
سر سید، پھر مولوی سید مہدی علی خاں اور پھر مولوی چراغ علی تھے۔ سر سید
مذہب کے سوا اخلاق و معاشرت و تمدن پر بھی اکثر مضامین لکھتے تھے مگر
پچھلے دونوں شخص زیادہ تر مذہب پر لکھنے والے تھے۔

اس پرچہ کے دو ہی تین نمبر بچنے پائے تھے کہ چاروں طرف سے اُس
کی مخالفت ہونی شروع ہوئی اور ساتھ ہی اس مدرسہ سے بھی جس کو سر سید
قائم کرنا چاہتے تھے عموماً سو وطن پیدا ہونے لگا۔ بہت سے اخباروں میں
مخالفاً مضمون چھپنے لگے اور چین پرچے جن میں سے کانپور کا نورالافاق
اور نورالانوار زیادہ مشہور تھا، تہذیب الاخلاق کے نوٹ پر جاری کیے گئے بحالہ
اشاعت السنۃ جو خاص اہل حدیث کی تائید کے لیے جاری ہوا تھا اُس میں
بھی تہذیب الاخلاق کے برخلاف مضمون بچنے لگے اور سر سید کا تکفیر کے
فتوے جا بجا لکھے جانے لگے۔ یہاں تک کہ اُن کے ساتھ اُن کے دوست
اور احوال و انصار بھی نیچری بلکہ کرسٹیان کہلانے لگے لطیفہ جب محسن الملک
سید مہدی علی خاں کے چند مضمون نہایت دھوم دھام سے اس پرچہ
میں شائع ہوئے تو کسی سنی صاحب نے اُن کے چپا سے جن کا تمام خاندان
محسن الملک کے سوا آشنا عسری ہے، جا کر کہا کہ آپ کے لیے رونے کا مقام
ہے کہ مہدی علی خاں کرسٹیان ہو گئے انھوں نے نہایت سادگی سے جواب
دیا کہ میاں اب تم کو رونا چاہیے، ہم تو اُسی دن رو چکے تھے جب اُس نے
باپ دادا کا طریقہ چھوڑ کر تمہارا طریقہ اختیار کیا تھا۔

با اینہم تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے سے رفتہ رفتہ ایک معتد بہ
گروہ مسلمانوں میں ایسا بھی پیدا ہو گیا جو اس پرچہ کا ویسا ہی دلدادہ

تھا جیسے انگلستان وائے ٹیلر اور اسپیکٹر کے دلدادہ تھے۔ وہ اس کے مضامین پر وجود کرتے تھے اور تاریخ معین پر اس کے انتظار میں ہمنہن چشم رہتے تھے۔ اور اس کے مخالفوں کو تعجب سے دیکھتے تھے جو نتائج اس پر چسپے مسلمانوں کے حق میں پیدا ہوئے اُن کو دوسرے حصہ میں بیان کیا جائے گا یہاں صرف اس قدر لکھا جاتا ہے کہ اگر سرسید یہ پرچہ جاری نہ کرتے اور مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کا خیال چھوڑ دیتے بلکہ صرف اُن کی تعلیم کا انتظام کرتے تو ظاہر اُن کی مخالفت کم ہوتی بلکہ شاید نہ ہوتی، مگر اس کے ساتھ ہی اعانت امداد بھی کم ہوتی اور جو تحریک چھبہ سال میں مسلمانوں میں پیدا ہو گئی اس کا صدیوں تک کہیں نام و نشان نہ ہوتا۔

اس پرچہ کی تمام تر کوشش اس بات میں تھی کہ جو خیالات مسلمانوں کی ترقی امداد کے مذہبی مانع سمجھے جاتے ہیں اور درحقیقت مذہب کے کچھ علاقہ نہیں رکھتے اُن کو جہاں تک ہو سکے رفع کیا جائے اور اسلام پر جو عیسائیوں کا یہ اعتراض ہے کہ وہ ترقی اور تمدن کا دشمن ہے، اس غلطی کا اصل منشا ظاہر کیا جائے اس کے سوا یورپ کی سولیزیشن کے اصول و فروع سے اور اُن اسباب سے جو یورپ کی ترقی کے باعث ہوئے ہیں قوم کو آگاہ کیا جائے، یہود اور مشرکوں سے اُن کو نفرت دلائی جائے اخلاقی وعادات میں جو بسبب قومی تنزل کے خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ بیان کی جائیں، علوم قدیمہ کی عظمت جو لوگوں کے دلوں میں حد سے زیادہ بیٹھی ہوئی ہے جہاں تک اس میں غلطی ہو اس کو ظاہر کیا جائے علوم جدیدہ جن سے نفرت کی جاتی ہے اُن کی اصل اور واقعی خوبیاں اور جو بدیہی نتائج دنیا میں اُن سے پیدا ہوئے ہیں جتائے جائیں اور بجائے نفرت کے ان کی طرف رغبت دلائی

جائے۔ اسلام میں مخالفوں نے جو باتیں تاریخی اور علمی تحقیقات کے خلاف بیان کی ہیں اُن کو تاریخ اور علم کے ساتھ منطبق کیا جائے یا اسلام کا دامن اُن سے پاک ثابت کیا جائے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اُن کے اکابر و اسلاف کی عظمت کا خیال پیدا کیا جائے، اُن کی قدیم علمی اور عملی ترقیات اُن کو یاد دلائی جائیں اور اس طرح قوم کے مردہ دلوں کو زندہ کرنے میں کوشش کی جائے۔ ان تمام اغراض و مقاصد کے پورا کرنے کے لیے سرسید اور اُن کے دوستوں نے صرف اپنی رائے اور اجتہاد ہی سے کام نہیں لیا بلکہ جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا وہ زیادہ تر قوم کے محققین کی تصنیفات سے استناد کر کے لکھا اور اخلاق و معاشرت و ترقی و تمدن کے متعلق یورپ کے مصنفین کے خیالات بھی جہاں تک ہو سکا اپنی زبان میں بیان کیے۔

چونکہ یہ پرچہ اسلام کو ایسی صورت میں ظاہر کرتا تھا جو مسلمانوں کے عام خیالات کے برخلاف تھی اور اُن کے کان میں وہ صدائیں پہنچاتا تھا جو انہوں نے پہلے کبھی نہ سنی تھیں، اس لیے اول اول لوگ اُس سے بہت بھڑکے، مگر رفتہ رفتہ مسلمانوں کے محدود دائرے میں اُس کا اثر پھیل گیا۔ اُن بڑھوسلمان جن کی تعداد ہمیشہ ایک گری ہوئی قوم میں بڑھے لکھوں کی نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے، وہ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ تہذیب الاخلاق کیسے جانور کا نام ہے۔ مولویوں اور واعظوں پر بھی اُس کا منتر نہیں چل سکتا تھا کیونکہ وہ اُس کو نہ صرف مذہب کے حق میں بلکہ شاید اپنے حق میں بھی مضر جانتے تھے۔ اُسرا تک اُس کی رسائی ہوئی سخت دشوار تھی کیونکہ اُن کو مسلمانوں کے تنزل کا یقین دلانا ایسا ہی مشکل تھا جیسا کہ مرغابی کو طوفان سے خوف دلانا۔ اسی لیے تہذیب الاخلاق کا اثر

صرف متوسط درجہ کے لوگوں میں محدود رہا جو نہ محض جاہل تھے اور نہ حجام
علوم عقلیہ و نقلیہ اور مقدور کے لحاظ سے نہ نہایت پست حالت میں تھے
اور نہ اعلیٰ درجہ میں۔ پھر خاص کردہ ملی اور لکھنؤ اور ان کے نواح میں جہاں
مسلمانوں کی قدیم شائستگی کے کچھ دھندے نشان باقی تھے اس کا اثر بہت
کم ہوا۔ باوجود اس کے چونکہ اُس کی آواز زمانہ کی گونج کے موافق تھی اُس نے
توقع سے بہت زیادہ کامیابی حاصل کی۔

زیادہ تر اُس کے مقبول ہونے کا سبب یہ تھا کہ اُس کے مضامین کا جہز و
اعظم سرسید کی دلنشین تحریریں اور سید مہدی علی خاں کے دلکش آرا مکمل تھے۔
سرسید کی تحریر کی نسبت یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اُس کے دیکھنے کے بعد
آدمی اپنے عقیدے پر قائم نہیں رہ سکتا۔ سید مہدی علی خاں کی تحریروں
پر بھی لوگ سر دھنتے تھے۔ اس کے سوا اُس میں ہر ایک بات نرمی اور سنجیدگی
سے برخلاف اس قدیم و آزارہ طریقہ کے جو مسلمانوں کے مناظر است و
مجادلات میں جاری تھا، بیان کی جاتی تھی کسی شخص کی طرف روئے سخن بہت
کم ہوتا تھا۔ بلکہ ہمیشہ قوم کی عام حالت پر بطور دلسوزی کے نہ بطور طعن و
تعریض کے گفتگو کی جاتی تھی۔ اُس میں ظرافت بھی ہوتی تھی، مگر نہ ایسی کہ
کسی کو ناگوار گندے اُس میں مخالفوں کے اعتراضات کے جواب نہایت
ضرورت کے سوا کبھی نہ دیے جاتے تھے اور اس لیے مناظرہ کے بے مزہ
رد و بدل اور جواب رد جواب و کتبہ جواب و حد جواب کے ناگوار تسلسل سے
وہ بالکل پاک تھا کیونکہ اُس کے جاری کرنے سے صرف یہ مقصود تھا کہ جوابات
سچ معلوم ہو وہ لوگوں کے کان میں ڈال دی جائے نہ یہ کہ اُن سے نہبردستی
منوائی جائے۔

تہذیب الاخلاق میں عام خبریں درج نہیں ہوتی تھیں مگر مدرسۃ العلوم کے متعلق کمیٹی خزانۃ البضائع کی روئدادیں اور تمام حالات اُس میں گنتی برس تک برابر چھپتی رہیں، اس لیے مدرسۃ العلوم کو اُس سے بہت تقویت پہنچی اور تو اس کے مضامین لوگوں کے خیالات میں انقلاب پیدا کر رہے تھے اور ادھر چہندہ کی روز افزوں ترقی، بانیان کالج کی سرگرمی اور سرسید کی کوششوں کے عملی نتائج اُس کے ذریعہ سے دریافت ہوتے تھے اور اس لیے روز بروز مدرسۃ العلوم کی عظمت کا خیال لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہوتا تھا۔

۱۸۷۹ء میں جب سرسید پنشن میسر علی گڑھ میں آگئے تو ان کو مجسّم تن مدرسہ کی تکمیل، اُس کی عمارتیں تیار کرنے اور ہر طرح سے کالج کی زمین کو آباد و سرسبز کرنے کی طرف متوجہ ہونا پڑا اس کے سوا ان کے وہ دوست جو تہذیب الاخلاق کے سرگرم معاون تھے وہ زیادہ اہم کاموں میں مصروف ہو گئے۔ نیز تہذیب الاخلاق اپنا کام بہت کچھ کر چکا تھا اور مسلمانوں میں جس قدر کہ اُبال آنے کی قابلیت تھی اُس قدر اُبال پیدا کر چکا تھا۔ ان تمام وجوہات سے اُس کو بند کرنا پڑا اور یکم رمضان ۱۲۹۳ھ کے پرچہ پر اس کا خاتمہ ہو گیا چھ پر س کے عرصہ میں ۲۲۶ مضمون تہذیب الاخلاق میں چھپے جن میں سے چھوٹے بڑے ۱۱۲ مضمون صرف سرسید کے لکھے ہوئے ہیں اور باقی اور لوگوں کے۔

جن لوگوں کو تہذیب الاخلاق کا چکا لگ گیا تھا ان کو اس کا بند ہونا شاق گذرا اور ان کی طرف سے برابر تحریکیں ہوتی رہیں کہ اُس کو پھر جاری کیا جائے۔ آخر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۶ھ میں دوسری بار جاری کیا گیا جو دہر س پانچ مہینے جاری

رہ کر بند ہو گیا، اس دفعہ چونکہ سرستید کی توجہ زیادہ تر تفسیر لکھنے کی طرف مصروف رہی اور ان کے سرگرم معاونوں کو اس مدد دینے کی فرصت یا موقع نہ تھا اس لیے اُس میں پہلے کی نسبت عمدہ مضامین کم نکلے۔ اب کی بار کل ۶۷ مضمون چھپے جن کے لکھنے والے مختلف آٹھ شخص تھے۔ انہیں جملہ ۲۳ مضمون سرسید کے اور باقی اور لوگوں کے تھے۔ سوال ۱۳۱۔ ہجری میں سرستید نے نواب محسن الملک کی تحریک سے اُس کو کچھ جاری کیا مگر اس دفعہ اس کا دار و مدار بالکل سرستید کی ذات پر رہا اور لوگوں نے اُس میں بہت مدد دی آخر تین برس جاری رہ کر بند ہو گیا۔

کمیشی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان

تہذیب الاخلاق ہی کے ساتھ سرستید نے دوسرا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم پر غور کرنے کے لیے انھوں نے بنارس ہی میں ایک دوسری کمیشی قائم کی۔ وہ لندن ہی سے ایک اشتہار تدار ترقی تعلیم مسلمانان کی نسبت اُردو اور انگریزی میں چھپوا کر اپنے آنے سے پہلے مولوی سید مہدی علی خاں کے پاس جو اُس زمانے میں مرزا پور میں تحصیلدار تھے اشاعت کی غرض سے بھیج چکے تھے مگر انھوں نے اس کی تمام کاپیاں ایک صندوق میں ڈال دیں اور معمولی اشتہاروں کی طرح اُس کی اشاعت کو محض بے سوخیال کیا۔ جب سرستید ولایت سے واپس آئے اور مولوی صاحب سے ملے تو انھوں نے تمام اشتہار سرسید کے سامنے رکھ دیے اور یہ کہا کہ ہر شخص سید احمد خاں نہیں ہے جو اس کام کو کر سکے۔ اب سرستید نے خود اس کام کو شروع کیا۔ وہی اشتہار جس کا عنوان یہ تھا "التماس نجدت اہل اسلام و حکام ہند و رباب ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان جہاں

جہاں مناسب سمجھا بھیجا اور اخبار کے ذریعہ سے بھی اُس کو شائع کیا۔ خلاصہ اس اہتمام کا یہ تھا کہ ”انگریزی حکومت سے جو تعلیم کے فائدے لوگ عام طور پر اٹھا رہے ہیں اور مسلمان اُن سے مستفید نہیں ہوتے۔ اس کے اسباب دریافت کرنے کی طرف خود مسلمانوں کو متوجہ ہونا چاہیے کیونکہ جو اسباب اور لوگوں نے اب تک بیان کیے ہیں اُن پر کافی مہروسا نہیں ہو سکتا اور بالیقین نہیں کہا جاسکتا کہ درحقیقت وہی اصلی اسباب ہیں۔ نیز یہ کہ اس بیماری کی اصلی جڑ دریافت کرنی گورنمنٹ کو بھی ضرور ہے۔ پس مناسب ہے کہ ایک انعامی اشتہار جاری کیا جائے اور مسلمانوں کو اس مسند پر مضامین لکھنے کی ترغیب دی جائے اور اس کام کے لیے مسلمانوں اور انگریزوں سے چندہ جمع کیا جائے۔ جب چندہ بقدر ضرورت جمع ہو جائے اُس وقت چندہ دہندگان میں سے ممبر منتخب کر کے ایک کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان منعقد کی جائے۔“

اس چندہ میں سب سے پہلے سرستید نے ایک رقم اپنی طرف سے پیش کی اور باتفاق مولوی مہدی علی خاں کے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ دسمبر ۱۹۰۷ء میں یہ اشتہار جاری ہوا تھا اسی مہینے میں ایک ہزار ایک سو دو روپیہ جمع ہو گیا اور اس کے بعد رفتہ رفتہ جمع ہوتا رہا۔ نواب کلب علی خاں مرحوم رئیس رامپور، کنور وزیر علی خاں مرحوم رئیس دانی پور ضلع بلتستان شہر اور سردیم میو لہنٹ گورنر شمال مغرب نے اس کام کی طرف خاص توجہ ظاہر کی تھی۔ الغرض۔

۲۶ دسمبر کو بمقام بنارس ”کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان“ منعقد ہو گئی جس کے سکریٹری سرستید قرار پائے۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ وہ جہاں ہو سکے اس بات کے دریافت کرنے میں کوشش کرے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لیے کم پڑھتے ہیں، علوم

قدیمہ اُن میں کیوں گھٹ گئے اور علوم جدیدہ کیوں نہیں رواج پاتے اور جب یہ مواقع ٹھیک ٹھیک دریافت ہو جائیں تو اُن کے رفع کرنے کی تدبیریں دریافت کرے اور اُن تدبیروں پر عمل درآمد کرنے میں کوشش کرے۔ نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ ”جس تاریخ کمیٹی مذکور کے انعقاد کے لیے جلسہ قرار پایا تھا اُس سے ایک روز پہلے میں پہنچ گیا تھا۔ رات کو سرستید نے میرا پتنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بھجوایا تھا۔ گیارہ بارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ وہ بجے کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے سرستید کو اُن کے پتنگ پر نہ پایا۔ میں اُن کے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور نادرہ قطار روتے جاتے ہیں میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدا نخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور نادرہ رونے لگے اور کہا کہ ”اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں۔ اور کوئی صورت اُن کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔ یہ پھر آپ ہی کہنے لگے۔ کہ ”جو جلسہ کل ہونے والا ہے مجھے امید نہیں کہ اس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو ساری رات اسی ادھیڑ بن میں گزر گئی ہے کہ دیکھیے کل کے جلسہ کا کیا انجام ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے یا نہیں۔“ نواب محسن الملک کہتے ہیں کہ ”سرستید کی یہ حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پر گندی اُس کو بیان نہیں کر سکتا اور جو عظمت اس شخص کی اُس دن میرے دل میں بٹھی ہوئی ہے اُس کو میں ہی جانتا ہوں۔“

اُسی تاریخ انعامی اشتہار جس میں تین انعام پانسو تین سو ڈیڑھ سو روپے کے مقرر ہوئے تھے جاری کیا گیا اور میعاد معین تک ۳۳ مسنون مختلف لوگوں

کے کھٹے ہوئے سکرٹری کے پاس پہنچے۔ مولوی ہدی علی خاں کا معنون سب سے عمدہ تھا مگر ان کی خواہش سے وہ انعام کی فہرست سے خارج رکھا گیا اور پہلا مولوی سید اشرف علی ایم اے کو جو اُس زمانے میں بنارس کالج کے طالب علم تھے، دوسرا نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین کو اور تیسرا مولوی عبدود کو ملا۔ سر سید نے ان مضامین سے ایک عمدہ رپورٹ اردو انگریزی میں تیار کی جس میں تمام رسالوں کا خلاصہ کر کے ان سے مفصلہ ذیل نتائج استخراج کیے تھے:

- ۱- ہندوستان کے سمجھ دار مسلمان اس تعصبات کو جو پرانے خیال کے مسلمان انگریزی تعلیم کی نسبت رکھتے ہیں لغو اور مسلمانوں کے حق میں مضر مانتے ہیں۔
- ۲- مسلمانوں کی تعداد سرکاری مدارس میں بمقابلہ ہندو طالب علموں کے جتنی ہونی چاہیے اس سے بہت کم ہے۔
- ۳- جن خیالات سے مسلمان سرکاری مدارس میں اپنی اولاد کو نہیں بھیجتے ان میں سے کچھ نا واجب اور اکثر واجب ہیں اور سرکاری طریقہ تعلیم مسلمانوں کی ضرورتوں کے لیے کافی نہیں ہے۔
- ۴- اگر گورنمنٹ مسلمانوں کے لیے اپنے طریقہ تعلیم میں کچھ تبدیلی بھی کر دے تو بھی ان کی تمام ضرورتیں رفع نہیں ہو سکتیں۔
- ۵- مسلمانوں کو اپنے علوم قدیمہ کے محفوظ رکھنے، علوم جدیدہ سے مستفید ہونے اور اپنی تمام ضرورتوں کے موافق اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت کرنے کے لیے اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ اپنی تعلیم کا فکر آپ کریں اسی رپورٹ میں مجوزہ کالج کی سکیم اور طریقہ تعلیم بھی مندرج تھا جو سر سید نے کیشی کے سامنے پیش کیا۔

مسلمانوں کی ترقی کے مواقع جو سرسید نے اس رپورٹ میں تمام رسالوں سے استنباط کر کے لکھے تھے اُن کی نسبت شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں کہ ”ایجوکیشن کمیشن نے بھی ۱۸۸۳ء میں تمام ہندوستان کے معتبر گواہوں کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی تعلیم کے وہی موانع تسلیم کیے ہیں جو سرسید نے ۱۸۵۳ء میں اپنی رپورٹ میں درج کیے تھے۔“

اس رپورٹ کی ایک ایک جلد گورنمنٹ ہند اور تمام لوکل گورنمنٹوں میں بھی بھیجی گئی تھی چنانچہ مدراس، بنگال اور بمبئی کی لوکل گورنمنٹوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق جو جو تدبیریں اور کارروائیاں ایک کی تھیں اُن کے تمام کاغذات سکریٹری کے پاس بھیج دیے اور گورنمنٹ شمال مغرب نے اس رپورٹ کی کچھ جلدیں تعلیم کمیشن کو تقسیم کرنے کی غرض سے طلب کیں اور یہ وعدہ کیا کہ اگر کمیٹی کی کوشش سے کالج مجوزہ قائم ہو گیا تو گورنمنٹ علوم دنیوی کی تعلیم کے لیے بموجب قاعدہ گرانٹ ان ایڈ کے اس مدرسہ کو مدد دے گی۔ اس کے بعد سکریٹری گورنمنٹ ہند کی چھٹی مورخہ ۹ اگست ۱۸۸۵ء اس مضمون کی پہنچی کہ ”نواب گورنر جنرل بہادر بہ اجلاس کونسل کو تجویز مندرجہ رپورٹ کمیٹی خواستگار ترقی کی اطلاع سے جوابت قائم کرنے ایکلو اور ٹیل کالج کے ہے۔ نہایت خوشی ہوئی ہے اور وہ دل سے امید رکھتے ہیں کہ اس تجویز میں جیسی کامیابی ہوئی چاہیے ویسی ہی ہوگی۔ شمال مغربی اضلاع کے مسلمانوں کی یہ تدبیر اس بات کی مستحق ہے کہ جہاں تک ممکن ہو گورنمنٹ اس میں مدد دے اور سید احمد خاں بہادر اور اُن صاحبوں کی کوششیں جو اس عمدہ کام میں اُن کے شریک ہیں نہایت تحسین وافرین کے قابل ہیں۔“ ان دونوں چھٹیوں کے آنے

سے کمیٹی کو حد سے زیادہ تقویت ہوئی۔

کمیٹی خزانۃ البضاعۃ

ایک دوسری کمیٹی اس غرض سے کہ قیام مدرسہ مجوزہ کے لیے وقتاً فوقتاً چندہ وصول کرتی رہے مقرر کی گئی جس کا نام ”کمیٹی خزانۃ البضاعۃ“ تواسیس مدرسۃ المسلمین“ رکھا گیا اور اس کے لائف سکریٹری سرسید قرار پائے اور یہ ٹھہرا کہ جب تک مدرسہ قائم کرنے کے لیے لائف سرمد جمع نہ ہو جائے تب تک اس کمیٹی کا مقام وہیں رہے جہاں لائف سکریٹری کا قیام ہو چنانچہ جب تک مدرسہ علیگڑھ میں قائم نہ ہو گیا تب تک کمیٹی مذکور کا دفتر بنارس ہی میں رہا جہاں سرسید حج سال کا نہ کوڑٹ تھے۔

جولائی ۱۸۸۷ء میں سرسید نے کمیٹی خواستگار تعلیم کی طرف سے ایک اشتہار جاری کیا جس میں مسلمانوں سے پوچھا گیا تھا کہ مدرسۃ العلوم کو نئے شہر میں قائم کیا جائے۔ اس اشتہار کے جاری کرنے کی یہ ضرورت تھی کہ بعضے لوگ جو سپامیری نوٹ خریدنے کے برخلاف تھے چندہ اس شرط سے دیتے تھے کہ ہمارے روپیہ سے جالیڈا خریدی جائے۔ پس تاوقتیکہ مدرسہ کے لیے کوئی جگہ قرار نہ پائے جالیڈا نہیں خریدی جاسکتی تھی کیونکہ جالیڈا کا مقام مدرسہ کے قریب خریدنا ضروری تھا۔ اس اشتہار پر مختلف راہیں لوگوں نے ظاہر کیں مگر سب سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جنہوں نے علیگڑھ کو ترجیح دی تھی ان کو معلوم تھا کہ سرسید نے مدت سے ارادہ کر رکھا ہے کہ پنشن لینے کے بعد دلی کی سکونت ترک کر کے علیگڑھ میں بود و باش اختیار کریں۔ کیونکہ غدر کے بعد دلی کے مسلمانوں کی جو حالت ہو گئی

تھی وہ اُن سے دیکھی نہیں جاسکتی تھی۔ اُن کو پنجاب کی طرز حکومت پر بھی اعتراض تھا۔ چنانچہ انھوں نے پنجاب کے ایک جلیل القدر حاکم سے صاف کہہ دیا تھا کہ دلی کو شمال مغربی اضلاع سے نکال کر پنجاب میں داخل کرنا انھیں سنراؤں میں سے ایک سزا ہے جو فتح دہلی کے بعد اہل دہلی کو دی گئیں۔ اس کے سوا مسلمانوں کی تعلیم کا جو اعلیٰ مضروریہ سرسید نے باندھا تھا اُس کا دلی میں پورا ہونا ممکن معلوم ہوتا تھا۔

کمیٹی کو سب سے زیادہ تقویت اس بات سے ہوئی کہ لارڈ ڈنار تھ بروک وائسرائے و گورنر جنرل ہند نے بعض شرائط کے ساتھ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی شاخ میں اسکالرشپ دینے کے لیے دس ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے دینے کا وعدہ فرمایا اور سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر اضلاع شمال مغرب نے ایک ہزار روپیہ کا چندہ اور اسی طرح سٹراپیٹکی جج ہائی کورٹ الہ آباد نے ایک معقول رقم دے کر اس کے لیے عنایت کی۔ ان عطیوں نے سرسید کی کوششوں میں جان ڈال دی اور کمیٹی کی ڈھارس سی بندھ گئی۔ جب اس طرح سے چندہ میں ترقی ہونے لگی تو سرسید نے کمیٹی میں تحریک کی کہ کمیٹی خزانہ البضاعت کی بموجب ایکٹ ۲۱ ۱۸۶۰ء کے رجسٹری ہو جانی چاہیے۔ ورنہ تمام جائیداد اور پراپیٹری نوٹ سکریٹری کے یعنی میرے نام سے خریدے جائیں گے اور میرے اور میرے وارثوں کے نام منتقل ہو سکیں گے۔ چنانچہ کمیٹی مذکور کی رجسٹری حسب ضابطہ عمل میں آئی اور تمام مسلمانوں کو چھاپے کے ذریعہ مطلع کیا گیا کہ جو سرمایہ مدرسۃ العلوم کے لیے جمع ہوا ہے یا آئندہ جمع ہوگا اس کی حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے۔

فروری ۱۸۶۳ء میں سید محمود نے ایک اسکیم انتظام و سلسلہ تعلیم

کی جو دلایت کے اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کا انتظام اور طریقہ تعلیم
 دیکھ کر مرتب کی تھی مجوزہ کالج کے لیے پیش کی، موجودہ ممبروں نے اس کو پسند
 کیا اور منظوری کے لیے اس کی کاپیاں چھپ کر تمام ممبروں کے پاس بھیجی
 گئیں اور نیز لوکل گورنمنٹس اور گورنمنٹ ہند میں بھی اس کی نقلیں ارسال کی گئیں
 تاکہ اگر گورنمنٹ اس اسکیم کو پسند کرے تو گرانٹ این لیڈ سے حسب وعدہ
 امداد کرے، نیز ایک استفتاء مع اس اسکیم کے علمائے وقت کے پاس
 بھیجا گیا جس میں ان سے پوچھا گیا تھا کہ جس مدرسہ میں اس اسکیم کے موافق
 تعلیم دی جائے گی اس میں چندہ دینا جائز ہے یا نہیں۔

جب یہ استفتاء شائع ہوا تو کانپور سے مولوی امداد العلی نے جو اس وقت
 وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے ایک دوسرا استفتاء شائع کیا جس میں بنارس کے استفتاء
 کو غلط اور دھوکا دینے والا بتایا تھا اور لکھا تھا کہ جو لوگ مدرسہ العلوم قائم
 کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت مسلمان نہیں ہیں، یہ پہلی مخالفت تھی جو
 علانیہ مدرسہ العلوم کے ساتھ کی گئی، اس کے بعد دھڑا دھڑ مخالفین ہونی
 شروع ہوئیں، بعض نے مشہور کیا کہ مدرسہ میں سید احمد خاں کا بت اور
 ان کے معاونوں کی تصویریں قد آدم با نصف قد آدم رکھی جائیں گی، بعض
 کہتے تھے کہ وہاں شیعوں کے مذہب کی کتابیں بھی پڑھائی جائیں گی اور
 اس باطل کی اعانت کی جائے گی، بعض کہتے تھے کہ جس شخص کے ایسے اور
 ایسے عقائد و اقوال ہوں اس کے قائم کیے ہوئے مدرسہ میں چندہ دینا یا اس
 میں اپنی اولاد کو تسلیم دلوانا مسلمان کا کام نہیں، بعض کا یہ اعتراض تھا کہ
 جو روپیہ چندہ سے جمع ہوگا وہ سود میں لگایا جائے گا اصنام کے پرمیسی
 نوٹ خریدے جائیں گے اور مدرسہ میں لڑکوں کو انگریزی لباس پہننا پڑے

کا بعض کہتے تھے کہ یہ تمام شور و غل سید احمد خاں کے دم تک سب سے اس کے بعد کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اس کام کو سرانجام کر سکے اور یہ ایک ایسی بات تھی جس کو سن کر سمجھ و ادراک آدمیوں کے دل بھی افسردہ ہو جاتے تھے۔ یہ تمام باتیں اخباروں میں شائع ہوئی تھیں، چند ویسی اخبار ہمیشہ سرسید اور مدرسۃ العلوم کے خلاف مضمون لکھتے تھے، ایک آدھ مضمون انڈین آبزرو میں بھی مدرسہ کے خلاف نہایت سخت لکھا گیا تھا، مگر آدھ اخبار پنجابی اخبار، اردو گائیڈ، پشمالو اخبار اور انگریزی اخباروں میں پاپونیر ہمیشہ مدرسہ کی تائید کرتے تھے۔

جب اس قسم کی مخالفتیں ہونے لگیں اور اتفاق سے انھیں ایام میں چندہ کی آمد بھی سست پڑ گئی تو سرسید کے دوست مایوس ہونے لگے، انھوں نے دوستوں کی بہت بندھوا سننے اور مسلمانوں کے دل سے غلط خیالات اور مخالفوں کے اعتراض رفع کرنے کے لیے ایک نہایت مفصل مضمون تہذیب الاخلاق میں چھاپا اور دیگر اخبارات سے بھی اس کے شائع کرنے کی درخواست کی، اس کے اخیر کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں، اب وہ وقت نہیں رہا کہ صرف کاغذ کے گھوڑے دوڑانے سے کام چلے بلکہ ہماری کمیٹی کے ممبروں کو خوشہ بہ شہر اور ضلع بہ ضلع دورہ کرنے، اسپیشل سنانے اور لوگوں کے دلوں کو جوش میں لانے کا وقت ہے، اس کام کے لیے علاوہ فرصت کے روپیہ بھی درکار ہے کہ بدوں خرچ کے دورہ نہیں ہو سکتا، کمیٹی کی تھیلی میں جو گیا پھر نہیں نکلتا، پس دورہ کرنے کا وقت، اس کی محنت اور اس کا خرچ سب ہم کو اپنی گرہ سے کرنا ہے، اگر خدا کی مرضی ہے تو ہم سب کچھ کریں گے، اگر زندہ ہیں اور خدا کو بھی منظور ہے تو اپنے مخالفوں کو دکھائیں گے کہ خدا نے کیا کیا اور

اگر اس میں آنکھ بند ہو گئی اور لحد میں جا سوائے تو یہ امید رکھیں گے کہ مرد
از غیب بروں آید و کارے بکند۔

اب سرستید نے چندہ جمع کرنے کے لیے زیادہ کوشش کرنی شروع
کی۔ جہاں جہاں اُن کے دوست اور مددگار تھے وہاں اس غرض کے لیے سب
کمیٹیاں قائم کیں، جیسے مرزا پور، علیگرہ، کانگرہ، پٹنا، وغیرہ۔ اور خود سرستید نے
مع اپنے اکثر دوستوں کے اسی مطلب کے لیے پٹنہ، لاہور، گورکھپور وغیرہ کا
سفر کیا اور ہر ایک مقام پر نہایت زبردست اسپینچیں اور لکچر دیے۔ تمام
سب کمیٹیوں نے تو قح سے زیادہ چندہ جمع کیا اور سرستید کے ہر ایک سفر میں
معتدبہ کامیابی ہوئی۔ انھیں دنوں میں سرستید نے ایک سرکار بحیثیت سکریٹری
ہونے کے انگلستان کو بھی روانہ کیا تھا جس میں اپنے یوروپین دوستوں سے
درخواست کی تھی کہ وہاں بھی مدرسۃ العلوم کے لیے چندہ جمع کرنے کے واسطے
ایک کمیٹی قائم کی جائے اور لارڈ لارنس سابق گورنر جنرل ہندوستان، لارڈ
اسٹینلی آف ایلٹرنی، سر بارٹل فریڈرکس چارلس ٹریوٹین اور آڈور وٹامس
کے نام پر لٹریٹ چھٹیاں روانہ کی تھیں کہ اس کمیٹی کے قائم کرنے کی
طرف متوجہ ہوں مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس تحریک کا کوئی نتیجہ ظاہر
نہیں ہوا۔ اس مقام پر ایک لطیفہ ذکر کرنے کے لائق ہے۔

جب دوسری بار سید محمود تقریباً انگلستان کو گئے اور کمبرج میں اپنے
دوستوں سے ملے تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کا سرمایہ بہت بڑھ گیا ہے اور آج
کل یہ ارادہ ہو رہا ہے کہ چرچ منغلہ ٹریوٹینی کالج کو منہدم کر کے ایک نہایت
عظیم الشان عمارت از سر نو بنائی جائے اور دس لاکھ روپیہ اس میں صرف
کیا جائے۔ سید محمود نے اپنے دوست سے پرسپل تذکرہ یہ کہا کہ اچھی خاصی

عمارت کو توڑ کر اس میں روپیہ ضائع کرنے سے کیا فائدہ ہے؛ اگر یونیورسٹی کا سرمایہ اس کی ضرورتوں سے زیادہ بڑھ گیا ہے تو دو چار لاکھ روپیہ مدرسہ العلوم ہی کی امداد کے لیے دیدیں۔ ان کے دوست نے کہا کہ ہندوستان میں کتنے مسلمان رہتے ہیں؛ سید محمود نے کہا چھ کروڑ۔ وہ سنکر نہایت متعجب ہوا اور یہ کہا کہ ”جس قوم کے لوگ ایسے پست بہت اور کم حوصلہ ہیں کہ چھ کروڑ آدمی اپنی اولاد کی تعلیم کے لیے ایک مدرسہ قائم نہیں کر سکتے ان کی اعانت کرنی گناہ ہے ان کو تباہ ہونے دو۔“

ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو

۱۸۶۱ء میں ڈاکٹر ہنٹر نے جو ہندوستان کے مدبران سلطنت میں شمار ہوتے ہیں ایک کتاب ہندوستان کے مسلمانوں کے مذہبی خیالات پر لکھ کر شائع کی جس کا نام ”اور اٹھ میں مسلمانز“ تھا اس کتاب میں انھوں نے اپنی دانست میں یہ ثابت کیا تھا کہ مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتی ہے اور گورنمنٹ کی کسی طرح خیر خواہ نہیں بن سکتی۔ نیز وہاں بیت اور بغاوت مترادف الفاظ ہیں، پس گورنمنٹ کو ان کی طرف سے مطمئن اور بے فکر نہیں رہنا چاہیے۔ اس کتاب کے عنوان کی عبادت یہ تھی، ”کیا ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں پر از روئے ایمان کے ملکہ معظمہ سے بغاوت کرنا فرض ہے؟ آگے چل کر انھوں نے ایک مقام پر لکھا تھا کہ ”اس بیان سے معلوم ہوا کہ تمام مسلمان اپنے بغاوت سکھانے والے پیغمبر کی زیر آئین نصیحتوں کو نہایت ذوق و شوق سے سنتے ہیں اور ایسے بہت تھوڑے ہیں جو اپنی تیزی طبعیت سے اپنی

شریعت کا کچھ اور مطلب ٹھہرا کر بغاوت کے برٹے فرض سے بچ جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد لکھا تھا کہ ”ہندوستان کے مسلمان اب بھی ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کے لیے موجب خطر ہیں جیسے کہ ایک مدت سے موجب خطر چلے آتے ہیں۔“ پس اگرچہ ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب کے شروع میں یہ ظاہر کیا تھا کہ ”اس کتاب کے مطالب صرف بنگالہ کے مسلمانوں سے متعلق ہیں کیونکہ میں صرف انھیں سے زیادہ واقف ہوں۔“ لیکن جو فقرے اُن کی کتاب کے اوپر نقل کئے گئے ان سے صاف پایا جاتا ہے کہ انھوں نے تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے گورنمنٹ کو بدگمان اور غیر مطمئن کرنا چاہا تھا۔

جس زمانہ میں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب شائع ہوئی یہ وہ زمانہ ہے کہ شاہ کا بنگالہ انگریزوں کو بھی تک فراسوش نہیں ہوا تھا، دوسرے بنگالہ کے دہائیوں کے مقدمات کا سلسلہ جاری تھا، تیسرے انھیں دنوں میں مسٹر نارین چیف جسٹس بنگال کا ایک مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہونا اُس پر اور طرہ ہو گیا تھا، ایسے وقت میں بخوبی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر ہنٹر جیسے معزز شخص کی کتاب نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا ہوگا اور مسلمانوں کی طرف سے اُن کی بدگمانی کو کس حد تک پہنچا دیا ہوگا۔

سرستید اپنے ریویو میں لکھتے ہیں کہ ”میں نے یہ سمجھ کر کہ یہ کتاب ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو مسلمانوں کا بڑا دوست ہے، نہایت شوق سے دیکھنی شروع کی تھی، مگر افسوس ہے کہ مجھ کو اس کے پڑھنے سے بڑی مایوسی ہوئی اور بے اختیار منہ سے نکلا کہ خدا مجھ کو میرے دوستوں سے بچائے۔“ انھوں نے اس ریویو میں بہت صاف اور روشن شہادتوں سے ڈاکٹر ہنٹر

کی غلطیاں ظاہر کی ہیں اور وہابیوں کی مختصر تاریخ اول سے آخر تک اور وہابیت کے اصول شرح بیان کیے ہیں، اور صاف اقرار کیا ہے کہ میں خود وہابی ہوں اور وہابی ہونا جرم نہیں ہے بلکہ گورنمنٹ کی بدخواہی اور بغاوت جرم ہے۔ جو شخص اس جرم کا مرتکب ہو گا خواہ وہ وہابی ہو یا عیسائی، ہندو ہو یا مسلمان یا اور کوئی مذہب والا بلا خیال مذہب کے مجرم قرار پائے گا، انھوں نے جہاد کے مسئلہ کی حقیقت اور جو غلط فہمیاں اس کی نسبت تھیں ان کو اچھی طرح ظاہر کیا ہے اور بتایا ہے کہ جو مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی رعایا اور متامن ہیں اور اپنے فرائض مذہبی بلا مزاحمت ادا کرتے ہیں وہ شریعت اسلام کی رو سے بمقابلہ انگریزوں کے نہ جہاد کر سکتے ہیں نہ بغاوت نہ اور کسی قسم کا فساد، ان کو ہندوستان میں انگریزی گورنمنٹ کے زیر حکومت اسی اطاعت و فرما برداری سے از روئے مذہب اسلام کے رہنا واجب ہے جیسا کہ ہجرت اولیٰ میں مسلمان حبش میں جا کر عیسائی بادشاہ کے زیر حکومت رہے تھے۔ سرسید کے ریلوے نے تمام انگریزی حکام کے دل پر اور نیز انگلستان کے

لے سلب ہے کہ جن دنوں بنگال میں وہابیوں کی تحقیقات اور تلاش ہو رہی تھی ایک لہریہ مغیرا فرسے جو اسی کام پر مامور تھا ریل میں سرسید سے مل بیٹھ ہو گئی، دونوں اگرہ جا رہے تھے اور سرسید کو کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ افسر وہابیوں کی تلاش پر مامور ہے اس افسر نے ان سے پوچھا کہ آپ کا کیا مذہب ہے، انھوں نے کہا وہابی مسلمان ہوں۔ پھر اس نے سرسید کا سلا پتہ دریافت کیا انھوں نے صحیح صحیح بیان کر دیا۔ جب ریل اگرہ میں پہنچی دونوں اتر کر اپنے اپنے ٹھکانے پہ چلے گئے پھر سرسید بشن صاحب کشن اگرہ سے ملنے کو گئے اتفاق سے وہ افسرانہیں کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اور ان سے ذکر کر چکا تھا کہ اس علیہ اول اس نام کا ایک وہابی مسلمان فلاں جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔ اب صاحب کشن نے افسر کو بلکہ کہہ لیا کہ لویہ تمہاری اسامی حاضر ہے جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ شخص باوجود وہابی ہونے کے بڑا غیر خواہ سرکار ہے تو اسے نہایت تعجب ہوا اور سب بہت دیر تک اس بات پر چنتے رہے۔

لوگوں پر نہایت عمدہ اثر کیا۔ اُس زمانہ میں حافظ احمد حسن مرحوم وکیل ٹونک لندن میں تھے، جب انھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب سے لندن میں نہایت جوش اور بے خیالات مسلمانوں کی نسبت پیدا ہو گئے ہیں انھوں نے تمام ریویو پالیونیئر کے پرچوں سے نقل کر کے جدا بطور پمفلٹ کے چھپوایا اور لندن میں جا بجا تقسیم کر دیا۔ سنا ہے کہ جب وہ لندن سے آئے تو انھوں نے بیان کیا کہ اس ریویو کے شائع ہونے سے لندن میں لوگوں کی طبیعتوں کا ایسا حال ہو گیا تھا جیسے کہ جلتی اور بھڑکتی آگ پر کوئی پانی ڈال دے۔ جو شخص اُس کو پڑھتا تھا ڈاکٹر ہنٹر کی تحریر پر تعجب کرتا تھا اور جو کچھ انھوں نے مسلمانوں پر دہابیوں کی نسبت لکھا تھا اس کو صحیح نہیں سمجھتا تھا۔

ہندوستان میں جب یہ ریویو پالیونیئر کے ذریعہ سے شائع ہوا انھیں دونوں میں پالیونیئر مورخہ ۲۳ نومبر ۱۸۷۱ء میں ایک بہت مبسوط آرٹیکل جو کسی ٹریس لائق عربی داں انگریز کا لکھا ہوا تھا اور جس کی نسبت یقین کیا گیا ہے کہ وہ سر ولیم میور کا لکھا ہوا تھا، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کے برخلاف گویا سر سید کی تائید میں چھپا اور پالیونیئر سے سوسائٹی اخبار میں نقل ہوا۔ اس آرٹیکل میں نہایت علانیہ لیاقت سے ڈاکٹر ہنٹر کے شبہات کا جواب دیا گیا تھا اور سر سید کی تائید کی گئی تھی۔ اُس کے آخر کے چند فقرے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں:

”وہابی وہ ہے جو خالص خدا کی عبادت کرتا ہو، موحّد ہو“

اور اس کا اسلام ہوا ہے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے پاک ہو، اُس کو یہ کہنا کہ وہ ہمیشہ درپردہ تخریب سلطنت کی فکر میں اور چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتا ہے اور غدر اور بغاوت کی تحریک کرتا ہے، محض تہمت ہے ہم اس وقت بہت سے ایسے آدمی

نشان دے سکتے ہیں جو سرکار کے ایسے ملازم ہیں کہ ان سے زیادہ
سرکار کا غیر خواہ اور معتد کوئی نہیں، بالائیمہ وہ اپنے تئیں
علی الاعلان اور بے تامل فخریہ طور پر دیالی کہتے ہیں اور سرکار نے
بے سوچے سمجھے ان کو معتد علیہ نہیں گردانا بلکہ غدر کے زمانہ میں
جبکہ فتنہ کی آگ ہر طرف مشتعل تھی ان کی وفاداری کا سونا اچھی
طرح سے تباہ کیا اور وہ خیر خواہی سرکار میں ثابت قدم رہے۔ اگر
وہ جہاد کا دغظ کہتے ہوتے اور بغاوت و ہابیت کی اصل ہوتی
تو جو کچھ ان سے ظہور میں آیا یہ کیونکر ظہور میں آتا، ہم ڈاکٹر ہنٹر کی
اسکا ہی کے لیے ان لوگوں کے چال چلن کو پیش کرتے ہیں۔

۱۰ اس کے ایک مدت بعد اڈیجا آئیر بورڈ مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۴۲ء میں خود
اس کے یوروپین اڈیٹر کا ایک زبردست آرٹیکل سرسید کے ریلویو پر نکلا جو
درحقیقت ہندوستان کے یوروپین حکام اور فیسروں کی رائے کا آئینہ تھا۔
ہم اس آرٹیکل کے چند مقام میاں بجنسہ نقل کیے دیتے ہیں تاکہ اچھی طرح معلوم
ہو جائے کہ اس ریلویو نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر کیا تھا اور تاکہ ہندوستانیوں
پر ظاہر ہو جائے کہ انگریز سچی بات کے قبول کرنے میں کس قدر بغیر متعصب اور
منصف مزاج ہوتے ہیں۔

وہ لکھتا ہے کہ ”ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے لوگوں نے یا دنیا میں سے اس
گروہ کے لوگوں نے جو اس قسم کی باتوں سے سوکار رکھتے ہیں، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب
متعلقہ مسلمانان ہندوستان کی قدر و منزلت کی بابت، بلکہ ٹھیک ٹھیک یہ کہتا
اچھا ہے کہ اس کے لچر و پوچ ہو نے کی بابت، بالاتفاق تصدیق کر دیا ہے۔
جہاں تک کہ ہم کو لٹرچر میں مداخلت ہے اس کے اعتبار سے ہم ڈاکٹر ہنٹر

کی کتاب کو لٹانی سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کے سوا ہم نہیں جانتے ہیں کہ کسی مصنف نے
 دیدہ و دانستہ ایسے مضمون پر کتاب چھاپی ہو جس سے وہ بالکل ناواقف ہو
 جس کسی کو کچھ بھی علم اُن باتوں کا ہو گا جن کی بحث اس کتاب میں ہے وہ ایک
 ہی نظر میں معلوم کر لے گا کہ ڈاکٹر ہنٹر مسلمانوں کے مذہب کی نسبت اور
 خاص کر وہابیوں کے مذہب کی نسبت کچھ بھی نہیں جانتے وہ شمال مغرب
 کی سرحد کے لوگوں کی حالت سے بالکل ناواقف ہیں۔ یہاں تک کہ جو قومیں
 اُس ملک میں بستی ہیں اُن کے نام تک نہیں جانتے اور اسواری سلطنت
 کی پیچیدہ باتوں کی نسبت اور اس بات کی نسبت کہ سید احمد کے زمانہ میں
 سکھ اور افغانوں کے باہم کیا معاملہ تھا، نہایت دھندلے خیالات کے سوا
 انھوں نے اور کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور جب سے کہ ملک پنجاب
 گورنمنٹ انگلیش کے قبضہ میں آیا ہے اُس کے بعد کی سرحدی تاریخ سے بھی
 ناواقف ہیں اور جو مسلمان خاص بنگالہ کی حد سے باہر رہتے ہیں اُن کے
 حالات سے بالکل بے خبر ہیں بلکہ جب اُن لوگوں کا ذکر کرتے ہیں تو اُس میں
 ایک غلطی سے دوسری غلطی میں پڑتے ہیں اور جب وہ اپنے خیال اور قیاس
 کو اکبر کے زمانہ کے حالات کے تذکرہ سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تو
 ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو ہنسی کے قابل اور بالکل غیر ممکن ہیں۔ اگرچہ
 وہ دلائل اسلام اور دارالحدیث کی بحث ایک مکہ کے مولوی کیسی فصاحت
 اور واقفیت کے ساتھ کرتے ہیں تاہم اُن کے مباحثہ کے ہر حصہ کے
 ماتندان باتوں کا علم بھی اُن کو اُن مہل اور بے صرفہ خیالات سے کچھ بڑھ
 کر نہیں ہے جو ہر ایسے تعلیم یافتہ اشخاص کے ہوتے ہیں جس نے کچھ
 ہسٹری پڑھی ہو۔

”اسی بڑی ناواقفیت کے باعث ڈاکٹر منہٹر کی کتاب میں ایک ایسا وصف ہے جو اُس کے ساتھ مخصوص ہے جیسا ہم اوپر کہہ آئے ہیں۔ یہ کتاب لٹریچر کے کتب خانہ میں بے نظیر ہے۔ بہر شخص جس نے سید احمد خاں کی تحریر کو پڑھا ہے ضرور یقین کرے گا کہ ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے اُس میں اس معاملہ کے اصل حالات کی نسبت کچھ مبالغہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر منہٹر کو یہ توقع کہ اپنی فصاحت و بلاغت اور دلفریب عبارت کے ذریعہ سے کامیاب ہو جائیں گے، مگر ظاہراً انھوں نے اپنی ناواقفیت کی گہرائی کی تھماہ دریافت نہیں کی تھی۔ یا غالباً یہ سمجھا تھا کہ جس قدر میں جانتا ہوں اُس سے زیادہ کوئی واقف نہ ہوگا اس لیے کوئی میری باتوں کی اصلاح نہ کر سکے گا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ میرے میزبان میری کیسی مداحات کریں گے؛ ان کی اس بات پر ہم سے زیادہ اور کسی کو افسوس نہ ہوگا۔ غالباً ڈاکٹر منہٹر ابھی زندہ رہیں گے اور بہت سی کتابیں لکھیں گے جن کی عبارت بہت سے لوگوں کے دل کو بھائے گی۔ مگر اصلی واقعات کے محقق ہونے کی ناموری اُن کے ہاتھ سے ایسی کھوٹی گئی ہے کہ پھر کبھی میسر نہ ہوگی۔ کتاب کا پڑھنے والا اُن کی کتابوں کو بغیر اس کے کہ کھول کر دیکھے بالائے طاق رکھ دے گا اور یہ سمجھے گا کہ قصہ کی دلچسپ کتابوں کے مانند ہیں جو اپنی طرز میں نہایت دلفریب ہوتی ہیں مگر کسی کام کی نہیں۔“

”سید احمد خاں کا پھوٹا سا رسالہ سوائے ڈاکٹر منہٹر کی تردید کے اور بھی خوبی اور عمدگی رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی لکھی ہوئی کتاب ہے جو ہر طرح سے سجاوے اور اپنے ہم مذہبوں کے درمیان ترجمانی کے کام کے لیے بخوبی لائق ہے۔ سید احمد خاں مذہب اسلام کو خاص خدا کا دیا ہوا ہونے پر نہایت پختہ یقین رکھتے ہیں اور اُن کو یہ بھی یقین ہے کہ آخر کار اور

مذہبوں پر یہی مذہب غائب آئے گا۔ مگر اسی کے ساتھ وہ دل سے اور نہایت
 گرجھوشی سے انگریزی عملداری کے معاون ہیں وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ
 اگر انسان وحشیانہ حالت کی طرف مراجعت نہ کر لی چاہے تو تہذیبوں کا ہوتے
 رہنا نہایت ضروری ہے۔ بغیر کسی استثنا کے وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اسلام کو
 روحانی سلطنت حاصل کرنی ہے تو وہ تہذیب و شائستگی کے ساتھ ملا جلا رہے۔
 کوئی انگریز اس قسم کی دلیل پر اعتراض نہیں کر سکتا، کیونکہ اُن کا دعویٰ اس قدر
 مدلل اور مستند ہے کہ کوئی انگریز اُن دلیلوں اور استدلوں کا بیسواں حصہ بھی
 اپنے بیان کی تائید میں پیش نہیں کر سکتا۔ پس اگر سید احمد خاں یہ کہتے ہیں کہ وہابی
 یا پکے مسلمان کے دین کا یہ کوئی جزو نہیں ہے کہ گورنمنٹ انگلشیہ کا مقابلہ
 کرے اور یہ کہ مسلمان پر جیسا اور غیر مذہب والوں کے ساتھ خاص خاص
 حالتوں میں جہاد کرنا فرض ہے ویسا ہی عیسائیوں کے ساتھ ہے اور ویسا ہی
 ہندوؤں کے ساتھ اور یہ کہ مسلمان حکمی فرض سمجھتے ہیں کہ وہ بھی اور مذہب
 والوں کی مانند تمام بنی آدم کے ساتھ برادرانہ طور پر یگانگت اور اتفاق سے
 رہیں تو گو اس قسم کے بیانات ہمارے اگلے خیالات کے کیسے ہی مخالف ہوں
 جب تک کہ ہم کو اس قدر اعلیٰ درجہ کی واقفیت نہ ہو کہ ہم سید احمد خاں پر غلطی
 کا الزام لگا سکیں اُس وقت ہم کو ان باتوں کے تسلیم کرنے کے سوا کوئی
 چارہ نہیں ہے۔“

”ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ تعصب اور فساد کے مقابلہ میں ہم نیا
 احتیاط نہ کریں، لیکن اب ایسی باتوں کا خوف جس سے زیادہ بڑھ گیا ہے، کیونکہ
 انگریزوں کے دلوں میں علی العموم اس بات کا یقین ہے کہ مسلمان جس قدر
 زیادہ ایماندار ہوگا اُسی قدر انتظام کا سخت دشمن ہوگا اور اُسی قدر اس کا پکٹا

ارادہ ہو گا کہ یا تو وہ اُسے توڑے یا خود اُس سے ٹوٹ جائے، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسے لوگ جن کو یہ یقین ہے کہ لنگر ہم کسی انگریز کو حق یا ناحق مار ڈالیں تو ہم کو ثواب دہی ملے گا، گورنمنٹ انگلشیہ سے لے نہایت وقت کی چیز ہیں۔ پس یہ نہایت تسلی اور راحت کی بات ہے کہ ایسی عمدہ عمدہ سے جس کی عمدگی حتی الامکان ثابت ہے یقین دلایا جائے کہ یہ خوف بے بنیاد ہے ہم بھی اس قسم کی باتیں بار بار کہہ چکے ہیں مگر ہم کو امید نہ تھی کہ ایک انگریز اخبار نویس کی رائے ایسے معاملہ میں کچھ معتبر ہوگی۔

اس کے بعد انڈین آنرور کے ڈیپارٹمنٹ نے سرسید کے رسالہ سے چند فقرے نقل کر کے ان کی تائید کی ہے اور ایک لمبی بحث کے بعد اپنے آرٹیکل کو اس فقرہ پر ختم کیا ہے "ممکن نہیں کہ کوئی بیان اس سے (یعنی سرسید کے بیان سے) زیادہ صاف ہو، اس سے ان لوگوں کا اطمینان ہونا چاہیے جو بزدل لادو دہی ہیں۔ سید احمد خاں کے مختصر رسالہ میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کا تذکرہ ہم کرتے اگر ہمارے اس پرچہ میں گنجائش ہوتی۔ ہم ایسی کسی کتاب سے واقف نہیں ہیں جس میں ایسی تھوڑی سی جگہ میں مسلمانوں کے خیالات کی نسبت اس قدر زیادہ اطلاع حاصل ہو۔ ہندوستان کے ہر انگریز کو اسے بغور پڑھنا چاہیے، اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ بہت پھیلے گی، یہ ٹھیک اسی قسم کی کتاب ہے جس کی ضرورت آج کل ان تمام عام لوگوں کے دلوں کو تسلی اور قرار بخشنے کے لیے ہے جو اپنی ناقصیت کے سبب سایہ سے بھی بھڑکتے ہیں۔" سر ایلفرڈ لائل اپنے ایک ایسے میں جو سرسید کے بعد تصدیق و حیلہ میں شائع ہوا تھا، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر یہ بارک کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس مصنف کو مبالغہ کا جن بسا اوقات پریشان کرتا

سب سے اچھے بہتر ہوتا اگر اس جن کو وہ اُتار دیتا۔“

سرستید کے ریلویو اور بھی بعض مدبرانِ سلطنت نے رائیں لکھی ہیں مگر ہم یہاں اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ ریلویو اخبارات میں شائع ہونے کے بعد کتاب کی صورت میں بھی اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپا تھا۔ اس کی پوری پوری کیفیت جب تک کہ وہ اول سے آخر تک نہ پڑھا جائے معلوم نہیں ہو سکتی، مگر ہم بطور نمونہ کے اس کا ایک مختصر مقام اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

ڈاکٹر منبر نے اپنی کتاب کے تیسرے باب کے خاتمہ پر یہ لکھا تھا کہ ”مجھ کو ہندوستان کے مسلمانوں سے دلی خیر خواہی اور محبت کی ہرگز توقع نہیں ہے بلکہ میں اُن ذات سے بڑی امید یہی کر سکتا ہوں کہ وہ حکومتِ انگریزی کے قبول کرنے میں سرد مہری کریں گے۔“ سرسید اس پر یوں لکھتے ہیں کہ ”اگر ڈاکٹر صاحبوں کو ہم لوگوں کے مسلمان ہونے کے باعث اس قدر باپوسی ہے تو میں اولاً اُن سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ قرآن شریف کی اس آیت کی طرف توجہ فرمائیں۔ ”وَلْتَجِدَنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَئِيْمًا ۖ عَلٰۤی ذٰلِكَ عَلَّمْنَا الْيٰهٰوۃَ وَالْاِنۡسَانَ ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوۡنَ“ (یعنی اے محمد تم پاؤ گے تمام آدمیوں میں سخت دشمنِ مومنین کا یہودیوں اور مشرکوں کو اور پاؤ گے مومنین کا سب سے زیادہ دوست اُن لوگوں کو جو اپنے کو نصارا سے کہتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ نصارا اُسے میں اکثر عالم اور عابد ہیں اور وہ بہت گھمنڈ نہیں رکھتے)۔

”دوسرے یہ مسئلہ مشہور ہے کہ جیسا کوئی کہتا ہے ویسا ہی اُس کو نتیجہ ملتا ہے۔ پس اگر مسلمان مجازِ سرد مہری کے قومِ حکمران کی جانب سے

کچھ سلوک نہیں دیکھتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب کو مسلمانوں کی سر دہری پر کچھ
تھیرنا ہونا چاہیے۔ ہم دونوں قوموں یعنی عیسائی اور مسلمانوں کو حضرت عیسیٰؑ
کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ جس سلوک کے تم اور آدمیوں سے متوقع ہو تم کو بھی
اسی طرح ان کے ساتھ سلوک کرنا چاہیے۔

پھر اسی باب کے خاتمہ پر ایک حاشیہ میں ڈاکٹر ہنٹر نے مندرجہ ذیل
سوال لکھا تھا "سوال اسے علماء و محققان شرع اسلام تمہاری اس معاملہ میں کیا
راٹے ہے کہ اگر کوئی مسلمان بادشاہ ہندوستان پر ایسے وقت میں حملہ
کرے جب کہ وہ انگریزوں کے قبضہ میں ہو تو اس ملک کے مسلمانوں کو انگریزوں
کی امان ترک کرنی اور اس غنیمت کی مدد دینی جائز ہے یا نہیں؟ اس سوال کے
جواب میں سرسید نے اول اصول اسلام کی رو سے ایک ہیبت لبی تقریر
کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "جب تک مذہبی معاملات میں ہم کو ہر قسم کی
سزاوی ہندوستان میں حاصل ہے۔ اپنے مذہبی فرائض بے کھٹکے ادا کرتے ہیں
اؤ ان جس قدر بلند آمان سے چاہیں مسجدوں میں دے سکتے ہیں۔ شارع عام
میں دعوت اسلام کر سکتے ہیں۔ پادری جو اعتراض مذہب اسلام پر کرتے ہیں
ان کا جواب بلا خوف و خطر دے سکتے ہیں، خود مذہب عیسوی پر اعتراض کر سکتے
ہیں، ان کے برخلاف کتابیں چھاپ سکتے ہیں اور عیسائیوں کو بلا کسی مزاحمت
اور اندیشہ کے جب وہ مسلمان ہونا چاہیں، مسلمان کر سکتے ہیں، اس وقت
تک انگریزی امان سے علیحدہ ہونا اور غنیمت کو مدد دینا کسی مسلمان کا مذہبی فرض
نہیں ہے، اور اگر مسلمان ایسا کریں تو وہ گنہگار خیال کیے جائیں گے، کیونکہ
ان کا یہ فعل اس پاک معاہدہ کا توڑنا ہو گا جو رعایا اور حکام کے درمیان ہے اور
جس کی پابندی مرتے دم تک کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔"

”اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ ”البتہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر آئندہ کوئی مسلمان یا کوئی اور بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو اس صورت میں باعتبار عمل درآمد کے ٹھیک ٹھیک مسلمان کیا کریں گے؛ کیونکہ وہ شخص درحقیقت نہایت دلیر ہے جو اپنے دلی دوستوں اور رشتہ داروں کے سوا عام شخصوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دے بلکہ میری دانست میں تو شاندرشتہ داروں اور دوستوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دینا مشکل ہے چنانچہ جو ملکی لڑائیاں ہندوستان میں ہوئی ہیں ان میں باپ بیٹوں سے اور بھائی بھائی سے لڑے تھے۔ پس کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ کسی بڑے ملکی ہنگامہ میں کل قوم کا کیا حال ہوگا؛ میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کریں گے جو ان کی پورے شکل حالت ان سے کروائے گی اور میری دانست میں یہ سخت سوال ہندوؤں سے بھی اسی طرح متعلق ہو سکتا ہے جیسا کہ مسلمانوں سے۔ پس اس لحاظ سے اس کا دریافت کرنا دونوں قوموں سے ضرور ہے۔“

سرسید نے جو کچھ ڈاکٹر منٹر کی کتاب پر لکھا تھا اس کا حال بقدر ضرورت ہم نے بیان کر دیا ہے مگر ہمارے نزدیک بڑی بے انصافی اور ناشکری ہوگی اگر اس مقام پر آنرہیل ڈبلیو ڈبلیو ڈاکٹر منٹر کے اس شریعہ برتاؤ کا ذکر نہ کیا جائے جو اس واقعہ کے بعد سرسید اور مسلمانوں کے ساتھ ان سے ظہور میں آیا۔ انھوں نے مدرسۃ العلوم کے پختہ بورڈنگ ہاؤس میں ایک کمرہ بنانے کے لیے ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے دیا اور ۱۸۸۶ء میں جب ”ایجوکیشن کمیشن“ کے پریسیڈنٹ تھے کمیشن کے دورہ کے وقت اضلاع شمال مغرب میں پہلا اجلاس علیگڑھ میں کیا اور اپنی اخیر اسپیچ محمدن کالج میں آ کر دی جس میں نہایت بشارت اور کشادہ دلی کے ساتھ سرسید اور ان کی کوششوں کی

بے انتہا تعریف اور کالج کے سرسبز ہونے کی تمنا ظاہر کی تھی اور کہا تھا کہ اگر ایسی ہی چند مثالیں سیلف ہلپ کی اور ہوں تو ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کی ضرورت نہ رہے گی۔

ابتدائی مدرسہ علیگرھ میں قائم ہونا

فروری ۱۸۶۳ء میں جو جلد صدر کمیٹی کا بنارس میں ہوا تھا اس میں سید محمود نے یہ بھی تحریک کی تھی کہ بہت جلد مقام مجوزہ میں ایک مدرسہ ماتحت مدرسہ العلوم مجوزہ کے قائم کیا جائے چنانچہ ۲۱ اگست ۱۸۶۳ء کو علیگرھ میں جو سب کمیٹی کا جلسہ ہوا اور جس میں علیگرھ اور بلند شہر کے اکثر رئیس اور معزز مسلمان شریک تھے، وہاں مولوی سمیع اللہ خاں سکریٹری سب کمیٹی اور سید محمود نے اپنی اسپیچوں میں مدرسہ ماتحت قائم کرنے کی دوبارہ تحریک کی۔ پھر ۲۱ دسمبر ۱۸۶۳ء کو دوسرا جلسہ علیگرھ ہی میں ہوا اور مولوی سمیع اللہ خاں نے تقریر کرتے وقت کہا کہ مدرسہ العلوم کی مخالفت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ اس کے رفع کرنے کی تدابیر اس سے بہتر نہیں کہ ایک ماتحت مدرسہ بطور نمونہ کے علیگرھ میں قائم کیا جائے جس کے طریقہ تعلیم سے لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ جو تعلیم صدر کمیٹی بنارس نے تجویز کی ہے وہ کسی طرح اصول اسلام کے برخلاف نہیں ہے۔ اس تجویز کو سب نے پسند کیا اور بعض علمائے اہل اسلام نے جو اس جلسہ میں شریک تھے طریقہ تعلیم کو جو سکریٹری نے اس وقت بیان کیا بلا محظور شرعی تسلیم کیا۔ اس جلسہ میں اور سب کمیٹیوں کی نسبت چندہ کی رقم زیادہ کھی گئی تھی اور جس شرط پر مدارس ماتحت مختلف مقامات میں جاری کر لے قرار پائے تھے اس کی طرف سے علیگرھ کی سب کمیٹی نے کافی اطمینان

کر دیا تھا۔ اس لیے صدر کمیٹی بنارس نے بھی علیگڑھ سب کمیٹی کی تجویز کو پسند کیا اور سکرٹری سے درخواست کی کہ علیگڑھ میں مدرسہ ماتحت جاری کیا جائے مولوی سمیع اللہ خاں سکرٹری سب کمیٹی نے جو اس وقت علیگڑھ میں بارٹونیٹ بیج تھے نہایت دلی سعی اور کوشش سے صدر کمیٹی کے مقصد کو انجام دیا اور ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کو جو کہ ملکہ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا مدرسہ کے افتتاح کی تاریخ قرار پائی۔ تاریخ مذکور پر سرستید بھی بنارس سے علیگڑھ آ گئے اور ایک جلسہ میں جس کے صدر انجمن مولوی محمد کریم مرحوم ڈپٹی کلکٹر علیگڑھ تھے رسم افتتاح عمل میں آئی اور یکم جون ۱۸۵۷ء سے جماعت بندی ہو کر تعلیم شروع ہو گئی تاریخ مذکور سے لے کر اب تک مدرسہ العلوم کو قائم ہوئے ۲۴ برس کا زمانہ گزرا ہے، اس عرصہ کے تمام واقعات اور حالات جو مدرسہ مذکور کے انتظار اور ترقی سے متعلق ہیں ان کے لکھنے کے لیے ایک مجدد کتاب کی ضرورت ہے اس لیے یہاں ہم صرف ضروری امور بیان کریں گے جو اس کتاب کے موضوع سے مناسبت رکھتے ہیں۔

جس وسیع میدان میں اب محمد بن کالج علیگڑھ اور اس کی تمام عمارتیں موجود ہیں کسی زمانہ میں یہ چھاؤنی سے متعلق تھا اور یہاں فوج کی پریٹ بٹوا کرتی تھی مگر اب وہاں چھاؤنی نہیں رہی تھی اور اس میدان میں سے کچھ قطعات لوگوں کو سرکار سے کوٹھیاں بنانے کے واسطے مل گئے تھے لیکن اب بھی

لے افتتاح کے موقع پر مولوی محمد اکبر اور مولوی محمد اشتم نے عربی نظم و نثر بطور مبارکباد کے اور مولوی صفدر حسین نے فارسی اداسود میں قطعات تاریخ لکھے تھے چونکہ یہ سب نثریں طرلان ہیں اس لیے صرف قطعہ تاریخ تحریر کیا جاتا ہے۔

قریب ۷۷ ایکڑ کے زمین باقی تھی۔ سرسید نے مدرسہ کے لیے کمیٹی کی طرف سے
 اس زمین کے ملنے کی درخواست کی تھی۔ اُس وقت ہنری لارنس علیگرہ میں
 کلکٹر تھے انھوں نے اس قطعہ کے ملنے کی رپورٹ گورنمنٹ میں بھیجی وہی اور
 سرولیم میور نے بھی جو اس زمانہ میں لفٹنٹ گورنر تھے اُس قطعہ کے دینے
 کا وعدہ کر لیا مگر ابھی وہ قطعہ کمیٹی کو ملنے نہیں پایا تھا کہ ماسٹی گیوٹ صاحب
 علیگرہ میں قائم مقام کلکٹر ہو گئے۔ انھوں نے اس بات کی سخت مخالفت کی
 کہ وہ قطعہ کمیٹی کو کالج کے لیے دیا جائے۔ ان کے بعد چوسٹر کا لون مستقل کلکٹر
 و مجسٹریٹ مقرر ہو کر آئے انھوں نے بھی ویسی ہی مخالفت کی اور اس وقت
 کے تمام یوروپین حکام ان کے ہم رائے اور ہمزبان ہو گئے یہ ایسی سخت جرات
 ہوئی تھی کہ بانیان کالج اس کے ملنے سے بالکل ہونے لگے تھے اور قریب
 تھا کہ وہ کالج کا خیال چھوڑ دیں اور تمام کوششیں برباد ہو جائیں۔ مگر خوش قسمتی
 سے اُسی زمانے میں سر جان اسٹریچی جن کا اس کالج پر سب سے زیادہ احسان
 ہے لفٹنٹ گورنر ہو گئے اور یہ معاملہ ان کے سامنے پیش ہوا۔ وہ خود دورہ
 کے دنوں میں علیگرہ آئے اور موقع کو ملاحظہ کیا۔ سرسید بھی بنارس سے علیگرہ
 پہنچے اور بہت سی گفت و شنید کے بعد ہنر آفرنے یہ فیصلہ کیا کہ زمین کالج بنانے
 کے لیے کمیٹی کو اس شرط پر دی جائے کہ جو عمارت اُس میں بنائی جائے اُس
 کے بننے سے پہلے اُس کا لفٹنٹ گورنمنٹ کے ملاحظہ کے لیے بھیجا جایا کرے
 اور اگر بالضرر کسی کوئی ایسا اتفاق پیش آئے کہ یہ کالج بند ہو جائے تو
 جس قدر عمارت کمیٹی کی بنائی ہوئی یہاں موجود ہوں گی ان سب پر سرکار
 کا قبضہ ہو جائے گا۔ کمیٹی نے یہ دونوں شرطیں منظور کر لیں اور سر جان اسٹریچی
 نے اُس کی منقولہ ہی گورنمنٹ ہند سے منگا کر سند عطا کرے اور کمیٹی کو عیناً

کی اور حسب ضابطہ قطعہ مذکور پر قبضہ دلایا گیا۔ مدرسہ ماتحت کے افتتاح سے پہلے یہ زمین کمیٹی کو مل چکی تھی اور جس بنگلہ میں اب تک محمد بن ہانی اسکول کی عمارتیں چڑھتی ہیں۔ اس بنگلہ میں ابتدائی مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔

۱۲۔ نومبر ۱۹۵۷ء کو سر ولیم میور جو اس زمانے میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے مدرسہ کے ملاحظہ کو آئے اور ایک لمبی اسپیچ دی جس میں کمیٹی کو مبارکباد دینے کے بعد سر سید کی نسبت کہا کہ میں خاص کر اپنے دوست کی دیرینہ خواہش کے پورا ہونے اور اُن کے دلی مدعا کا پہلا پھل حاصل ہونے پر اُن کو مبارکباد دیتا ہوں۔

جب یہاں تک نو بہت پہنچ گئی اور مدرسہ کو جاری ہوئے ایک سال گزر چکا تو سر سید کو ضروری معلوم ہوا کہ نوکری سے علیحدہ ہو کر مدرسے کی تکمیل میں اطمینان اور کامل توجہ سے کوشش کی جائے کچھ نو سرکاری کاموں کی مصروفیت مدرسے کے کام میں جارح ہوتی تھی اور کچھ وہ اپنی جلیبی احتیاط کے سبب سے سرکاری عہدہ دار ہونے کی حالت میں چمنہ وصول کرنے سے بچکے تھے۔ پیش کا نقشہ تو وہ مدرسہ کے جاری ہوتے ہی بھیج چکے تھے، جولائی ۱۹۵۷ء کے آخر میں نیشن کی منظوری بھی آگئی اور وہ اُسی وقت ملازمت سے کنارہ کش ہو کر علیگڑھ چلے آئے اور اپنی قدیم کوٹھی جو علیگڑھ میں تھی ولایت جاتے ہوئے رہن کر گئے تھے مگر جب یہ امر طے ہو گیا کہ مدرسہ العلوم علیگڑھ میں قائم کیا جائے تو سید محمود نے اپنے اور سر سید کے رہنے کے لیے ایک اور کوٹھی خرید لی تھی اور پہلی کوٹھی کو فروخت کر دیا تھا۔ جب سر سید بنارس سے آئے تو اس کوٹھی کو اپنی ضرورت کے موافق درست کیا اور اس میں سکونت اختیار کی۔

جب وہ بنارس سے آئے تو ضلع علیگڑھ کے رؤسا اور معزز لوگوں نے اُن کو دعوت دی اور ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا جس میں اضلاع قرب و جوار کے رؤسا بھی شامل تھے اس جلسہ میں سرسید کو ایڈریس بھی دیا گیا تھا جس میں اُن کے احسانات کا ذکر تھا جو قوم کی بھلائی کے لیے اُن سے ظہور میں آئے سرسید نے ایک فقرے کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے وہ ہم بجنسہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ”ہاں یہ بات سچ ہے کہ میں نے اپنے اس قدیم نامی اور پرانے شہر کو جہاں میرے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں اتیک زمین میں پڑی ہیں اور جہاں میرے بہت سے عزیز ایتک رہنے ہیں جس کی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا میں بنا ہوں اور پھر اُسی میں میری خاک مل جائے گی۔ صرف مدرستہ العلوم کی محبت، اپنی قوم کی بھلائی اور رعایان ضلع علیگڑھ و بلند شہر کی محبت و عنایت کے خیال سے چھوڑا ہے اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو، دور و دراز سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عاملوں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود و عیش و آرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں! جہاں تک ہوسکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا، سب سے اول یہی تدبیر سوچیں کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرستہ العلوم

قائم کیا جائے جس کی بنا آپ کے شہر میں اور آپ کے زیر سایہ پڑی ہے۔

فوٹو لشن سٹون کا جلد

الغرض سرستید علیگرھ میں آکر مہتمن کالج کے کام میں مصروف ہو گئے کالج کی عمارتوں میں جلد اور جلد ترقی ہونے لگی۔ ہندوستان کے اطراف میں چاند کے واسطے زیادہ تحریکیں اور کوششیں ہونے لگیں اور علیگرھ صرف دارالعلوم ہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ قومی ہمدردی، قومی اتحاد قومی مصالح اور قومی مقاصد کی تحریک کا صدر مقام اور مرکز بننے لگا۔ ۱۸۷۷ء کے شروع میں کالج کا بنیادی پتھر غیر معمولی اور غیر متوقع شان و شوکت کے ساتھ رکھا گیا۔ پہلے یہ پنجویں ٹھنیری تھی کہ لارڈ نارٹھ بروک کے ہاتھ سے یہ رسم ادا کی جائے گی۔ لیکن لارڈ ممدوح کو کسی خانگی ضرورت کی وجہ سے پیش از وقت ہندوستان کو چھوڑنا پڑا۔ پھر سر جان اسٹریچی لفٹنٹ گورنر شمال مغرب نے اس رسم کے ادا کرنے کا وعدہ کیا، مگر سرکاری ضرورتوں کی وجہ سے وہ بھی وقت معین پر نہ آ سکے۔ آخر لارڈ لٹن وائسرائے و گورنر جنرل کشور بہتہ کے ہاتھ سے اس عظیم الشان دربار کے بعد جو ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا ادا ہوئی، لارڈ لٹن نے دربار قبیری کے بعد دلی سے مدرسہ العلوم میں آنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ چنانچہ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو مع لیڈی لٹن کے علیگرھ میں تشریف لائے اور سرستید کے ہاں مہمان ہوئے۔ سہ پہر کو وقت معین پر مع لیڈی صاحبہ کے فوٹو لشن کے موقع پر تشریف لے گئے۔ اول تید محمود نے ایڈریس پڑھا اور وائسرائے نے اس کا جواب نہایت شیریں زبانی اور اپنی مشہور فصاحت کے ساتھ دیا۔ پھر سرستید نے بنیاد کا پتھر رکھنے کی

درخواست کی چنانچہ حضور ممدوح نے بنیاد کا پتھر اس موقع پر جہاں اسٹریچی ہال کے صدر مقام میں سنگ مرمر کا کتبہ بنیاد کے قریب لگا ہوا ہے اپنے ہاتھ سے رکھا اور فونڈیشن کی تمام رسمیں یورپین قاعدہ کے موافق ادا کی گئیں۔

وائسرائے نے علیگڑھ سے چلتے وقت اپنی تصویر اور کئی جلدیں اپنی تصنیفات سرسید کو بطور یادگار کے عنایت کیں، اس کے بعد شہر میں ان کو ایک کشتی تقریبی بطور تحفہ اور یادگار کے بھیجی جس پر عبارت کندہ تھی۔ ”بیادگار کھنے بنیاد کالج کے بدستب خاص وائسرائے بتاریخ ۸ جنوری ۱۸۶۷ء نشان اعزاز بخش دوستی از جانب رابرٹ لارڈ لٹن جی۔ سی۔ بی۔ جی۔ ام۔ ایس۔ اے وائسرائے و گورنر جنرل ہند بھولی سیاحمد خاں صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔ پریسیڈنٹ اینگلو اورینٹل کالج اہل اسلام مقام علیگڑھ بتاریخ یکم جنوری ۱۸۶۷ء۔“

سید محمود نے جو سکیم ۱۔ فروری ۱۸۶۷ء کو کمیٹی میں پیش کی تھی اس میں انھوں نے صاف اس بات کی تصریح کی تھی کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنی ہے۔ پس کمیٹی نے جو انگیزی میں اپنا نام ”محمدن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی رکھا ہے اس میں سچائے کالج کے یونیورسٹی کا لفظ ہونا چاہیے اور اردو میں بجائے مدرسۃ العلوم کے دارالعلوم نام رکھنا چاہیے اور سبجز اس کے کہ گورنمنٹ انگریزوں کے حال رہے۔ اس کی اور کسی قسم کی مداخلت اس دارالعلوم میں نہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس سکیم کی جو کاپی گورنمنٹ میں بھیجی گئی تھی اس میں بھی یونیورسٹی کا لفظ لکھا تھا۔ لوکل گورنمنٹ سے اس کا یہ جواب آیا کہ اگر کمیٹی محمدن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ اس میں گرانٹ ان ایڈ نہیں دینے کی باوجود اس کے سرسید

کا ارادہ یہی تھا کہ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اُن کو یقین تھا کہ جب تک موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم سے قطع نظر نہ کی جائے گی اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے اُن کی ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت کا اپنے طور پر انتظام نہ کیا جائے گا، تب تک اصلی لیاقت قوم کے بچوں میں ہرگز پیدا نہ ہوگی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس دارالعلوم میں کیمبرج یونیورسٹی کے موافق فیلوشپ جاری کیا جائے اور جو طالب علم فارغ التحصیل ہو جائے اُس کو کسی خاص علم میں جس سے وہ خاص مناسبت رکھتا ہو، مصروف رہنے اور اُس میں کمال حاصل کرنے کے لیے فیلوشپ دی جایا کرے اس طرح ایک گروہ عالموں اور محققوں کا قوم میں پیدا کیا جائے جو تمام قوم میں علم و کمال پھیلانے کے لیے بمنزلہ آلہ کے ہو۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ ایسی یونیورسٹی صرف قوم کے بھروسہ پر قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، طالب علم اور نہ اُن کے مربی کوئی اس بات پر رضامند ہونے والا تھا کہ یونیورسٹیوں کی ڈگریوں سے جو گورنمنٹ کی نوکری کا ذریعہ ہیں قطع نظر کی جائے اور فی الحقیقت مسلمانوں کی حالت اسی بات کی مقتضی تھی کہ صرف موجودہ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں حاصل کرنے ہی کو فہم نہ سمجھا جائے الغرض سرسید کو اپنا منصوبہ پورا کرنے سے بالکل مایوسی ہو گئی۔ یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال انھوں نے بالکل چھوڑ دیا اور مدرستہ العلوم میں وہی کورس اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیاں تجویز کریں۔ انھوں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی۔

نہ ہوتا بپردانہ گرا آسمان تک
تو داں تک اُڑیں ہو رسائی جہاں تک

چندہ وصول کرنے کی تدبیریں

مدرسۃ العلوم کے متعلق سب سے زیادہ مشکل کام چندہ کا وصول کرنا تھا۔ جن کی اولاد کی تعلیم کے لیے مدرسہ قائم کرنا منظور تھا اول تو وہ پہلے ہی انگریزی تعلیم سے نفور تھے، دوسرے جس وقت مدرسہ کے لیے تحریک شروع ہوئی اسی کے ساتھ تہذیب الاخلاق جاری ہو گیا جس کے مضامین سے مسلمان عموماً نفرت کرتے تھے اور جس کی وجہ سے مدرسۃ العلوم میں چندہ دینے کو معصیت جاننے لگے تھے۔ اخباروں اور رسالوں میں مدرسۃ العلوم کے خلاف بے شمار مضامین چھپتے تھے اور سرسید کی تکفیر کے فتوے شائع کیے جاتے تھے۔ مولوی وعظ کی مجلسوں میں لوگوں کو چندہ دینے سے روکتے تھے۔ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ منصبی دباؤ سے چندہ وصول کیا گیا ہو گا مگر یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے۔ سرسید نے مدرسہ قائم ہونے سے ایک ہی برس بعد ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اس سے پہلے جس قدر چندہ ہوا وہ زیادہ تر علیگڑھ، لاہور، پٹنہ، مرزا پور اور پٹنہ وغیرہ سے ہوا۔ بنارس میں جہاں وہ خود سرکاری عہدہ دار تھے انھوں نے اپنے چندہ ہندو یا مسلمان دوستوں کے سوا کسی سے چندہ مانگنا پسند نہیں کیا۔ اس کے سوا ہندوستانی اور خامکر مسلمان قومی کاموں میں چندہ دینے کے مفہوم سے محض ناواقف تھے۔ جب تک کسی حاکم کا دباؤ یا اشارہ ہوتا تھا چندہ جمع ہونا نہایت مشکل تھا۔ میں نے سنا ہے کہ سرسید نے ولایت جانے سے پہلے ایک روز نواب انوجان مرحوم سے جو ان کے قریب رشتہ دار تھے برسبین تذکرہ یہ کہا کہ کیوں حضرت آپ کے نزدیک مسلمانوں کی تعلیم کے لیے دس لاکھ

روپیہ جمع ہو سکتا ہے یا نہیں۔ انھوں نے نہایت تعجب سے کہا ”نعم کیا دیوانوں کسی باتیں کرتے ہو! مسلمانوں سے دس لاکھ پیسے بھی وصول نہیں ہو سکتے۔“ اس حکایت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت چندہ جمع کرنے کی نسبت لوگوں کے کیسے خیالات تھے۔ باوجود اس کے یہ بات کچھ کم تعجب انگیز نہیں کہ ایک شخص کی تحریک یا کوشش سے بیس برس کے عرصہ میں سات آٹھ لاکھ کی عمارت تیار ہو گئی اور مدرسہ کی آمدنی اس حد تک پہنچ گئی کہ اسی ہزار روپیہ سالانہ تک اس میں خرچ ہونے لگا۔ ایک ایرانی سیاح نے مدرسہ کو دیکھ کر خود بہارے سامنے یہ الفاظ کہے ”واللہ معجزہ بینا بدکاریکہ از سلطنت برنیا بدچگونہ از یک فرورعیت سرانجام شد۔“ مگر ہم سرستید کی اس کامیابی کو معجزہ نہیں سمجھتے بلکہ کامیابی کے اسباب پر نظر کرتے ہیں جن پر بغور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دانشمند اور راست باز آدمی استقلال اور ہمت سے ہر قسم کی مشکلات پر غالب آ سکتا ہے۔

سرستید نے مدرسہ کے کام کو جس لیاقت اور باقاعدگی کے ساتھ شروع کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ سمجھ دار اور روشن خیال مسلمان اس کی طرف گرویدہ ہو گئے اور سلطنت کے بڑے بڑے جلیل القدر رکن اس کی جانب التفات ظاہر کرنے لگے اور اس کے معاون بن گئے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کا اثر ذی مقدور لوگوں پر پڑنے لگا۔ اگرچہ مخالفتیں چلتی گاڑی ہیں برابر مددگار اٹھاتی رہیں مگر کام کی عظمت اس کی تائید کرنے والوں کا اعتبار اور ان کی وجاہت اور خود سرستید کا استقلال آہستہ آہستہ ہر ایک مخالفت کا مقابلہ کرتا رہا۔ تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں کی مقیم حالت اور انگریزی تعلیم کی ضرورت ان پر ظاہر کرنی شروع کی اور مذہبی توہمات جو تبدیلی حالت کے

سدا راہ نھے شیٹا فشیٹا فور ہونے لگے، سرستید کی طرف سے اس بات کا اطمینان کہ جس کام کے لیے روپیہ دیا جاتا ہے وہ اسی کام میں صرف ہوگا، سب سے زیادہ فراہمی چندہ کا باعث ہوا۔

سرستید کی سب سے بڑی تدبیر جس نے کالج کی عظمت کا نقشہ ص و عام کے دل پر بٹھا دیا اور جس سے کالج کو بے انتہا مدد پہنچی وہ یہ تھی کہ کالج اور بورڈنگ ہوس کی عمارتیں تاحقہ و راعلیٰ درجہ کے اسکیل پر بنائی تجویز کیں اور عمارات کے بنانے میں نہایت جرات اور دلیری سے کام لیا۔ اگر روپیہ میں کمی ہوئی تو قرض لے لیکر عمارتوں کو پورا کیا۔ اس تدبیر سے ایک طرف تو کالج کی بڑائی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور مسلمانوں کو قومیت کے بھولے ہوئے خواب یاد آنے لگے۔ حکام کے دل میں کالج کی وقعت زیادہ ہونے لگی اور ہر شخص کو اس میں چندہ دینے کی ترغیب ہوئی اور دوسری طرف کرایہ کی آمدنی روز بروز بڑھتی شروع ہوئی جو رفتہ رفتہ ۲۳ برس کے عرصہ میں تقریباً دس ہزار سالانہ تک پہنچ گئی۔ مگر بڑی بڑی عمارتوں کا بنوانا خود روپیہ کا محتاج تھا سو اس کے لیے سرستید نے یہ تدبیر نکالی کہ کالج کی ہر ایک عمارت کا تجزیہ کر کے اس کو متعدد حصوں میں تقسیم کر دیا اور اثبات دے دیا کہ فی حصہ اس قدر روپیہ ہوتا ہے، جو شخص اتنا روپیہ دے گا اس کا نام عمارت پر کندہ کیا جائے گا۔ مثلاً کالج کے بڑے احاطہ کی سنگین جالیوں کے لیے فی جالی جس روپیہ قرار دیا ہے اور اس طرح احاطہ کا ایک بیڑا حصہ تیار ہو گیا، یا بورڈنگ ہوس کی پختہ بارک کے لیے فی کمرہ چندہ سو روپیہ مقرر کیا اور اس طرح ایک تعداد کثیر پختہ کمروں کی رفتہ رفتہ تیار ہو گئی احاطہ کے تین دروازے مقرر کیے اور جو شخص ایک دروازہ

بنواد سے اُسی کے نام سے اُس دروازہ کو نامزد کرنا تجویز ہوا۔ اسٹریچی ہال کی لاگت کے بہت سے حصے کر کے فی حصہ پانسو روپیہ مقرر کیا اور تین آدمیوں نے پان پانسو روپیہ دینے کا سب کے نام اُس میں منگ مرمر پر کندہ کر دینے۔ اس کے سوا بہت سی عالیشان عمارتیں کالج کے بڑے بڑے محسنوں کی یادگار میں بنائی تجویز کیں جن میں ان کے دوستوں اور خواہموں نے بطیب خاطر چندہ دینا قبول کیا۔ طالب علموں کے رہنے کے لیے بہت سے مکان قرض لے کر بنوائے اور ان کے کرایہ کی آمدنی میں سے کسی قدر سود میں لگا دیا اور جب کہیں سے کچھ روپیہ مہم پہنچا فوراً قرضہ ادا کر کے اُن کی کل آمدنی مدرسہ کے تحت میں لے لی۔

صیغہ تعمیرات کے سوا کالج کے ادراخراجات کے لیے سرستید نے نئے نئے طریقوں سے روپیہ وصول کیا جس کو سن کر لوگ تعجب کریں گے ایک دفعہ تین ہزار کی لاٹری ڈالی۔ ہر چند مسلمانوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی مگر سرستید نے کچھ پروانہ کی اور بعد تقسیم انعامات کے بیس ہزار کے قریب کالج کو پہنچ رہا۔ لطیفہ۔ جن دنوں میں لاٹری کی تجویز پیش تھی دو رئیس سرستید کے پاس آئے اور لاٹری کے ناجائز ہونے کی گفتگو شروع کی۔ سرستید نے کہا جہاں ہم اپنی ذات کے لیے ہزاروں ناجائز کام کرتے ہیں وہاں قوم کی بھلائی کے لیے بھی ایک ناجائز کام سہی۔ سرستید کے ایک دوست وہاں موجود تھے۔ انھوں نے کہا "لاٹری کا گناہ درحقیقت شیوں اور دولت مندوں پر ہوگا۔ اگر وہ مدرسہ کی مدد کرتے تو کیوں لاٹری کی ضرورت ہوتی۔"

لاٹری کے سوا انھوں نے اور بے شمار تدبیروں سے روپیہ جمع کیا۔

اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابیں فروخت کر کے روپیہ پیدا کیا۔ اپنی تصویر کی کاپیاں بیچیں اور جو کچھ ملا کالج کو دیدیا جب خلیفہ سید محمد خاں مرحوم وزیر ریاست پٹیالہ کے پوتا پیدا ہوا اور انھیں دنوں میں سرسید کا پٹیالہ جانا ہوا تو وزیر صاحب سے پوتے کے ہونے کی خوشی میں چراغی کے پانچ روپے طلب کیے جس پر انھوں نے ایک مقول رقم ان کی نذر کی۔ اُن کے ایک دوست کے قبائل دور دراز سفر سے علیگڑھ آئے، آپ سیادت کے دعوے سے اُن کے ہاں امام ضامن کا روپیہ مانگنے کے لیے پہنچے اور وہاں سے ایک شرفی اور کچھ روپیے لے کر آئے۔

چندہ وصول کرنے کے موقع پر انھوں نے کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ میں کون ہوں؛ کس سے مانگتا ہوں؛ اور کس طرح مانگتا ہوں؛ نمائش گاہ علیگڑھ میں انھوں نے کتابوں کی دوکان لگائی اور خود کتابیں بیچنے کے لیے دوکان پر بیٹھے۔ نیشنل و انٹرنیشنل کرگسٹ میں جھولی ڈالی۔ پنی ریڈنگ کاجلسہ کیا اور اسٹیج پر کھڑے ہو کر غز لیں گائیں۔

پنی ریڈنگ کاجلسہ اس لیے قرار دیا گیا تھا کہ غریب طالب علموں کے وظیفوں کے لیے کچھ سرمایہ جمع کیا جائے۔ جب اس جلسہ کی تجویز تھیری تو دوستوں نے منع کیا کہ ایسا ہرگز نہ کیجیے گا۔ لوگ مطعون کریں گے اور تماشے والا کہیں گے۔ اخباروں میں ہنسی اڑائی جائے گی۔ سرسید نے کہا "اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے اس میں سے کچھ بھی نہ کر سکتا۔ لوگوں کے کہنے کا کچھ خیال نہ کر دیکھو کہ اس سے درحقیقت قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں؟" جس وقت وہ اسٹیج پر کھڑے ہوئے تو انھوں نے ایک نوٹہ تقریر کی جس کے چند فقرے یہاں لکھے جاتے ہیں:

”کون ہے جو آج مجھ کو اسپتال پر دیکھ کر حیران ہوتا ہو گا؟ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں، وہی جن کا دل جھوٹی شجی اور جھوٹی مشیت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی فتحی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کیے جائیں ان کو بے عزتی کے کام سمجھیں۔ آہ اس قوم پر جو لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے مکر و پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقع کو اپنے منہ پر ڈالے ہوئے ہوں مگر اپنی بد صورتی اور دل کی برائی کا کچھ علاج نہ سوچیں۔ آہ اس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور شکست کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام کرے جن سے بے شرمی و بے حیائی بھی شرمناک نہ لگے۔ لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور تعزیر کا کام سمجھے۔“

”اے ریشیو اور اے دولتمند و انتم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ قوم کی بُری حالت ہو اور ہمارے بچوں کے لیے سب کچھ ہے۔ یہی ان لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے مگر اب انھیں کے بچوں کی وہ قربت ہے جس کے لیے ہم آج اسپتال پر کھڑے ہیں۔ اے صاحبو! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے۔ قوم کے بچے اخراجات تعلیم کے سرانجام نہ ہونے سے ذلیل اور ذلیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے غریب بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے۔ مگر افسوس! کامیابی نہیں ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی، مگر قلیل ملی۔ والنیٹر بنالے چاہے، مگر بہت کم بنے اور جو بنے ان سے کچھ بن نہ آئی۔ پس میں اسپتال پر اس لیے آیا ہوں کہ قوم

کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کر سکوں ۔ اس کے بعد سرسید نے کچھ اور تقریریں
کی اور آخر کو خواجہ حافظ کی یہ غزل بہ اضافہ دو اشعار حسب حال جلسہ میں پڑھی

ساقیا بر خیز و در وہ جام را	خاک بر سر کن غم ایام را
ساغر سے بر کفم نہ تازہ بر	بر کشم این دلق اندر قیام را
گرچہ بدنامی ست نزد عاقلان	مانمی خواہیم تنگ و نام را
بادہ در وہ چند اندر باد غرور	خاک بر سر نفس نافر جام را
دوہ آہ سینہ نالان من	سوخت این افسر دکان خام را
محرم راز دل شیداٹے خود	کس نمی بینم زخاص و عام را
باد لارے سرا خاطر خوش ست	کز دلم کیبارہ برد آرام را
ننگ دو گیسو و اندر چمن	ہر کہ دید آں سر و سیم اندام را
کیست آں سرو سہی کاندہ سرش	با ختم دین و دل و آرام را
قوم ما ! اے قوم ما ! کز بہر تو	دادہ ام بر باد ننگ و نام را
صبر کن احمد بہ سختی روز و شب	عاقبت روز سے بیابی کام را

غرض کہ سرسید نے مدرسہ کی خاطر ہر رات کو اپنے نفس پر گوارا کر لیا تھا۔

۱۸۵۷ء میں جب پہلی بار انھوں نے لاہور میں لکچر دیا، جہاں لاہور کے تمام
جلیل القدر عہدہ دار اور حاکم اور شہر کے ہندو اور مسلمان رئیس اور ادبے اور
اعلیٰ تقریباً دس بارہ ہزار آدمی جمع تھے، تو مذہبی مخالفتوں کا ذکر کر کے انھوں
نے کہا کہ ”فرصت کرو کہ میں ایک بد عقیدہ ہوں، مگر اے یورگان پنجاب! میں
آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی میں کوشش
کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم اور اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے؟ آپ کے لیے
دولت سرا بنانے میں میں آپ آرام کرتے ہیں اور آپ کے بچے پڑش

پاتے ہیں، یا آپ کے لیے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد الجلال
کا نام پکارتے ہیں، چوڑھے، چار، قلی کا فرست پرست، بد عقیدہ سب
مزدوری کرتے ہیں، مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں
اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں، آپ مجھ کو بھی اس
مدرسہ کے قائم کرنے میں ایک قلی چمک کی مانند تصور کیجیے اور میری محنت
اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجیے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے
والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمک ہے۔ اپنے گھر کو مست
ٹھہرایئے۔“

مدرسہ کے لیے قلیل سے قلیل چندہ کو بھی ویسی ہی خوشی اور کشادہ
پیشانی سے قبول کرتے تھے جیسے بڑی بڑی رقموں کو لیتے تھے۔ لوگ دو دو
آنے، اور چار چار آنے دیتے تھے اور وہ چوم پاٹ کر رکھ لیتے تھے ایک
صاحب نے ناچ کی محفل میں اہل محفل سے چندہ جمع کیا، یہاں تک کہ
طوائف اور سازندوں نے بھی مدرسہ کی حقیقت سن کر خوشی سے چندہ دیا
اور اس طرح سو سو روپیہ جمع ہو گیا، انہوں نے سید کو اطلاع کی کہ ایسا اور
ایسا روپیہ ہے اگر کہیے تو بھیج دیا جائے، سرستید نے کچھ پس و پیش نہیں کی
اور فوراً روپیہ منگوا لیا۔

مدرسہ کے لیے انہوں نے بڑے بڑے لیے سفر کیے، ٹپنہ، گورکھ پور،
الہ آباد، مرزا پور، لاہور، امرتسر، پٹیالہ، حیدر آباد، نیل گری، بھوپال، جبل پور
اور دیگر مقامات میں صرف مدرسہ کی دھن میں گئے، لاہور اور حیدر آباد متعدد
دفعہ اسی غرض سے جانا ہوا، ہزار ہا روپیہ ان سفروں میں ان کا صرف ہوا۔
اگرچہ ان کے دوست اور رفیق بھی جو ان کے ہمراہ جلتے تھے اپنا اپنا

خرچ اپنی گرہ سے اٹھاتے تھے لیکن وہ اکثر ہلتے رہتے تھے اور سرسید کا
 ہر سفر میں ہونا ضروری تھا۔ اس کے سوا ہمیشہ رزرو ڈ گاڑیوں میں سفر کرتا
 تھا اور جس قدر سواریاں کم ہوتی تھیں ان کی کمی زیادہ تر سید کو پورا کرنی پڑتی
 تھی۔ ایک بار ان کے ایک دوست نے ان سے کہا کہ آپ راجپوتانہ کا بھی
 ایک بار دورہ کیجیے۔ سرسید نے کہا روپیہ نہیں ہے۔ ان کے منہ سے
 نکلا کہ جب آپ کالج کے واسطے سفر کرتے ہیں تو آپ کا سفر خرچ کمیشن
 کو دینا چاہیے۔ سرسید نے کہا میں اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ مدد
 چلے یا نہ چلے مگر میں اسی حالت میں مدرسہ کے لیے سفر کر سکتا ہوں جب
 سفر کے کل اخراجات اپنے پاس سے اٹھا سکوں۔

ایک اور طریقہ انھیں سفروں میں چندہ جمع کرنے کا انھوں نے
 یہ نکالا تھا کہ جو احباب دعوت کرنی چاہتے تھے ان سے نقد روپیہ لے لیتے
 اور کالج کے چندہ میں جمع کر دیتے تھے۔ جب وہ دوسری بار پنجاب کو جانے
 لگے تو انھوں نے خان بہادر برکت علی خاں کو ایک خط لکھا جس کا خلاصہ
 یہ تھا کہ ”آپ سے اور سب دوستوں سے درخواست ہے کہ جو کچھ آپ یا
 اور احباب سیری مہانداری میں صرف کرنا چاہیں انہیں مدد عنایت اس کی لاگت
 نقد عنایت فرمائیں۔ میں نے اکثر دوستوں سے اسی طرح دعوت کے
 بدلے نقد روپیہ لیا ہے اور اس کو کالج کے چندہ میں جمع کر دیا ہے۔ اس
 میں خوبی یہ ہے کہ امیر اور غریب سب دعوت کر سکتے ہیں۔ ایک دفعہ
 ایک دوست نے مجھے دعوت کی بابت ایک روپیہ عنایت کیا۔ میں
 نہایت خوش ہوا کہ مدرسہ العلوم کے کئی مزدوروں کی مزدوری ملی وہ دوست
 بھی خوش ہوئے کہ دعوت ٹھکانے لگی۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے ساتھ

چند دوست بھی ہوں گے پس اگر یہ طریقہ دعوت کا اختیار نہ کیا جائے گا تو جن کے ہاں ٹھیکروں کا اُن پر خرچ کثیر پڑ جائے گا اور وہی مثل ہوگی کہ مہ کا کھایا کھیت جس کا پاپ نہ پن۔

حیدرآباد کے پہلے سفر میں جو شہر میں سرستید نے کیا تھا جس قدر روپیہ دعوت میں آیا وہ سب انھوں نے چندہ میں جمع کر دیا تھا جب وہاں سے واپس آئے تو علیگڑھ میں اُن کے اجاب نے فی کس بیس روپیہ کے حساب سے دو سو بیس روپیہ اس لیے جمع کیے کہ سرستید کو شکر گزاری کے طور پر دعوت دی جائے۔ سرستید نے کہا اس کا انتظام میں خود کروں گا۔ وہ سب روپیہ ان سے لے کر اہم بیس روپیہ اپنے حصہ کے اس میں ملا کر دو سو چالیس روپیہ کی دوا سکا لڑ چسپاں دس دس روپیہ ماہوار کی غریب طالب علموں کے لیے مقرر کر دیں۔ اُن کے دوستوں نے کہا کہ آپ نے اپنے ساتھ ہم کو بھی دعوت سے محروم رکھا اب ہم آپ سے دعوت لیں گے۔ اس پر مولوی محمد کریم مرحوم نے کہا کہ سید صاحب کی طرف سے میں سب صاحبوں کو دعوت دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے بڑی دھوم سے سب کی دعوت کی۔

سید محمود کی شادی میں نواب امتصار جنگ نے سو روپے بطور اظہار سترت کے اس غرض سے بھیجے تھے کہ کالج میں صرف کیے جائیں۔ اس پر سرستید نے نہایت خوشی ظاہر کی اور اخبار میں لکھا کہ ”ہمارے بعض دوست نیرتاناہ لینے سے ناراض ہوئے مگر ہم نیرتالیف کو موجود نہیں اگر اس کارروپیہ اسی طرح مدد سے العلوم میں خرچ کرنے کو دیا جاتا۔“ پھر لکھا کہ بعض دوستوں نے شکایت کیا ہے کہ شادی میں دعوت دلیہ

نہیں کی، مگر ہم نہ جاگیردار ہیں نہ رئیس ہیں، اگر دعوت ولیمہ کو تے تو زیادہ سے زیادہ پانسو روپیہ لگا سکتے تھے، سو ہم نے پانسو روپیہ مدرسہ میں دیدیا۔
پوستے کی بسم اللہ کی تقریب میں بھی جو شہ کی کانفرنس کا اجلاس ختم ہونے کے بعد سب ممبروں کی موجودگی میں ہوئی تھی سرستید نے ایک شہادت عہدہ تقریب کے بعد اسی طرح پانسو روپیہ مدرسہ کی نذر کیے تھے۔

حبیب آباد کے اخیر سفر میں جب کہ وہ ایک ڈپوٹیشن بیکر حضور نظام میں ایڈریس پیش کرنے کو گئے تھے، چونکہ تمام ڈپوٹیشن سرکار عالی کا مہمان تھا، سرستید کے دوستوں نے جو کچھ ان کی دعوت میں دیا وہ سب مدرسہ کے چندہ میں جمع کیا گیا۔ نواب انتصار جنگ نے تو غالباً ہزار روپے نقد دیدیے تھے مگر نواب محسن الملک نے بڑی دھرم کی ایک گارڈن پارٹی دینی چاہی تھی۔ سرستید نے انکار کیا اور کہا کہ نقد دلو، محسن الملک نے کہا نقد بھی لیجیے اور پارٹی بھی ہونے دیجیے۔ سرستید نے ہرگز نہ مانا اور کہا کہ نقد اور پارٹی دونوں میں جس قدر خرچ ہو وہ سب نقد ہی دیدو۔ آخر پارٹی سو قوف رہی اور ایک ہزار روپیہ نقد نواب محسن الملک نے سرستید کی نذر کیا۔

ابتداء نے قیام مدرسہ کے وقت جس طریقے سے سرستید نے نواب مختار الملک مرحوم کی مدرستہ العلوم کی طرف متوجہ کیا وہ یادگار کے قابل ہے انھوں نے مصور سے ایک تصویر بنوائی جس میں مسلمانوں کی حالت اور ان کے تنزل کی کیفیت محض تصویر کے ذریعے سے ظاہر کی گئی تھی اس کی صورت یہ تھی کہ سرستید سمندر کے کنارے ایک درخت سے کمر لگائے حیران اور فکر مند کھڑے ہیں اور اس سے کسی قدر فاصلہ پر مختار الملک مع دو صاحبوں کے استراہ ہیں۔ سمندر میں طوفان آ رہا ہے، جہاز جس میں بہت سے مسافر

سوار میں اس کا مستول ٹوٹ گیا ہے اور وہ ڈوبا چاہتا ہے۔ کچھ آدمی پانی میں گر پڑے ہیں اور ڈبکیاں لے رہے ہیں۔ ایک کشتی جس میں کچھ آدمی سوار ہیں اُن ڈوٹیوں کے بچانے کی جہاز کی طرف جا رہی ہے۔ اُس کی جھنڈی کے پھریرے پر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہیں "وون لک روپیز" سرسید اس حیرت اور تشویش کی حالت میں کہہ رہے ہیں کہ "ناٹ سفیشنٹ" یعنی یہ روپیہ کافی نہیں ہے، ایک فرشتہ آسمان سے اتر رہا ہے جو ہوا میں معلق ہے اور ایک ہاتھ سے سرسید کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ کی انگلی سے نواب مختار الملک کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور سرسید سے کہتا ہے "لک انیٹ دس نوئل مین" یعنی اس شریف آدمی کی طرف دیکھو۔

اس تصویر میں سمندر سے زمانہ مراد ہے اور جہاز سے مسلمانوں کی قوم۔ کشتی جو جہاز والوں کی دستگیری کے لیے جا رہی ہے اُس سے مدرستہ العلوم مراد ہے، اُس کے پھریرے پر جو "ایک لاکھ روپیہ" کا لفظ لکھا ہے اس سے وہ لاکھ روپیہ مراد ہے جو اس وقت تک مدرسہ کے لیے جمع ہوا تھا۔ سرسید گویا مسلمانوں کی سقیم حالت دیکھ کر اپنے دل میں یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے اُنھار نے کس لیے ایک لاکھ روپیہ کافی نہیں ہے، اُس وقت خدا کی طرف سے اُن کے دل میں یہ انفا ہوتا ہے کہ نواب مختار الملک سے مدد مانگنی چاہیے۔ فرشتہ کا ان کی طرف اشارہ کرنا اسی مضمون پر دلالت کرتا ہے۔

یہ تصویر نواب مختار الملک سید تہراب علی خاں مرحوم کی خدمت میں بھیجی گئی اور وہ اس کو دیکھ کر نہایت متاثر ہوئے۔ سنا ہے وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اس تدبیر کے سوا کوئی دوسری تدبیر روپیہ مانگنے کی ہر

دل پر مؤثر نہیں ہو سکتی تھی انھوں نے سو روپیہ ماہوار اپنی خامس جاگیر سے اور اول تین سو اور پھر پانسو ماہوار سرکار عالی نظام سے مقرر کیے۔ اُس کے بعد جب حضور نظام نے عنان اختیار اپنے ہاتھ میں لی تو پانسو روپیہ ماہوار کا دو دفعہ کر کے اور اضافہ ہوا۔ پھر ۱۸۹۱ء میں جب سرسید ڈپوٹیشن لیٹر حبیب آباد گئے تو حضور نظام نے بجائے ایک ہزار کے دفعہ دو ہزار روپیہ ماہوار ہمیشہ کے لیے مقرر کیا اور اُس کی سند سرسید کو عنایت فرمائی۔ درحقیقت یہ اسی تصویر کا نتیجہ تھا جو رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچ گیا۔

غرض کہ اس قسم کی بیشمار تدبیروں سے سرسید نے مدرسہ کے لیے سرمایہ جمع کیا ہے۔ ولایت سے واپس آ کر وہ اٹھائیس برس زندہ رہنے اس عرصہ میں برابر اُن کو یہی ادھیڑ بھن لگی رہی کہ کس طرح روپیہ فراہم ہوا اور کیونکر مسلمانوں کے لیے اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کا سامان مدرسۃ العلوم میں مہیا کیا جائے، اُن کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے اُن کو مسلمانوں کی تعلیم کا خیال پیدا ہوا انھوں نے چند اصول گویا اپنے اوپر لازم کر لیے تھے۔ اولاً انھوں نے ہر قسم کی داد و دہش سے اپنا ہاتھ روک لیا۔ مدرسۃ العلوم کے سوار فاہ عام کے اور کاموں میں چندہ دینا شادی اور غمی کی رسموں میں روپیہ صرف کرنا، اپنے کنبے کے حقداروں کے سوا عموماً مساکین و غربا کی امداد کرنا اور اسی قسم کے تمام ابواب یک قسمل بند کر دیے اور جہاں تک ہو سکا مدرسہ کے چندوں میں آپ بھی دیا اور اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بھی لیا اور اپنے دل میں ٹھان لی کہ جو لوگ مدرسہ کی اعانت کریں وہی دوست ہیں اور وہی عزیز و رشتہ دار ہیں۔ اگر غیروں نے اعانت کی تو اُن کو دوست اور عزیز سمجھا اور اگر دوستوں

اور عزیزوں نے پہلو تہی کی تو اُن کو سو غیروں کا بغیر جانا انہوں نے ایک بار اپنے بچپن کے ایک نہایت گارے دوست کو جو ذی مقدور آدمی تھے مگر مدرسہ کے کچھ سرگرم معاون نہ تھے صاف یہ کہلا بھیجا کہ بغیر مدرسہ کی اعانت کے دوستی قائم نہیں رہ سکتی۔

دوسرے جیب سے انہوں نے مدرسہ کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا مروت اور لحاظ کو جو اُن کی ایک جیلی شخصیت تھی بالکل بالائے طاق رکھ دیا جن سے بے تکلفی اور خالص دوستی تھی اکثر اُن کا نام اور اُن کی رقم چندہ کی فہرست میں بغیر اُن کے اسمتراج کے لکھ دی جاتی تھی اور اُن کو صرف اُس وقت خبر ہوتی تھی جب اُن سے روپیہ مانگا جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ انکار کرتے تھے اور دیر سے سخت اصرار بلکہ ناراضگی کا اظہار ہوتا تھا اور آخر کار بغیر دینے کچھ بن نہ آتا تھا۔ سرسید کے دوست دیتے دیتے تھک گئے مگر وہ مانگتے مانگتے نہ تھکے۔ وہ ایک آڑھل میں لکھتے ہیں کہ "ہمارا ثواب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ جلدی صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بمبائی سیری قسمت میں بھیج ایک مانگتا لکھا تھا سو اس لکھے کی بد ملتا مہوں مگر شکر ہے کہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔ اس پر سعدی کا ایک شعر یاد آیا اور دل نے چاہا کہ اس میں کچھ مصرعے لگا جائیں تاکہ حسب حال ہو جائے، سو ایک خدا کے بندہ نے مصرعے لگا دیے اور اب اُس شعر کی یہ صورت ہو گئی۔

چش ازین سعدی ریش دل دکاندیش

گفت در باب گدایاں سخن از صدق و یقین

”گر گدا پیش رو شکر اسلام بود کافر از بیم توقع برودتا در چین“

ایک دن نوبت ملاکار بجائے پر سید کہ بہ کافر چہ رسد خود تہواں گفت چنین

”گر گدا پیش رو شکر اسلام بود ہم مسلمان رو داز ہم سوالش تا چیں

ایک بار مدرسہ کے کسی کام کے لیے چندہ کھولا گیا، سرستید نے اپنے قدیم دوست مولوی سید زین العابدین خاں سے چندہ کا اتفاق کیا، انھوں نے بد مزہ جو کر کہا ”صاحب ہم تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے، سرستید نے کہا ”اے میاں اب کوئی دن میں ہم مرجائیں گے، پھر کون تم سے چندہ مانگے گا؟ یہ الفاظ کچھ ایسے طور پر کہے گئے کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور چندہ فوراً ادا کیا گیا۔

چندہ کے علاوہ جب کبھی ان کو دوستوں سے کچھ اچک لینے کا موقع ملا انھوں نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ”خلۃ دوستاں بر دہ و در دشمنان بکوب“ ایک روز مٹر تھیو ڈور بک کے والد جو سیاحت کے لیے ہندوستان میں آئے ہوئے تھے ایک خاص سکے کی اشرفی دوستانہ طور پر مولوی زین العابدین خاں کو دینی چاہتے تھے اور وہ اُس کے لینے سے انکار کرتے تھے، آخر دونوں صاحب سرسید کے پاس آئے اور واقعہ بیان کیا، سرستید نے نہایت بد مزہ جو کر مولوی صاحب سے کہا کہ دوستوں کے ہدیہ کو رد کرنا نہایت بد اخلاقی کی بات ہے، انھوں نے وہ اشرفی لے لی سرستید نے کہا دیکھوں کس سکے کی اشرفی ہے اور ان سے لیکر مدرسہ کے کھانا میں جمع کر دی، اسی طرح ایک دن سید محمود نے قاضی رضا حسین مرحوم سے کسی بات پر پچاس روپیہ کی شرط بدی اور یہ ٹھیکر کہ جو ہار سے پچاس روپے مدرسہ میں دے، اتفاق سے سید محمود ہار گئے، وہ سو روپیہ کانٹھیلے کر آنے اور قاضی صاحب سے کہا کہ پچاس روپیہ دیجیے اور

نوٹ لیجیے۔ انھوں نے کہا وہ تو ہنسی کی بات تھی، کیسی شرط اور کیسا روپیہ؟
 دوسرے شرط بد ناجائز بھی نہیں ہے۔ سرسید بھی وہیں موجود تھے۔ جب انھوں
 نے دیکھا کہ روپیہ مدرسہ میں آنا ہے فریالہ جس شرط میں اپنا فائدہ ملحوظ نہ ہو وہ ہائز ہے اور
 فریالہ جس میں سے پیاس روپیہ نکال کر۔ سید محمود کو دیدیے اور نوٹ لے لیا۔
 اس قسم کے صد ہا واقعات روزمرہ گزرتے تھے، ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے
 بیان کرنے سے مدعا یہ ہے کہ جس قوم میں عام طور پر تعلیم کی قدر نہ ہو،
 جہاں ہر کام کا مدار شخصیت اور ذاتی اغراض پر ہو۔ جہاں قومی ترقی اور قومی فلاح
 کے نتائج سے لوگ بے خبر ہوں، جہاں امیر بے پروا، دولت مند مسرف یا
 بخیل، علما زمانے کی ضرورتوں سے ناواقف اور عوام الناس جاہل اور مغلس ہوں
 وہاں ایک ایسا کام جس سے تمام قوم کی بھلائی متصور ہو کوئی شخص نہیں کر سکتا
 جب تک کہ وہ سرسید کی طرح اپنے تئیں اس کام میں فائدہ نہ کر دے اور جو فائدے
 کہ وہ اپنی عقل مندی، شہرت، لیاقت، وجاہت، دوستی، کوشش اور محنت سے
 خود اٹھا سکتا ہے ان سے آپ دست بردار ہو کر اس کام پر وقف نہ کر دے۔
 دوستوں کے علاوہ اجنبی اور اسحاق آدمی جن سے کچھ وصول ہونے کی امید
 ہوتی تھی، شاید پہلی ایک آدھ ملاقات میں ان کی باری نہ آتی ہو ورنہ اکثر حساب
 سلامت ہوتے ہی سوال ڈالا جاتا تھا اور اس میں کچھ مسلمان ہی کی خصوصیت
 نہ تھی بلکہ انگریزوں سے بھی بعض اوقات یہی برتاؤ ہوتا تھا۔ ایک بار سرسید
 نے ایک محض اجنبی مسافر انگریز سے جو ڈاک بنگلہ میں ٹھہرا تھا چندانہ طلب
 کیا۔ اس نے بہت روکھے پن سے یہ جواب دیا کہ آپ کو اس کام کے لیے صرف
 اپنی قوم سے مانگنا چاہیے۔ سرسید نے کہا ”بشیک ہم کو قوم کی پست بہتی سے
 غیروں کے سامنے ہاتھ پیرا ناٹھتا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیے۔ اگر یہ انٹی ٹیوشن

بخیر انگریزوں کی اعانت کے قائم ہو گیا تو انگریزوں کے لیے کوئی ذلت کی
 بات اس سے زیادہ نہ ہو گی کہ وہ باوجود یکہ ہندوستان کی حکومت سے ملے انتہا
 فائدے اٹھاتے ہیں مگر ہندوستانیوں کی بھلائی کے کاموں میں مطلق شریک
 نہیں ہوتے۔ وہ انگریزوں کے شکر مند ہوا اسی وقت ایک لڑائی میں روپے کا سرسید کی نذر کیا۔
 سرسید نے مدرسہ کی خاطر اس بات کو بھی اپنے اوپر لازم کر لیا تھا کہ کوئی
 سعی اور کوئی کوشش کسی ایسے کام میں صرف نہ کی جائے جو مدرسۃ العلوم سے
 کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو۔ جو کوشش بظاہر وہ خاص اپنی ذاتی اعراض کے لیے کرتے تھے
 ان سے بھی اگر غور کر کے دیکھا جائے تو خود ان کو اس قدر فائدہ نہیں پہنچتا تھا جس
 قدر کہ مدرسۃ العلوم کو پہنچتا تھا۔ یہ بات مشہور ہے کہ وہ کبھی کسی اپنے پارلے
 کی سفارش کسی سے نہیں کرتے تھے۔ درحقیقت اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی
 ملاقات یا دوستی یا وابستہ سے جس قدر فائدہ اٹھا سکتے تھے وہ مدرسۃ العلوم
 کے سوا کسی کو پہنچا یا نہیں چاہتے تھے۔ معاویہ ابن ابی سفیان نے اپنے ایک
 جلس سے کہا کہ ”تو اوروں کے فائدے کے لیے سفارش مت کیا کر کیونکہ اس
 سے تیرے فائدوں میں کمی پڑے گی“ اگرچہ یہ نصیحت جن معنوں میں کی گئی تھی
 اس کو کوئی کریم النفس آدمی قبول نہیں کر سکتا، مگر جن معنوں میں سرسید نے
 اس پر عمل کیا وہ ایک جواہر فانی خصلت تھی جو سرسید کے سوا کسی میں نہیں
 دیکھی گئی۔ وہ محض قوم کی خاطر دوستوں اور عزیزوں کا ہراسنا گوارا کرتے تھے اور
 جو خوشی لوگوں کی سفارش اور حاجت روائی کرنے سے انسان کو حاصل ہوتی ہے
 اس کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے۔ سرسید کے ایک معزز ہ وطن نے ایک رفاہ
 عام کے کام میں ان کو شریک کرنا اور اپنی کمیٹی کا ممبر کرنا چاہا۔ انھوں نے
 صاف کہہ دیا کہ میں صلاح و مشورہ سے مدد دینے کو آمادہ ہوں لیکن چند

نہ خود وہی گا اور نہ امدوں سے دلوانے میں کرشمہ کرے گا اگر اس شرط پر ممبر بنانا ہو تو مجھ کو ممبری سے کچھ انکار نہیں۔ لطیفہ ایک شخص نے جس سے کچھ واقفیت نہ تھی سرسید سے سفارش کی درخواست کی اور لکھا کہ "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک بزرگ ہیں جن کی لوگ بے انتہا تعریف کرتے ہیں کہ ان کی تمام عمر قوم کی خیر خواہی میں گزاری ہے جب میری آنکھ کھلی تو مجھ کو یقین ہو گیا کہ ہوں نہ ہوں وہ بزرگ آپ ہی ہیں اور میری مشکل آپ ہی سے آسان ہوگی" سرسید نے اس کا یہ جواب لکھ بھیجا کہ "جس باب میں آپ سفارش چاہتے ہیں اس سے مجھ کو کچھ تعلق نہیں ہے۔ اور جن بزرگ کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے وہ غالباً شیطان تھا۔"

عمارات کا لچ

ہم چاہتے تھے کہ لچ کی عمارات کا حال اور ان کی تفصیل مفصل طور پر بیان کی جائے کیونکہ ان تمام عمارتوں کا اس قدر جلد اور ایسی خوبی کے ساتھ تیار کر دینا اور ایک ویران قطعہ زمین کو چند سال میں محض قومی چنڈ سے گلزار بنادینا اور سیکڑوں پر ویسی طلبہ کی تمام ضروریات اور آسائش اور تعلیم و تربیت اور ہر قسم کی ریاضت کا سامان مہیا کر دینا یہ بھی سرسید کی زندگی کے انھیں بڑے بڑے کاموں میں سے ایک کام ہے جن کا ذکر ان کی لائف میں کرنا ضروری ہے۔ لیکن ہم کو معلوم ہوا ہے کہ نواب محسن الملک کا امدادہ لچ کی مفصل تاریخ لکھنے کا ہے اور امید ہے کہ اس میں عمارات کا حال نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا جائے گا۔ اس لیے ہم اس موقع پر تمام لچ اور بورڈنگ کی عمارتوں کا مفصل حال بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتے مگر جو اصول کہ

سرستید نے ان عمارتوں کے بنانے میں ملحوظ رکھے ہیں اور جس کوشش اور توجہ سے انھوں نے یہ دشوار کام آسان کیا ہے اور جن معنائح سے وہ برخلافت اکثر ممبران کمیٹی کی رائے کے تعمیر کے کام کو سب کاموں سے مقدم سمجھتے رہے ان کو کسی قدر بیان کرنا ضروری ہے۔

کالج کمیٹی کے سرگرم ممبر جو کالج کے کاروبار سے زیادہ وابستگی رکھتے تھے ان میں بہت ہی کم ایسے ہوں گے جو کالج بلڈنگ میں زیادہ روپیہ صرف کرنے کے روافد ہوں کیونکہ ابتدا میں تعلیم ہی کے اخراجات کے لیے کافی روپیہ بہم پہنچانا دشوار معلوم ہوتا تھا چہ جائیکہ لاکھوں روپیہ کی عمارتیں تیار کرائی جائیں۔ مگر سرستید نے کالج کی ترقی بلکہ اس کا قیام و دام اسی پر منحصر سمجھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اعلیٰ درجہ کی اسکیل پر عمارتیں بنانی جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ کالج کے اصلی نتائج علی الاعلان ظاہر ہونے کے لیے جس سے عام لوگوں کو اس کی طرف ترغیب ہو ایک مدت دراز درکار ہے اور تعلیم و تربیت کی خوبی کے سمجھنے والے لاکھوں بلکہ کروڑوں میں ہمیشہ معدود آدمی ہوتے ہیں البتہ عمارات کی شان و شوکت ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر فداً خاص و عام کے دل پر پڑتا ہے۔ سرستید کا یہ خیال جہاں تک دیکھا جاتا ہے بالکل صحیح نکلا۔ فی الواقع کالج کی عظمت کا خیال باوجود سخت مخالفتوں کے جس قدر سرعت کے ساتھ تمام ملک میں پھیل گیا یہ زیادہ تر اس کی شاندار عمارتوں کا نتیجہ تھا۔ خصوصاً گورنمنٹ اسکولوں کی نظر میں جن کی توجہ اور التفات سے کالج کو نہایت فائدہ پہنچا ہے اس کی وقعت بہت کچھ اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ۱۸۸۲ء میں جب کہ ایجوکیشن کمیشن نے علیگڑھ میں اپنا اجلاس کیا تھا اس وقت علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ ہال میں مسٹر وارڈ

نے جو کمیشن کی لوکل کمیشن کے ممبر تھے علیگزہ کے ہندوؤں کے ایڈریس کے جواب میں پورٹنگ ہاؤس محمدن کالج کی سچتہ بارگ کی نسبت یہ الفاظ کہے تھے کہ ”جس وقت میں نے کمروں کی قطار کو دیکھا جو بعد مکمل ہونے کے تمام دنیا میں شاید اپنی قسم کی سب سے عمدہ عمارت ہوگی تو مجھ کو اس بات کا خیال ہوا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے دل میں ان مکانات کو دیکھ کر آیتہ کی نسبت نئی ہمت پیدا نہ ہو۔“ میرے ایک عزیز دوست جو ولایت میں تعلیم پا کر آئے ہیں ان کا بیان ہے کہ ”انگلستان کے نامور سیاح رپورٹر کینن ہارنٹ جب چین، جاپان اور امریکہ کی سیاحت کے بعد لندن میں آئے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے کہیں کیسیرج یا آکسفورڈ کے کالجوں کے نمونہ کا کالج سوائے محمدن کالج کے نہیں دیکھا۔“

مرستہ کو کالج کی زیادہ شاندار عمارتیں بنانے کا خیال اس نظر سے بھی ضرور ہوتا چاہیے تھا کہ آیتہ نسلوں کو اپنے قومس انٹی ٹیوشن کا عظیم و شان دیکھ کر اس کے قائم رکھنے کا زیادہ خیال ہو۔ ایشیائی قوموں میں برخلاف اہل یورپ کے یہ خیال کبھی پیدا نہیں ہوا کہ اگلوں نے جو کام ادنیٰ درجہ کی حالت میں چھوڑا ہے اس کو اعلیٰ درجہ تک پہنچائیں یا جو کام وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں ان کو پورا کر دیں۔ ہم ایسے بہت سے دے سے اور فائق ہیں نشان دے سکتے ہیں جن کے بانی ان کو نہ تمام چھوڑ کر مر گئے اور وہ چند روزہ میں کھنڈ ہو گئیں۔ لیکن اکثر اوقات عمارت کا عظیم و شان ان ملکوں میں بھی لوگوں کو اس ات پر مجبور کر دیتا ہے کہ اس کو جس طرح ہو سکے قائم اور آباد رکھیں۔ ہم کو اسٹریچی ہال کی نسبت جبکہ وہ بالکل مرتب اور تیار ہو چکا تھا ایک معزز مسلمان کا یہ کہنا یاد رہے گا کہ ”جب تک یہ عمارت قائم ہے مسلمان یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے

بھی ایسے کام کر گزرتے ہیں جو زندوں سے نہیں ہو سکتے۔ بہر کیف اس انسٹیٹیوٹ کے قائم و برقرار رہنے کی اگر کچھ امید ہو سکتی ہے تو انھیں عمارتوں کی بدلت ہو سکتی ہے جن کی نسبت کمیٹی نے گورنمنٹ سے یہ اقرار کر لیا ہے کہ اگر خدا نخواستہ کالج بند ہو جائے تو تمام عمارتیں گورنمنٹ کے قبضہ میں چلی جائیں۔ سرسید نے ان عمارتوں میں آیتہ نہ نسوں کے فخر و مباہات کے لیے ایک نہایت موثر طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ تمام سنگین اور سختہ عمارتوں پر ان کے بانیوں کے اور کالج کے محنتوں، سربچوں اور مددگاروں کے نام جن میں زیادہ تر مسلمان ہیں بڑے اہتمام سے کندہ کر لئے ہیں۔ ان میں بہت سی عمارتیں بن چکی ہیں، کچھ زیر تعمیر ہیں، کچھ ناقص پڑی ہیں اور بہت سی قوم کی فیاضی کی منتظر ہیں۔ اگر قوم میں کچھ جان باقی ہے تو وہ ضرور ان معزز ناموں اور معزز کتبوں کی لاج رکھے گی اور اس قوم کی یادگار کو صفحہ روزگار سے شے نہ دے گی۔ سنا ہے کہ کالج کے احاطہ کی جالیوں پر مسلمانوں کے نام کھدے ہوئے دیکھ کر ایک یورپین افسر نے کہا تھا کہ ”یہ احاطہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ گویا مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے اس کالج کو چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں کہ کوئی آفت اس پر نہ آنے پائے“

کتبوں کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی باتیں ان عمارتوں میں ملحوظ رکھی گئی ہیں جن سے مسلمانوں کے دل میں کالج کی طرف ایک کشش پیدا ہو مشدداً اکثر محرابین سیرینک اسٹائل پر بنوائی گئی ہیں یا برونزنگ بوس کے صمد ووازہ کی پیشانی پر کھجور کا دخت جو عرب کی خصوصیات میں سے ہے اور بلال و تاج کا نشان جو مسلمانوں کا برٹش حکومت کے ساتھ تعلق ظاہر کرتا ہے۔ نسبت کرایا گیا ہے۔ اکثر انگریزوں کی اسپیس میں مسلمانوں کو غیرت اور

ان کے اسلاف کی عظمت یاد دلانی گئی ہے جا بجا پتھروں پر کندہ کرادی ہیں۔
جن پرورنہیں افسروں اور حاکموں نے کالج کی مدد کی ہے ان کی عالیشان یادگاریں
بنوائی گئی ہیں تاکہ مسلمانوں کو آئندہ زمانے میں اس بات پر فخر کرنے کا موقع
ملے کہ ان کے اسلاف اپنے محنوں کے کیسے شکر گزار اور دل سے قدر
کرنے والے تھے۔

بعض ممبروں کی یہ رائے تھی کہ تعمیر کے ایسا مہماری با سالانہ ایک
رقم معین ہونی چاہیے کہ اس سے زیادہ کبھی صرف نہ ہونے پڑے بیشک یہ
ایک نہایت سلامت روی کی چال تھی لیکن اگر ایسا ہوتا تو سرسید نے جو
ہتیلی پر برسوں جاتی ہے یہ برگزظہور میں نہ آتا اور کالج کی وقعت جو دفعۃً
تمام زمانے کے دل میں پیدا ہوگئی اس کے لیے ایک مدت دراز تک
انتظار کرنا پڑتا اور سرسید کے بعد کسی سے یہ امید نہ تھی کہ تعمیر کا کام ایسے چوڑے
اور سنگ سے سراسر انجام کرنا جیسے کوئی اپنا محل تیار کرتا ہے۔ حالانکہ سرسید کا
سب زیادہ دلچسپ مشغلہ بیٹے تصنیف و تالیف و مضمون نگاری کا کام رہا
ہے اور ایسے لوگوں کا کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہونا نادرات سے ہے
باوجود اس کے انھوں نے اس قطعہ زمین کے آباد و سرسبز کرنے میں فوق العادۃ
کوشش اور توجہ کی ہے۔ برسوں بلا ناغہ دو دوپہر اور تمام دن محنت سے
سخت موسموں میں وہ خود مدد پر جاہا کر بیٹھے ہیں اور اپنے سلمے راج مزدوروں
اور سنگتراشوں سے کام لیا ہے۔ باوجود اس تن و تلاش کے وہ کالج کے بلوغ
کی تیاری میں پہروں دھوپ اور لونوں میں پھرتے تھے، کنوئیں کھدواتے تھے
زمین ہمار کرتے تھے، ہل چلواتے تھے، روشیں ہواتے تھے، دوردور سے
بر قسم کی پود سنگلاتے تھے جو ان کے روبرو باغ میں لگائی جاتی تھیں، باوجود ان

تمام باتوں کے تعمیر وغیرہ کے متعلق ہر ایک کام اُن کو اپنی رائے سے کرنا پڑتا تھا۔ نہ کوئی انجینیر یا اور سیر تھا جس سے اصلاح لی جائے نہ کوئی لائق مستری تھا جس کی تجویز اور رائے پر اطمینان ہو جن درمیانی معماروں سے یہ کام لیے گئے انہوں نے کبھی اس قسم کی عمارتیں نہیں بنائی تھیں اس لیے سرستید کو ہر ایک عمارت کا نقشہ خود ہی سوچنا پڑتا تھا اور خود ہی اس کے تمام تشبیب و فراز سوچنے پڑتے تھے۔ معماروں اور سنگتراشوں کو خود پیچھ کر ایک ایک بات بتانی پڑتی تھی اور پھر جب تک وہ کام ختم ہو خود ہی اس کی نگرانی کرنی پڑتی تھی کہ جس طرح بتایا گیا ہے اُسی طرح کام بنتا ہے یا نہیں۔

ہم نے سنا ہے کہ بعض یورپین انجینروں نے کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی عمارتوں کو دیکھ کر تعجب ظاہر کیا ہے اور جب اُن کو یہ معلوم ہوا کہ بغیر کسی تعلیم یافتہ انجینیر کی صلاح اور مشورہ کے یہ عمارتیں تیار ہوئی ہیں تو وہ اور بھی زیادہ متعجب ہوئے ہیں۔ با انیہہ ممکن ہے کہ ان عمارتوں میں انجینرنگ کے اصول کے موافق یا طلبہ کے آرام و آسائش کے لحاظ سے کوئی کمی یا نقص رہ گیا ہو لیکن ہم کو اس قومی انسٹیٹیوشن کے لیے ایسا انجینیر ملنا ناممکن تھا جو خود ہی تعمیر کے لیے روپیہ فراہم کرے۔ خود ہی عمارت بنوانے، ایک کوڑی تنخواہ کی نہ لے، تہدایت و دیانتداری سے اپنا کام انجام دے اور ہر ایک عمارت کو ایسے مٹوق سے بنوائے کہ گویا اپنا گھر بنواتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تعمیر پر جتنا روپیہ صرف ہونا چاہیے تھا اس سے بہت زیادہ صرف ہوا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسی عالیشان عمارتیں بنانی کیا ضرورہ تھیں۔ بعض کہتے ہیں کہ بیسیوں عمارتیں ناتمام پڑی ہیں ان کے شروع کرنے کی کیا ضرورت تھی جس قدر روپیہ آتا جاتا اس قدر عمارتیں بنتی جاتیں

بعض اور اعتراض کرتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ انھوں نے خود کسی قومی عمارت کا نمونہ اس سے بہتر بنا کر دکھا یا ہے اور نہ کوئی ایسی عمارت نشان دیتے ہیں جو قوم سے بھی یک مانگ مانگ کر اس سے بہتر کسی نے بنائی ہو۔

ٹھیکے دارم زدانشمند مجلس ہائے پیرس

کار فرمایاں سپہ را خود کار کتری کنند

عمارات کے متعلق اخیر بات جو سرسید کی لائف میں نمونہ کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ سرسید نے باوجود اس کے کہ کالج کے بانی ہونے کا فخر و حقیقت انھیں کو حاصل تھا، ہمیشہ اس بات سے انکار کیا ہے کہ کالج میں ان کے نام کا کوئی کتبہ یا نشان خصوصیت کے ساتھ قائم کیا جائے۔ جب اول ہی اول کالج کے قائم ہونے کی تجویز ہوئی تو ان کے دوستوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ کالج کا نام مدرسہ احمدیہ رکھا جائے۔ بلکہ ملک کے اخبار اردو گائیڈ نے ایک دفعہ یہ نام اپنے پرچہ میں چھاپ بھی دیا، مگر سرسید نے اس کی سخت مخالفت کی اور ہرگز اس بات کو منظور نہیں کیا کہ کالج ان کے نام سے موسوم کیا جائے اس کے بعد ۱۸۸۱ء میں آنریریبل حاجی محمد اسماعیل خاں نے سرسید کی اطلاع اور مرضی کے بغیر ایک عمارت ان کی یادگار میں بنانے کے لیے چندہ اکھولا اور کالج کا دروازہ ان کی یادگار میں بنانا اور اس پر سرسید کے نام کا کتبہ لگانا تجویز کیا انھوں نے اس کی بھی مخالفت کی اور یہ کہا کہ مسلمان جن سے میری یادگار کا چندہ وصول کرنے کی آپ امید رکھتے ہیں ان کی نظر میں میری اور میرے کاموں کی مطلق وقعت نہیں ہے پس آپ چندہ کس سے وصول کریں گے مگر جب حاجی صاحب نے کسی طرح نہ مانا تو سرسید دو شرطوں پر راضی ہوئے۔ ایک یہ کہ دروازہ کی پیشانی پر جو کتبہ لگایا جائے

اس پر یہ لکھا جائے کہ قوم نے قومی بھلائی کے لیے یہ کالج بنایا ہے۔ دوسرے
یہ کہ جو کتبہ دروازہ کے اندرونی جانب لگایا جائے اس پر مولوی سمیع اللہ خاں
اور حاجی اسماعیل خاں کا نام بھی جو اس عمارت کے بنانے کے محرک ہوئے
ہیں کندہ کرایا جائے حاجی صاحب نے پہلی شرط تو یہ اکراد قبول کر لی، مگر
دوسری شرط کی نسبت یہ کہا کہ آج تک کہیں ایسا نہیں سنا گیا کہ کسی خاص
شخص کی یادگار میں اوروں کے نام بھی شریک کیے جائیں۔ سرسید نے کسی طرح
نہ مانا اور دونوں شرطیں قبول کرنی پڑیں۔ چنانچہ دروازہ کے پیش طاق پر چند
عربی اشعار کندہ کرائے گئے جن میں کسی خاص شخص کے نام کی تصریح نہیں
ہے اصلندہ دنی جانب حاجی محمد اسماعیل خاں اور مولوی سمیع اللہ خاں کا نام
بھی شامل کیا گیا۔

قطع نظر اس کے کہ حاجی صاحب کے اصرار نے سرسید کو مجبور کر دیا تھا
ٹبری وجہ سرسید کے راضی ہو جانے کی یہ تھی کہ ان کو اپنی یادگار کے حیلہ سے
احاطہ پور ڈنگ ہاؤس اور کالج کا مسجد دروازہ جو ایک نہایت ضروری عمارت
تھی اور پور ڈنگ ہاؤس کے چھ پختہ کمرے تیار ہونے نظر آتے تھے جن کا بغیر
اس حیلہ کے تیار ہونا نہایت دشوار تھا۔ چنانچہ ۲۶ جون ۱۸۸۷ء کے جلسہ "کمیشن
یادگار سید احمد خاں" میں مولوی سید فرید الدین احمد خاں نے صاف کہا تھا کہ
اگر حاجی صاحب اس چندہ سے پور ڈنگ کی ایک ضروری عمارت کا بنانا جو نیز
نہ کرتے تو سید احمد خاں اس کی شدید مخالفت کرتے۔

اسی طرح ایک دفعہ کالج کے بعض پور وین انسروں نے یہ تحریک کی
کہ ایک میاں بھی ولایت کے کالجوں کی طرح فوٹو راز ڈے (یعنی بانی مدرسہ
کی ساگرہ کا دن) بطور ایک خوشی کے دن کے قرار دیا جائے جس میں

ہر سال کالج کے ہوا خواہ اور دوست اور طالب علم جمع ہو کر ایک جگہ کھانا کھایا
کریں اور کچھ تملٹے تفریح کے طور پر کیے جایا کریں۔ سرسید نے اس کو بھی
منظور نہیں کیا اور یہ کہا کہ ”بملاے ملک کی حالت انگلستان کی حالت سے
بالکل جداگانہ ہے۔ وہاں ایک ایک شخص لاکھوں کروڑوں روپیہ اپنے پاس
سے دے کر کالج قائم کر دیتا ہے اور یہاں سوا اس کے کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں
سے چپندہ جمع کر کے کالج قائم کیا جائے اور کوئی صورت ممکن نہیں۔ پس کوئی
وجہ نہیں کہ جو کالج قوم کے روپیہ سے قائم ہو اس کے کسی خاص بانی کے نام
پر ایسی رسم ادا کی جائے، اس لیے میرے نزدیک نوٹرز ٹرسٹ کے نوٹیشن
ٹرسٹ یعنی کالج کی سالگرہ کا دن، مقرر ہونا چاہیے۔ چنانچہ اسی تجویز کے
موافق کئی سال تک یہ رسم ادا کی گئی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرسید نے کس لیے اپنی یادگار قائم
کرنے کی مخالفت کی تھی؟ تمام دنیا میں اور خاص کر ان ملکوں میں جہاں ہمیشہ ایسے
قومی رفاہ کے کام ہوتے رہتے ہیں، یہ عام دستور ہے کہ ہر قوم کے افراد
ان لوگوں کی شکر گزاری کے طور پر جن سے کوئی قوم کی بھلائی کا کام ہوتا ہے۔
ان کی یادگاریں قائم کرنے ہیں اور اس سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قوم کی فائزگی
و احسان فراموشی کا دھبہ نہ لگے اور آئندہ نسلوں میں بھی قوم کی خیر خواہی کا
حوصلہ پیدا ہو، پھر کیا وجہ تھی کہ ایسے مفید کام کے کرنے سے سرسید لوگوں کو
مانع آتے تھے؟

اس کا جواب بہت صاف ہے۔ جن ملکوں میں قومی بھلائی کے کام کرنے
اور محض قوم کی خیر خواہی میں اپنی عمر صرف کر دینے کا عام دستور ہے اور
جہاں ہر زمانے میں ایسی مثالیں کثرت پائی جاتی ہیں وہاں کبھی ایسے لوگوں پر

جو ایسے کام کرتے ہیں خود غرضی کا گمان کسی کو نہیں ہوتا بلکہ او نے سے لے کر اعلیٰ
 اور جاہل سے لے کر عالم تک سب دل سے اُن کی عزت کرتے ہیں، اُن کا احسان
 مانتے ہیں، اُن کو مدد دیتے ہیں اور اُن کی شکر گزاری اور آئینہ نسلموں کا دل
 بڑھانے کے لیے اُن کی یاد گاریں قائم کرتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک کمال اس
 کے برخلاف ہے۔ یہاں ایسی مثالیں کیا اب بلکہ نایاب ہیں کہ کوئی شخص بے شائبہ
 غرض محض قوم کی بھلائی میں اپنی عمر صرف کر دے۔ مات و ن اسی اڈھیر بن میں
 لگا رہے اور قوم ہی کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بندھے، اس لیے اگر حسن اتفاق
 سے قریبوں اور صدیوں کے بعد کوئی ایسا شخص پیدا ہو جاتا ہے تو اُس کو یہ مشکل
 پیش آتی ہے کہ جس قسم کے کام کا وہ ارادہ ظاہر کرتا ہے اس کا نمونہ قوم میں موجود
 نہیں ہوتا اس لیے اُس کو اپنی طرف سے بدگمانی کے رخنے بند کرنے
 پڑتے ہیں تاکہ قومی رفقاء کے کام میں خلل واقع نہ ہو اور لوگ اس کا ذاتی کام سمجھ
 کر امداد اور اعانت سے پہلو نہیں نہ کریں۔ چنانچہ ایک آدھ موقع پر جس کا ذکر
 دوسرے حصہ میں کیا جائے گا، کسی وجہ سے جو سرسید اس مصلحت کا لحاظ نہ
 کر سکے تو نہ صرف اُن کے مخالف بلکہ نہایت عزیز دوست اُن کی طرف
 سے کھٹک گئے اور طرح طرح کی بدگمانیاں لوگوں میں پیدا ہو گئیں۔

تعلیم

کالج میں ہاول دو ڈپارٹمنٹ قائم کیے گئے تھے ایک انگریزی ڈپارٹمنٹ
 جس میں یونیورسٹی کا کورس پڑھایا جانا تجویز ہوا تھا، دوسرا اردو ڈپارٹمنٹ جس
 کی پڑھائی مقرر کرنی کمیٹی کے اختیار میں تھی اور اردو میں علوم جدیدہ اور فارسی
 و عربی ادب اور علوم قدیمہ پڑھانے جانے قرار پائے تھے اور انگریزی کے

یہ بطور سکندریہ گوج کے صرف ایک گھنٹہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس ڈپارٹمنٹ کے لیے سرسید انگلستان سے بڑے بڑے نامور علماء و فضلا سے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کی ایک فہرست لکھوا کر اپنے ساتھ لائے تھے جس میں ہر فن کے علمائے اپنے اپنے فن کی نہایت مستند اور معتبر کتابیں لکھی تھیں مطلب یہ تھا کہ ہندوستان میں ان کا ترجمہ کر کر اور انٹیل ڈپارٹمنٹ کی ٹیچائی میں داخل کر دیں مگر سو اس کے کہ شمس العلماء مولوی محمد ذکا اللہ نے اس فہرست کی اکثر کتابوں کا ترجمہ بطور خود کر دیا اور کوئی نتیجہ اس سے پیدا نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ تک دونوں ڈپارٹمنٹ جاری رہے مگر انٹیل ڈپارٹمنٹ روز بروز تنزل کرتا جاتا تھا یہاں تک کہ بلا سبالغہ طلبہ کی تعداد سے استادوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ چونکہ طالب علموں اور ان کے مربیوں کو مشرقی زبانوں کی تعلیم میں کوئی امید و نبوی فائدے کی نہ تھی اس لیے انٹیل ڈپارٹمنٹ کو کوئی پتہ نہ کرتا تھا آخر مجبور ہو کر اس کو توڑ دیا گیا۔ مگر انگلش ڈپارٹمنٹ جیسا کہ آگے کسی موقع پر بیان کیا جائے گا روز بروز ترقی کرنے لگا۔

کالج کلاس قائم کرنا

۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کو جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا اہستہ اہستہ کھولا گیا تھا اور یکم جنوری ۱۸۵۸ء کو کالج کلاس قائم ہو گئی نیز اسی سال محمدن کالج فرسٹ آرٹس کے امتحان تک اور ۱۸۵۹ء میں بی اے اور ایم اے کے امتحان تک اور ۱۸۶۰ء سے قانونی امتحان میں کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ اور اسی طرح سائنس اور آرٹس کی اعلیٰ تعلیم میں اور نیز قانونی تعلیم میں الہ آباد یونیورسٹی کے ساتھ ایلیٹیٹ ہو گیا۔ جو ترقی گذشتہ ۲۴ سال میں تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اس کالج نے کی ہے اس کے متعلق

مفصل حالات کالج کی سالانہ رپورٹوں سے معلوم ہو سکتے ہیں، یہاں ہم صرف اس قدر دکھانا چاہتے ہیں کہ اس کالج کی بدولت صوبہ شمال مغرب و اوڈھ کے مسلمان گریجویٹس کی تعداد میں بمقابلہ ہندو گریجویٹس کے کس قدر اضافہ ہوا ہے۔

۱۹۳۱ء میں جو لکچر آنریبل سید محمود نے ایجوکیشنل کانفرنس میں بمقام علیگڑھ دیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ مذکور کے سوا ہندوستان کے ہر ایک صوبہ میں سنہ مذکور تک مسلمان گریجویٹس کی تعداد بمقابلہ ہندو گریجویٹس کے اس قدر گھٹی ہوئی تھی کہ اُس کو صفر سے زیادہ وقعت نہیں دی جاسکتی۔ مثلاً بنگال میں جہاں مردم شماری کے لحاظ سے مسلمان گریجویٹس فیصدی ۱۵.۹۱ ہونے چاہیں وہاں اُن کی تعداد ۳۷۳ سے زیادہ نہیں بنتی۔ اسی طرح مدراس میں بجائے ۶۶۸ کے صرف ۹۱ اور بمبئی میں بجائے ۲۱۰۵ کے ۱۱۲ اور پنجاب میں بجائے ۱۷۹ کے ۲۵ فیصدی برآمد ہوئی تھی برخلاف اضلاع شمال مغرب و اوڈھ کے جہاں نسبت مسلمان گریجویٹس کی تعداد ۱۱۷۲ ہونی چاہیے تھی لیکن معلوم ہوا کہ سنہ مذکور تک اُن کی تعداد ۱۷۶۶ تھی۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ محمدن کالج نے قطع نظر اہ فوائد کے جن کا ذکر دوسرے حصہ میں کیا جائے گا خاص کر ترقی تعلیم کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کو اس تعلیل عرصہ میں کچھ کم فائدہ نہیں پہنچا۔

تفسیر القرآن

معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت سرسید کو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا، اسی وقت سے اُن کو اس بات کی فکر تھی کہ جس طرح ذمیوی عزت کے لیے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنا ضرور ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضرور ہے کہ اُن کو تعلیم کے اُن مضر نتائج سے جو مذہب کے حق میں اُس (حاشیہ اگلے صفحہ پر ہے)

سے پیدا ہوتے نظر آتے ہیں بہمانک ممکن ہو بچایا جائے۔ وہ دیکھتے تھے کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں خواہ ہندو ہوں خواہ مسلمان اور خواہ عیسائی، اُن کے دل میں مستثنیٰ صورتوں کے سوا عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ وہ مذہب کی کوئی بات جو بظاہر یا فی الحقیقہ عقل یا قانون قدرت کے خلاف ہو اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ ریاضی اور علم طبیعی کی ممارست سے مذہبی باتوں کا بھی ویسا ہی ثبوت چاہتے لگتے ہیں جیسا ریاضی اور سائنس کے ہر ایک مسئلہ پر اُن کو ملتا رہا ہے۔ اُن کے عقیدے ثبوت اور معلوم ملک الوہیت کی طرف سے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں اور مذہبی احکام کا استخفاف اُن کے دلوں میں بیٹھ جاتا ہے۔ اُن کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت اکثر ممالک یورپ میں مرفہ و رفہ و ہریت اور الحاد پھیلتا جاتا ہے اور عیسائی مذہب مضطرب ہوتا جاتا ہے اسی لیے ان کو اندیشہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے جس کو وہ قوم میں پھیلانا چاہتے ہیں کہیں ویسے ہی مضر نتائج اسلام کے حق میں بھی نہ پیدا ہوں جیسے یورپ میں عیسائی مذہب کے حق میں پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں کہ یہی زمانہ اُن کے تفسیر شروع کرنے کا معلوم ہوتا ہے انہوں نے ایک ایچ میں خاکر مدرستہ العلوم کے طالب علموں کی طرف مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہو۔ پھر اگر تم آسمان

بحاشہ پچھلے صفحہ کا) ملے صوبہ شمال مغرب داودہ کے گرجاؤں سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے اُس صوبہ کے کسی کالج میں تعلیم پا کر یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہو نہ صرف وہ گریجویٹ جو خاص صوبہ مذکور کے باشندے ہوں کیونکہ اُن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے پنجاب سے آکر مڈل کالج میں تعلیم پائی اور کسی یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ۱۲۔

کے تارے ہو گئے تو کیا! پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں یعنی علم اور اسلام کے نمونے ہو گے اور جیسی ہماری قوم کی عزت ہوگی۔

لیکن باوجود اس اندیش کے وہ مغربی تعلیم کو مسلمانوں کے لیے نہایت ضروری اور ناگزیر جانتے تھے۔ اور اسی کے ساتھ جیسا کہ انھوں نے اپنی اکثر تحریروں اور اسپچوں میں ظاہر کیا ہے ان کو یہ بھی یقین تھا کہ غالیوں اسلام جس کو وہ ہمیشہ ٹھیک اسلام سے تعبیر کرتے تھے اس کو انگریزی تعلیم سے وہ صدمہ برگز نہیں پہنچ سکتا جو یہ پ میں عیسائی مذہب کو پہنچا ہے ان کا ہمیشہ یہ قائل رہا ہے کہ جو لوگ مغربی تعلیم یا مغربی علوم کو اسلام کے حق میں خطرناک تصور کرتے ہیں اور اس لیے مسلمانوں میں ان کا پھیلنا نہیں چاہتے وہ درحقیقت اسلام کو بہت بڑا اور کمزور مذہب خیال کرتے ہیں جو علم و حکمت کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتا۔ انھوں نے ایک موقع پر کہا کہ ”یہ حکمت و فلسفہ جو اس زمانہ میں سچا مانا جاتا ہے اگر آئندہ غلط ثابت ہو جیسے کہ یونانی حکمت اب ثابت ہوئی ہے اور حکمت و فلسفہ کے بالکل نئے اصول سچے ثابت ہوں تو بھی میں دھوکے کرتا ہوں کہ قرآن مجید ایسا ہی سچا ثابت ہوگا جیسا کہ اب سچا ہے۔ اور غور کرنے کے بعد ثابت ہوگا کہ جو کچھ غلطی تھی وہ ہمارے ہی علم کا نقصان تھا مگر قرآن ویسا ہی سچا تھا“ البتہ وہ یہ ضرور کہتے تھے کہ جس مجموعہ مسائل و احکام و اعتقادات وغیرہ پر فی زمانہ اسلام کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے وہ یقیناً مغربی علوم کے مقابلہ میں قائم نہیں رہ سکتا۔

الغرض ان کو مدت سے یہ خیال تھا کہ انگریزی تعلیم سے اسلام کے حق میں جن مضر نتائج کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے ان کا انسداد کیا جائے۔ لیکن جو طریقہ استدلال کا زمانہ گذشتہ میں یونانی فلسفہ کے مقابلہ کے لیے ہمارے

متکلمین نے اختیار کیا تھا اور جس سے رفتہ رفتہ ایک نیا فلسفہ بنام علم کلام کے پیدا ہو گیا وہ کسی طرح فلسفہ حال کے مقابلہ میں کچھ کام نہیں دے سکتا تھا کیونکہ برخلات یونانی فلسفہ کے جس کا مدار محض قیاس اور ظن و تخمین پر تھا، فلسفہ حال کا ہر ایک مسئلہ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت کیا جاتا ہے۔ پس ضرور تھا کہ جس طرح مسائل حکمیہ کے ثبوت کا طریقہ بدل گیا ہے اسی طرح اُس کے مقابلہ کے لیے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے۔

ہمارے علما جو فلسفہ قدیم اور علوم دینیہ میں تمام قوم کے نزدیک مسلم الثبوت ہیں اور جن کا یہ منصب تھا کہ فلسفہ جدیدہ کے مقابلہ میں اسلام کی حمایت کے لیے کھڑے ہوتے، اُن کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ یونانی فلسفہ کے سوا کوئی اور فلسفہ اور عربی زبان کے سوا کوئی اور علمی زبان بھی دنیا میں موجود ہے۔ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ علوم جدیدہ صرف کرسچینٹیٹی یا صرف اسلام کی بلکہ تمام دنیا کے مذاہب کی جڑ کاٹ رہے ہیں، اور اگر بالفرض وہ اسلام کی حمایت کا کوئی نیا طریقہ مقتضائے وقت کے موافق اختیار کرنے کا ارادہ بھی کرتے تو ہرگز امید نہ تھی کہ وہ اپنے ارادہ میں کم و بیش کامیابی حاصل کر سکتے اُن کو تقلید کی عادت نے ہرگز اس قابل نہیں رکھا کہ وہ قدما کی پیروی کے دائرہ سے قدم باہر رکھ سکیں اور طعن و ملامت کے خوف اور مرجع خاص و عام بننے کی خواہش نے آنلاوی کا جوہر اُن کی طبیعتوں میں بالکل نہیں چھوڑا۔

مہر کیف سرسید کو اس طرف سے بالکل مایوسی تھی کہ ہمارے مسلم الثبوت علماء اس ضروری کام کی طرف توجہ کریں گے۔ پس اُنھوں نے اس خیال سے کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا باعث میں خود ہوا ہوں اس کام کو اپنا ایک ضروری فرض سمجھ کر اپنے ذمہ لیا۔ اُنھوں نے اپنا ایک اسپیش میں

اس معاملہ کے متعلق اپنے تمام خیالات مفصل طور پر بیان کیے ہیں جن میں سے چند فقرے مختلف مقامات سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں

انھوں نے کہا کہ ”جو لوگ بلا فلسفی دلیل و حجت کے اسلام پر یقین رکھتے ہیں بلا شک ان کا ایمان اور ان کا یقین بہ نسبت ان لوگوں کے جو دلیل و حجت سے اپنے عقیدہ کو مستحکم کرتے ہیں بہت زیادہ مستحکم ہے کیونکہ ان کے دل میں کسی قسم کے شک و شبہ نے راہ نہیں پائی اور نہ راہ پالنے کی اس میں گنجائش ہے۔۔۔۔۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ان کے ایمان کو (میں اور کسی سے کیوں کہوں) اپنے ایمان سے تو بہت زیادہ مستحکم مانتا ہوں۔۔۔۔۔ خدا کے مانتے اور رسول پر یقین کرنے کے لیے ان کو کسی منطقی دلیل اور فلسفی برہان کی حاجت نہیں، کیسی ہی کوئی بات خارج از عقل و ناقابل یقین صیغہ یا غلط ان کے سامنے یہ کہہ کر کہ ”خدا اور رسول نے فرمایا ہے“ بیان کیجائے، وہ فوراً اُس پر یقین کریں گے۔ پس ایسے لوگ ماری بحث سے بالکل خارج ہیں۔ میں ان کو یقین کا ستارہ اور اسلام پر یقین کرنے کا نمونہ سمجھتا ہوں اور ٹھیک مسلمان جانتا ہوں۔“

”و مگر ان کے سوا ایک اور فرقہ بھی ہے جو ہر چیز کی صداقت کے لیے دلیل چاہتا ہے اور اس بات کا خواہشمند ہے کہ اسلام کے عقائد فلسفی دلائل سے اُس کو بتائے جائیں اور اُس کے دل کے شبہ مٹائے جائیں تاکہ اُس کے دل کو تسخیر ہو۔۔۔۔۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ دل میں تو ڈھکڑ پکڑ ہو اور وہ زبان سے لوگوں کے ڈریا سو سائٹی کے دباؤ سے ہاں ہاں کہا کرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہمدے مخاطب ہیں اور جن سے ہم کو بحث ہے۔“

و جس زمانہ میں خلفائے عباسیہ کی سلطنت رونق پر تھی۔۔۔۔۔ اُس وقت

علوم جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں، یا مشتبہ ٹھہرا دیں، یا اسلامی مسائل کو ان سے مطابق کر دکھائیں اس وقت جو بزرگ اس جلسہ میں موجود ہیں میں ان سب سے واقف نہیں ہوں مگر میں یقین کرتا ہوں کہ یہاں بہت سے ذی علم لوگ بھی موجود ہیں، میں اس سچ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک جو لوگ ایسا کرنے کے لائق ہیں اور وہ پوری کوشش حال کے علم طبعی و فلسفہ کے مسائل کو اسلامی مسائل سے تطبیق دینے یا ان کا ابطال ثابت کرنے میں نہ کریں گے وہ سب گنہگار ہیں اور یقیناً گنہگار ہیں۔

”میں ایک شخص ہوں جس کا یہ یقین ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو جدید فلسفہ اور جدید علم طبعی سے بخوبی واقف ہو اور ان تمام اسلامی مسائل پر جو اس زمانہ میں اسلامی مسائل کو بلانے ہیں یقین رکھتا ہو۔ انگریزی خواں نوجوان مجھے معاف کریں گے میں نے کوئی انگریزی خواں جس کو انگریزی علوم کا مذاق بھی حاصل ہو گیا ہو ایسا نہیں دیکھا جس کو پورا پورا یقین ہمارے زمانے کے مروجہ مسائل اسلام پر ہو میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر یہ علوم پھیلیں گے اور ان کا پھیلنا ضروری ہے اور میں خود بھی ان کے پھیلنے میں معین و مددگار ہوں۔ اسی قدر لوگوں کے دلوں میں مروجہ اسلام کی جانب سے بدظنی، بے پروائی بلکہ روگردانی ہوتی جائے گی۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ اصلی مذہب کا یہ نقصان نہیں ہے بلکہ یہ ان غلطیوں کا سبب ہے جو اسلام کے نورانی چہرہ پر لگ گئی ہیں یا تاوانستہ لگا دی ہیں۔“

”میں ہرگز اس لائق نہیں ہوں کہ اسلام کے نورانی چہرہ پر سے ان غلطیوں کے سبب و جہتوں کے چھڑانے کا دعوئے کروں یا حمایت اسلام کا کام اپنے ذمہ لوں، یہ منصب اور یہ فرائض دوسرے مفقذین و با علم لوگوں کا

ہے۔ مگر جب کہ میں مسلمانوں میں اُن علوم کے پھیلانے کا سعی ہوں جن کی نسبت میں نے ابھی بیان کیا کہ وہ اسلام کے کس قدر مخالف ہیں تو میرا فرض تھا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے صحیح یا غلط جو کچھ میرے اسکان میں ہو اُس طرح اسلام کی حمایت کروں اور اُس کے اصل نورانی چہرہ کو لوگوں کو دکھلاؤں۔ میرا کانشنس مجھ سے کہتا تھا کہ اگر میں ایسا نہ کروں گا تو خدا کے سامنے گنہگار ہوں گا۔

”اے میرے دوستو! میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ میری تحقیقات ہے وہی صحیح ہے مگر جب مجھ کو بجز اس کے کہ جو کچھ مجھ سے ہو سکے وہ کروں اور چارہ کار نہ تھا تو مجھ کو ضرور وہی کرنا تھا جو میں نے کیا یا کرتا ہوں۔ میری نیت خالص خدا کے ساتھ ہے۔ اگر میں نے بُرا کیا ہے وہ چاہیگا معاف کرے گا چاہے گناہ کرے گا۔ اگر میں نے اچھا کیا ہے تو میں اس کا صلہ کسی بندہ سے نہیں چاہتا اور یہی وجہ ہے کہ نہ میں لوگوں کے کافر یا نیچری کہنے سے ڈرتا ہوں اور نہ بُرا مانتا ہوں۔ جو لوگ میری ان کوششوں کے سبب بُرا کہتے ہیں کافر بتلاتے ہیں میں اُن سے اپنی شفاعت کا خواستگار نہیں ہوں اور نہ ہوں گا۔ جو بھلا یا بُرا معاملہ ہے وہ خدا کے ساتھ ہے۔ اگر مجھ سے کچھ غلطی ہوئی ہے یا آہندہ ہوگی خدا سے مجھے امید ہے کہ وہ مجھ پر رحم کرے گا۔“

الغرض سرسید نے مذکورہ بالا مقصد کے پورا کرنے کے لیے اول اسلام کی سچائی ثابت کرنے کا ایک ایسا معیار قرار دیا جو ہر مذہب کی سچائی دریافت کرنے کا پیمانہ قرار پاسکے یعنی یہ کہ اس میں کوئی بات قانونِ فطرت کے برخلاف نہ ہو۔ کیونکہ قانونِ فطرت درحقیقت خدا کا فعل ہے اور جو مذہب فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہو گا وہ خدا کا قول ہو گا پس اُس کے فعل اور اُس کے قول میں مطابقت ہونی ضرور ہے۔

اس کے بعد انھوں نے اس اسر پر غور کی کہ اسلام جس کی نسبت ہم

و حوثی ہے کہ اس میں کوئی بات علم و حکمت و صداقت کے برخلاف نہیں اور وہ بالکل قانون فطرت کے مطابق ہے اُس سے کیا مراد ہے؟ اور اُس کی حد کیا ہے؟ اور اُس کے ثبوت کی بابت ہم کیا شک ذمہ دار ہو سکتے ہیں؟ اس امر کے متعلق انھوں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ اسلام کے متعارف مجموعہ میں سے وہ حصہ جس کو تمام مسلمان ملہم من عند اللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخر الزمان کے دل میں القا ہوا ہے اسی طرح بے کم و کاست نبی سے انھوں نے اتحد بسم تک پہنچا ہے صرف وہی حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اُس میں جو بات مائلی فلسفہ و حکمت کے خلاف معلوم ہوا ہیں اور مائلی حکمت میں تطبیق کی جائے یا مائلی حکم کی غلطی ثابت کی جائے پس انھوں نے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ ”حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ“ اپنے جدید علم کلام کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق محض قرآن مجید کو قرار دیا، اور اُس کے سوا تمام مجموعہ احادیث کو اس دلیل سے کہ اُن میں کوئی حدیث مثل قرآن کے قطعی البتہ نہیں ہے اور تمام علماء و مفسرین کے اقوال و آراء اور تمام فقہاء و مجتہدین کے قبایلات و اجتہادات کو اس بنا پر کہ اُن کے جوابدہ خود علماء و مفسرین اور فقہاء و مجتہدین ہیں نہ اسلام، اپنی بحث خارج کر دیا۔

لے سرسید کا دعویٰ اسلام کی حمایت کے موقع پر صرف اس قدر ہے کہ کوئی اقل من سائنس کی مدد سے قرآن مجید پر وارو نہیں ہو سکتا اس لیے انھوں نے اپنی بحث کا موضوع محض قرآن مجید کو قرار دیا ہے اور مجموعہ احادیث و غیرہ کو اس بحث سے الگ رکھا لیکن جو لوگ مذہب اسلام کا اطلاق مجموعہ کتاب و سنت و اجماع و قیاس پر کرتے ہیں اُن کو اسلام کی حمایت کے لیے منویٰ ہے کہ وہ اس تمام مجموعہ کو سائنس کے حلقے سے بچائیں، عام اس سے کہ اس کو سائنس کے مسائل پر تطبیق کریں۔ یا اُس کے مقابلہ میں سائنس کے مسائل کا اطلاق ثابت کریں یا اُن کو غیر محقق ٹھہرائیں ۱۲۔

یہ دونوں اصول ملحوظ رکھ کر سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا مقصد
 ارادہ کر لیا۔ اول اول جب تک کہ تہذیب الاخلاق جاری رہا کبھی کبھی بلا لحاظ ترتیب
 کے وہ متفرق آیتوں کی تفسیریں بطور آرائیگیل کے تہذیب الاخلاق میں چھاپتے
 رہے۔ مگر جب تہذیب الاخلاق کا پرچہ پہلی دفعہ بند ہو گیا اور سرسید سرکاری
 خدمات سے سبکدوش ہو کر بنارس سے علیگڑھ چلے آئے تو انھوں نے ابتداء سے
 قرآن مجید کی تفسیر ترتیب وار لکھنی شروع کی اور اس وقت سے اخیر دم تک
 جب کبھی ان کو اور کاموں سے فرصت ملی برابر اس کے لکھنے میں مصروف رہے
 اور قریب دو خنس کے تفسیر لکھنی باقی تھی کہ پیغام اجل آ پہنچا۔

جس اصول پر سرسید نے یہ تفسیر لکھنی شروع کی تھی یہ ایک ایسا شکل کام
 تھا کہ اگر کوئی اور شخص ایسا کام شروع کرتا تو چند روز بعد اس کا خیال بالکل چھوڑ
 دیتا۔ یہ کہہ نیا تو بہت آسان ہے کہ اسلام میں کوئی بات قانون فطرت کے
 خلاف نہیں ہے مگر اس کی تمام جزئیات کو قانون فطرت پر منطبق کرنا خصوصاً
 اس حالت میں جب کہ سلف کی تصنیفات میں کوئی ایسا نمونہ موجود نہ ہو
 نہایت مشکل کام تھا۔ باوجود اس کے سرسید نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور
 باوصف سخت مخالفوں کے جو قوم کی طرف سے ہونے لگی اور باوجود ان بے شمار
 مشکلات کے جو تفسیر لکھنے وقت ان کو پیش آتی تھیں نہایت استقلال
 کے ساتھ اس کام کو اپنے مذہبی قرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری
 فرض سمجھ کر انجام دیتے تھے۔

اس تفسیر کے مضامین پر ہم دوسرے حصہ میں بحث کریں گے یہاں صرف
 اس قدر لکھا جاتا ہے کہ اگرچہ سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی
 ہیں اور بعض بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں۔

با اینہمہ اس تفسیر کو ہم اُن کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں جس سے اسلام کی محبت اور بہرہ دہی کے علاوہ اُن کی تشریری لیاقت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ظاہر ہوتا ہے۔

اس تفسیر کے برخلاف اکثر مولویوں نے تفسیریں لکھی ہیں جن میں تفسیر حقانی سب سے زیادہ مشہور ہے مگر اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے لکھنے والوں میں سے ایک شخص بھی یہ نہیں سمجھا کہ سید احمد خاں نے کس غرض سے یہ تفسیر لکھی ہے اور کس بنا پر انھوں نے اکثر جگہ تمام معسرین سے اختلاف کیا ہے جس طرح بعض چالاک وکیل کسی جیلہ سے جج کو فریقِ مخالفت پر افر وختہ کر کے اپنا کام نکال لیتے ہیں اسی طرح ان مولویوں نے اپنی تفسیروں کے خریدار پیدا کرنے کا یہ گُر نکالا ہے کہ سر سید کو کہیں شیطان کا منکر، کہیں فرشتوں کا منکر، کہیں معجزات کا منکر، کہیں نبوت کا منکر، کہیں جنت و دوزخ کا منکر قرار دے کر مسلمانوں کو ان سے اور اُن کی تفسیر نہایت بدگمان اور متنفر کر دیا ہے۔ اگر یہ لوگ فی الواقع حمایتِ اسلام کی نظر سے سر سید کی تفسیر کا جواب لکھتے تو اُن کو سب سے پہلے اس بات کا مفید کرنا چاہیے تھا کہ اگر نیری تعلیم مذہب کے حق میں فی الواقع کوئی خطرہ کی چیز ہے یا نہیں اور اگر ہے تو آیا اس کا علاج یہ ہے کہ انگریزی تعلیم کو قوم میں رواج نہ دیا جائے یا یہ کہ تعلیم سے جو شبہات اسلام کے حق میں پیدا ہوتے نظر آتے ہیں اُن کا جہاں تک ممکن ہو استیصال کیا جائے۔ اس کے بعد اُن کو یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ سر سید نے جو طریقہ شبہات کے استیصال کرنے کا اختیار کیا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔ اگر ٹھیک ہے تو انھوں نے کہاں تک قرآن کی تفسیر اُس طریقہ کے موافق کی ہے اور کہاں کہاں اُس سے انحراف کیا ہے اور اگر وہ طریقہ ٹھیک نہیں

ہے تو پھر کونسا طریقہ ہے جس کو اس مقصد کے لیے اختیار کرنا چاہیے اور کس طرح اس طریقہ سے اُن شبہات کا جو علوم جدید کی تعلیم یافتہ گروہ کے دل میں پیدا ہوتے ہیں استنبال کیا جائے مگر افسوس ہے کہ انھوں نے مراتب مذکورہ بالا میں سے ایک بات کا بھی اپنی تفسیروں میں لحاظ نہیں کیا بلکہ اپنی تمام محنت اس بات میں صرف کی ہے کہ سرسید کی نسبت لوگوں کے نقصانات کو اور زیادہ بھڑکائیں تاکہ اُن کی تفسیروں کی زیادہ قدر ہو اور لوگ اُن کو بہت بڑا عامی دین اسلام سمجھیں۔

لطیفہ: ایک شخص نے سرسید کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "میں بہت کثیر ایصال ہوں اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں۔ آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں میری نوکری کے لیے سفارش کر دیجئے۔ میں نے انگریزی کی تعلیم تو نہیں پائی مگر عربی کی کتب و رسم پڑھی ہیں جو کام آپ میرے لائق سمجھیں اُس کے واسطے سفارش کر دیں۔" سرسید نے اُن کو لکھ بھیجا کہ میری عادت کسی کی سفارش کرنے کی نہیں ہے اور وجہ معاش کی تدبیر میرے نزدیک اس سے بہتر نہیں ہے کہ آپ میری تفسیر کا رد لکھ کر چھپوائیں خدا چاہے تو خوب بکے گی اور آپ کو تنگی معاش کی شکایت نہیں رہے گی۔"

چھٹا باب :

۱۸۶۸ء سے ۱۸۹۸ء تک

وائسرائے کی کونسل کی ممبری، ایجوکیشن میں شہادت، محمدن
سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن، محمدن ایسوسی ایشن علیگڑھ، محمدن ایجوکیشنل
کالفرنس، پبلک سروس کمیشن کی ممبری، انڈین نیشنل کانگریس کی
مخالفت، پٹریاکھک ایسوسی ایشن، کے سی ایس کا تمغہ ملنا، ایل ایل
ڈی کی ڈگری، ٹرسٹی بل پر اختلاف، کالج کے رویہ میں غبن ہونا،
سرستید کی وفات،

۱۸۷۸ء میں سرستید کو لارڈ لٹھی نے وائسرائگیل لیجسلیٹو کونسل کا ممبر مقرر کیا اور
اُن کے بعد دوسری دفعہ لارڈ ڈرپن نے اُن کو ممبری کونسل کے لیے انتخاب کیا۔
قانونی کونسل میں ہندوستانیوں کے شریک کرنے کی تحریک جیسا کہ اوپر بیان
ہو چکا ہے سب سے اول سرستید ہی نے کی تھی۔ انھوں نے اپنے رسالہ اسباب
بغاوت میں سب سے بڑا سبب بغاوت کا کونسل میں ہندوستانیوں کے بھرتی
نہ ہونے اور انتظام سلطنت سے بالکل بے خبر رہنے کو قرار دیا تھا۔ پس جس
عزت و امتیاز کا دروازہ انھوں نے اپنے ہم وطنوں کے لیے کھولا تھا اس کا اتھاق
فی الواقع سرستید سے زیادہ کوئی نہیں رکھتا تھا۔ مبنی گزٹ میں اُن کے انتخاب
کی نسبت یہ رپارک کیا گیا تھا کہ "گورنمنٹ اُن نقصوں کے پورا کر لے سے

جو سید احمد خاں نے اسباب بغاوت میں ظاہر کیے تھے غافل نہیں تھی، خود اُس کو لارڈ لٹن اور لارڈ رین کا ممبری کے لیے منتخب اور نامزد کرنا اس بات کی عمدہ ضمانت تھی کہ گورنمنٹ اپنی عیال کے ایک عمدہ حصہ کی ضرورت یا توجہ خواہشات سے آگاہ ہو۔

ہندوستانیوں میں سرستید پہلے شخص ہیں جنہوں نے ممبری کونسل کے نامہ میں ہندوستان کی بھلائی کے لیے قانون سنایا۔ وہ چارہ برس متصل وائسرائے کونسل کے ممبر رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے دو مسودے کونسل میں پیش کیے۔ چچیپ کے ٹیکے کا قانون اور قاضیوں کے تقرر کا قانون۔ یہ دونوں مسودے سے پاس ہو گئے۔ اور اُس سے آج تک اُن کے موافق ہندوستان کے اکثر حصوں میں عمل درآمد چلا آتا ہے۔

قانون ٹیکہ چچیپ

چچیپ کے ٹیکے کا قانون جس کا مسودہ ستمبر ۱۸۷۹ء میں کونسل میں پیش ہوا اس غرض سے بنایا گیا تھا کہ ٹیکے کا قاعدہ اصلاح شمال مغرب، اودھ، ممالک متوسط، برٹش برہما، آسام، اجیر اور کورگ میں، اور نیز فوجی چھانڈیوں میں لازمی کر دیا جائے، چونکہ ایسا جبری قانون جاری کرنے سے رعایا کی شہمی آزادی میں ایک نوع کی مداخلت کرنی پڑتی تھی اس لیے سرستید نے مسودہ پیش کرتے وقت جو اُس پر ایسا مبارک کیا تھا، اُس میں اُس قانون کے جاری کرنے کی ضرورت بہت خوبی سے ثابت کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ شخصی آزادی کی رعایت اُس سہولت کو جائز نہیں رکھ سکتی جو مرض چچیپ کے متعدی ہونے سے اوروں کو پہنچتی ہے اور نیز چچیپ کا ضرر بالخصوص اُن بے گناہ بچوں کو

پہنچتا ہے جو اپنی جانوں کی خود حفاظت نہیں کر سکتے۔ پس ٹیکے کے لازمی کر دینے سے جس طرح بڑی عمر کے آدمی ہمسایوں کی یا بے پروائی کے مضر نتائج سے محفوظ رہیں گے اسی طرح معصوم بچوں کی جانوں کی حفاظت ان کے والدین کی بیوقوفی کے نتائج سے عمل میں آوے گی۔ پھر یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جس طرح پہلے زمانے میں لوگ عموماً ٹیکے سے ڈرتے تھے اب ایسا حال نہیں رہا۔ اب ملک میں ایک بہت بڑی جماعت تعلیم یافتہ لوگوں کی ایسی موجود ہو گئی ہے جو ٹیکے کا لازمی ہونا پسند کرتے ہیں۔

مح ڈاک ٹیکا لگانے کے قواعد میں جہاں تک کہ ممکن تھا ہر طرح کی آسانی اور نرمی کا لحاظ رکھا ہے۔ اولاً لوکل گورنمنٹوں کو اس میں اختیار دیا گیا ہے کہ جس ہیوسپتلی سے مناسب سمجھیں اس کو متعلق کریں۔ اس کے سوا ٹیکا لگوانے والوں کو اور بہت طرح سے آسانیاں دی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ بچوں کے مکانوں پر جا کر ٹیکا لگایا جائے۔ ہیوسپل کمشنریوں میں سے کوئی ممبر خود جا کر اپنے سامنے ٹیکا لگوائے۔ پولیس کی دست اندازی جہاں تک ممکن ہو نہ پانے پانے اطفال غیر محفوظ کی تحقیقات ادا ان کے رجسٹر کی ترتیب ہیوسپل کمشنریوں اور سپرنٹنڈنٹ ویکسینٹروں سے متعلق رہے تاکہ بچوں ادا ان کے مرتبوں کو رجسٹر کے برو برو جبراً حاضر کرانے کی ضرورت نہ رہے کسی بچہ کے بازو سے مادہ نہ یا جا سکے بلکہ جہاں تک ممکن ہو حیوانی مادہ سے ٹیکا لگایا جائے اور قانون کی خلاف ورزی کی سرائیں صرف جرمانہ پر محسوس ہو رہیں۔

باوجود ان سب باتوں کے یہ بل اختلاف رائے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ خصوصاً نواب لغٹ گورنر پنجاب اس کے سخت مخالفت تھے۔ مگر کونسل کے اکثر لیگل ممبر اس سے اتفاق رکھتے تھے آخر ایک آدھ دفعہ کی مجبوری

تزمیم کے بعد ۱۹۴۹ء میں پاس ہو گیا۔

قانون تقرر قاضیان

قاضیوں کے تقرر کا قانون بھی ۱۹۵۵ء میں کسی قدر اختلاف کے بعد مجادلی سے پاس ہو گیا۔ اس قانون کے بنانے کا منشا یہ تھا کہ گورنر قضا کی وہ حیثیت جو اہل اسلام کے عہد میں ایک جج یا مجسٹریٹ کے برابر تھی، انگریزی عدالتوں میں باقی نہ رہی تھی، مگر پھر بھی انگلش گورنمنٹ نے اپنے عہد حکومت میں اس عہدہ کو بالکل موقوف نہیں کر دیا تھا بلکہ بعض قوانین کے ذریعہ سے جو ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک وقتاً فوقتاً جاری ہوتے رہے، بنگالہ، اڑیسہ، بہار، بمبئی اور مدراس میں ایک عدالتی اختیارات کے سوا باقی تمام کام جو قاضیوں سے متعلق چلے آتے تھے قائم رکھے تھے، جیسے دستاویزات کا تیار اور تصدیق کرنا، بمکاح خوانی اور غلامی کی مجلسوں میں صند نشین ہونا، انواع و اقسام کے آداب و رسومات وغیرہ کا انجام دینا، فرق شدہ جائیداد کے نیلام کی دید بانی، زرخیرات و ونشن و وظائف کا تقسیم کرنا وغیرہ وغیرہ پھر رفتہ رفتہ حسب مقتضائے وقت ان کی خدمات محدود ہوتی گئیں، یہاں تک کہ ۱۹۵۲ء میں جلد قوانین جو قاضیوں کے تقرر اور ان کے کاموں سے متعلق تھے منسوخ کیے گئے اور یہ قرار پایا کہ قاضیوں کا تقرر بذریعہ گورنمنٹ کے عمل میں آنا قرین مصلحت نہیں ہے اور قاضیوں کو اجازت دی گئی کہ جس وقت لوگ ان سے کسی رسم مذہبی وغیرہ کے انجام دینے کے خواستگار ہوں تو وہ بطور خود اس کو انجام دیں۔

مگر جس طبقہ کے لوگوں کو ایسے کاموں کے لیے قاضیوں کو فرصت جوتی تھی ان کے ذریعہ سے عموماً اور مسلمانانِ صوبہ مدراس کے ذریعہ سے خصوصاً

بارہا گورنمنٹ کی اطلاع میں آچکا تھا کہ بغیر ایسے قاضیوں کے جو گورنمنٹ کی طرف سے مقرر ہوں لوگوں کے کاموں میں جرح واقع ہوتا ہے اس لیے سرسید نے یہ مسودہ تیار کیا جس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ گورنمنٹ نے جو قاضیوں کے تقرر کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں رکھا اس کو وہ پھر اپنے ہاتھ میں لے اور اول صوبہ مدراس میں اُس کو نافذ کرے اور تمام لوکل گورنمنٹوں کو اختیار دے کہ جس صوبہ کے مسلمان اس قانون کو اپنے صوبہ میں جاری کرانا چاہیں وہاں اس قانون کو جاری کریں۔ اس میں ہے کہ جہاں جہاں یہ قانون جاری ہو چکا ہے یا آئندہ جاری ہو گا وہاں کے قدیم قاضیوں کے خاندان جو سرکاری عہدہ دار نہ ہونے کی وجہ سے ایک کس پر سی حالت میں تھے ان کی قدس و پیشش زیادہ ہونے لگے گی اور خاص خاص طبقوں کے مسلمانوں کو نکاح خوانی وغیرہ میں ان سے مدد ملے گی۔

قانون وقف خاندانی

ان دونوں قانونوں کے علاوہ سرسید نے ممبری کونسل کے زمانہ میں ایک اور نہایت مفید خدمت اپنی قوم کی کرنی چاہی تھی مگر انوس بے کہ بعض موانع کے سبب وہ تدبیر لپدی نہ ہو سکی۔ انھوں نے ایک مسودہ قانون وقف خاندانی کے نام سے تیار کیا تھا جس سے مسلمان خاندانوں کو تباہی اور بربادی سے بچنا مقصود تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ مسلمان خاندانوں کی حالت روز بروز تباہ و برباد ہوتی جاتی ہے اور جو امیر اور ذی مقدر خاندان تھے اُن کی اولاد مفلس ہوتی جاتی ہے۔ اور جن میں ابھی کچھ جان باقی ہے وہ تین بیستوں کے بعد ان کی جائیدادیں اور ریاستیں بھی سب برباد اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم اور فرختہ

میں فروخت ہو جائیگی اس لیے اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر کیجائے جس سے مسلمانوں کے معزز خاندان بنے رہیں اور اُن میں کچھ ایسے ذمی مقدور اور ریشہ دکھائی دیں جن سے مسلمانوں کی قوم کی عزت اور امتیاز قائم رہے۔

اول انھوں نے نہایت محنت و جانفشانی سے سنی اور شیعہ دونوں کی فقہی کتابوں سے اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی جائیداد کو اپنے لیے اور اپنے بعد اپنی اولاد اور اپنی نسل کے لیے ہمیشہ کو وقف کر دے جس کی رو سے وہ جائیداد نہ کبھی بیع ہو سکے اور نہ وراثت میں تقسیم ہو سکے اور ہمیشہ قائم و برقرار رہے پھر جہاں جہاں ہندوستان میں مسلمان رئیسوں نے اپنی جائیدادیں اس طرح بھانپنے خاندان کے لیے وقف کی تھیں اُن کی بہت سی مثالیں بہم پہنچائیں تاکہ مسلمانوں کے عمل درآمد سے مسئلہ شرعی کو اور زیادہ تقویت ہو، اس کے بعد انھوں نے دیکھا کہ جو لوگ خانگی طور پر بلا محنت سرکار اپنی جائیدادیں اپنے خاندان کے لیے وقف کرتے ہیں ایسے وقف سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اول تو یہ امید نہیں کہ وہ جانشینی کا ایسا قاعدہ کلیہ مقرر کر سکیں جس میں آخر کار خلیفہ پیدا نہ ہوں اور نزاع کا احتمال باقی نہ رہے دوسرے اس صورت میں ہمیشہ وقف کے فرضی اور فرضی ہونے کا الزام لگا کر اُس کی منسوخی کے دعوے، جیسا کہ اکثر ہوتا رہتا ہے، عدالت میں دائر ہو سکتے ہیں، تیسرے چونکہ اکثر جائیدادیں دیہانتیہ مالگناری سرکار ہوتے ہیں اس لیے جب کوئی مالانق منولی یا جانشین نہ مالگناری سرکار ادا نہیں کرتا تو اس شرعی یا قانونی اس بات کا مانع نہیں ہوتا کہ وہ حاجت و اجلت باقی نیلام ہو جائے اس لیے انھوں نے ضروری سمجھا کہ یہ مسئلہ شرعی بند بیچہ ایک

قانون کے گورنمنٹ کی منظوری سے استحکام پا جائے۔

اس غرض سے انھوں نے ایک مسودہ نہایت لیاقت کے ساتھ تیار کیا اور کونسل میں پیش کرنے سے پہلے وائسرائے سے پرائیویٹ طور پر اس کے مشتبہ کرنے اور مسلمانوں کی رائیں اس کی نسبت دریافت کرنے کی اجازت لے کر تہذیب الاخلاق، علیگڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات میں مشتبہ کرایا بہت سے مسلمانوں نے خطوں کے ذریعے سے اس کے ساتھ اتفاق ظاہر کیا۔ بعض شہروں میں وہاں کے رئیسوں اور ممتاز لوگوں نے جلسے کیے اور اس تجویز کو نہایت پسند کیا، بعض نہایت مستند عالموں نے وقف خاندانی کے مسئلہ کو تسلیم کیا اور اس کے جواز پر فتویٰ لکھ دیا، مگر بہت سے مسلمانوں نے اور خاصکر مولوی ابو سعید عظیم آبادی اور ان کے پیروں نے سخت مخالفت کی، چنانچہ وقف خاندانی کے عدم جواز پر فتوے لکھے گئے اور گورنمنٹ میں اس کے برخلاف عرضیاں اور ممبرانِ علی بھیجی گئی۔

جس زمانہ میں اس مسودہ کے برخلاف مولویوں کے فتوے شائع ہو رہے تھے کسی انصاف پسند مسلمان نے ان فتوؤں کے خلاف ایک اٹکل لکھا تھا جس کا پہلا فقرہ یہ تھا ”امگستان کا ایک مصنف لکھتا ہے کہ ”جو شخص اپنے ملک یا اپنی قوم کا بدخواہ ہو اس کی زیارت کرنی چاہیے کیونکہ وہ دنیا میں ایک عجائب چیز ہے، ہم کہتے ہیں کہ یہ مصنف چونکہ یورپ میں پیدا ہوا تھا اس لیے شاید اس نے عمر بھر میں کوئی قوم کا بدخواہ نہ دیکھا ہو گا اور اسی لیے وہ قوم کے بدخواہ کو ایک عجیب چیز سمجھتا تھا، لیکن اگر وہ ہماری قوم میں پیدا ہوتا تو بجائے اس قول کے شاید یہ جملہ اس کی زبان سے نکلتا کہ جو شخص مسلمان مولوی ہو کر اپنی قوم کا بدخواہ نہ ہو اس کی زیارت کرنی چاہیے کیونکہ دنیا میں کوئی چیز اس

سے زیادہ عجیب نہیں ہے ۔

ممبر حال سرستید نے یہ تدبیر مسلمان رٹھیوں کے لیے نہایت عمدہ سوچی تھی مگر افسوس ہے کہ وہ اس مسودے کو کونسل میں پیش نہ کر سکے۔ نہ اس لیے کہ مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی تھی کیونکہ وہ قانون لازمی نہ تھا اور اس کی پابندی محض مالک جائیداد کی مرضی پر منحصر تھی۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اصول قانون کی رو سے پاس نہیں ہو سکتا تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ قانون بالکل فریقین کی روایات فقہیہ کے مطابق بنایا گیا تھا اور فقہ کی رو سے ضرور تھا کہ جو وقف اس طرح اولاد کے لیے کیے جائے وہ وقف دائمی ہو نہ میعاد می۔ مگر ولایت کے مقننوں کی یہ رائے قطعی طور پر قرار پا چکی تھی کہ کسی جائداد کو ہمیشہ کے لیے ناقابل انتقال بنادینا مالک کو نقصان پہنچانا ہے۔ پس سرستید کے بعض دوستوں نے جو کونسل میں تھے ان کو یہ صلاح دی کہ موجودہ صورت میں مسودہ قانون پیش کرنا عبث ہے کیونکہ اس کے منظور ہونے کی امید نہیں۔ ہاں اگر وقف کی کوئی میعاد مقرر کر دی جائے جس سے جائیداد ایک مدت معین تک ناقابل انتقال رہے اور اس کے بعد موجودہ وارثوں میں تقسیم ہو جائے تو البتہ یہ قانون پاس ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ ایسے وقف کو میعاد قرار دینا شرعاً جائز نہ تھا اس لیے لاچار اس سے دست بردار ہونا پڑا۔

کونسل میں اسپیشل

سرستید نے ان تینوں مسودوں کے تیار کرنے کے سوا اور اکثر موقعوں پر جب تک کہ وہ کونسل میں ممبر رہے غیر معمولی بیاقت ظاہر کی ہے۔ باوجود انگریزی نہ جاننے کے ہر ایک اہم معاملہ پر جو کونسل میں پیش ہوتا تھا وہ

گفتگو کرتے تھے اور اس لیے اُن کو تمام کاغذات جو اس معاملہ سے متعلق اور
 بالکل انگریزی میں ہوتے تھے سمجھنے پڑتے تھے اور اس طرح کافی اطلاع حاصل
 کرنے کے بعد وہ کونسل میں اسپیکر کرتے تھے۔ اکثر چھوٹی چھوٹی اسپیکر
 اول خود اُردو میں لکھ کر اُن کا انگریزی میں ترجمہ کرتے تھے اور پھر انگریزی الفاظ
 کو فارسی حروف میں لکھ کر خود کونسل میں اسپیکر دیتے تھے اور بڑی بڑی سیمیں
 جو وہ تیار کر کے لجاتے تھے ان کو اکثر کونسل کا سکرٹری پڑھ کر سناتا تھا۔ اُن
 کی ایک اسپیکر پر جو فارسی حروف میں لکھ کر دی تھی لارڈ لٹن نے بڑا تعجب ظاہر
 کیا تھا۔ سر سید کہتے تھے کہ ”جب میں اجلاس ختم ہونے کے بعد کونسل کے
 بال سے اپنے کمرے کی طرف چلا تو لارڈ لٹن بھی پیچھے پیچھے چلے آئے اور مہربانی
 سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ میں نے ایسی قابلانہ اسپیکر کبھی نہیں
 سنی تھی۔“ یہ اسپیکر غالباً مسودہ قانون مزارعین دکن پر تھی جس کا انتخاب کرنل گریم
 نے سر سید کی لائف میں چھاپ دیا ہے۔

ایک اور اسپیکر مسودہ قانون انتقال جائیداد کی رپورٹ پیش ہونے پر سر سید نے
 ۲۶ جنوری ۱۸۵۷ء کی تاریخ کی تائید میں کی تھی۔ اُس بل پر انگلش میں ایک لبا آرٹیکل
 چھپا تھا جس میں سر سید کی اسپیکر کی نسبت لکھا تھا کہ ”کسی ہندوستانی جنٹلمین
 نے اب تک اس مسئلہ کی تائید نہ کی کہ ملک کا قانون کو ڈیکلینشن (یعنی مجموعہ احکام
 بنانے) کا محتاج ہے اور اس میں ڈیکلینشن کی گنجائش ہے۔ اور ملک
 کے دونوں فرقوں کی تاریخ اور لٹریچر ایک قومی ضرورت کی طرف بڑے استحکام
 ساتھ اشارہ کرتی ہے۔ ایسی ضرورت کیساتھ نہیں کی ہے جیسی کہ آئوہل سید احمد خاں نے کی ہے۔“
 اسی طرح قانون حقوق استفادہ اور قانون ترمیم مجموعہ ضابطہ قومی جہو
 ہندوستان میں ہمیشہ یاد رہے گا اور نیز دیگر قوانین پر انھوں نے بہت باوقت

اسپیشل کی ہیں۔ خصوصاً وہ اسپیشل جو قانون لوکل سلف گورنمنٹ متعلقہ اضلاع متوسط پر ۱۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو لارڈ پرنس کے زمانہ میں کی تھی وہ خاص توجہ کے لائق ہے۔ قانون مذکور میں جو کہ خاص اضلاع متوسط کے لیے بنایا گیا تھا اس صوبہ کی حالت کے لحاظ سے لوکل بورڈوں میں دو ڈسٹ ممبر الکشن سے اور ایک ڈسٹ گورنمنٹ کے انتخاب سے مقرر ہونے تجویز کیے گئے تھے مگر لارڈ پرنس کی پالیسی سے اس بات کا یقین تھا کہ شمالی ہندوستان میں کل ممبر الکشن سے مقرر ہوا کریں گے چونکہ سرسید کی رائے اس کے برخلاف تھی اور ان کو یہ امید نہ تھی کہ وہ اس وقت تک جبکہ ان صوبوں کے لیے قانون بنایا جائے گا کونسل میں ممبر رہیں گے اس لیے انھوں نے اپنی اسپیشل میں نہایت مدلل طور پر بیان کیا ہے کہ تمام ہندوستان میں اسی اصول کے موافق دو ڈسٹ ممبر الکشن سے اور ایک ڈسٹ کمیشن سے مقرر ہوا کریں چنانچہ انھیں کی اسپیشل پر لارڈ پرنس نے شمالی ہندوستان میں ایک ڈسٹ ممبروں کا تقرر گورنمنٹ کے ہاتھ میں رکھا اور دو ڈسٹ کے لیے الکشن کا قاعدہ مقرر کیا۔

یہ اسپیشل سرسید کی اول اسپیشل اور لکچروں کے ساتھ ایک مجموعہ میں چھپ گئی ہے اس لیے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اس کے بعض فقرات ہم اس موقع پر نقل کریں گے جہاں انڈینیشنل کانگریس کی مخالفت کا مفصل ذکر کیا جائے گا۔ لارڈ پرنس کے عہد میں جس قدر زمانہ کہ سرسید کے کونسل میں شریک رہنے کا تھا اس کے پورا ہونے بھی ابھی چند روز باقی تھے اور ان کے پورا کرنے کے لیے کھلتے جانے میں مدرسہ وغیرہ کے کاموں میں حرج واقع ہوا تھا اس لیے انھوں نے بذریعہ تکرار کے کونسل سے استعفا بھیج دیا مگر اس کے بعد اس میں جب کہ اضلاع شمال مغرب میں کونسل قائم ہوئی ان کو لوکل گورنمنٹ نے اپنی کونسل کے لیے پھر انتخاب کیا اور اس وقت سے لے کر اب تک وہ

برائے اس میں ممبر رہے۔ آخر پھر ان کو مدد سے کسی کے کاروبار کی ضرورت اندر
ضعیفی کی وجہ سے استعفا دینا پڑا۔

کرنل گریم سر سید کی لائف میں ان کی ممبری کو نسل کی نسبت لکھتے ہیں
کہ ”جب سر جان منکلم کو بورڈ آف ڈائریکٹرز نے عہدہ گورنری پر مقرر کیا تو
اس تقریب میں گریٹ ڈیوک آف ونگٹن نے سر جان منکلم کو ایک ڈنر
دیا تھا اس موقع پر جو تقریر دے ڈیوک نے کی تھی، اگر اس تقریر میں سب سے
انگلستان کے ہندوستان اور سب سے انگریز کے مسلمان کا لفظ بنا دیا جائے تو وہ
تقریر سید احمد خاں کے ممبر کو نسل ہونے پر خوب چپاں ہوتی ہے اور وہ
فقہ یہ ہے ”ایک ایسا مقرر جیسا کہ یہ ہے عمل کرنے والا ہے۔ انگلستان
کے تمام عرض و طول پر اور کم سے کم عمر کا نوجوان انگریز اس میں ایک مثال
پاتا ہے جس کی وہ تقلید کرے۔ اور ایک کامیابی پاتا ہے جس کو وہ حاصل کرے
اور ایسے فیملی کے جو ش سے جو بھلائی ملے حاصل ہوتی ہے، اس کی کچھ
انتہا نہیں“

ایجوکیشن کمیشن میں شہادت

۱۸۸۲ء میں جب کہ سر سید لیمبلیٹھو کو نسل میں ممبر تھے ان کی شہادت بھی
ایجوکیشن کمیشن میں لی گئی تھی۔ ان کا طو لانی اظہار علی گڑھ گزٹ کے متعدد پرچوں
میں چھپا ہوا موجود ہے جس سے ان کا ایک بڑا تجربہ کار ایجوکیشنسٹ ہونا
ثابت ہوتا ہے۔

سر سید اول کمیشن مذکور کے ممبر مقرر ہوئے تھے، مگر جو طریقہ کمیشن کی کارروائی
کا تھا وہ ان کی رائے کے خلاف تھا، اول تو ممبروں کو کسی کارروائی کی اطلاع

پہلے سے نہیں دیکھائی تھی تمام رزولوشن دفعہ پیش کیے جانے تھے اور ممبروں کو ان پر کافی غور اور بحث کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ دوسرے جو مباحثہ برائیک رزولوشن پر ہوتا تھا وہ قلمبند نہیں کیا جاتا تھا اس لیے انھوں نے ایک آدھ اجلاس کے بعد پریسیڈنٹ سے کہا کہ میرے نزدیک ممبروں کو پہلے سے اطلاع ہونی چاہیے کہ کونسی تاریخ کیا کارروائی ہوگی تاکہ ان کو غور کرنے کا موقع ملے دوسرے جو مباحثہ کمیشن میں ہوؤ وہ بالکل قلمبند ہونا چاہیے مگر پریسیڈنٹ نے ان دونوں باتوں کو منظور نہیں کیا اور کہنا کہ موجودہ حالت

۱۔ حاشیہ بعد فتح کے) ”سید محمود نے اپنی میری کے زمانہ میں ۱۸ رزولوشن کمیشن میں ایسے پاس کر اٹھے تھے جو خاص مسلمانوں کی ترقی تعلیم اور بہبودی سے علاقہ رکھتے تھے مگر گورنمنٹ سے ان کی نسبت یہ حکم ہوا کہ ان کے اجرا یا عدم اجرا کا اختیار لوکل گورنمنٹوں کو ہونا چاہیے جس تجویز کو وہ اپنے صوبہ میں مناسب سمجھیں جاری کریں اور جس کو مناسب نہ سمجھیں جاری نہ کریں وہ رزولوشن یہ ہیں۔
۱۔ مسلمانوں کی تعلیم کی خاص تقویت اور ترقی کا بارہ لوکل میونسپل اور پرووینشل فنڈوں پر جائز سمجھا جائے۔

۲۔ جو ویسی مدد سے مسلمانوں کے ہیں ان کو ترغیب دیکھائے کہ اپنے ہاں کی خواندگی میں خاص ذہنی تعلیم میں اضافہ کریں۔

۳۔ مسلمانوں کے پرائمری اسکولوں کے واسطے خاص سینڈر مقرر کیے جائیں۔

۴۔ پرائمری اور ہڈل اسکولوں میں سوائے ان مقامات کے جہاں اسلامی جماعتیں کسی اور زبان کی خواہش کریں اصل زبان مسلمانوں کی تعلیم

میں بھی کام کی کثرت بہت ہے۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو کام بہت بڑھ جائے۔
 گلاسٹید نے کہا کہ اس صورت میں کمیشن کی شرکت سے مجھ کو معاف رکھا
 جائے۔ جب لارڈسپن کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے سرستید سے کہا کہ اگر
 کے لیے اُردو ہونی چاہیے۔

۵۔ جہاں دفاتر کی زبان اُردو نہیں ہے وہاں بطور اختیاری مضمون کے
 پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جو مسلمانوں کے لیے پبلک فنڈ سے
 قائم ہیں دفاتر کی زبان خواندگی میں بڑھائی جائے اور غیر حساب اور
 سیاق اسی زبان میں سکھایا جائے۔

۶۔ جن مقامات میں مسلمانوں کی نسیتی تعداد بلحاظ آبادی کے معتد بہ ہے
 وہاں پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جو کہ پبلک فنڈ سے قائم ہیں ایسا
 انتظام کیا جائے کہ اُردو اور فارسی زبان کی تعلیم دی جائے۔
 ۷۔ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے لیے خوب اچھی طرح ترغیب عمل
 میں لائی جائے کیونکہ یہ ایسی تعلیم ہے جس میں اس جماعت کو خاص
 مدد کی ضرورت ہے۔

۸۔ جہاں جہاں ضرورت ہو ایک درجہ دار طریقہ خاص اسکالرشپوں کا
 مسلمانوں کے واسطے جاری کیا جائے جو انعام میں دیے جائیں یعنی (۱)
 جو پرائمری اسکولوں کی کامیابی پر مڈل اسکولوں میں دیئے جائیں، (۲) جو
 مڈل اسکولوں کی کامیابی پر ہائی اسکولوں میں دیئے جائیں، (۳) جو
 انٹرنس اور ایف اے کے امتحانات کے نتائج پر کالجوں میں دیئے
 جائیں۔

۹۔ ہر قسم کے اسکولوں میں جو پبلک فنڈ سے قائم ہیں ایک خاص نسبتی

آپ ممبری سے علیحدہ ہوتے ہیں تو سید محمود کو اپنی جگہ ممبری قبول کرنے پر
راضی کر دیجیے اور آپ خود کمیشن میں شہادت دیجیے چنانچہ سید محمود اُن کی
جگہ مقرر کئے گئے اور سرسید نے شہادت دی۔

نعماد وظیفوں کی بالخصوص مسلمان طلبہ کے لیے رکھی جائے۔

۱۰۔ جن مقامات میں تعلیمی اوقاف مسلمانوں کے فائدے کے واسطے
ہیں اور گورنمنٹ کے زیر انتظام ہیں وہاں اوقاف کی آمدنی صرف
مسلمانوں کی ترقی تعلیم میں صرف ہونی چاہیے۔

۱۱۔ جہاں مسلمانوں کے اوقاف پرائیویٹ لوگوں یا جماعت کے زیر
انتظام ہیں وہاں فیاضی سے گرانٹ ان ایڈوی جایش اور پرائیویٹ
لوگوں کو ترغیب دیجائے کہ گرانٹ ان ایڈ کے قاعدے کے
موافق انگریزی تعلیم کے لیے اسکول اور کالج قائم کریں۔

۱۲۔ جہاں ضرورت ہو نورل اسکول یا کلاسیں مسلمان معلموں کی تربیت
کے لیے قائم کی جائیں۔

۱۳۔ جن مسلمان مدرسوں میں (جو اوقاف سے قائم ہیں) اردو میں درس
ہوتا ہو وہاں کوشش کی جائے کہ حتی الامکان مسلمان معلم تعلیم دیں۔

۱۴۔ افسران معائنہ جو مسلمان ہوں وہ ان پرائمری اسکولوں کا معائنہ جو
مسلمانوں کے لیے ہیں موجود دستور سے زیادہ کیا کریں۔

۱۵۔ ترقی تسلیم مسلمانان کے واسطے جو ایسوسی ایشن ہیں اُن کو تسلیم کیا
جائے اور ان کی بہت بڑھائی جائے۔

۱۶۔ پبلک انسٹرکشن کی سالانہ رپورٹوں میں ایک خاص باب مسلمانوں
کی تعلیم پر ہوا کرے۔

مہر سید کے اظہار میں سے چند دلچسپ جواب جو انھوں نے بعض عام سوالات یا جرح کے سوالات پر کشن میں دیے اس مقام پر بطور خلاصہ کے نقل کیے جاتے ہیں تاکہ تعلیم کے متعلق جو اہم سوالات ہیں ان کی نسبت ان کی اصلی رائے جو انھوں نے ہر ایک موقع پر نہایت آزادی سے ظاہر کی ہے ناظرین کو معلوم ہو جائے۔

انھوں نے اس سوال کے متعلق کہ آیا مغربی علوم کی تعلیم ویسی زبانوں میں بہ نسبت انگریزی زبان کے زیادہ مفید ہوگی؟ اس طرح جواب دیا کہ "اُن ورنیکلر و انگریزی پرائمری اور ثانل اسکولوں میں جن کا مقصد طالب علموں کو اعلیٰ درجے کی تعلیم کے واسطے تیار کرنے کا نہیں ہے۔ مغربی علوم کا جہاں تک کہ وہ ان میں پڑھاٹے جاتے ہیں ورنیکلر زبان میں پڑھایا جاتا ہے شک کے حق میں بہتر ہوگا۔ مگر انگریزی اہل اسکولوں میں جو اس غرض سے قائم کیے گئے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے واسطے بطور ایک ذریعہ کے کام دیں ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے یورپین علوم کو پڑھانا تعلیم کو برباد کرنا ہے میں اقرار کرتا ہوں کہ میں وہی شخص ہوں جس نے سب سے پہلے اس بات کا گمان کیا تھا کہ یورپین علوم کا ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے تحصیل کرنا ملک کے حق میں زیادہ سودمند ہوگا۔ میں وہی شخص ہوں جس نے لارڈ مکالے

۱۷۔ لوکل گورنمنٹوں کی توجہ اس نسبت کی طرف مائل کرائی جائے جو تعلیم یافتہ مسلمانوں اور دیگر اقوام کے لوگوں میں نوکریاں تقسیم کرنے میں ملحوظ رکھی جاتی ہے۔

۱۸۔ اصول مذکورہ بالا جو سفارش میں بیان کیے گئے ہیں وہ دیگر اقوام پر بھی جو حالات مذکورہ میں مسلمانوں کے برابر ہوں، عائد ہوں ۱۷۔

کے منٹ ۱۸۳۵ء پر مکتہ چینی تھی کہ انھوں نے مشرقی تعلیم کے نقص کو ظاہر کیا اور مغربی علوم کی تعلیم پر توجہ دلائی، اور اس بات کے خیال کرنے سے قاصر رہا تھا کہ ایسی زبانوں کی وساطت سے یورپین علوم کی اشاعت اہل ہند کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے یا نہیں؟ میں نے اپنی رائے کو صرف بیان ہی پر محدود نہیں کیا بلکہ اس کو عمل میں لانے کی کوشش کی، بہت سے مباحثے بہت سے جلسوں میں کیے، اس مضمون پر متعدد رسالے اور مضامین لکھے، لوکل اور سپریم گورنمنٹوں کو عرضداشتیں بھیجیں اور اسی غرض سے ایک سوسائٹی موسوم بہ سائنٹفک سوسائٹی علیگرہ قائم کی گئی جس نے کئی علمی اور تاریخی کتابوں کا انگریزی سے ورنیکلر زبان میں ترجمہ کیا، مگر انجام کار میں اپنی رائے کی غلطی کتنا عتراف سے باز نہ رہ سکا، مجھ کو ایک مشہور لیبرل سٹیمین کے قول کو تسلیم کرنا پڑا جس نے کہا تھا کہ "جو کچھ ہمارے زمانہ کے ہندوستانیوں کو درکار ہے، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، وہ یہ ہے کہ وہ اُس علم و حکمت پر نظر ڈالیں جو ان کے زمانہ کی اور اُس قومی قوم کی جان ہے اور جو اُس کے نزدیک تمام علوم اور تمام طاقت کا مخزن ہے۔" میں لارڈ ولیم بنٹنک کی اس پالیسی کی صحت اور سچائی کو سمجھ گیا کہ ہندوستان کی قوموں میں یورپ کے علم و حکمت کو ترقی دینا گورنمنٹ کا مقصد علی ہونا چاہیے۔

”خیال کیا جاتا ہے کہ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی تا وقتیکہ وہ علم خود اُس ملک کی زبان میں نہ آگیا ہو، مگر اس دلیل میں ایک بڑے جزو کو جسے اُس کی جان کہنا چاہیے چھوڑ دیا گیا ہے، وہ حقیقت نہایت موزونیت کے ساتھ یوں کہا جاسکتا ہے کہ کسی ملک نے کسی علم میں ترقی نہیں کی تا وقتیکہ وہ علم اس زبان میں نہ آگیا ہو جو اُس ملک پر حکمران ہے، ہندوستان میں جو زبان حکمران ہے وہ ورنیکلر نہیں ہے بلکہ انگریزی زبان ہے، ایسے اس ملک میں ورنیکلر کے ذریعہ سے کسی علم کو ترقی نہیں

ہو سکتی۔ تمار پنج میں کوئی نظیر اس بات کی نہیں پائی جاتی کہ کسی ایسی زبان کی وساطت سے جو حکمران قوم کی زبان نہ ہو کسی قوم میں کسی علم نے ترقی پائی ہے۔

پھر اس سوال پر کہ کونسی تدبیر سے تعلیم کی آزادی اور اس کا اختلاف نوعی محفوظ رکھا جاسکتا ہے، اس طرح جواب دیا کہ "تعلیم کی آزادی اور اس کے اختلاف نوعی کا محفوظ رکھنا اس طریقہ پر منحصر ہے جو کسی ملک کی یونیورسٹی نے مختلف علوم میں ڈگریاں عطا کرنے کے لیے قرار دیا ہو پس ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس ملک کی یونیورسٹیوں نے اس باب میں کیا کیا ہے۔ ہیں یہاں صرف کلکتہ یونیورسٹی کی نسبت جو اس ملک کی سب سے پوری یونیورسٹی ہے گفتگو کروں گا۔ یہ یونیورسٹی انجینئرنگ میڈیسن اور آرٹس میں ڈگریاں عطا کرتی ہے اور ہر شخص کو اس بات کی بالکل آزادی ہے کہ اُن میں سے جس مضمون کو چاہے اختیار کرے۔ وہ بلاشبہ تعلیم کی آزادی اور اختلاف نوعی کو لوگوں کے حق میں جہاں تک کہ اس کو علم کی ان چار مختلف شاخوں سے تعلق ہے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن آرٹس کا سبجیکٹ ایک وسیع سبجیکٹ ہے اور آزادی و اختلاف نوعی کو جواب ہم اس میں محفوظ نہیں رکھا گیا، یا نہایت محدود کر دیا گیا ہے اُس کا محفوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ جو کورس آرٹس کے امتحان کے واسطے ہماری یونیورسٹی نے اختیار کیا ہے وہ لندن کی یونیورسٹی کی ایک نامکمل تقلید پر قرار دیا گیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس کے گریجویٹ کسی سبجیکٹ میں ایک کامل علم حاصل نہیں کرتے ہیں۔ پس اس طریقہ مروجہ کے برخلاف ہوں۔ مگر چونکہ یہ سبجیکٹ کمیشن کے احاطہ تحقیقات سے خارج ہے اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ مجھ کو اُس کی نسبت کچھ زیادہ بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔ میں صرف ہیرا کیلنسی وائسرائے کی اسپیچ میں سے جو کلکتہ یونیورسٹی کے پچھلے سالانہ جلسہ میں حضور ممدوح نے ارشاد فرمائی تھی انتخاب مندرجہ ذیل کمیشن کی اطلاع کے واسطے پیش کرتا ہوں "جس بات کی سب سے اول

تعلیم میں ضرورت ہے وہ علم کی تکمیل ہے۔ فوراً عقلیہ کوچیزوں کے کامل طور پر سیکھنے سے بہ نسبت اس کے کہ بہت سی باتیں بالائی طور پر سیکھی جائیں زیادہ تر عمدہ طور پر تربیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ "ایک مضمون کو کامل طور پر سیکھنے سے بہ نسبت اس کے کہ سو علم ناما کامل طور پر سیکھے جائیں زیادہ تر اصلی عقلی تربیت حاصل ہوتی ہے۔"

پھر اس سوال پر کہ گورنمنٹ کو کس کس حد تک ہر قسم میں تعلیم کی امداد دینی مناسب ہے، اس طرح جواب دیا کہ "اس امر کی نسبت جو میری خاص رائے ہے وہ پبلک فیلنگ کے برخلاف ہے۔ میں نے اس معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کامل کرنے کے بعد اپنی رائے قائم کی ہے کہ جب تک خود لوگ اپنی تعلیم کا تمام اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس وقت تک مناسب طور پر ان کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ پس ملک کے لیے یہ زیادہ تر مفید ہو گا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔ مگر پبلک کی رائے اس رائے کی موید نہیں ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ گورنمنٹ کا اس تعلیم سے علیحدہ ہونا واجب ہو ایک نہایت لائق ہندوستانی نے جس کا میں دل سے ادب کرتا ہوں مجھ سے کہا کہ "یہ خیال کہ ہم کو آپ اپنی تعلیم کا بندوبست کرنا چاہیے بالکل ایک غلط خیال ہے، اور لفظ "اپنے آپ" کا کسی قومی معنوں میں ہندوستان کے باشندوں کی نسبت استعمال کرنا بیجا ہے۔ کوئی قوم بڑا کام نہیں کر سکتی جس میں اعلیٰ اور ادنیٰ تمام فرقوں کے لوگ شریک نہ ہوں۔ ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کا پویشیکل اور انتظامی اقتدار گورنمنٹ اور اس کے یور وپین عہدہ داروں کو حاصل ہے اور جو شخص ہندوستان میں تجارت سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں وہ بھی یور وپین ہیں اور اس وجہ سے وہ

فی الحقیقت ہندوستان کی آبادی میں سب سے زیادہ وقت رکھتے ہیں۔ مگر جب کبھی ان عہدہ داروں سے کسی کالج یا اسکول کیلئے جو اس ملک میں ہندوستانیوں کے فائدہ کے واسطے قائم کیا جانے نہ ہر نقد کی امداد کی درخواست کی گئی ہے تو وہ علی العموم اس سے اس طرح پر علیحدہ رہے ہیں کہ گویا ان کو اس سے مطلق بہ کھ سروکار نہیں تھا۔

اس کے بعد سرسید نے کہا کہ ”اس مقام پر میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو خود میرے ساتھ گزرا ہے یعنی جس زمانہ میں کہ محمدن اینگلو اوڈیشیل کالج علیگرہ میں قائم ہوا تو میں نے ایک نہایت معزز یورپین افسر سے اس کی امداد کی درخواست کی اس نے جواب دیا کہ ”ہم پر اس کی امداد کرنا کچھ فرض نہیں ہے۔ وہ تمہارا بچہ ہے، ہمیں اس کو دھکا دینا چاہیے۔ اگر ہمارا بچہ ہوتا تو ہم البتہ اس کو والدینی شفقت کے ساتھ چھاتی سے لگا لیتے، پس ایک اچھین کے لحاظ سے میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے واسطے اس بات کا کہنا کچھ آسان نہیں ہے کہ لوگوں کو اپنی تعلیم کا خرچ اپنے آپ برداشت کرنا چاہیے اگر ہم ہندوستان کی حالت موجودہ پر ذرا غور کریں تو اس بات کے کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اگر لوگ اس قسم کا کوئی ارادہ کریں گے تو اس میں ایسی بے انتہا مشکلات ہیں جن کے سبب سے اس میں سراسر ناکامی کے ہونے کا اندیشہ ہے۔“

اس کے بعد اسی سوال کے متعلق انھوں نے کہا کہ ”اکثر لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا ہے کہ گورنمنٹ اس ملک میں ہائی ایجوکیشن موقوف کرنا چاہتی ہے۔۔۔۔۔ پس اگر گورنمنٹ موجودہ کالجوں میں سے کسی کالج کو برداشت کرے گی تو گو وہ کیسی ہی واجب اور معقول دلیل پر کیوں نہ ہو، لوگوں کو یہی خیال ہو گا کہ اس سے گورنمنٹ کا مقصد ہائی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کا ہے۔“

پھر کہا کہ ”گو میرے نزدیک مشنری اسکولوں اور کالجوں میں بائبل پڑھنا کسی طرح پر مذہب اسلام کے برخلاف نہیں ہے، مگر مسلمانوں کی عام فہم انگ بائیتین میری اس رائے کے خلاف ہے اور اگر کسی مشنری اسکول کی موجودگی کے سبب کوئی گورنمنٹ اسکول توڑ دیا جائے گا تو غالباً اس کی وجہ سے لوگوں میں ناراضی پیدا ہوگی۔ پس گورنمنٹ کو اس باب میں کسی کارروائی کے کرنے سے پہلے پبلک فہم انگ کی اصل حالت دریافت کرنا مناسب ہے۔“

پھر کہا کہ ”جہاں مشنری کالج اور اسکول ہیں اگر وہاں رعایا کا کوئی فرقہ ان میں اپنی اولاد کو تسلیم دلوانا پسند نہ کرتا ہو تو لوگوں کو لازم ہے کہ آپ اپنے لیے علیحدہ اسکول یا کالج قائم کریں اور گورنمنٹ بھی اس کو بغیر لحاظ اس بات کے کہ وہاں مشنری اسکول یا کالج پہلے سے قائم ہیں اور اس صورت میں اور مدرسوں کی ضرورت نہیں، کسی قدر مدد و عطا فرمائے، اس کے علاوہ گورنمنٹ اس بات کی بھی خبر گیری کرے کہ حکام ضلع اس قسم کی لوکل کوششوں میں خلل انداز نہ ہوں اور اپنی حکومت اور رعب داب کو ان کے برخلاف عمل میں نہ لائیں، جیسا کہ بعض ضلعوں میں ہوا ہے۔“

پھر اس سوال پر گرانٹ ان ایڈ کا قاعدہ جو بالفعل مروج ہے وہ کافی ہے یا نہیں؟ اس طرح جواب دیا کہ ”ایک ہائی اسکول کا اسٹاف جب تک کہ اس میں ایک یورپین ہیڈ ماسٹر اور اس کے ماتحت ماسٹریو نیوٹری کے گریجویٹ اور سکنڈ لیگورج یعنی عربی، فارسی اور سنسکرت کے تین لائق ٹیچر نہ ہوں کافی خیال نہیں کیا جاسکتا۔ اور ایسا اسکول بغیر نو سو روپیہ ماہوار خرچ کے قائم نہیں ہو سکتا اب ہم دیکھتے ہیں کہ قواعد مدحیہ کے موافق اس قسم کے مدرسوں میں کس قدر گرانٹ ان ایڈ دیا جاتا ہے ان قواعد میں یہ شرط ہے کہ لڑکوں کی

اوسط حاضری پر جو انگریزی پڑھتے ہوں فی طالب علم ڈیڑھ روپیہ ماہوار سے۔
 نیا وہ گرانٹ ان ایڈ کا اوسط نہ پھیلے پس ایسے اسکول ہیں جس کا اوپر ذکر ہوا
 جب تک کہ اوسط حاضری انگریزی پڑھنے والوں کی کم سے کم تین سو نہ ہو گورنمنٹ
 سے اس قدر گرانٹ ان ایڈ کے ملنے کی بھی توقع نہیں ہو سکتی جو اس کے
 نصف خرچ کے برابر ہو۔ یہ شرط علماً اس کے مساوی ہے کہ کبھی کوئی شخص
 گورنمنٹ سے مناسب گرانٹ کے ملنے کی توقع پر ایک عمدہ ہائی اسکول قائم
 کرنے کا قصد کرتے..... میرے نزدیک گرانٹ ان ایڈ طالب علموں کی تعداد
 کے لحاظ سے نہیں بلکہ جو تعلیم دی جائے اس کی عمدگی کے لحاظ سے بخیر کرنا چاہیے
 محدود لڑکوں کو ایک عمدہ تعلیم دینا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ بہت سے لڑکوں
 کو ناقص تعلیم دی جائے۔

پھر سوال متعلقہ اسکالرشپ پر اس طرح جواب دیا کہ "میں اسکالرشپوں کے
 قاعدہ کا طر فہار ہوں اور اس بارے کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا کہ اسکالرشپ دے
 کر پڑھانا گویا تعلیم کیلئے رشتہ دینا ہے..... بالخصوص ہندوستان میں اور
 زیادہ تر مسلمانوں کے واسطے اسکالرشپوں کی نہایت ضرورت ہے۔ اسکالرشپوں
 سے اُن غریب طلبہ کو جو اپنی حالت کی وجہ سے اپنی تعلیم کسی خاص جماعت سے
 آگے جاری نہیں رکھ سکتے نہایت مدد پہنچتی ہے۔ اگلے زمانہ کے مشہور و معروف
 شخصوں میں جنہوں نے سائنس کو بڑی ترقی دی ہے، یا اپنی عمدہ تصنیفات
 سے لڑکچکر کو رونق دی ہے، مسلمانوں اور نیز اقواموں میں اکثر وہ لوگ تھے
 جو غریب اور نہایت مفلس شخصوں کی اولاد میں سے تھے اب بھی اس قسم کے
 لوگوں سے بڑی بڑی امیدیں کی جا سکتی ہیں..... اگر میری معلومات میں غلطی نہ ہو
 تو میں خیال کرتا ہوں کہ اب بھی انگلستان میں اُن غریب آدمیوں کے لیے جو

”سینر“ کہلاتے ہیں کوئی طریقہ جاری ہے۔ مگر اُن کے زیادہ خوش حال اسکول فیلو اُن کو کسی قدر حقیر سمجھتے ہیں۔ محمڈن کالج علیگڑھ میں بھی مینیجنگ کمیٹی نے اس قسم کے سینر طالب علموں کی امداد کا ایک طریقہ جاری کیا ہے۔ لیکن وہ اُس کو ایسے محض طور پر امداد کرتی ہے کہ اور طالب علموں کو اس قسم سینر کے موجود ہونے کی اطلاع نہیں ہوتی اور وہ اُس حقارت سے بچ جاتے ہیں جو اور طرح پر کج جاتی ہے۔“

پھر ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ”گورنمنٹ کی تعلیم اس اثر کے پیدا کرنے سے اس لیے قاصر تھی جس کے مضامین تعلیم بشیاء ہیں اور کسی ایک مضمون میں کافی زحمت نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی واقعی عمدہ مصنف یا خیالات کے ہادی پیدا نہیں ہوئے جن کا نام غالباً باقی رہتا۔ یا جن کا اثر قوم پر پڑتا ہو اور سوشل ترقی کے لیے یہ ایک بڑی مصیبت ہے۔ اس ملک کے عام لوگوں کی رائے کثرت مضامین تعلیم کے برخلاف ہے۔ اگر اُس کا مقصد عمیق علم حاصل کرنے کا نہ ہو۔ ہمارے ہاں ایک فارسی مثل مشہور ہے کہ ”نیم حکیم خطرہ جان دیم ملاً خطرہ ایمان“ اور میں نے سنا ہے کہ پوپ کا بھی کوئی شعر اسی کے مطابق ہے۔“

پھر اس سوال پر کہ گورنمنٹ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم میں کہاں تک کوشش کر سکتی ہے اور اُس کی کامیابی کی کیا توقع ہے؛ مفصل جواب دینے کے بعد کہا کہ ”گورنمنٹ عملاً کوئی تدبیر ایسی اختیار نہیں کر سکتی جس سے اشرف خاندانوں کے مسلمان اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے واسطے گورنمنٹ اسکولوں میں بھیجنے پر مائل ہوں اور نہ کوئی ایسا اسکول قائم کر سکتی ہے جو کہ ان لڑکیوں کے سر بیوں کی طمانیت کے لائق ہو۔ یہ مسلمانوں پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ اپنی لڑکیوں

کو ان اسکولوں میں نہیں بھیجتے اور یقیناً کوئی اثرات پور نہیں بھی، گو وہ کیسا ہی تعلیم
 نسوان کا شوقین ہو۔ مسلمانوں پر ایسا ازام نہیں لگا سکتا، بشرطیکہ وہ اس ملک
 کے مدرسوں کی حالت سے واقف جس حیثیت اور وقت کے مدارس
 نسوان ہندوستان میں ہیں اگر ایسے مدرسے انگلستان میں فرض کیے جائیں تو کیا
 اثرات خاندانوں کے انگریز اپنی لڑکیوں کو ان مدرسوں میں تعلیم کے لیے بھیجا پند
 کریں گے؟ ہرگز نہیں... عورتوں کی تعلیم کا معاملہ اس فلاسفر کے سوال سے
 نہایت مشابہ ہے جس نے پوچھا تھا کہ پہلے سرخی پیدا ہوئی یا انڈا؟ جن شخصوں
 کی یہ رائے ہے کہ مردوں کی تعلیم سے پہلے عورتوں کی تعلیم ہونی چاہیے وہ غلطی
 پر ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اس وقت تک نہ ہوگی
 جب تک کہ اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں گے۔ اگر ہندوستان
 کے مسلمانوں کی سوشل حالت پر غور کیا جائے اس وقت تک جو حالت مسلمان
 عورتوں کی ہے وہ میری رائے میں عالمی خوشی کے واسطے کافی ہے۔ جو کچھ بالفعل
 گورنمنٹ کو کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے بندوبست
 کے جانب کافی توجہ کرے۔ جب کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل سنبھالی تعلیم و تربیت
 یافتہ ہو جائے گی تو مسلمان عورتوں کی تعلیم پر اس کا ضرور یا ضرور ایک
 زبردست گورخفیہ اثر پڑے گا۔ تعلیم یافتہ باپ یا بھائی یا شوہر بالطبع اپنی رشتہ
 مند عورتوں کی تعلیم کے خواہشمند ہوں گے۔ ... اگر گورنمنٹ مسلمان شریف خاندانوں
 میں تعلیم نسوان کے جاری کرنے کی کوشش کرے گی تو حالت موجودہ میں محض
 نامکامی حاصل ہوگی اور میری رائے ناقص ہیں اس سے مضر نتیجے پیدا ہوں گے
 اور روپیہ اور محنت ضائع ہونے لگی۔

مسٹر پیرسن نے سوال کیا کہ: "آیا ہندوستان کے مزدوری پیشہ لوگ اس

بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو تعلیم سرکاری مدرسوں میں دی جاتی ہے وہ ان کے بچوں کے لیے مناسب ہے یا نہیں؛ سرسید نے اس کے جواب میں کہا کہ "ان کو اس قسم کے سوال پر غور کرنے کی فرصت نہیں۔"

پھر انھوں نے یہ سوال کیا کہ "تعلیم کی ترغیب کے لیے ایجوکیشنل درباروں کی نسبت آپ کی کیا رائے ہے؛ سرسید نے کہا کہ "یہ دربار بجز نمائش کے اور کچھ نہیں۔"

مسٹر وارڈ نے سوال کیا کہ کیا آپ کوئی ایسا یورپین اسٹیشن ہندوستان میں بتا سکتے ہیں جہاں اہل یورپ کسی مٹن اسکول یا اور پرائیویٹ اسکول کے مدارف کے واسطے جو ہندوستانیوں کے لیے ہو کنٹری بیوٹن یعنی چندہ نہ دیتے ہوں؛ سرسید نے اس کا یہ جواب دیا کہ "یہ سوال پیچیدہ ہے..... اس سے ضمنیہ تسلیم کر لینا نکلتا ہے کہ ہندوستان کے ہر ایک یورپین اسٹیشن میں انگریز ہندوستان کی تعلیم کے لیے کنٹری بیوٹن دیتے ہیں۔ میں اس ضمنیہ تسلیم کو جو سوال سے نکلتی ہے تسلیم نہیں کرتا۔ باقی سوال دو حبا گانہ امور سے متعلق ہے۔ اول مشنری اسکولوں سے۔ سوائس کی نسبت میرا یہ جواب ہے کہ میں کسی ایسے یورپین سے واقف نہیں ہوں جہاں کوئی مشنری اسکول کنٹری بیوٹن کے ذریعہ سے مقرر ہوا ہو اور انگریز اس کی مدد نہ کرتے ہوں۔ دوسرے یہ سوال پرائیویٹ اسکولوں سے متعلق ہے۔ اس حصہ سوال کی نسبت میرا یہ جواب ہے کہ میں کسی ایسے اسٹیشن سے واقف نہیں ہوں جہاں کوئی ہندوستانی اسکول قائم ہوا ہو اور اس کی امداد انگریز بذریعہ کنٹری بیوٹن کے کرتے ہوں، سوائس نے محمدن کالج علیگر ٹھ کے جس میں فی الحال صرف ایک کنٹری بیوٹن یورپین کی طرف سے مقرر ہے..... اس کے بعد لارڈ نارٹھ ہیرڈک، لارڈ لٹن اور دیگر جلیل القدر حکام اور کان سلطنت

کے عطیات کی شکر گزاری کے بعد کہا کہ ”مگر اسٹیشن کے یور وٹھین عہدہ داروں میں سے کسی نے ہمارے کالج کو کوئی ماحواری یا سالانہ کنٹری بیوشن اور سوائے ایک کے کسی نے اس کو کمیٹت چننا بھی نہیں دیا۔“

مسٹر وارڈ نے سوال کیا کہ ”محمدن کالج کے پرنسپل میں کیانی الواقع اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ صرف مسلمانوں پر چننا نہ کامدود رکھنا مناسب ہے؛ اس کا جواب سر سید نے اس طرح پر دیا کہ ”کیشی نے تجویز کی تھی کہ انگریزی قوم سے جو ہمارے حاکم ہیں اس کام میں شریک ہونے کی درخواست کی جائے کیونکہ کیشی کے نزدیک ایسے کالج کو قائم کرنا جو انگریزوں کی ہمدردی سے جدا ہو پوٹشل مصلحت کے برخلاف تھا۔ پس اس نے یہ تجویز کی تھی کہ مسلمان۔ انگریزوں سے بھی امداد کی درخواست کریں۔“

پھر مسٹر وارڈ نے پوچھا کہ ”کیانی الواقع سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے قائم کرنے میں انگریزوں نے روپیے اور ہمدردی کے لحاظ سے آپ کی بڑی مدد کی تھی؟ اس کا جواب سر سید نے یہ دیا کہ ”سوائے مسٹر براملی کے جنہوں نے مجھ کو ایک ہزار روپیے دیے تھے اور کسی سے مجھے کچھ مدد نہیں ملی مگر انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے اس سے پہلے تعلیم کی جانب توجہ نہیں کی تھی۔“

محمدن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن

۱۸۸۳ء میں سر سید نے ”محمدن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن“ قائم کی۔ اول اُن کو ۱۸۷۸ء میں جب کہ سائنٹفک سوسائٹی کو قائم ہونے چند سال گزرے تھے یہ خیال ہوا تھا کہ عام ہندوستانیوں کو خواہ ہندو ہوں اور خواہ مسلمان، تعلیم کی

غرض سے یورپ کے سفر پر آمادہ کرنے کے لیے ایک ایسوسی ایشن قائم کی جائے اور اس کے ممبر ۱۰ روپیہ ماہوار چنڈہ دیا کریں جو بطور ایک فنڈ کے یورپ کے سفر کے لیے جمع ہوتا ہے۔ مگر اس تدبیر میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ ہندو اس وقت یورپ کے سفر کو مذہب اور ذات کے قواعد کے برخلاف جانتے تھے اور مسلمان بھی اس قسم کے توہمات رکھتے تھے اس کے سوا یہ پ کا سفر اس زمانہ میں مشکل بھی معلوم ہوتا تھا۔ مگر ۱۸۸۳ء میں یورپ کی آمدورفت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا اور ہندوستانیوں کے وطن کے تعلیم کے لیے ولایت جانے لگے تھے۔ لیکن خاص کر مسلمانوں کے لیے حالت موجودہ میں سول سروس کا امتحان ولایت جا کر پاس کرنا جیسا کہ سر سید نے علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۱- اگست ۱۸۸۳ء میں مفصل بیان کیا ہے نا ممکن معلوم ہوتا تھا۔ انھوں نے خیال کیا کہ کسی قوم کی جب تک کہ وہ گورنمنٹ میں کچھ حصہ نہ رکھتی ہو، عزت نہیں ہو سکتی۔ دو تہہ مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ان کو اپنی اولاد کی تعلیم کا مطلق خیال نہیں اس وقت سول سروس کے قاعدہ کے موافق ۱۹ برس کی عمر میں ولایت جا کر سوال سروس کا امتحان پاس کرنا پڑتا تھا، حالانکہ اس کے وطن کے ۱۹ برس کی عمر تک بچے سمجھے جاتے تھے اور سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بقول سر سید کے اس وقت تک تعویذوں کی ہیکل بھی ان کے گلے سے نہیں اترتی ہاں متوسط درجہ کے لوگوں کو بلا شک اولاد کی تعلیم کا خیال تھا اور خیال ہے مگر ولایت کے مقرر کا پورا خرچ وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی لیے سر سید نے ایسوسی ایشن خاص مسلمانوں کے لیے اس غرض سے قائم کی کہ اگر کم سے کم پانچ سو تہہ مسلمان ممبر دو دو روپیہ ماہوار دینے والے پیدا ہو جائیں تو اس سے ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہو جائے گی جو بطور فنڈ کے جمع ہوتی رہے گی تاکہ جن

مسلمانوں کے لڑکے ولایت کا تمام خرچ اپنے پاس سے ادا نہیں کر سکتے ان کو اس فنڈ سے امداد کی جائے اور مدرسہ العلوم میں ایک خاص کلاس قائم کی جس کی تعلیم کا طریقہ ایسا مقرر کیا گیا تھا جس سے اس کلاس کے طالب علموں کو ولایت پہنچ کر سول سروس کے امتحان میں مدد ملے۔

اگرچہ اس کلاس کا نام سول سروس کلاس رکھا گیا مگر درحقیقت اس کے طالب علموں کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جاتا تھا کہ وہ انگلستان پہنچ کر مندرجہ ذیل کورسوں میں سے کوئی کورس اختیار کر لیں:

۱۔ سول سروس کا امتحان مقابلہ۔

۲۔ کسی مضمون میں ولایت کی کسی یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کرنی۔

۳۔ کسی پیشہ میں شل بیرسٹری، ڈاکٹری یا انجینیری کے ڈپلومہ حاصل کرنا۔

پھر اس ایسوسی ایشن کے کام کو زیادہ وسعت دینے کے لیے انھوں نے شمال ہندوستان کے ہر ایک ضلع میں سب کمیٹیاں قائم کرنے کا ارادہ کیا تاکہ ممبروں کی تعداد زیادہ ہو اور سب کمیٹیوں کے لیے قواعد مقرر کر کے شائع کیے۔ مگر اس تمام کوشش کا نتیجہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا کہ ایسوسی ایشن میں ۲۹۹ ممبر شامل ہوئے جو کچھ عرصہ تک دو روپیہ ماہوار دیتے رہے اور کچھ لوگوں نے بطور ڈونیشن کے بھی کسی قدر روپیہ دیا آخر سب کے ارادے سست ہو گئے اور جیسا کہ ماہواری یا سالانہ چندوں کا ہمیشہ انجام ہوتا ہے، رفتہ رفتہ چندہ دینا بند ہو گیا ایسوسی ایشن مذکورہ کی آمدنی سے چار ہزار ایک روپیہ جمع ہوا تھا جس کو ممبروں کی منظوری سے سرسید نے الہ آباد بینک میں جمع کر دیا تھا، تاکہ جن کام کے لیے وہ جمع کیا گیا تھا جب اس کا موقع آنے وہاں خرچ کیا جائے اور اس وقت تک اس کے منافع سے محمدن کالج علیگڑھ کے طلبہ کو امداد دی جائے۔

محمدن ایسوسی ایشن علیگر ٹھہ

اسی سٹشن میں سرسید نے بہ شریکت رئیسان ضلع علیگر ٹھہ محمدن ایسوسی ایشن قائم کی جس کے مقاصد نہایت عمدہ تھے اور اس کا چلنا بھی ایسا دشوار نہ تھا جیسا کہ سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن کا چلنا اور قائم رہنا دشوار تھا کیونکہ اس کے مقاصد رؤسائے ضلع کے مذاق کے موافق تھے، مگر چونکہ سرسید مدرسہ کے کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے اس کے پیروکار نہ تھے اس لیے وہ چند روز کے بعد بالکل مدھم پڑ گئی اور اب اس کا نام ہی نام باقی رہ گیا ہے۔

محمدن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کرنا

۱۸۸۶ء میں سرسید نے محمدن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی محمدن کالج کی حالت جب کسی قدر اطمینان کے قابل ہو گئی تو سرسید کو یہ خیال ہوا کہ اگر بالفرض یہ کالج ہر طرح مکمل ہو گیا تو بھی اس سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور ایک کالج چھ کر دہ مسلمانوں کی تعلیم کی کفالت نہیں کر سکتا۔ اس کے سوا مسلمانوں کی قوم جو ہندوستان کے دور دراز حصوں میں پھیلی ہوئی ہے وہ سب ایک دوسرے کی حالت سے محض بے خبر ہیں اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ مختلف صوبوں اور مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں اپنے اپنے خیالات قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ایک دوسرے پر ظاہر کریں، بہرحصہ ملک کے مسلمانوں کی ترقی یا تنزل کا حال تمام قوم کو معلوم ہو اور مسلمان جو باوجود ایک قوم ہونے کے ہنر لہ مختلف قوموں کے ہو رہے ہیں ان میں قومی یگانگت اور ہمدردی پیدا ہو۔ اسی بنا پر جیسا کہ سرسید

نے پہلے اجلاس میں بیان کیا تھا یہ کانفرنس قائم کی گئی اور اس کا پہلا جلسہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو بمقام علیگر محمد محمدن ایگرو اور ٹیل کالج میں منعقد ہوا۔

اس کانفرنس کے مقاصد اولاً حسب ذیل قرار دیئے گئے تھے :

- ۱۔ مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے میں کوشش کرنا۔
- ۲۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تا بمقدور عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔
- ۳۔ علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علما نے اسلام جا بجا بطور خود دیتے ہیں اس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا۔

۴۔ جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہے اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزل ہو گیا ہے اس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا۔ قرآن خوانی اور حفظ قرآن کے لیے جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان کے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا۔

مذکورہ بالا مقاصد کے سرانجام کرنے کے لیے دو طریقے تجویز کیے گئے تھے۔ ایک یہ کہ ہر سال کسی مناسب مقام پر جہاں کے ممتاز آدمی کانفرنس کے اجلاس کی خواہش کریں اور کانفرنس کا انتظام اپنے ذمہ لیں، کانفرنس کا اجلاس ہوا کرے اور اجلاس کی تاریخوں میں کانفرنس کے ممبر جو پنجویں مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے متعلق مناسب سمجھیں وہ اجلاس میں پیش کریں اور بعد غور اور مباحثہ کے اتفاق یا کثرت رائے سے ان کی منظوری یا نا منظوری عمل میں آئے، دوسرے جہاں تک ممکن ہو ہر شہر و

قصبہ میں کانفرنس کے مقاصد کے لیے کمیٹیاں قائم کیا میں اور جہاں جہاں اسلامی انجمنیں قائم ہیں اگر وہ منظور کریں تو انھیں کو کانفرنس کی کمیٹیاں تصور کیا جائے تاکہ یہ کمیٹیاں اپنے اپنے نواح یا ضلع یا شہر یا قصبہ کی نسبت و توافقتاً ہر قسم کے مدارس اور مکاتب و صنعت و حرفت و تجارت و زراعت وغیرہ کی ترقی و ترقی کے حالات جو مسلمانوں سے علائقہ رکھتے ہیں تحریر کر کے کانفرنس کے جلسوں میں بھیجے رہیں اور جو تجویزیں کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں منظور ہوں ان میں سے جو تجویز ان کے علاقہ میں قابل اجرا ہو اس کے جاری کرنے میں کوشش کریں۔

۸۶ء سے ۹۶ء تک اس کے سالانہ جلسے برابر مختلف شہروں میں ہوتے رہے مگر سال گذشتہ میں کچھ تو سرکاری روک ٹوک کے سبب جو طاعون کے انداد کے لیے ریل کے مسافروں کے ساتھ جا بجا کی جاتی تھیں اور زیادہ تر سرسید کی افسردہ دلی اور انقباض کی وجہ سے جس کی نوبت آخر کو مرض الموت تک پہنچ گئی اس کا اجلاس موقوف کیا گیا۔ منجمد گیارہ کے اول کے پانچ اجلاسوں میں پنجاب اور شمال مغربی اضلاع کے مختلف مقامات کی چھوٹی بڑی ۳۵ رپوٹیں اسلامی انجمنوں اور خاص خاص شخصوں نے لکھ کر کانفرنس میں بھیجیں یا خود آکر پیش کیں اس کے بعد ظاہر اچھر کوئی رپورٹ نہیں آئی اور تقریباً استی رزولوشن اتفاق یا کثرت رائے سے پاس ہوئے۔

ہر سال اجلاس کی تمام کارروائی ایک کتاب کی صورت میں چھپرہ ممبروں کو تقسیم ہوتی رہی جس میں کیفیت انتظام کانفرنس، فہرست ممبران و وزیٹران، تعداد و رچندہ رپورٹ سکریٹری متضمن حساب جمع و خرچ و رچندہ و کیفیت تعمیل و عدم تعمیل تجویزات سال گذشتہ، رزولوشن جو اجلاس میں پیش ہو کر پاس ہوئے اور ان کے متعلق ممبروں کی اسپیکر اور مباحثے، رپورٹیں جو مختلف اضلاع سے موصول

ہوئیں، لکچرارہ نظمیں جو کانفرنس میں پڑھی گئیں وغیرہ وغیرہ درج ہوتی تھیں۔
 اس اجتماع کا نتیجہ براہ راست یہ ہونا چاہیے تھا کہ جو تجویزیں کانفرنس کے
 اجلاس میں ہر سال منظور ہو کر شائع ہوئیں ان کے موافق ہر ضلع کی اسلامی انجمنیں اپنی
 اپنی بستیوں اور شہروں میں عمل درآمد کرتیں جو تعلیمیں کانفرنس کے سیکرٹری سے
 تعلق رکھتی تھیں ان کو سیکرٹری انجام دیتا اور عام مسلمان جہاں تک ان کے قبضہ
 اختیار میں تھا، کانفرنس کی تجویزوں کی تائید دلائے کانفرنس کی صلاح کے موافق اپنی
 اولاد کی ترقی تعلیم کا انتظام کرتے، کیونکہ کانفرنس اس کے سوا اور کچھ اختیار نہیں رکھتی
 کہ مسلمانوں کو ان کی واقعی حالت سے اور جو تدبیر ان کی بھلائی کے لیے مناسب
 سمجھے اس سے آگاہ کر دے۔

لیکن سوا اس کے کہ سرسید نے جو ابتداء سے اخیر دم تک سیکرٹری رہے اپنے
 فرائض کا پورا پورا حق ادا کیا اور انھیں کی توجہ اور کوشش سے کانفرنس کے اجلاس
 بلبرگیا رہے برس تک ترقی روزانہوں کے ساتھ ہوتے رہے، اس کی تجویزوں پر
 مثبت ہی کم عمل درآمد ہوا۔ سرسید ہر سال جہاں کانفرنس ہوتی تھی وہاں اجلاس کی
 تاریخوں سے کئی کئی دن پہلے خود پہنچتے تھے، وہاں کی نوکل کمیٹی کو ہر قسم کے انتظام
 میں مدد دیتے تھے۔ انھیں کی صلاح اور مشورے سے اجلاس کے لیے اکثر ہاں
 کی تیاری اور ممبروں کی آسائش کا بندوبست ہوتا تھا، وہ خود کانفرنس کی کارروائی
 کے قواعد اور پروگرام بتاتے تھے، ٹکٹ چھپواتے تھے، رزلوشن انتخاب
 کرتے تھے، سال گذشتہ کا حساب اور تعلیمات کی رپورٹ کانفرنس میں پیش
 کرنے کے لیے تیار کرتے تھے، کانفرنس کے اجلاس کے بعد تمام کارروائی کو
 ایک کتاب کی صورت میں مرتب کرتے تھے، اس کو چھپوا کر تمام ممبروں کے
 پاس بھیجتے تھے منجانب کمیٹی جو ہر سال کانفرنس کا مقام تجویز کرنے کے لیے

مقرر ہوتی تھی، اس سے خط و کتابت کرتے تھے، سال بھر میں کانفرنس کے متعلق وقتاً فوقتاً اخبار میں آرٹیکل چھاپتے تھے اور جب کانفرنس کا اجلاس علیگڑھ میں ہوتا (اور زیادہ تر علیگڑھ ہی میں ہوتا تھا، تو لوکل کمیٹی کے تمام فرانض خود انجرام دیتے تھے۔ انھوں نے صرف اس غرض سے کہ ہر ایک ضلع کی رپورٹ باقاعدہ مرتب ہو کر آیا کرے، دوسرے سال کے اجلاس میں ضلع علیگڑھ کی مفصل رپورٹ بطور نمونہ کے لکھنؤ میں خود لکھ کر پیش کی تھی۔ جن رزولوشنوں کی تعمیل بحیثیت سیکرٹری ہونے کے اُن کی ذات سے متعلق ہوتی رہی انھوں نے برابر اس کی تعمیل کی، کبھی کسی لوکل گورنمنٹ سے کبھی سررشتہ تعلیم سے اور کبھی یونیورسٹی کے رجسٹرار سے اُن کو خط و کتابت کرنی پڑتی تھی اور تمام خط و کتابت کا خلاصہ اور اس کا نتیجہ کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں پیش کرنا ہوتا تھا۔ باوجود ان تمام باتوں کے وہ خود بھی اور ممبروں کی طرح اکثر رزولوشن پیش کرتے اور ان پر لمبی لمبی اسپچیں دیتے تھے۔ اس کے سوا اور بھی بہت سے کام کانفرنس کے متعلق اُن کو انجام دینے پڑتے تھے جیسا کہ کانفرنس کے گزشتہ جلسوں کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ البتہ جہاں جہاں کانفرنس کے اجلاس ہوئے وہاں کی لوکل کمیٹیوں نے بھی چندہ کی فراہمی اور ممبروں کی ملاقات اور اُن کی آسائش و خورد و نوش کا انتظام نہایت فیاضی اور کوشش و جانفشانی سے کیا مگر جہاں کانفرنس کا جلسہ ختم ہوا پھر سال بھر تک کسی کو اس کا خیال تک نہیں آتا تھا۔

کانفرنس میں میٹ سے رزولوشن ایسے پاس ہوئے ہیں کہ اگر اُن کے موافق عمل درآمد ہوتا تو قوم کو بیت فائدہ پہنچنے کی امید تھی، شلاً قرآن مجید کی تعلیم کو ترقی دینا مسلمانوں کے اوقات کی طرف گورنمنٹ کو توجہ دلانا، تمام شہروں

اور قصبوں میں مقاصد کانفرنس کی تائید کے لیے کمیٹیاں قائم کرنا اور اسلامی
انجمنوں سے اُس کی تائید کی خواہش کرنا۔ تمام اسلامی
انجمنوں کا اس باب میں کوشش کرنا کہ مسلمان طلبہ کی وظیفوں سے امداد کی جائے
سرکاری مدرسوں میں مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کا موقع دینے کی گورنمنٹ سے درخواست
کرنا، تعلیم نسواں کے لیے مذہب اسلام اور طریقہ مشرفائے اہل اسلام کے موافق
مدرسے جاری کرنے، یورپ کے مورتھوں نے حمہ غلط الزام مسلمانوں پر لگاے
ہیں اُن کی غلطیاں دور کرنے کے لیے رسائل لکھے جانے، مسلمان بادشاہوں کے
قدیم قارئین جمع کر کے اُن کو محفوظ رکھنے کے لیے چھپوانا صاف اور سلیس اردو میں
خلاقی رسائل اور کتابیں لکھنا جو لڑکوں کی تعلیم میں کام آسکیں مسلمانوں کی قدیم
درستہ کتابوں کا جو کہ اب نامہ الوجود ہیں، پتہ لگانا اور تا بقدر اُن کو بہم پہنچانا
سب بات کی تحقیقات کرنا کہ جو علوم مسلمانوں نے یونان وغیرہ ملکوں سے
اصل کیے تھے اُن پر کس قدر اضافہ انھوں نے خود کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ مگر انہوں
سے کہ اُن میں سے کسی تجویز پر الامشا، اللہ کوئی مقتد بہ نوجہ قوم یا قومی انجمنوں کی طرف سے نہیں ہوئی
با اینہمہ کانفرنس سے جو نتائج بالذات یا بالغرض پیدا ہوئے وہ بھی اُسید
اور توقع سے زیادہ تھے۔ سب سے بڑا فائدہ جو اس مجلس کے انعقاد سے ہوا وہ
یہ تھا کہ ہر سال مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر جس کی تعداد بعض اجلاسوں میں
ہزار ہزار سے متجاوز ہو گئی، نہ کسی سیر اور تماشے کی غرض سے۔ نہ کسی حاکم کے
حکم سے اور نہ کسی ذاتی منفعت کے لیے بلکہ محض اس خیال سے کہ جو مجمع قوم کی
بھلائی کے ارادے سے ہوتا ہے اُس میں شریک ہوں، دور دراز سفر کی تکلیف اور
آمد و رفت کا خرچ برداشت کر کے کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے
تھے، ایک دوسرے سے ملتے تھے، ایک جگہ کھانا کھاتے تھے، ایک جگہ

رہتے تھے۔ قومی معاملات پر گفتگو کرتے تھے۔ جیتے تھے، بولتے تھے، انجانوں
 میں تعارف پیدا ہوتا تھا، دوستوں میں خلوص بڑھتا تھا، اوساس طرح ایک مردہ
 اور پرانگندہ قوم کے اجزائیں رونہ بردہ التیام پیدا ہوتا جاتا تھا۔ اس کے
 سوا جب سے کانفرنس قائم ہوئی مسلمانوں میں علی العموم تعلیم کا خیال زیادہ
 ہو گیا۔ خصوصاً جس شہر میں کانفرنس کا اجلاس ہوتا تھا وہاں کے باشندوں پر بالخصوص
 اس کا اور بھی زیادہ اثر پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ صرف کانفرنس کی بدولت گزشتہ
 برسوں میں غریب مسلمان طلبہ کی امداد بہت زیادہ ہوتی رہی۔ کئی سال تک خود
 کانفرنس کے چندہ میں سے بعد منہائی اخراجات کے جس قدر روپیہ بچا وہ
 وظائف میں صرف ہوتا رہا۔ نیز پنجاب کی اکثر اسکولس انجمنوں نے کانفرنس کی صلاح
 سے بہت سے طالب علموں کی امداد کی۔ کانفرنس ہی کی تحریک یا اتضا سے
 بہت سے عمدہ اور نہایت عمدہ رسالے، مضامین، اور لکچر ایسے تیار ہو گئے
 جن سے اردو لٹریچر میں ایک معقول اضافہ ہوا ہے جیسے مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم
 الجزیرہ، مضمون کتب خانہ اسکندریہ، حقوق الذمیین، مسلمانوں کی ترقی و تنزل
 کے اسباب، البوریحان بیرونی کی لائف، کتاب کلید و منہ کے تاریخی حالات
 اشاعت اسلام بلا استعانت حمام، شمس العلماء مولانا ندوی رحمہ اور نواب
 محسن الملوک اور آرمیل سید محمود کے لکچر اور اسپچیں وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور ضمنی
 فائدہ کانفرنس سے یہ ہوا کہ ہلکے سپیکنگ کی بیاقت میں کانفرنس کے مباحثوں
 سے بہت ترقی ہو گئی۔ جن لوگوں کی طبیعت میں اس کی خدا داد قابلیت موجود
 تھی، مگر اس کے ظاہر ہونے کا کوئی موقع نہ تھا ان کو کانفرنس میں گفتگو کرنے
 کا موقع ملتا تھا اور ان کا ایک مختصر جوہر ظاہر ہوتا تھا اور چونکہ ممبروں کی تمام
 اسپچیں کانفرنس کی روناو میں ہر سال چھپتی تھیں اس سے اردو لٹریچر میں

ایک مفید اور بکار آمد اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اسی کانفرنس کی تحریک سے الہ آباد یونیورسٹی نے ”کاکس ہسٹری“ کو جس میں مسلمانوں کی توہین کے مضامین مندرج تھے، ہائی اسکولوں کے کورس سے خارج کیا اور جب کہ یونیورسٹی میں نہایت زور شور سے اس بات کی تحریک ہوئی کہ فارسی زبان یونیورسٹی کی تعلیم سے خارج کی جائے تو اسی کانفرنس کے ذریعہ سے یونیورسٹی کو مسلمانوں کی ایک با وقعت جماعت کے خیالات سے مطلع ہونے کا موقع ملا اور اس کو معلوم ہو گیا کہ

فارسی زبان یونیورسٹی کے کورس سے خارج کی جائے گی تو اس سے مسلمانوں کی دل شکنی ہی نہ ہوگی بلکہ ہندوستان کی تہذیب، اس کے علم مجلس اور اس کی ملکی زبان یعنی اردو کو سخت صدمہ پہنچے گا نیز کانفرنس ہی کی تجویز کے موافق نواب وقار الملک کو گورنمنٹ میں اس بات کی تحریک کرنے کی جرأت ہوئی کہ سرکاری مدارس میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ گورنمنٹ افلاح شمال مغرب نے بعض شرائط پر اس کی اجازت دیدی جس کا ٹکڑیہ گیا رھو یہ اجلاس میں ادا کیا گیا۔

سب سے عمدہ اور نتیجہ خیز تجویز جو کانفرنس کے اجلاس واقع ۱۸۹۲ء میں بمقام دہلی مسٹر تھیوڈور بک پرینسل علی گڑھ محکمہ کالج نے پیش کی تھی وہ تعلیمی مردم شماری کی تجویز تھی، یعنی یہ کہ ہندوستان میں جو مسلمان اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم نہیں دلو اتے ان کا اندازہ کیا جائے کہ وہ کسی قدر میں؟ اور کیوں وہ اپنی اولاد کو تسلیم نہیں دلو اتے؟ آیا مذہبی خیالات سے، یا اس وجہ سے کہ تعلیم کے اخراجات

کا مقدور نہیں رکھتے، یا محض اپنی بے پروائی اور سہل انگاری کے سبب؟ اور جن کی نسبت نمبریں وجہ معلوم ہو ان کو اولاد کی تسلیم پر متوجہ کیا جائے، ان سے اس عرض کے لیے خط و کتابت کی جائے اور ان کے سمجھانے کے لیے لائق آدمی بھیجے جائیں۔ چنانچہ اس تجویز میں مسٹر بک کی توجہ سے بہت

کامیابی ہوئی ہے اور اگر اسی طرح کوشش برابر جاری رہے تو اُس سے عمدہ نتیجے پیدا ہونے کی امید ہے۔

اسی طرح کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں جو کانفرنس کے نتائج میں شمار ہو سکتے ہیں مگر ایسے مجموعوں کے مفید یا غیر مفید ہونے کا اندازہ ان باتوں سے نہیں ہوتا بلکہ صرف اس بات سے ہوتا ہے کہ قوم اُس کو برابر ترقی رہنا فنروں کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے یا نہیں! اگر قوم میں اُس کے تھامنے اور ترقی دینے کا حوصلہ پایا جاتا ہے تو اُس کی نسبت نہایت وثوق کے ساتھ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی قوم میں جان ڈالنے والی اور اُن کو قومیت کے درجہ تک پہنچانے والی ہوگی۔ لیکن اگر اُس کا مدار کسی خاص شخص کی ذات پر ہو تو اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ کیونکہ اس قسم کے سالانہ جلسوں کے نتائج اُن ملکوں میں بھی جو صدیوں سے اُن کے عادی چلے آتے ہیں اور اُن سے بے شمار فائدے اٹھا چکے ہیں، مدتِ دیر کے بعد ظہور میں آتے ہیں پس ہندوستان جیسے ملک میں جہاں محض یورپ کی تقلید سے ایسی مجلسیں انعقاد پاتی ہیں جہاں نہ قومی بندش ہے نہ عملی طاقت اور جہاں قومی مجلسیں پہلے پر کسی قسم کا رعب و داب نہیں رکھتیں یہ امید رکھنی فضول ہے کہ کوئی کانفرنس یا کانگریس قوم کو چند سال میں کوئی معتد بہ فائدہ پہنچا سکے جو لوگ کانفرنس پر بہ اعتدال من کرتے ہیں کہ اُس نے آج تک کوئی کار نمایاں نہیں کیا وہ گویا اس کو کمہار کا آوا سمجھتے ہیں جس میں بڑن بہت جلد پک کر تیار ہو جاتے ہیں لیکن حقیقت وہ کمہار کا آوا نہیں بلکہ چینی کا خمیر ہے جس کے تیار ہونے کا سالہانہ دلائل تک انتظار کرنا چاہیے۔

اگرچہ سال گذشتہ میں جو سرسید کی افسردہ دلی کے سبب کانفرنس

کا اجلاس منعقد ہو سکا اس سے بہت بڑی مایوسی ہو گئی تھی اور لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ سر سید بعد کانفرنس کا قائم رہنا مشکل ہے لیکن سر سید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی جوش مسلمانوں میں اٹھا ہے اس سے کانفرنس میں پھر جان پڑتی نظر آتی ہے۔ نواب محسن الملک نے سر سید کی زندگی ہی میں کئی سال سے کانفرنس کی ترقی پر کوشش کرنی شروع کر دی تھی خصوصاً ۱۸۹۶ء میں جیسا کہ گیارہویں اجلاس کی رپورٹ میں مفصل مذکور ہے جو کوشش اور جانفشانی انھوں نے کانفرنس کی اصلاح اور ترقی میں کی وہ گذشتہ دس سال میں کبھی کسی سے بن نہیں آئی تھی اور اب بھی جس سرگرمی کے ساتھ کہ وہ محمدن کالج کی ترقی پر متوجہ ہوئے ہیں اسی طرح انھوں نے کانفرنس کی طرف توجہ کی ہے چنانچہ اس سال زندہ دلان پنجاب نے کانفرنس کو لاہور میں مدعو کیا ہے جس سے اس بات کی امید بندھتی ہے کہ مسلمان اس قومی میلے کو ہمیشہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

پبلک سروس کمیشن کی ممبری

۱۸۸۶ء میں سر سید کو لارڈ ڈفرن نے مول سروس کمیشن کی ممبری کے لیے انتخاب کیا۔ اس کمیشن میں سر سید کے سوا کوئی ہندوستانی ممبر ایسا نہ تھا جو انگریزی کی اعلیٰ درجہ کی مہارت نہ رکھتا ہو۔ صرف سر سید ہی ایک ایسے ممبر تھے جو انگریزی میں سواس کے کہ اپنا نام لکھ سکتے تھے یا بقدر ضرورت انگریزی سمجھ سکتے تھے، اور ٹوٹی پھوٹی میں معمولی بات چیت کر سکتے تھے، اور کچھ نہ جانتے تھے۔ باوجود اس کے جیسا کہ سنا گیا ہے۔ ممبری کمیشن کے فرائض انھوں نے نہایت عمدگی سے ادا کیے جس طرح وائسرائے کوئل کی ممبری میں انھوں نے ہر ایک قانون پر جو ان کی موجودگی میں پیش ہوا بڑی بڑی لیگل آپینین کیوں اور قانونی مہارت کا بہت بڑا ثبوت دیا اسی طرح مول سروس کمیشن میں تمام سوالات کے زیر

بحث تھے نہایت قابلیت کے ساتھ بحث کی۔

افسوس ہے کہ کمیشن مذکور کی رپورٹ میں ممبروں کے مباحثے اور انکی اسٹیجس جن سے ہر ایک سوال کے متعلق ہر ایک ممبر کی رائے معلوم ہو، بالکل درج نہیں کی گئیں اور اس لیے ہمارے پاس کوئی ذریعہ معلومات کا ایسا نہیں جس سے سرستید کی کار گزاری اور ان کی رایوں کا جو کمیشن میں انھوں نے ظاہر کیا، سراغ لگ سکے۔ صرف ایک خط سرسید کا جو راقم کے خط کے جواب میں انھوں نے اسی امر کے متعلق لکھا تھا موجود ہے، اُس میں سے چند سطریں جو اس مقام کے مناسب ہیں نقل کی جاتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

ادسول سروس کمیشن کا حال دریافت کرنے کے لیے جو آپ رپورٹ طلب کرتے ہیں اُس سے آپ کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اُس میں بجز اس کے کثرت رائے فلاں امر کی طرف ہوئی اور کچھ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اُن ممبروں کا جن کی رائے مخالف یا موافق تھی، نام بھی ظاہر نہیں کیا گیا، اگر آپ کو میری نسبت کچھ لکھنا ہے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پبلک سروس کمیشن میں اس بات پر سعی تھا کہ سینیٹیوٹری سول سروس جو جاری ہے اور جس سے ہندوستانیوں کا انتخاب یوروپین کے عہدوں پر ہوتا ہے وہ منسوخ نہ ہو، اور جو قواعد اُس کی نسبت گورنمنٹ سے جاری ہوئے ہیں اگر ضرورت ہو تو اُن میں کچھ اصلاح کی جائے۔ کثرت رائے اس کے برخلاف تھی اور وہ چاہتے تھے کہ قانون مذکور منسوخ ہو اور اُس کی جگہ دھرا قانون پارلیمنٹ سے جاری ہو اور اُس میں جدید قواعد مرتب کیے جائیں۔ اسی کثرت رائے کے مطابق یہاں سے رپورٹ گئی، مگر ولایت

میں یہ تجویز ہوئی کہ سٹیٹیوٹری سول سروس کے قانون کو منسوخ کرنا ضروری نہیں اور جدید قانون کے بھی جاری کرنے کی حاجت نہیں مگر ولایت سے اسی تجویز کے مطابق جو کہ کثرت رائے سے جدید قانون بنانے کے لیے مکھی گئی تھی، کچھ قواعد بن کر آئے جن کے بموجب اب عمل درآمد ہے اور جن کو میں پسند نہیں کرتا۔ زیادہ تفصیل اس کی بغیر آپ کی ملاقات کے بیان نہیں ہو سکتی۔

سرستید کا یہ خط ۲۲ نومبر ۱۹۵۷ء کا لکھا ہوا ہے۔ اگرچہ اس خط کے آنے کے بعد کئی دفعہ اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر اس خیال سے کہ جب کمیشن مذکور کی ممبری کا حال لکھنے کا وقت آئے گا اُس وقت اُس کی مفصل کیفیت دریافت کر لی جائے گی، اُن سے زیادہ تفصیل نہیں پوچھی گئی۔ کیا خبر تھی کہ جب پوچھنے کا وقت ہوگا تو اس وقت وہ دنیا میں نہ ہوں گے۔ لاچار اسی مختصر بیان پر اکتفا کیا گیا۔

انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت

سرستید کی لائف میں کانگریس کی مخالفت کرنا ایک ایسا واقعہ ہے جس کا اثر ہندوستان سے لے کر انگلستان تک ایک نہایت تعجب انگیز صورت میں اور مختلف قوموں پر مختلف طور سے ظاہر ہوا ہے۔ اس لیے ہم اس واقعہ کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

مئی ۱۹۸۸ء میں بابو سرندر ناتھ بینرجی نے ہندوستان کے اکثر حصوں میں اس غرض سے دورہ کیا تھا کہ ہندوستان کی تعلیم یافتہ جماعتوں کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جائے کہ سول سروس کے امیدواروں کی عمر محدود ۲۱

برس سے گھٹا کر ۱۹ برس کی قرار دی گئی ہے اُس کی گورنمنٹ سے درخواست
 کریں کہ ۲۱ کی عمر کا قاعدہ جو امتحان مذکور کے لیے پہلے مقرر تھا وہی اب پھر جاری
 کیا جائے اور تمام ہندوستانی مل کر ایک فنڈ بنام نیشنل فنڈ جمع کریں
 جب کبھی اُن کو گورنمنٹ ہند یا گورنمنٹ انگلستان میں کوئی درخواست یا شکایت
 پیش کرنے کی ضرورت ہو اُس فنڈ کی آمدنی میں سے خرچ کیا کریں۔

اس دورہ میں انھوں نے ایک مقام علیگزہد میں بھی کیا تھا اور جو جلسہ اس
 مقصد کے لیے علیگزہد میں ہوا تھا اُس میں سر تیدہد رانجن تھے نیز جو درخواست
 سول سروس کی عمر بڑھانے کے لیے ولایت بھیجی گئی تھی اُس کے بھیجنے میں
 بھی سر تیدہد شریک تھے۔

غالباً اسی سنہ میں بنگالیوں نے کلکتہ میں ایک انجن فائٹ کی جس کا نام
 اول بنگال نیشنل لیگ رکھا گیا تھا اور جس کا مقصد مختصر لفظوں میں یہ تھا کہ
 گورنمنٹ نے جن حقوق کے دینے کا ہندوستانیوں سے وعدہ کیا ہے اُن کا
 مطالبہ کیا جائے ۱۸۵۷ء کے شروع میں نیشنل لیگ کی طرف سے انگریزی میں
 ایک گنام پمفلٹ شائع ہوا جس کا نام ”دی سٹار این دی ایسٹ“ یعنی ستارہ
 مشرقی تھا۔ اس پمفلٹ کے شروع میں جو چند انگریزی اشعار تھے اُن کا یہ معنوں
 تھا ”اے آسمان! کیا اُمید اور انصاف سرگئے! کیا کوئی نیا دن کبھی نمودار نہ
 ہوگا! آہ! اے بچو تمہاری ماں اہندوستان! ہمیشہ اسی طرح عبث منتوں
 پر منتیں کیے جائے گی! ایک ستارہ (نیشنل لیگ) مشرق کے شفاں افق
 پر چمک رہا ہے اور (اے ہندوستان) تیرے بچے جادو کے زور سے
 ایک مدت سے سوتے پڑے خواب دیکھ رہے تھے تیری جگانے کی آواز
 اُن کے کان تک پہنچ گئی ہے۔“

پھر انھیں دنوں میں ایک رسالہ بطور سوال و جواب کے اور ایک اور رسالہ جس میں مولوی فرید الدین اور ارام بخش دو فرضی شخصوں کا مکالمہ چھپا تھا شائع ہوئے۔ ان تینوں رسالوں کی پیماس ہزار جلدیں ہندوستان کی بارہ زبانوں میں ترجمہ ہو کر ہندوستان کے تمام اطراف و جواہر میں مشتہر کی گئیں ازاں جلد اس کا ایک ترجمہ اردو میں بھی شائع ہوا تھا جس میں گورنمنٹ کی بے انصافی اور موجودہ طریقہ انتظام کی برائی ایسے طور پر ظاہر کی گئی تھی جس سے خاص کر جاہل اور نا عاقبت اندیش لوگوں کے دل پر بڑا اثر ہوتا تھا اور گورنمنٹ کی طرف سے غلط خیالات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ انھیں رسالوں کی نسبت لارڈ ڈڈلہ نے ایک ایچ میں کہا تھا کہ "کانگریس کے ممبر لاکھوں ناواقف اور ذرا اعتقاد شخصوں کے درمیان ان رسالوں کے تقسیم کرنے کے جوابدہ ہونے جو نہایت مشتبہ نیت کے ساتھ لکھے گئے تھے اور جن کا مقصد مرتج سرکاری افسروں کے برخلاف لوگوں کی عداوت کا برانگیختہ کرنا تھا" اسی طرح انھوں نے ولایت جانے سے پہلے اہل کلکتہ کے الوداعی ایڈریس کے جواب میں بنگالی اخبار نویسوں کی نسبت کہا تھا کہ "گورنمنٹ کے برخلاف رعایا کے بھڑکانے کے لیے کوشش مت کرو جیسا کہ تیس برس کا عرصہ ہوا اسی نظم کی غلط بیابیاں زبردست باعث اس بات کا ہوئیں کہ اس ملک میں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔"

۱۸۸۶ء کے شروع میں جب کہ سرستید سول سروس کمیشن کے ساتھ لاہور گئے تھے ان اشعار کے مضمون پر جو ستارہ شرقی کے شروع میں چھپے تھے بہت سے مسلمانوں کے مجمع میں خود راقم کے سامنے نہایت افسوس کرتے تھے اور بنگالیوں کے ساتھ ٹرکپ ہونے کو مسلمانوں کے حق میں مضرت بتاتے تھے۔ پھر جب مولوی فرید الدین اور ارام بخش کا مکالمہ مشتہر ہوا اور انھوں نے دیکھا

کہ اُس میں ایک فرضی نام مسلمان مولوی کا ہے اُن کو زیادہ خوف ہوا کہ مبادا مسلمان جو پہلے ہی سے بدنام ہیں اس مجمع میں شریک ہو جائیں۔

ہم یہ ہرگز نہیں کہتے کہ یہ رسالے فی الواقع بد نیتی سے اور ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کی غرض سے لکھے گئے تھے، مگر اس میں شک نہیں کہ سرسید کا خوف بالکل بجا تھا۔ انہوں نے مشن کے واقعات صرف آنکھ ہی سے نہیں دیکھے تھے بلکہ خود اُن کو جھگٹا تھا اور جو مصائب انگریزوں اور ہندوستان پر گذرے اُن میں وہ خود اور اُن کے اکثر عزیز اور رشتہ دار شریک تھے مگر وہ ایسی ہی جس آگ کا دھواں تک نہیں پہنچا تھا وہ خود سرسید کے گھر میں لگی ہوئی تھی۔ وہ خوب جانتے تھے اور اپنی کتاب اسباب بغاوت میں بدلائل ثابت کر چکے تھے کہ مشن کی بغاوت جس نے ہزاروں مسلمان خاندانوں کو تباہ کر دیا وہ محض غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا نہ کسی ملکی سازش یا پولیٹیکل نفرت کا۔ پس گو یہ رسالے یومیہ نیت سے نہ لکھے گئے ہوں مگر نہایت قرین تھا کہ جاہل اور نادان لوگ اُن کا مضمون سن کر گمراہ ہو جائیں۔ یا گورنمنٹ اُن کو بغاوت کی ایک تحریک سمجھے۔

سرسید تیس برس سے جیسا کہ اُن کی لائف علی الاعلان شہادت دیتا ہے۔ براہِ کوشش کر رہے تھے کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں ہوائست اور دوستی پیدا ہو اور دونوں قوموں کو ایک دوسرے پر زیادہ بھروسہ اور زیادہ اعتماد ہو۔ اس لیے اُن سے زیادہ کسی کو اس بات کا خیال نہیں ہو سکتا تھا کہ مسلمان کہیں پھر انگریزوں کی بدگمانی کا نشانہ نہ بن جائیں۔ وہ قدریں یہ تلاش اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے کہ کارتوس کی مخالفت جو بغاوت کی بنیاد تھی ہندوؤں سے شروع ہوئی اور مسلمانوں پر ہتھ پگٹی۔ اُن کو اب بھی یہی خوف تھا کہ جو چیر بگایوں کی لبرٹی سمجھی جاتی ہے، وہ مسلمانوں میں آکر میوٹنی نہ بن جائے۔ چنانچہ

گورنر مدراس نے صاف ایک اسپچ میں کہا تھا کہ عقاب چڑیوں کی چائیں چائیں کی کچھ پروا نہیں کرتا لیکن باز یا تجرہ اس کے آگے چوں بھی کرتا ہے تو فوراً اس کی گردن توڑ ڈالتا ہے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ مسلمان اور ہندوستان کی اکثر قومیں عموماً تعلیم کے لحاظ سے نہایت پست حالت میں ہیں اور آزادی کے مفہوم اور برٹش حکومت کے اصول سے محض بے خبر، ان میں غالب حصہ ان لوگوں کا ہے جن کے نزدیک تمام ملک کا متفق ہو کر گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنا اور اپجٹیشن پھیلا کر بغیر ایسا ہے جیسے سلطنت سے بغاوت اختیار کرنا پس ان کی اور خاص کر مسلمانوں کی خیر اسی میں ہے کہ وہ تعلیم یافتہ لوگوں کے اپجٹیشن سے بالکل علیحدہ رہیں اور ایسی بدایتوں سے جو ناواقفوں کی گمراہ کرنے والی ہوں اپنے کان بند کر لیں، ان کو یقین تھا کہ شہر کی بغاوت نے ہندوستانیوں کے اعتبار کو سو برس پیچھے ہٹا دیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ "اگر یہ واقعہ ظہور میں نہ آتا تو آج ہمارے سیکڑوں جوان والٹیر ہوتے، ایکٹ اسلمہ کبھی وجود میں نہ آتا اور ہم میں بہت سے لوگ فرج کے کپتان اور کرنیل و جرنیل نظر آتے، پس اس بات کا خوف کرنا کچھ بجا نہ تھا کہ مبادا جو صفائی اور اعتبار ہندوستانیوں نے تیس برس میں از سر نو حاصل کیا ہے یا کرتے جاتے ہیں وہ پھر اسی بے اعتباری کے ساتھ بدل جائے جو تیس برس پہلے گورنمنٹ کو ان کی طرف سے جو گئی تھی۔

باوجود ان تمام باتوں کے سرسید نے علی الاعلان کانگریس کی مخالفت ظاہر کرنے میں جلدی نہیں کی، وہ ابتدا سے ہندو مسلمانوں میں قومی اتحاد اور سوشل یگانگت پیدا کرنے کے خواہشمند تھے، انھوں نے ملکی معاملات میں ہندوؤں سے کبھی سخیارت کا خیال نہیں کیا، ملازمت کے زمانہ میں ان کا

برتاؤ ہندو مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ یکساں رہا۔ ایامِ غدر میں بجنورہ کے ہندو رئیسوں نے خود درخواست کر کے ضلع کا انتظام اُن کے سپرد کر لیا۔ سانٹھک سوسائٹی کے قائم کرنے سے اُن کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں اور انگریزوں میں میل جول اور اتحاد کو زیادہ ترقی ہو۔ اگرچہ ۱۸۶۷ء میں جب کہ شمال مغربی اضلاع کی اکثر ہندو بھانوں اور لکھنؤں نے اُردو زبان اور فارسی صرفوں کے برخلاف نہایت سخت کوشش کی تھی، سرسید کی طبیعت ہندوؤں کی طرف سے کشمکش گئی تھی، اور اُن کو یہ امید نہ رہی تھی کہ ہندو مسلمانوں کی ایک قوم کے بل جملہ کوئی کام کریں گے، اس کے سوا بنگالی اخباروں کی نمکتہ چنیاں اور اعتراضات جو کہ وہ ہمیشہ گورنمنٹ کی اُن جزوی رعایتوں پر کرتے رہتے ہیں جو کبھی کبھی مسلمانوں کے ساتھ اُن کی حالت کے لحاظ سے کی جاتی ہیں اور اُن کی وہ مخالفانہ اور دشمن تحریریں جو مسلمانوں کے برخلاف اُن میں ہمیشہ چھپتی رہی ہیں۔ اور بھی مایوس کرنے والی تھیں، مگر پھر بھی جہاں تک ممکن تھا وہ دونوں قوموں میں اتحاد قائم رکھنے کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے بارہ بار اپنی پبلک اسپیچوں میں ظاہر کیا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ سب اپنے تئیں ایک قوم سمجھیں اور کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے مغایرت پائی جانے لے تاکہ کہ گائے کی قربانی کی نسبت جیسا کہ انھوں نے ایک آرٹیکل میں ظاہر کیا تھا ہمیشہ اُن کی یہ رائے رہی ہے کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں میں دوستی قائم ہے تو یہ دوستی ہمارے لیے گائے کی قربانی سے بہت زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت کی بات ہے۔ محمدن کالج علیگڑھ میں انھوں نے کوئی قاعدہ ایسا نہیں رکھا جس سے مسلمانوں طالب علموں کی ہندوؤں پر ترجیح لازم آئے چنانچہ اب تک تقریباً دو سو ہندو طالب علم اس کالج سے مختلف

امتحانوں میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

پس اگرچہ وہ کانگریس کے طریق عمل کو ناپسند کرتے تھے مگر اس خیال سے کہ دونوں قوموں میں زیادہ اختلاف نہ پیدا ہو جائے، دو برس تک انھوں نے کانگریس کے برخلاف کوئی کارروائی نہیں کی بلکہ نہایت صبر و خاموشی کے ساتھ اس بات کے منتظر رہے کہ کانگریس میں کیسی تجویزیں پیش ہوتی ہیں۔ اور کس قسم کے حقوق وہ گورنمنٹ سے طلب کرتے ہیں؛ یہاں تک کہ کانگریس کی رپورٹیں شائع ہوئیں اور اس کے مقاصد ان کو معلوم ہوئے تو ان کو نچتہ یقین ہو گیا کہ اگر بالفرض کانگریس کی کارروائیوں پر گورنمنٹ کو کچھ اعتراض نہ ہو اور اس کے مطالبے بھی سراسر ادب اور تہذیب کے ساتھ ہوں تو بھی مسلمانوں کا اور ان تمام قوموں کا جو تعلیم کے لحاظ سے نہایت پست حالت میں ہیں۔ کانگریس میں شریک ہونا اور اس کی تائید کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ انھوں نے خیال کیا کہ کانگریس کے اصلی اور مقدم مقاصد ایسے ہیں کہ اگر وہ پورے ہو جائیں تو مسلمانوں کی پوشل حالت کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مثلاً مقابلہ کا امتحان جو متعہد عہدوں کے لیے ولایت میں ہوتا ہے اس کا ہندوستان میں ہونا یا تمام متعہد عہدوں کا مقابلہ کے امتحان کے ساتھ مشروط ہونا، یا ایچ ایس لیٹو کونسل میں رعایا کی طرف سے اور علیا کے انتخاب سے ممبروں کا مقرر ہونا وغیرہ وغیرہ۔ پھر اسی کے ساتھ ان کو معلوم ہوا کہ مدراس میں جو عنقریب کانگریس کا اجلاس ہونے والا ہے اس میں بعض تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان بھی شریک ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس لیے ان کو ضروری معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو ان نتائج سے آگاہ کر دیں جو ان کے نزدیک کانگریس کی شرکت سے مسلمانوں کے حق میں پیدا ہونے والے تھے۔

۲۸۔ دسمبر ۱۹۷۸ء کو جب کہ محمد بن ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں
 اور کانگریس کا تیسرا اجلاس مدراس میں سہوار ہاتھا، مسلمانوں کے عام جلسہ میں سرسید
 نے انڈین نیشنل کانگریس کے خلاف ایک نہایت مفصل اور سبز و سرخچر دیا جو ان
 کی اسپچوں کے مجموعہ میں چھپ گیا ہے اور اس لیے اس کے اعادہ کی یہاں
 ضرورت نہیں ہے۔ مگر جو بحث کہ اس میں کونسل کے الگشن اور امتحان مقابلہ پر کی
 گئی ہے اس کا تب لبا ب ہم اس مقام پر دیکھتے ہیں کونسل کے الگشن کے متعلق
 ان کی تقریر کا حاصل یہ ہے کہ "اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو
 کسی طرح مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہندوؤں
 کی تعداد ہندوستان میں بمقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ہے پس جو طریقہ انتخاب کا
 قرار دیا جائے گا اس سے اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا تو چار ہندو ہوں گے اور
 اگر بغرض ممال کوئی ایسا قاعدہ رکھا جائے جس کی رو سے ہندو اور مسلمان دونوں
 قوموں کے ممبر برابر رہیں تو موجودہ حالت میں ایک مسلمان بھی ایسا نکلے گا
 جو وائسرائے کی کونسل میں بمقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے قابل ہو" اس
 موقع پر انھوں نے صاف یہ بات کہی کہ میں نے کونسل میں چار برس کام کیا ہے۔
 مگر ہمیشہ یہ سمجھا ہے کہ مجھ سا ذلیل اور نادانق اور مجھ سے بدتر کونی ممبر نہیں ہو سکتا
 اس کے بعد جو تقریر انھوں نے کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "اگر بالفرض کوئی ایسا
 مسلمان نکل بھی آئے تو ہرگز یہ امید نہیں کہ وہ اپنے کاروبار چھوڑ کر سفر کی تکلیف
 گوارا کر کے تمام اخراجات جو ایک ممبر کونسل کے لیے زیبا ہیں اپنے پاس سے
 برداشت کر کے یا قوم سے چپہرہ کر کے کلکتہ اور شملہ میں حاضر ہے گا بمقابلہ کے
 امتحان کی نسبت ان کی تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ "اس امتحان کے لیے ہمارا
 ملک تیار نہیں ہے انگلستان میں بمقابلہ کا امتحان ہر شخص ڈیوٹ سے کر

ایک اونے دزدی کے بیٹے تک دے سکتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ ولایت سے مقابلہ کا امتحان دے کر میاں آتے ہیں ان میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ خاندان کے لوگ ہوتے ہیں مگر یہ لوگ جو انگلستان سے حاکم مقرر ہو کر آتے ہیں وہ ہماری نظر سے اتنی دور ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کسی لارڈ کے بیٹے ہیں۔ یا دزدی کے، اس لیے یہ امر کہ ہم پر ایک اونے حکومت کو رہا ہے ہماری آنکھ سے چھپا رہتا ہے۔ مگر ہندوستان کا حال اس کے برخلاف ہے، ہندوستان کی شریف قومیں اپنے ملک کے ایک اونے درجہ کے شخص کو جس کی جڑ بنیاد سے وہ واقف ہیں کبھی اپنی جان اور مال پر حاکم ہونا پسند نہ کریں گی۔ اس کے سوا مقابلہ کا امتحان اس ملک میں ہو سکتا ہے جہاں اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک سب ایک قوم کے آدمی ہوں یا مختلف قومیں بسبب تعلیم و تربیت کے مل جیں کہ ایک ہو گئی ہوں مگر ہندوستان میں جہاں مختلف قومیں آباد ہیں اور ایک قوم دوسری قوم سے بالکل الگ ہے کسی طرح مقابلہ کا امتحان قرین مصلحت نہیں پھر تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ہندوستانیوں کی حالت اس قدر مختلف اور متفاوت ہے کہ بہت سی قومیں جیسے مسلمان، راجپوت، سکھ اور جاٹ وغیرہ موجودہ حالت میں کبھی مقابلہ کے امتحان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ بلکہ ہندوستان کی کوئی قوم بنگالیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پس اگر ہندوستان میں تمام مشعبد اور غیر مشعبد عہدوں کے لیے مقابلہ کا امتحان مقرر کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کوئی شخص ملک کا ایسا نہ رہے گا کہ سوائے بنگالیوں کے یا کسی قدر تعلیم یافتہ ہندوؤں کے اور کسی کی صورت حکومت یا عدالت کی کرسی پر دکھائی دے۔

سرستید کا یہ لکچر اردو اور انگریزی میں بذریعہ اخبارات کے بہت جلد ہندوستان میں شائع ہو گیا، اور ہندوستان کے اکثر فامور اخباروں نے اس

سے نوٹس لیا اور اس پر عدد ریمارکس کیے۔

اس کے بعد ۱۴ مارچ ۱۹۵۷ء کو بمقام میرٹھ انھوں نے دوسرا لکچر اسی قدر طویل جیسا کہ لکھنؤ میں دیا تھا مسلمانوں کے عام جذبہ میں دیا۔ اس لکچر کا بڑا مقصد اس بات کا ثبوت کرنا تھا کہ کانگریس والوں نے جو اخبارات اور رسالوں کے ذریعہ سے یہ مشہور کیا ہے کہ مسلمان عموماً کانگریس میں شریک ہیں یہ بالکل غلط ہے اور معدوم ہے چند مسلمان جو اس میں شریک ہوئے ہیں انھوں نے غلطی کی ہے۔ اور ان کے شریک ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمان من حیث القوم کانگریس میں شریک ہیں۔ یہ لکچر بھی نہایت پُر زور اور موثر تھا۔ ان دونوں لکچروں میں بڑی بات یہ تھی کہ پُرلے خیالات کے مسلمان جو ہمیشہ سرسید کی ہر ایک رائے اور ہر ایک تجویز کی مخالفت کیا اس سے نفرت ظاہر کرتے تھے انھوں نے بالاتفاق ان کی رائے کو تسلیم کر لیا اور بااستثنا سے معدوم چند تمام تعلیم یافتہ مسلمانوں نے بھی اس پر پورا عمل کیا۔ نیز پُرلے خیالات کے اکثر ہندوؤں نے اور تقریباً کل تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور رئیسوں نے عام اس سے کہ بندہ ہوں یا مسلمان ان کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔

پٹیریا ٹک ایسوسی ایشن

اس کے بعد اگست ۱۹۵۷ء میں سرسید نے بمقام علیگڑھ "پٹیریا ٹک ایسوسی ایشن" اس غرض سے قائم کی کہ جو قومیں اور جو رئیس اور تعلقہ دار وغیرہ کانگریس میں شریک نہیں ہیں ان کی رائے اور خیالات اور خط کتابت بطور مفصل کے وقتاً فوقتاً انگریزی میں چھپوا کر اہل انگلستان اور ممبران پارلیمنٹ کی اطلاع کے لیے دلالت کو بھیجے جائے اور نیز اخبارات کے ذریعہ سے ہندوستان

اور انگلستان میں عام طور پر شائع کیجائے۔

اس ایسوسی ایشن کے قائم کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بنگال، بہار، مدراس، بمبئی، ممالک متوسط اضلاع شمال مغرب، اودھ اور پنجاب کی بے شمار اسلامی انجمنوں میں کانگریس کے برخلاف جیسے کیے گئے تمام تعلقہ داران اودھ، بہار، بنارس، ریاست حیدرآباد اور دیگر ریاستوں کی طرف سے، ایسوسی ایشن کے ساتھ اتفاق کیا گیا اور جس قدر کارروائیاں کانگریس کے برخلاف تمام ملک میں ہوئیں ان کی روئدادیں ایسوسی ایشن کے ذریعہ سے وقتاً بعد وقت چھپ کر ولایت کو روانہ ہوتی رہیں اور پارلیمنٹ کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ کانگریس میں ہندوستان کی بہت سی قومیں اور خاص کر مسلمان شریک نہیں ہیں۔

بنگالی اخباروں میں سرسید کی اس کارروائی سے سخت ناراضی ظاہر کی گئی اور ان کے برخلاف بڑے بڑے تلخ آرٹیکل لکھے گئے۔ سب سے بڑا اعتراض ان پر یہ کیا گیا کہ وہ ابتدا سے ریپریزنٹیشن اصول کے بڑے طرفدار رہے ہیں اور ان کی تمام اگلی تحریروں اور اسپچوں سے پایا جاتا ہے کہ وہ رعایا کی آزادی کے بہت بڑے حامی ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس پر جو ہندوستان میں ریپریزنٹیشن اصول کے موافق عمل درآمد چاہتی ہے، معترض ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وہ ریپریزنٹیشن گورنمنٹ کو پسند کرتے تھے اور اس باب میں ان کی اب بھی وہی رائے تھی جو ہمیشہ اپنی تحریروں میں ظاہر کرتے تھے۔ انھوں نے خود لکھنؤ کے لکچر میں اقرار کیا تھا کہ ”میں کنسروٹو نہیں ہوں بلکہ بہت برا لبرل ہوں“ انھوں نے کونسل میں جب کہ لارڈ رین کے سامنے سلف گورنمنٹ کا قانون پیش تھا، اپنی اسپچ میں صاف کہا تھا کہ ”میں اس بات کے خیال کرنے سے خوش ہوں کہ میں اس قدر عرصہ تک

زندہ رہا کہ میں نے اُس دن کا آغاز دیکھ لیا جب کہ ہندوستان اپنے حاکموں کے ہاتھ سے سیلف ہیلپ اور سیلف گورنمنٹ کے وہ اصول سیکھنے کو ہے جنہوں نے انگلستان میں برپرزنیٹو انسٹیٹوشن پیدا کیے ہیں اور اُس کو دنیا کی قوموں میں بڑا بنا دیا ہے۔“

لیکن اسی اسپیج میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ”انگلستان سے برپرزنیٹو انسٹیٹوشنوں کا اصول مستعار لینے میں ان سوشل اور پولیٹیکل معاملات کا یاد رکھنا ضروری ہے جن کے لحاظ سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان امتیاز پایا جاتا ہے۔ ہندوستان فی نفسہ ایک براعظم ہے اور اُس میں مختلف انواع اور مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں۔ مذہبی دستورات کی سختی نے اب تک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جدا رکھا ہے۔ ذات کا قاعدہ بہت شد و مد کے ساتھ جاری ہے۔ ممکن ہے کہ ایک ہی ضلع میں مختلف مذاہب اور مختلف قوموں کے باشندے ہوں اور ایک گروہ دولتمند اور تجارت پیشہ ہو تو دوسرا گروہ ذی علم اور ذی رعب ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک گروہ بلحاظ تعداد کے دوسرے گروہ سے بڑا ہو اور روشن ضمیری کے جس درجہ تک وہ گروہ پہنچ گیا ہو وہ درجہ باقی باشندوں کے درجہ سے بہت اعلیٰ ہو ایک قوم اس بات سے بخوبی واقف ہو کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں اُن کی طرف سے ممبروں کا شرکیہ ہونا نہایت ضروری ہے اور دوسری قوم کو اس قسم کے معاملات کی مطلق پروا نہ ہو۔ پس ان صورتوں میں اس بات سے انکار کرنا شاید ہی ممکن ہو کہ ہندوستان میں برپرزنیٹو انسٹیٹوشنوں کے جاری کرنے سے بری شکلیں اور سوشل اور پولیٹیکل خطرات پیدا ہوں گے۔ ایسے ملک میں جیسا کہ انگلستان ہے۔ جہاں قومی امتیاز

اب باقی نہیں رہا اور جہاں مذہبی معاملات میں تفرقہ اور اختلافات تحمل کی ترقی کے سبب کم ہو گئے ہیں، وہاں ایسے معاملہ میں اس قسم کی مشکلات پیش نہیں آئیں قوم اور مذہب کے متحد ہونے سے تمام انگریز ایک قوم ہو گئے ہیں اور تعلیم کی ترقی سے خفیف اختلافات جو بیشتر ملک کی یہودی سے متعلق ہیں بالکل ناچیز ہو گئے ہیں، عیسائیوں کو پارلیمنٹ میں اپنے مطالب کی حمایت کرنے کے واسطے یہودیوں کی نسبت ووٹ دینے میں کچھ غم نہیں ہوتا اور درحقیقت سوشل اور پولیٹیکل مقام کے واسطے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگلستان کی کل آبادی ایک ہی قوم ہے۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے۔ جہاں ذات کے اختلافات اب تک موجود ہیں، جہاں مختلف قومیں غلط ملط نہیں ہوئی ہیں، جہاں مذہبی اختلافات اب تک زور شور پر ہیں اور جہاں تعلیم نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک مساوی مناسبت کے ساتھ ترقی نہیں کی، مجھ کو یقین کامل ہے کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں مختلف مطالب کی حمایت کی غرض سے الگشن کے خالص اور سادہ اصول کے جاری کرنے سے بہ نسبت محض تمدنی خیالات کے زیادہ خرابیاں پیدا ہوں گی۔ جب تک کہ قوم اور مذہب کے اختلافات اور ذات کا امتیاز ہندوستان کی سوشل اور پولیٹیکل حالت میں ایک جزو اعظم رہے گا اور ان معاملات میں جو ملک کے انتظام اور یہودی سے بیشتر متعلق ہیں اس کے باشندوں پر اثر ڈالے گا، اس وقت تک الگشن کا خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں ہو سکتا۔ بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر بالکل غالب آویگی اور جاہل آدمی گورنمنٹ کو اس قسم کی تدابیر کے جاری کرنے کا جوابہ سمجھیں گے جن کے باعث سے قوم اور مذہب کے اختلافات بہ

نسبت سابق کے اور بھی سخت ہو جائیں گے۔“

یہ ایسی سرسید نے ۱۷ جنوری ۱۸۸۳ء کو یعنی اُس لکچر سے جو کانگریس کے خلاف لکھنؤ میں دیا پانچ برس پہلے لارڈ رین کے سامنے کی تھی۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ جس طرح ہمیشہ رپرزنٹٹیو گورنمنٹ کو پسند کرتے تھے اُسی طرح وہ ہندوستان کو موجودہ حالت میں اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ اُس میں رپرزنٹٹیو اصول کے موافق عمل درآمد کیا جاسکے، انگلستان میں ہوم رول بل پر جو سب سے بڑا اعتراض مخالف پارٹی کا تھا اور جس نے آخر اُس کو پاس نہ ہونے دیا وہ یہی تھا کہ آئر لینڈ میں رومن کیتھولکس کی تعداد بمقابلہ پروٹسٹنٹ فرقہ کے بہت زیادہ ہے۔ پس اگر یہ بل پاس ہو جائے گا تو پروٹسٹنٹوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔ جب آئر لینڈ جیسے ملک میں جہاں قومی اور مذہبی اختلافات یقیناً ہندوستان سے بہت کم ہیں، ایک فرقہ کی مبارٹی دوسرے فرقہ کے حق میں اس قدر مضر خیال کیجاتی ہیں تو ہندوستان میں جہاں ہر خلافت تمام دنیا کے مذہبی اور قومی تعصبات ترقی تعلیم کے ساتھ روز بروز بڑھتے جاتے ہیں رپرزنٹٹیو اصول سے کیا بھلائی کی امید ہو سکتی ہے؟

سرسید پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ کانگریس کے قائم ہونے سے پہلے جب کہ بابو سر نہرو ناتھ بنیرجی علیگڑھ میں آئے تھے اور انھوں نے نیشنل فنڈ جمع کرنے کی تحریک کی تھی اُس وقت سرسید نے کیوں اُن کے ساتھ اتفاق رائے کیا تھا؟ اور کیوں اُس جلسہ میں صدر انجمن بنے تھے جو نیشنل فنڈ جمع کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا؟ اور جب کہ وہ فنڈ اسی لیے جمع کیا جاتا تھا کہ تمام ہندوستان کی طرف سے پارلیمنٹ میں جو درخواستیں بھیجی جائیں یا جو استغاثے پیش کیے جائیں اُن کے اخراجات میں صرف کیا جائے تو نیشنل

کانگریس سے جس کے لیے وہ منبٹ جمع کیا جاتا تھا، کس لیے مخالفت کی گئی؟
 اس کا جواب بہت صاف ہے۔ جس جلسہ کا ذکر کیا جاتا ہے اس میں صرف
 ایک مقصد کی تصریح کی گئی تھی، یعنی یہ کہ ایک عرضداشت ولایت میں اس
 عرض سے بھیجی جائے کہ سول سروس کے امتحان کی عمر بھائے ۱۹ برس کے ۲۱
 برس کی قرار دی جائے۔ اس کے سوا جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے اور کسی خاص
 مقصد کی تصریح نہیں کی گئی۔ چنانچہ اس مقصد کے متعلق جس کے لیے وہ
 جلسہ منعقد ہوا تھا سرسید کی رائے میں کبھی فرق نہیں آیا۔ سول سروس کمیشن میں
 انھوں نے برابر اس کی تائید کی اور وہ مقصد اسی طرح حاصل بھی ہو گیا جس
 طرح کہ ہندوستانیوں کی خواہش تھی اور اگر وہ تجویزیں جو آخر کو کانگریس میں پیش
 ہوئیں اور جن سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے کا یقین دیا جاتا ہے اگر اس علی گڑھ
 والے جلسہ میں ان کی تصریح کی جاتی تو ہرگز قیاس میں نہیں آتا کہ سرسید ان
 تجویزوں سے اتفاق کرنے کیونکہ جو ایسے انھوں نے پانچ برس پہلے قتل
 سیلف گورنمنٹ پر کونسل میں کی تھی اس کا سا انچوشاس بات پر ہے کہ
 ہندوستانیوں کو ایسے حقوق دینے جن سے ہندوستان کی تمام معزز قومیں برابر
 مستعد نہ ہو سکیں کسی طرح مناسب نہیں۔

اس کے سوا جو طریقہ کانگریس نے گورنمنٹ پر دباؤ ڈالنے کا اختیار کیا
 سرسید اس طریقہ کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب
 "اسباب بغاوت" میں گورنمنٹ پر اعتراض کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں
 چھوڑا تھا مگر اس کی ایک کاپی بھی اس طرح جیسے کہ پچاس ہزار رسالے کانگریس
 نے تمام ملک میں تقسیم کیے ہندوستان میں شائع نہیں کی بلکہ جس قدر جلدیں
 چھپوائیں ان میں سے ایک آدھ جلد گورنمنٹ ہند کے ملاحظہ کے لیے اور

باقی کل جلدیں پارلیمنٹ میں بھیج دیں وہ اس قسم کے ایکمیشن کو جیسا کہ کانگریس نے ہندوستان میں شروع کیا تھا تمام ملک کے حق میں عموماً اور مسلمانوں کے حق میں خصوصاً نہایت مضر سمجھتے تھے۔ وہ ایک چٹھی میں جو بدر الدین طیب جی کے نام انھوں نے لکھی تھی ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ "اسریجا میں اول اسی قسم کا ایکمیشن شروع ہوا تھا اور آخر کو میاں ملک نوبت پہنچی کہ آخری لفظ جو ان کے منہ سے نکلا وہ یہ تھا کہ "نویگیسٹن ووا، وٹ رپرینٹیشن" پس جن لوگوں میں اس لفظ کے کہنے کی طاقت ہو وہ اس کانگریس کے ایکمیشن میں شریک ہوں ورنہ ہجڑوں کی طرح تائیاں بجاتی ہیں" پھر آگے چل کر اسی چٹھی میں لکھتے ہیں کہ "غدر کیا ہوا۔ ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان دل چلے تھے، وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔"

اگرچہ کانگریس سے علیحدہ رہنے میں مسلمانوں نے عموماً سرستید کے کہنے پر عمل کیا اور چند مستثنیٰ اشخاص کے سوا کوئی مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہوا لیکن بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان سرستید کی اس پاسی کو مدت تک نہایت تعجب سے دیکھتے رہے۔ چنانچہ ایک نہایت لائق تعلیم یافتہ مسلمان نے ہم سے کہا کہ "جب گورنمنٹ نے اول ہی اول ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کرنی چاہی تھی اس وقت ہندوؤں نے اس کو خوشی سے قبول کر لیا تھا مگر مسلمانوں نے نہایت سختی کے ساتھ اس سے انکار کیا تھا لیکن آخر کار مسلمان اپنے انکار سے پشیمان ہوئے اور مجبور ہو کر ان کو انگریزی تعلیم اختیار کرنی پڑی۔ اسی طرح اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کو کہیں نیشنل کانگریس کی علیحدگی سے بھی آخر کو پیلے کی طرح پشیمان ہونا نہ پڑے۔" مگر سال گذشتہ میں جمعہ

افسوسناک واقعات پو نامیں گھر سے اور جو عبرت انگیز نتیجے اُن پر مترتب ہوئے
اُن کو دیکھ کر غالباً سب کی آنکھیں کھل گئیں ہوں گی اور معلوم ہو گیا ہو گا کہ سرسید کی
رائے اس باب میں کس قدر صائب تھی اور کانگریس سے علیحدہ رہنا ایک ایسی
قوم کے لیے جیسے کہ مسلمان ہیں کس قدر ضروری تھا۔

اگرچہ ہنگالیوں کی طرف سے سرسید پر بے انتہا لے دے ہوئی، اُن کو
خوشامدی، زمانہ ساز، ٹائم سرور اور کیا اور کیا کہا گیا۔ اُن کی پھیلی تحریروں کا حال
کی تحریروں سے مقابلہ کر کے دکھایا گیا کہ وہ ایک دوسرے سے کس قدر
مختلف ہیں مگر سرسید نے جس بات کو اپنے نزدیک قوم کے حق میں بہتر سمجھ
لیا تھا اخیر دم تک اُسی پر قائم رہے اور کسی کے کہنے سننے پر مطلق التفات
نہیں کیا۔ یہاں تک کہ نکتہ چینیوں کے ترکش خالی ہو گئے اور سب کی زبانیں بند
ہو گئیں۔

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

کے سی۔ ایس۔ آئی کا تمغہ ملنا

۱۸۸۸ء میں سرسید کو اعزاز "نانٹ کانڈرٹنٹ اعلیٰ ستارہ ہند" سے
منازہ کیا گیا۔ ۱۴ مئی روزہ دو شنبہ کو اس تقریب سے علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ کے بڑے
ہال میں ضلع اور شہر علیگڑھ کے رئیس اور سرسید کے مسلمان بند و اور یورپین دوست
جو باہر سے اس رسم میں شریک ہونے کو آئے تھے اور تمام اسٹیشن کے انگریز
جمع ہوئے۔ ہال کی دیواریں علاوہ دیگر معمولی آرائشوں کے شہرتی وضع کی تلواروں
اور مغربی وضع کی بند و فوں سے سجائی گئیں۔ مسٹر کریڈک ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ

پولیس، مولوی محمد کریم مرحوم ڈپٹی کلکٹر اور راجہ جیکشن داس سی۔ ایس۔ آئی اپنے اپنے
 تمنے پہنے ہونے سرسید کو ہال کے اندر لائے، تمام حاضرین ان کے آنے پر
 کھڑے ہو گئے اور تعظیمی گارڈ نے جس کو ضلع کی پولیس نے مامور کیا تھا
 ہتھیاروں سے سلامی ادا کی۔ اس کے بعد سٹرائی۔ ایچ ریڈیچی اسٹنٹ
 مجسٹریٹ نے فرمان شاہی حب ذیل پڑھ کر سنائے:

(اول)

(دستخط) وکٹوریہ آرمی

وکٹوریہ یا مذللہ متحدہ گریٹ برٹن و آئرلینڈ۔ ملکہ حامی دین قیصر ہند فرماں روا نے
 طبقہ اعلائے ستارہ ہند

بنام نامی مولوی سید احمد خاں بہادر شریک طبقہ اعلائے موصوف ممبر کونسل نواب
 لفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی بہ سلامتی و مبارک باد آنکے

چونکہ یہ مد نظر ہو کہ آپ کو ایک ایسا نشان خسروانہ عطا کیا جائے جس سے وہ قدر
 منزلت آپ کی نمایاں ہو جو اس سلطنت اور آپ کی ذات اور ان خدمات کے
 نمایاں ہو جو آپ سے اس سلطنت کے لیے ظاہر ہوئیں، لہذا یہ مناسب اور
 زیبے کہ آپ کو اعزاز "ناٹ کمانڈر طبقہ اعلائے ستارہ ہند" سے ممتاز
 و سربسند کیا جائے۔ اس لیے بذریعہ اس تحریر کے آپ کو اعزاز ناٹ کمانڈر
 طبقہ اعلائے ستارہ ہند عطا ہو کر اختیار دیا جاتا ہے کہ آپ اس اعزاز سے سرفراز
 و مفتخر ہو کر حقوق جزو کل متعلقہ طبقہ اعلائے موصوف ہوں۔

عدالت عالیہ مقام اسپورن بذریعہ ہر طبقہ موصوف
 آج یکم جنوری ۱۹۹۹ء اور ۱۰ جولائی کو جاری ہوا
 (دستخط) کراس (وزیر ہند)

(دوم)

(دستخط) وکٹوریہ آر آئی۔

وکٹوریہ مذکورہ متحدہ گریٹ برٹن آئر لینڈ، ملکہ حامی دین، قیصر ہند فرماں روا نے
 طبقہ اعلائے ستارہ ہند

بنام نامی مولوی سید احمد خاں بہادر شریک طبقہ اعلائے موصوف ممبر کونسل قانونی نواب
 ٹیٹنٹ گورنر مہاراجہ مہاراجہ مغربی و شمالی بھارتی و مبارکباد آملہ

آپ کو اعزازہ طبقہ اعلائے ستارہ ہند سے ممتاز و نامور کیا گیا ہے از انجاکہ ہم کو حسب
 اختیارات قوانین طبقہ اعلائے موصوف اختیار حاصل ہے کہ آپ کی حاضری
 ولایت کی بغرض استفادہ اعزازہ طبقہ اعلائی کے مساوات کریں لہذا حسب اختیار
 حردانہ طبقہ موصوف ہم آپ کو پورے اختیارات پہنچنے و استعمال کرنے
 ستارہ موصوف کی بجانب چپ بالائے پوشاک بیرونی عطا کرتے ہیں۔ اور
 نیز نشان خاص و بندش متعلقہ ٹائٹل کمانڈر موصوف پہنچیں اور استعمال کریں۔
 اور حسب فحوالے اختیارات مذکور آپ کو اختیار دیا جاتا ہے کہ تمامی حقوق جزو
 کل متعلقہ طبقہ ٹائٹل کمانڈر موصوف مع استعمال ایک نشان خاص ٹائٹل بچلر
 سلطنت موصوف سے مستفیہ و بہرہ یاب ہوں اور یہ اسی طریقہ اور طریقہ
 سے متصور ہے جیسا کہ آپ اس ٹائٹل ہڈے ہم سے یا بجائے ہمارے
 نائب سلطنت اور گورنر جنرل ہند سے جو گورنر ہند ماسٹر طبقہ موصوف

ہیں اعزاز حاصل کرتے۔

عدالت عالیہ مقام آسٹریلیا بذریعہ ممبر طبقہ موصوف

آج ۱۱ فروری ۱۹۹۸ء عیسوی اور ۱۷ شہرہ جلوسی کو جاری ہوا

(دستخط، کراس (قدیر ہند)

اس کے بعد صاحب کلکٹر مسٹر کینیڈی اپنی کرسی پر سے اٹھے۔ سب لوگ
 ان کے ساتھ کھڑے ہو گئے اور نعلین گاڑنے پھیر سدا کی ادائیگی صاحب ممدوح
 نے حضور ملکہ معظنہ کو ان و کثور یا کی طرف سے تارہ ہند سرسید کے سینہ پر لگا
 دیا اور فقیہ مع بیخ کے جو اس کے ساتھ تھا، ان کے گلے میں ڈال دیا۔ سب لوگ
 پھر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور صاحب کلکٹر نے اردو میں ایک لمبی تقریر کی جس
 میں سرسید کی بہت تعریف کی تھی اور جس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرنے
 ہیں۔ انھوں نے کہا کہ "اہل فرنگ اور اہل ہند نے سید صاحب کی وسیع
 عقل اور روشن حب الوطنی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان میں نوجوانی سے
 دو وصف برابر پائے گئے ہیں ایک علم کی محبت دوسرے وطن کی محبت کہ
 یہ دونوں ایک جگہ بہت کم پائی جاتی ہیں۔" - لبرل نے ان کو کنسر وٹو خیال کیا
 کیوں کہ انھوں نے رسومات مغربی کی بالکل نقل نہیں کی اور کنسر وٹو کی سمجھ میں
 نہیں آیا کہ وہ کس طرح اپنے ملک کے باہر کوئی عمدہ چیز پاسکیں گے انھوں
 نے اہل فرنگ اور اہل ہند کے درمیان معقول واقفیت پیدا کرنے کے لیے
 وہ مدد دی جو بہت کم لوگوں نے دی ہے۔" - سید صاحب وسیع ہمدردی
 دانشمندانہ صلاح، تجربہ کاری، سرگرمی، مستعدی، مستقل مزاجی اور حب الوطنی
 کی مثال ہیں اور نیز وہ شخص ہیں جنہوں نے اپنے واسطے کبھی کبھار تلاش نہیں کیا
 بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی اور اس لیے ان کے ملک کے لوگ اور

مکہ معظمہ اُن کی عزت کرتی ہیں اور ہم لوگ محبت اور تعلیم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔
 اس کے بعد سرسید نے اس مضمون کے معمولی اقرار نامہ پر کہ وہ طبقہ مذکور
 کے قوانین کی اطاعت کریں گے دستخط کیے اور جلسہ برخواست ہو گیا اور مسز
 کینیڈی نے اسی تقریب میں چند انگریزوں اور مسلمانوں کی اپنے ہاں حاضری
 پر دعوت کی۔

اس واقعہ کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ روسائے
 ضلع علیگڑھ کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ سرسید کو تمغہ مذکور ملنے والا ہے تو انہوں
 نے سرسید کو اور یورپین افسروں کو اسی خوشی میں ایک بہت بڑا ڈنر دینا
 چاہا اور کچھ لوگ ریشیوں کی طرف سے مع ایک خط کے سرسید کے پاس
 آئے کہ آپ اس ڈنر میں آنا منظور کریں سرسید نے اس کے جواب میں
 بعد شکریہ روسائے ضلع کے یہ لکھ بھیجا کہ ”چونکہ قوم کی حالت ابتر ہے
 اور اُس کو ہم برساتی تعلیم کی بہت حاجت ہے اس لیے میں ایسے فضول خرچہ
 کا سخت مخالف ہوں۔ پس اس ڈنر اور سب سے آپ مجھے معاف رکھیں“
 اور اخبار میں ایک آرٹیکل لکھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ ”کسی خوشی یا تقریب
 میں ڈنر دینے محض فضول ہیں، سب سے بڑی ضرورت اس وقت مسلمانوں
 کی تعلیم میں خرچ کرنے کی ہے۔ ہمارے لیے جو ڈنر تجویز ہوا تھا اُس کے
 لیے بارہ سو روپیہ کا تخمینہ ہوا تھا اگر وہ روپیہ تعلیم مسلمانان کے اخراجات
 میں صرف ہوتا تو کس قدر مفید ہوتا۔“

سرسید کے واسطے اس اعزاز کے ملنے کی بہت دن سے تجویز ہو رہی
 تھی مگر چونکہ اس تمغے کے پانے والوں کی تعداد محدود ہوتی ہے یعنی کبھی
 ۷۲ سے زیادہ نہیں ہوتے پاتی اس لیے جب تک نائٹ کمانڈر کا عہدہ

خالی نہیں ہوتا دوسرے شخص کو تمنہ نہیں مل سکتا۔ چنانچہ لارڈ ڈلہن نے دربارہ
قیصری کے بعد اس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ بسبب خالی نہ ہونے کسی نائٹ
کمانڈر کے عہدہ کے اس وقت سرسید کو یہ اعزاز نہ مل سکا۔

ڈاکٹر آؤف لاز کی ڈگری

۱۸۸۹ء میں سرسید کو اڈنبرا یونیورسٹی سے بحیثیت ایک اعلیٰ مصنف اور
حامی علوم ہونے کے ایک بڑا علمی امتیاز دیا گیا۔ انگلستان میں دستور ہے کہ
جو لوگ علمی حیثیت سے ملک میں امتیاز حاصل کرتے ہیں یا علم کی روشنی
پھیلانے میں کوشش کرتے ہیں ان کو اہل علم کے عام مجمع میں کسی یونیورسٹی
کی طرف سے ایک خاص اعزاز دیا جاتا ہے جس کو ”ڈگری آؤف ڈاکٹر
آؤف لاز“ کہتے ہیں سرسید کی شہرت، خطبات احمدیہ اور دیگر تصنیفات و
تحریرات کے سبب سے انگلستان میں بحیثیت ایک اعلیٰ درجہ کے مصنف
کے ہندوستان سے کچھ کم نہ تھیں۔ اس کے سوا مدرسہ العلوم کے قائم کرنے
اور ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کے رواج دینے سے وہ علوم جدیدہ کے
بہت بڑے جامی سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے بغیر اس کے کہ سرسید کو اطلاع
ہو ۱۸۸۹ء میں اڈنبرا کی مشہور یونیورسٹی سے ان کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری ملنی
تجویز ہوئی۔

۱۸ اپریل کو ایک شہر اڈنبرا کے سب سے بڑے ہال میں جو سائنڈ ہال کے
نام سے مشہور ہے گریجویٹیشن کی رسم ادا کی گئی۔ یہ جلسہ جیسا کہ علیگڑھ گورنمنٹ
مطبوعہ ۲۸ مئی ۱۸۸۹ء میں بحوالہ اخبارات و چٹھیاں ولایت مفصل مذکور
ہے۔ بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا تھا۔ تمام گیلیاں اور سال کا ایک

عام لوگوں سے جو مدعو کیے گئے تھے مجھرا ہوا تھا اور دوسرا حصہ یونیورسٹی کے
گرجویٹس سے مزین تھا۔ اس جلسہ میں دو تہائی سیڈیاں تھیں جن میں لیڈی
میور صاحبہ جنھوں نے مدرسنہ العلوم علیگرھ کی "میور پارک" میں سب سے
پہلا پودا اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔ موجود تھیں اوران کے معزز شوہر ولیم میور
بھی جن کو ہندوستان کے لوگ عموماً جانتے ہیں بحیثیت پرنسپل یونیورسٹی لارڈ
چانسلر کے ہمراہ جو جلسہ کے پریسڈنٹ تھے، تشریف لائے تھے جس وقت
لارڈ چانسلر کے سامنے سرسید کا ذکر کیا گیا اور حاضرین نے اس پر تحسین و آفرین
کا نعرہ بلند کیا تو سر ولیم میور اور لیڈی میور صاحبہ خوشی سے باغ باغ
ہو گئیں۔ اس موقع پر بارہ آدمیوں کو جن میں سے چھ حاضر اور چھ غیر حاضر تھے
یہ ڈگری ملنی تجویز ہوئی تھی۔ پروفیسر کرک پیٹرک نے سرسید کو لارڈ چانسلر سے
انسٹروکٹس کرتے وقت کہا کہ "میں سب سے پہلے آپ سے یہ اجازت
چاہتا ہوں کہ سرسید احمد خاں بہادر کے سی۔ ایس۔ آئی کو ان کی غیر حاضری میں
ڈاکٹر آف لاز کی اسٹیریڈی ڈگری عطا کی جانے" اس کے بعد سرسید کی تاریخ
ولادت، خاندان سلطنت مغلیہ کا قدیم توسل سرکاری ملازمت، ایام غدر
کی خدمات اور تیس انگریزوں کی جان بچانے میں نہایت شرفیادہ ہیرو ہونے کا
ظاہر کرنا، پرنسپل پنشن اور خطابات کا ملنا، وائسیریل کونسل کی ممبری، ملکی
اور قومی خدمات، آثار الصنادید اور دیگر تصنیفات خصوصاً خطبات احمدیہ
کا لکھنا، سپیکنگ کی اعلیٰ یاقوت، رائل ایریشیا کلب سوسائٹی کا فیلو مقرر
ہونا، محمدن کالج قائم کرنا اور بڑے بڑے ارکان سلطنت ہند کا اس میں مدد
دینا، یہ سب باتیں بیان کیں اور کہا کہ، "سرسید سب سے زیادہ نامور
مسلمان سچکٹ حضور لکڑے سفیر ہند کے ہیں اور اس لیے خصوصیت

کے ساتھ یونیورسٹی کے اس اعزاز کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد تمام حاضرین علیہ
نے تحسین و آفرین کے نعرے بلند کیے اور سرسید کو ایل ایل ڈی کی ڈگری
عطی کی گئی۔ افسوس ہے کہ جو سند انبرا کی یونیورسٹی نے سرسید کو بھیجی تھی وہ
اس کتاب کے لکھتے وقت ہم کو دستیاب نہیں ہوئی۔ اس لیے ہم یہاں اس
کے نقل کرنے سے معذور ہیں۔

اگرچہ سرسید انبرا یونیورسٹی کی اس قدر شناسی کے نہایت شکر گزار تھے
اور جو اعزاز کہ اُس نے اُن کو دیا تھا اُس پر فخر کرتے تھے لیکن انھوں نے
ایسی آزریری ڈگریوں کو ڈگری پانے والوں کی اصلی لیاقت کا معیار کبھی نہیں
سمجھا بلکہ وہ یونیورسٹی کی ہر ایک ڈگری کو اُس قوم کے حق میں جس کے ہاتھ
میں اُس یونیورسٹی کی باگ نہ ہو ایک بھیک کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں
جانتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایک ایڈیٹس کے جواب میں جواباً پنجاب
نے ۱۹۰۷ء میں اُن کو بمقام جالندھر دیا، صاف کہا تھا کہ ”یونیورسٹیوں کی مثال
اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام جیسی ہے۔ ہم یونیورسٹیوں کے
تابع ہیں، اُس کے ہاتھ کچے ہوئے ہیں جو مگر اسرا علم کا وہ دیتی ہے اُسی کو
کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کرتے ہیں۔ اے دوستو
ہماری پوری پوری تعلیم اُس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں
ہوگی، یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی، ہم آپ اپنی تعلیم کے
مالک ہوں گے اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم
پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے ہاتھ میں ہوگا اور نچرل سائنس ہاتھ میں
اور کلمہ لا الہ الا اللہ کا تاج سر پہ۔ یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو صرف خچر بناتی
ہے۔ اے دوستوں میں خود بھی انھیں میں ہوں کیونکہ مجھ کو بھی ایک یونیورسٹی

نے ایل ایل ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ہم آدمی جیسی بنیں گے جب ہماری تعلیم
ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔

ٹرستی بل پر اختلاف

کالج کا انتظام ابتدا میں صرف ایک کمیٹی سے جو کالج فنڈ کمیٹی کہلاتی تھی
متعلق تھا۔ لیکن جوں جوں کالج ترقی کرتا گیا نئی نئی ضرورتیں پیش آتی گئیں چنانچہ
۱۸۸۳ء میں پہلے قواعد کی ترمیم ہو کر نئے بالی لاز بنائے گئے اور کالج فنڈ
کمیٹی کے ماتحت چار اور کمیٹیاں مقرر ہوئیں۔

- ۱۔ کمیٹی ڈائریکٹران تعلیم السنہ مختلفہ و علوم دنیویہ۔
- ۲۔ کمیٹی مدبران تعلیم مذہب اہل سنت و جماعت۔
- ۳۔ کمیٹی مدبران تعلیم مذہب اشاعتیہ۔
- ۴۔ مینجنگ کمیٹی جس کا کام بورڈنگ ہاؤس کا انتظام اور بورڈوں کی ہر طرح کی
نگرانی تھا۔

اس کے بعد جب کالج کی حالت اور اس کی جائیداد بہت ترقی کر گئی اور
اس پر لوگوں کا اعتماد زیادہ ہو گیا یہاں تک کہ لوگ ہزار ہا روپیہ اپنے بچوں کی
تعلیم کے لیے پیشگی طور پر کمیٹی میں امانت رکھوانے لگے تو سرسید کو یہ خیال
ہوا کہ اب کالج کا ایک معمولی کمیٹی کے سپرد رہنا مناسب نہیں۔ اس خیال کو
پیدا ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ اتفاق سے سرسید سخت بیمار ہو گئے جب
صحت یابی ہوئی تو انھوں نے اس بات کو بہت ضروری سمجھا کہ ان کی زندگی میں سرکاری
قانون مروجہ وقت کے موافق کالج اور اس کی جائیداد کے لیے ٹرسٹی (امین)
مقرر ہو جائیں اور ایسے قواعد اور رگولیشن بنائے جائیں جو تمام ضروری ضروریات

کالج پر حاوی ہوں اور جہاں تک ممکن ہو ایسا انتظام کیا جائے کہ جن اصول پر کالج کی بنیاد رکھی گئی ہے انھیں اصول پر وہ ہمیشہ قائم رہے سرسید کے معزز یوروپین دوستوں نے بھی وعدہ اندیشی کی راہ سے یہی صلاح دی اور گورنمنٹ کی طرف سے بھی یہ ایسا پایا گیا کہ جب تک طینان کے قابل آئینہ انتظام نہ ہو گا گورنمنٹ اور سید آباد کی امداد جاری نہیں رہ سکتی۔

پس سرسید نے ۱۸۸۹ء میں حسب حابطہ ٹرسٹیوں کے تقریر اور دیگر انتظامات کے لیے ایک کوڈ بنایا اور بل کی صورت میں چھپوا کر اس کی کاپیاں تمام ممبروں کے پاس رائے کے لیے بھیجیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سی ایم جی نے اس کی بعض دفعات سے اختلاف کیا جن میں سے ایک وہ دفعہ تھی جس کی رو سے آرمیبل سید محمود کو جانشین سکرٹری مقرر کیا گیا تھا اور ان کے ساتھ ان کے اکثر دوست بھی جن میں زیادہ تر ضلع علیگڑھ اور بلند شہر کے رئیس تھے اس اختلاف میں شریک ہو گئے۔ اگر یہ اختلاف اختلاف رائے کی حد سے متجاوز نہ ہوتا اور ٹرسٹیوں کے پاس ہو جانے پر بالکل رفع ہو جاتا تو ہم اس کو خدا کی رحمت سمجھتے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ آخر کار مخالفت کی صورت میں بدل گیا۔ باوجودیکہ مسودہ ممبران کی پیشی کے بھرے جلسہ میں مجارٹی کی رو سے پاس ہو گیا مگر ان کی مخالفت رفع نہ ہوئی۔ چنانچہ مولوی سمیع اللہ خان اور تقریباً ان کی تمام پارٹی کالج سے بے تعلق ہو گئی۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ سرسید کی رائے اس باب میں خطا پر تھی تو بھی جب کہ ٹرسٹیوں کا قاعدہ کے موافق پاس ہو چکا تھا تمام کالج کے ہواخواہوں کو اسے سر پر رکھنا چاہیے تھا۔ یہی وہ مستحکم بنیاد ہے جس پر تمام شاہد ملکہوں میں قومی جماعتیں اور قومی انسٹی ٹیوشن قائم ہیں اور روز بروز ترقی کرتے جاتے

ہیں جب تک کوئی تجویز کثرت رائے سے پاس نہیں ہوتی اس سے نہایت دور شور کے ساتھ اختلاف کیا جاتا ہے اور ایک پارٹی دوسری پارٹی پر غالب آنے کے لیے تمام وسائل جو اس کی قدرت میں ہوتے ہیں کام میں لاتی ہے مگر جہاں ایک پارٹی کثرت رائے سے غالب آئی فوراً دوسری پارٹی نے ہتھیار ڈال دیئے اور اختلاف اتفاق کے ساتھ بدل گیا۔ چنانچہ انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین نے کہ وہ بھی اس اختلاف میں شریک تھے بل پاس ہو جانے کے بعد اس کو برسرِ حشم قبول اور منظور کر لیا اور کالج کے پہلے سے زیادہ حامی و مددگار بن گئے مگر اور صاحبوں نے قانونِ ٹریشیاں کو سرگز نسیم مہیں کیا اور کالج سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔

اگرچہ سرسید چالیس برس برابر طرح طرح کی مخالفتیں جھیلتے رہے مگر کوئی مخالفت ان کو ایسی شاق نہیں گزری جیسی کہ مولوی سمیع اللہ خاں اور ان کی پارٹی کی مخالفت جس سے فی الواقع ان کا حوصلہ تنگی کرنے لگا تھا اور صبر و تحمل کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اول تو مولوی سمیع اللہ خاں کو وہ اپنا قوت بازو سمجھتے تھے جن سے کالج اور یورڈنگ کے انتظام اور نگرانی میں ان سے بے انتہا تقویت پہنچتی تھی اور ایسے عزیز دوست اور مددگار سے ایسی سخت مخالفت کا ظہور میں آنی توقع ناقابلِ برداشت تھا۔ دوسرے ان کی مخالفت انھیں کی ذات تک محدود نہ تھی بلکہ کالج کے بہت سے معاون ان کے ساتھ ہو گئے تھے اور اس لیے سرسید کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں کالج کی چلتی گاڑی میں روڑا نہ اٹک جائے چنانچہ انھیں دنوں میں جو انھوں نے ایک نہایت پُر جوش آرٹیکل علی گڑھ گزٹ میں شائع کیا تھا اور جس میں فرانس چل کر ڈوئل لڑنے کا چیلنج دیا گیا تھا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرسید

کے دل کی اُس وقت کیا حالت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سید احمد خاں بالکل ایک ڈسپالک طبیعت کے آدمی تھے۔ اس خصلت کو چاہو اُن کے تمام بڑے بڑے کاموں کی بنیاد سمجھو اور چاہو اُن کے اخلاقی عیوب میں شمار کرو بہر حال یہ خصلت اُن میں ضرور تھی، گو وہ جزوی اور فرضی باتوں میں اختلاف رائے سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے مگر جن اصول پر انھوں نے کالج کی بنیاد رکھی اُن سے وہ ہرگز دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے اور جس بات کو ان میں مغل سمجھتے تھے اُس کو جہاں تک کہ اُن کے اسکان میں تھا چلنے نہیں دیتے تھے۔ اُن کا مقصد محمدن کالج قائم کرنے سے صرف یہی نہ تھا کہ مسلمانوں کی اولاد اس میں تعلیم پائے بلکہ سب سے بڑا اور مقدم مقصد جو عرصہ سے لیکرا خیروم اُن کے پیش نظر رہا، یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں یک جہتی میل جول اور اتحاد کو ترقی ہو۔ اسی لیے انھوں نے یورپین اسٹاف کو کالج کا جزو غیر منفک قرار دیا تھا اور انگلستان سے سپیدہ چیدہ آدمی بلوا کر کالج میں جمع کیے تھے مگر بد قسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ یورپین اسٹاف مولوی صاحب ممدوح کی طرف سے کھٹک گیا تھا اور اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ اگر سرسید نے اپنی زندگی میں آئینہ کے لیے سکریٹری شپ کا کوئی انتظام نہ کیا تو ان کے بعد ضروری مولوی مسیح اللہ خاں سکریٹری ہوں گے۔ انھوں نے اعدائے بعض اور یورپین افسروں نے سرسید کو صلاح دی کہ سپہ محمود کو جاسٹ سکریٹری مقرر کر دیں تاکہ یورپین اسٹاف کا جس کو معاہدہ کر کے انگلستان سے بلایا گیا ہے سرسید کے آئینہ جانشین کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہو جائے، اگرچہ سرسید کو یقین تھا کہ سپہ محمود کو جاسٹ سکریٹری مقرر کرنے سے لوگوں کے دل میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوں گی اور ایسی بدگمانیوں سے جیسا کہ

اس کتاب کے صفحات میں جا بجا مذکور ہے۔ وہ سو سو کوں بھاگتے تھے۔ اس کے سوا سید محمود کی نسبت معتبر فریعوں سے سنایا گیا ہے کہ وہ جائنٹ سکرٹری یا سکرٹری بننے کو پسند نہیں کرنے تھے مگر چونکہ یوروپین اسٹاٹ کو اس بات پر سخت اصرار تھا ادا ان کو کالج کی آئینہ حالت کی نسبت مطمئن کرنا ضروری تھا اس لیے سرسید کو ٹرسٹی بل میں ایک خاص دفعہ سید محمود کے جائنٹ سکرٹری مقرر کرنے کے لیے داخل کرنی اور سید محمود کو یہ جبر اس تجویز پر راضی کرنا پڑا۔

جو لوگ کالج کے خیر خواہ تھے ان کا فرض تھا کہ اول تو اس تجویز سے اختلاف ہی نہ کرنے کیونکہ وہ ہر ایک ایسی مصلحت پر مبنی تھی جس کو سرسید نے ہمیشہ نظام کالج میں سب سے زیادہ مقدم سمجھا ہے، یہاں تک کہ اگر بالفرض کثرت رائے سرسید کی طرف نہ ہو جاتی تو سرسید قطعاً کالج کو چھوڑ بیٹھتے اور یوروپین اسٹاٹ یقیناً کالج کو خیر باد کہہ کر چلا جاتا اور پھر کوئی یورڈین جنٹلمین یہاں آنے کی ہامی نہ بھرتا اور انگریزوں اور افسروں اور حاکموں کو جو ہمدردی کہ اب کالج کے ساتھ ہے وہ ہرگز باقی نہ رہتی۔ اور اگر انھوں نے اختلاف ہی کیا تھا تو بل پاس ہو جانے کے بعد لازم تھا کہ اس کو خوشی سے منظور کر لیتے اور سمجھ لیتے کہ اگر اس تجویز کے نتائج خاطر خواہ نہ نکلتے تو ہر وقت اس تجویز کا تدارک اور دفعہ مذکور کی ترمیم ہو سکتی ہے لیکن اگر اس مخالفت پر باوجود پاس ہو جانے بل کے برابر اصرار کرتے رہے تو کالج کو سخت صدمہ پہنچے گا اور مسلمانوں کی پھوٹ اور نا اتفاق پر سالانہ منے گا۔ یہ کہنا کہ ہم حق پر تھے اور اس لیے ہم کو غلط مجاہدی کا اتباع کرنا ضروری نہ تھا، بالکل ایسی بات ہے جیسے دو فریق قرعہ اندازی پر فیصلہ کا

انحصار کریں اور جب قمرہ کسی فریق کے خاطر خواہ نہ نکلے تو یہ غدر کرے کہ اس میں میری حق تلفی ہوتی ہے اس لیے میں اس فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتا۔

الغرض بل پاس ہو جانے کے بعد اگرچہ مولوی صاحب اور اُن کی پارٹی کالج سے بالکل بے تعلق ہو گئی تھی مگر مدت تک اُن کے نام ٹرسٹیوں کی جماعت میں بدستور قائم رکھے گئے اور مثل تمام ٹرسٹیوں کے سرسید اُن سے بھی کالج کے معاملات میں برابر مشورہ اور رائے طلب کرتے رہے لیکن چونکہ وہ تمام کارروائی کو جو جدید قواعد کے بموجب کی جاتی تھی، غلط سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے کبھی کبھ جواب نہیں دیا اور آخر ایک عرصہ کے بعد مجبور ہو کر اُن کا نام ٹرسٹیوں کی جماعت سے خارج کر دیا گیا۔

پھر کچھ دنوں بعد نواب سرو قار الامرا مہار مدارا مہام ریاست حیدرآباد نے جبکہ وہ کالج کے ملاحظہ کے لیے علیگڑھ میں تشریف لائے ہوئے تھے، بنظر سرپرستی کالج و خیر خواہی اہل اسلام سرسید اور مولوی صاحب ممدوح کے درمیان صفائی کرا دی تھی چنانچہ سرسید نے سالانہ اجلاس ٹرسٹیاں میں مولوی صاحب اور اُن کی پارٹی کے نام پھر ٹرسٹیوں میں داخل ہونے کی تحریک کی اور تمام حاضرین جلسہ نے بہت خوشی سے اُس کو منظور کیا، مگر بعض مقول و جوبات پر جن کی تفصیل طولانی ہے انہوں نے ٹرسٹی بننا منظور نہیں کیا اور جو صفائی کہ نیر کیلنسی نے کرائی تھی سرسید کی زندگی میں اُس پر کوئی عمدہ نتیجہ مترتب نہ ہوا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ گزشتہ جولائی میں نواب لفتیش گورنر اضلاع شمال مغرب نے مسلمانوں کو بدبختی پر رحم فرما کر آئریبل سید محمود اور مولوی سمیع اللہ خان سی ام جی کے باہم چھ صفائی کرا دی ہے اور خدا کی دانستہ سے امید ہے کہ اس صفائی کا انجام بہتر ہوگا اور تمام

لائق اور ذی رعب مسلمان متفق ہو کر اس قومی انسٹیوشن کے استحکام و دوام اور ترقی میں دل و جان سے کوشش کریں گے۔

اگرچہ قوم کے اُن دو معززہ ممبروں میں صفائی ہو جانے کے بعد ہمارا ہرگز جی نہ چاہتا تھا کہ سرسٹی بل کے ناگوار واقعہ کا ذکر کر کے ناظرین کو وہ نامبارک زمانہ یاد دلائیں جو قومی کالج اور قومی تعلیم کے حق میں ایک سخت مصیبت کا زمانہ تھا مگر چونکہ سرسید کی بائوگرافی میں اُن تمام واقعات کا جن سے اُن کے اخلاق پر کوئی روشنی پڑتی ہو، استقصا کرنا ضروری ہے اس لیے جو کچھ اس معاملہ کے متعلق ہم کو معلوم تھا یا ہماری سمجھ میں آیا ہے کم و کاست بیان کر دیا گیا۔

کالج کے رچیے میں غبن ہونا

عربی میں یہ مثل مشہور ہے: "اللَّهُمَّ بَقْدِ الْهَمِّ" یعنی جس قدر ہمتیں عالی ہوتی ہیں اسی قدر رنج و غم زیادہ ہوتے ہیں۔ سرسید نے کالج کے عیش میں اتنے کام اپنے سر دھر لیے تھے کہ ایک آدمی کا اُن سے عہدہ ہوا، ہونا سخت دشوار تھا۔ آخر ۱۸۹۵ء میں اُن کو کالج کی بدولت ایک ایسا دھچکار لگا جس کا صدمہ اخیر دم تک فراموش نہیں ہوا۔ منجملہ اہلکار اِن دفتر سکریٹری کے ایک شخص شام بہاری لال جون ۱۸۸۳ء سے ہیڈ کلرک کے عہدہ پر مامور تھا جو علیگڑھ کے ایک ممتاز کالیستھ خاندان کا آدمی تھا اس کا باپ پنجاب میں تحصیلدار اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہ چکا تھا اور اب نیشن پاتا تھا اس کا دادا لفظ منشی پنجاب میں میر منشی تھا سرسید نے اس کو ایک اشرف خاندان کا آدمی سمجھ کر اپنے انگریزی دفتر میں ہیڈ کلرک مقرر کر لیا تھا۔ اگرچہ سرسید کو اس کی تقرری کے برس ڈیڑھ برس بعد جتایا گیا کہ یہ پنجاب میں سرکاری ملازم تھا اور وہاں سرکاری

روپیہ غبن کرنے کی علت میں سزا سے قید پا چکا ہے مگر سرسید نے اس خیال سے کہ اول تو یہاں اُس کی معمول میں کچھ روپیہ نہیں رہتا جس میں غبن کا احتمال ہو دوسرے اثرات آدمی ایک دفعہ زک اٹھا کر پھر ویسی ہی خطا نہیں کرتا اُس کو بدستور اس کے عہدہ پر سجال رکھا۔ سرسید میں ایک خاص خصالت تھی جس کو اگرچہ پرانی سوسائٹی میں ایک نہایت شریفانہ خصالت خیال کیا جاتا تھا مگر اس زمانہ میں وہ سخت اعتراض کے قابل سمجھ جاتی ہے خاص کر اُس صورت میں جبکہ اُس کا اثر ذاتی معاملات سے گزر کر قومی معاملات تک پہنچ جائے، اُن میں ایک خاص قسم کی مردت بہد جبہ غایت تھی وہ کسی کو ملازم رکھ کر، عام اس سے کہ اُن کا ذاتی ملازم ہو یا نہ ہو، باوجود متواتر شکایتوں کے علیحدہ کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اُس کے باب میں کسی قسم کی شکایت کو صحیح نہیں سمجھتے تھے کسی کی نسبت اُن کو مطلق بدگمانی نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنے ماتحتوں پر پورا اعتماد کر لیتے تھے اور جو کام اُن کو سپرد کر دیتے تھے اُس کی طرف سے بالکل مطمئن ہو جاتے تھے۔ اگرچہ بغیر اعتبار کے دنیا کا کوئی کام نہیں چل سکتا۔ لیکن اس مشہور قول کے موافق کہ *الحذوم سوء الظن* ضرور ہے کہ کبھی کبھی امتحان اپنے ماتحتوں کے کام کو جانچ لیا جائے تاکہ اُن کے دل میں ڈر رہے اور وہ ہر ایک بات کا اپنے تئیں جوابدہ سمجھتے رہیں، مگر سرسید کے دل میں کبھی اس قسم کے امتحان کا خیال نہ آتا تھا۔ شام بہاری لال چون سٹنہ سے جولائی ۱۸۵۷ء تک اُن کے دفتر میں رہا اس عرصہ میں کبھی اُس نے یہ نہیں جانا کہ مجھ سے کوئی باز پرس کرنے والا ہے یا نہیں۔

کالج کا بہت سارے پیہ بیشک بنگال میں بصیغہ امانت جمع رہتا تھا جو وقتاً فوقتاً حسب ضرورت چمکیوں کے ذریعہ سے وصول کیا جاتا تھا اور کچھ پرائیمری

نوٹ مالیت کالج بطور کیپٹل فنڈ کے بینک کی سپردگی میں تھے جن کا منافع تقریباً دو ہزار سالانہ بینک سے ہر سال وصول ہوتا تھا چیک بک سرسید کے پاس ایک بکس میں بند رہتی تھی اور اُس کی کبھی بھی انھیں کے پاس رہتی تھی مگر جب چیک جاری کرنے کی ضرورت ہوتی تھی تو شام بہاری لال سرسید سے کبھی لے کر چیک نکال لیتا تھا اور اس کی خانہ پُری کر کے سرسید سے دستخط کرا لیتا تھا اور چیک جاری کر دیتا تھا سرسید چونکہ انگریزی نہیں جانتے تھے اور کلرک پر اعتماد رکھتے تھے بے تامل چیک پر دستخط کر دینے تھے کئی سال تک تو وہ ٹھیک ٹھیک کام کرتا رہا مگر جب اُس نے دیکھا کہ سکرٹری کو اس پر پورا اعتماد ہو گیا ہے اس نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کیے جب چاہتا سکرٹری سے کبھی لے کر چیک نکال لیتا اور جس قدر روپیہ چاہتا اُس میں درج کر کے کبھی خود سکرٹری سے دستخط کرا لیتا اور کبھی آپ ان کے جعلی دستخط بنا کر چیک جاری کر دیتا۔ یہاں تک کہ جب ذرا امانت جو بینک میں جمع رہتا تھا ختم ہو گیا تو اس نے ایک نہایت دلیری کا کام کیا۔ ۴۹ ہزار کے پرائیسری نوٹ جو بطور کیپٹل فنڈ کے بینک کی سپردگی میں تھے اور کسی کو ان کے منافع کے سوا اصل فنڈ میں تصرف کرنے کا اختیار نہ تھا ان پر ہاتھ مارنے کا ارادہ کیا۔ اُس نے ٹرسٹیوں کی طرف سے ایک جعلی مختار نامہ بنایا جس میں بینک کو اختیار دیا گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً جس قدر روپیہ کی کالج کو ضرورت ہو پرائیسری نوٹوں کی کفالت پر سودی روپیہ قرض دیتا رہے اور سات ٹرسٹیوں کے جعلی دستخط کہ اس کو بینک میں بھیج دیا۔ کچھ کم ۶۳ ہزار روپیہ تو وہ ذرا امانت میں سے غبن کر چکا تھا اب نوٹوں کی کفالت پر سودی قرض بینک سے وصول کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ علاوہ ذرا امانت کے بیالیس ہزار پالسو ستر روپیہ اور بینک

سے وصول کر کے خور و برد مکر گیا۔

پتہ یہ ہے کہ ماہ جولائی ۱۸۹۵ء کا لچ کے حق میں، سرسید کے حق میں اور خود اس ناخدا ترس کے حق میں جس نے مسلمانوں کا کوڑی دکان سانگہ ہوا ایک لاکھ پانچ ہزار چار سو نو روپیہ شراب خواری اور عیاشی میں برد و باد کر دیا۔ سخت معنوں اور نامبارک مہینہ تھا جس کے بعد کا لچ کی تعمیر باطل بند اور آگے کو چپندہ کی راہ مسدود ہو گئی، سرسید کا اس رنج میں گویا کام ہی تمام ہو گیا اور شام بہاری لال قالج میں مبتلا ہوا، اسی حالت میں پکڑا گیا، دورہ سپرد ہوا اور نہایت تلخی اور رسوائی کے ساتھ حوالات ہی میں کچھ کھا کر مر گیا۔

اگرچہ اس صدمہ کا اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے جو اس عین فاحش سے سرسید کے دل پر گزرا ہو گا انھوں نے مچھتیوں مچھتیوں تالاب بھرا تھا اور قطرہ قطرہ اس جمع کر کے قوم کی پیاس بجھانے کا سامان مہیا کیا تھا مگر باوجود اس سخت صدمہ کے وہ نہایت غنیمت سمجھتے تھے کہ ان کی زندگی میں یہ راز کھل گیا تھا اور شام بہاری لال کی بد اعمالی سب پر علی ہر ہو گئی اگر وہ دفعۃً سخت بیمار نہ ہو جاتا تو خدا جلنے یہ مادہ فاسد اندر ہی اندر کس حد تک پہنچ جاتا اور اس سے آخر کو کیا نتیجے پیدا ہوتے سرسید نے انھیں دنوں میں جب کہ شام بہاری لال پر کالج کی طرف سے فوجداری میں مقدمات دائر ہو رہے تھے راقم کو ایک خط لکھا تھا اس میں لکھتے ہیں کہ: ”اگرچہ ان دنوں میں میری طبیعت نہایت پریشان ہے اور عدالت میں حاضر ہونے اور مقدمات میں حاضری اظہار دینے کی تکلیف نہایت سخت معلوم ہوتی ہے مگر جو امور تقدیری ہیں ان سے کچھ چارہ نہیں..... بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شام بہاری لال نے جو تصرف کیا وہ اس خیال سے تھا کہ چونکہ میری عمر زیادہ ہو

گئی ہے اور سوت کے دن قریب آتے جاتے ہیں، ایک دن میں مریاؤں لگا
اور جو کچھ اس نے جیلسازی کی ہے وہ سب تپٹ ہو جائے گی مگر خدا کا شکر
ہے کہ میری زندگی میں اس کی جیلسازی اور قریب کھل گیا، ورنہ میرے بعد
بڑی مشکل پڑتی اور لوگ سمجھتے کہ میں نے ہی روپیہ میں تصرف کیا ہے۔
پس خدا کی مہربانی تھی کہ میرے سامنے ہی یہ راز کھل گیا، بعض لوگ اپنی حماقت
نے سمجھتے ہیں کہ روپیہ میری تحویل میں اور میرے قبضہ میں تھا، حالانکہ یہ امر
بالکل غلط ہے، قانون ٹرسٹیان میں حکم ہے کہ روپیہ بینک میں جمع کیا جائے
چنانچہ کل روپیہ بینک میں جمع تھا اور بینک کے خزانے سے بذریعہ جعلی
چیکوں کے تصرف ہوا اور جعلی چیکوں کو روکنا جب تک کہ اُن کا حال نہ کھلے کسی
بشر کے اختیار میں نہیں، بہر حال میں تو خدا کی رحمت سمجھتا ہوں کہ میری زندگی
میں یہ حال کھل گیا گو کہ مجھ کو کیسا ہی رنج اور صدمہ ہو۔

الغرض جب شام مباری لال و نغہ فالج میں مبتلا ہو گیا اور اس کی غیبت میں
بینک سے چھیاں موصول ہوئیں تو اُن کا معنون سُنکر سرستید کو شبہ ہوا انہوں
نے چیک بک نکلا کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ بہت سے چیکوں کے نصف ٹکڑے
جو بینک میں بھیجے جاتے ہیں نثار میں اور اُن کے ٹٹنے جو چیک بک میں لگے
رہتے ہیں وہ کورے بغیر کھے لگے ہوئے ہیں جب روز نامچہ دیکھا تو ان نمبروں
کے کسی چیک کی روائتی روز نامچہ میں مسدود پائی گئی اور جو ڈاکٹ کے چیکوں کے
ساتھ حسب قاعدہ بینک میں بھیجے گئے تھے ان کی نقل بھی رجسٹر میں نہ ملی۔
آخر جب سرسید نے بینک سے خط کتابت شروع کی اور وہاں سے
تمام کاغذات کی نقلیں منگوائیں تو کلرک کی تمام چوریوں اور جیلسازیوں میں
وہ ظاہر ہو گئیں۔ انہوں نے حسب منشاء قانون ٹرسٹیان فوراً اس واقعہ

کی اطلاع گورنمنٹ میں بھیج دی اور دس مقدمے شام مہاری لال پر فوجداری میں دائر کیے گئے یہاں تک کہ صاحب مجسٹریٹ نے اُس کو سپریشن کر دیا لیکن ابھی عدالت سشن میں رو بکاری کی نوبت نہ پہنچی تھی کہ وہ حوالات ہی میں غالباً کچھ کھا کر دفعۃً مر گیا۔

سر سید نے جو رپورٹ سالانہ اجلاس ٹرسٹیاں منعقدہ یکم جنوری ۱۸۸۷ء میں پیش کی تھی اُس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے ایک بات کے سوا اُن تمام فرائض کے ادا کرنے میں جو بحیثیت سکرٹری ہونے کے اُن کی ذات سے علاقہ رکھتے تھے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ بلکہ اُن سے یہ بہت برمی فرو گداشت ہوئی کہ ایک مدت دوازہ تک یہ دھاری چورچیک بنگ میں سے نکال نکال کر جعلی چیک جاری کرتا رہا اور اُن کے مٹنے کو رے بغیر لکھے چیک بنگ میں لگے رہے اور کبھی کسی نے چیک بنگ کو کھول کر نہ دیکھا کہ اُس میں دن و رات کیا ہواٹھ مچ رہی ہے اور اُس کا سبب سرسید کی وہی نیک دلی اور ان کا حسن ظن تھا جس کی وجہ سے خبیث نفس کی طرف کبھی ان کا ذہن انتقال نہ کرتا تھا جیسا کہ کہا گیا ہے۔ ”اِنَّ الْکِرَامَ اِذَا خَافَتْهُ لَخَدَّ عَا“، یعنی کریم النفس آدمی کو جب دھوکا دو گے وہ دھوکا کھا جائے گا۔ اس ایک الزام کے سوا کسی قسم کی گرفت سرسید پر نہیں کی جاسکتی۔ اُن کا کلرک کی انگریزی تحریر پر بلا تامل دستخط کر دینا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ تمام دقات سرکاری وغیرہ سرکاری میں اسی طرح ماتحتوں پر اعتماد کیا جاتا ہے کیونکہ اگر ان پر ایسا اعتماد نہ کیا جائے اور خواہی نحو اسی اُن کے کام کو مشتبہ سمجھا جائے تو ہر گرام نہیں چل سکتا۔ اس کے سوا کلرک مذکور نے تمام جعلی چیکوں اور جعلی ڈاکٹوں پر سرسید سے دستخط نہیں کرائے بلکہ زیادہ تر اپنے ہاتھ سے جعلی دستخط بنا کر چیک جاری

کیے جو روپیہ نوٹوں کی کفالت پر بطور سودی قرض کے بینک سے وصول کیا گیا۔
 اس کا الزام بھی عائد نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کو ہر طرح سے اطمینان تھا اور اطمینان ہونا
 چاہیے تھا کہ کیٹل فنڈ کی کفالت پر بینک کسی کو ایک حربہ قرض نہیں دے
 سکتا۔ اور جعلی مختار نامہ کلرک نے بینک میں بھیج کر اس کو دھوکا دیا اس کا کسی
 کو سان گمان بھی نہ تھا۔ نہ اس پر سرسید کے اصلی دستخط تھے اور نہ کسی ٹرسٹی
 کے بلکہ سب کے دستخط کلرک نے اپنے ہاتھ سے بنائے تھے اور مختار نامہ
 بالا ہی بالاتیہ کر کے بینک کو چلتا کر دیا تھا۔ مرزا علی بیگ صاحب ٹرسٹی
 کالج اور سید ولایت حسین صاحب بی۔ اے سکند ماسٹر اسکول ڈیپارٹمنٹ
 نے جو تین مہینے کی لگاتار کوشش اور محنت سے کالج کے حساب کی ابتدا سے
 اخیر تک جانچ پڑتال کی اور اس کا مقابلہ بینک کے حسابات سے کیا اس سے
 جیسا کہ سرسید کی رپورٹ میں درج ہے۔ صاف پایا جاتا ہے کہ بینک میں پہنچنے
 سے پہلے کسی طرح کا تغلب دفتر سکرٹری میں نہیں ہوا، بلکہ بینک میں پہنچنے
 کے بعد جعلی چکیوں کے ذریعہ سے روپیہ ٹھکرایا گیا۔ چنانچہ سرسید کی رپورٹ
 مذکورہ بالا شکریہ تمام ٹرٹیوں نے جو جلسہ میں حاضر تھے اس بات کو تسلیم کیا
 تھا کہ سرسید نے جو احتیاط کہ ممکن تھی اس میں کسی طرح کی فروگزاشت نہیں
 کی اور جس طریقے کے غبن وقوع میں آیا اس کا احتمال بہت کم ہوتا ہے اور
 شام مباری لال کے ہاتھ میں کسی رقم وصولی کا نہ رہنا اور تمام رقوم سندھ
 روز نامہ کے بالیقین بینک میں جمع ہو جانا اس بات کے لیے کافی تھا کہ سرسید
 کو کلرک کی نسبت کسی طرح کی بے اطمینانی نہ ہو۔ اسی بنا پر جلسہ حاضرین نے
 بالاتفاق ایک ووٹ آؤٹ فل کا فیصلہ عیس اس معنوں کا پاس کیا کہ سرسید
 نے حسابات کالج میں کوئی دقیقہ احتیاط کا فروگزاشت نہیں کیا اور یہ کلرک

پرائس سے زیادہ ہم دس نہیں کیا جیسا کہ انگریزی دفتروں میں عموماً ایسے عہدہ داروں پر کیا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے اس ووٹ کے پاس ہونے کا حال سن کر کہا کہ "ٹرستی اگر ایسا ووٹ پاس نہ کرنے تو اور کیا کرتے! وہ خود اس الزام میں جس سے انھوں نے سکریٹری کو بری کرنا چاہا ہے۔ سکریٹری کے شریک غالب تھے۔ حق یہ ہے کہ ٹرسٹیوں کے پاس اس اعتراض کا کوئی معقول جواب نہیں ہے اور ہمارے نزدیک مولوی سمیع اللہ خاں نے اپنے خط مودودہ سکریٹری مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۱۷ء میں بالکل صحیح لکھا تھا کہ "اگر ٹرسٹی نگرانی کرتے اور سال میں دو سال میں بھی کبھی اپنے فرض کے پورا کرنے کے خیال سے حسابات کو کالج کے جانچتے تو یہ لاکھ روپیہ سے زیادہ کے تغلب کی مصیبت جس میں مسلمانوں کا روپیہ برباد گیا، کالج پر کیوں نازل ہوتی۔" سچی بات یہ ہے کہ گو مسلمان قومی تعلیم میں روپیہ خرچ کرنا سیکھ گئے ہیں مگر روپیہ دینے کے بعد پھر اس کی خبر لینا بالکل نہیں جانتے اور ٹرسٹیوں میں ایسے لوگ شاد و نادر ہی نکلیں گے جو اپنے تئیں کالج کے کسی معاملہ کا ذمہ دار سمجھتے ہوں پس جب کہ مسلمانوں میں یہ خیال پیدا نہ ہو گا کہ جو روپیہ ہم نے قوم کی تعلیم کیلئے دیا ہے وہ کیونکر خرچ ہوتا ہے اور اس کے محض طور پر ہونے کا کیا انتظام کیا گیا ہے، اور جب تک تمام ٹرسٹی اپنے تئیں کالج کے معاملات کا جوابدہ نہ سمجھیں گے اور اپنے فرائض کو جو قانون ٹرسٹیان میں بیان ہوئے ہیں ہمیشہ نصب العین نہ رکھیں گے اس وقت تک کالج کا سرمایہ بدستور خطرے میں رہے گا۔ ایک سکریٹری کس کس چیز کی خبر سکھے گا اور کہاں کہاں اپنا ذہن دوڑائے گا اور ایک قحط زدہ قوم میں ایسا جامع حیثیات سکریٹری کہاں سے آئے گا جو فکر معاش سے فارغ ابال اور خانگی بکھیروں سے بالکل آزاد ہو۔ رات دن کالج کے انتظام میں مصروف رہے اور جب روپیہ کی ضرورت ہو تو در و در بھیک ماگتا پھرے، گورنمنٹ اور

قوم دونوں کا معتمد علیہ ہو، سپیکر ہو، رائٹر ہو، خزانچی ہو اور باوجود ان تمام باتوں کے ایک نہایت کارآمد و مکرر بھی ہو جو مکرر کی چالاکیوں سے بخوبی آگاہ اور خبردار ہو۔

سرسید کی وفات

اگرچہ غبن کے واقعہ نے سرسید کی خوش دلی کو بہت کچھ کمزور کر دیا تھا مگر اس صدمہ سے اُن کی طبیعت ایسی مغلوب نہیں ہوئی تھی کہ اُن کی بہت اور کوشش میں فتوہ آجائے وہ تمام قومی خدمات اپنی قدیم عادت کے موافق برابر انجام دیتے تھے اور غبن کے سبب سے جو نقصان کالج کو پہنچا تھا اُس کے تدارک کی فکر سے بھی غافل نہ تھے۔ لیکن اہوس ہے کہ اس غلٹ سے ابھی سبکات نہ ہوئی تھی کہ اُن کو ایک ایسی لاعلاج مصیبت پیش آئی جس کا اعادہ کرنا اُس سے زیادہ سخت مصیبت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ۱۸۹۶ء کے نصف اخیر میں اُس بیٹے کی علالت اور سوء مزاج نے جس پر نہ صرف باپ کو بلکہ تمام قوم کو فخر تھا سرسید کو آوے کی طرح بٹھا دیا۔ گو یہ ظاہر وہ اس مصیبت کو اخیر دم تک نہایت صبر اور خاموشی کے ساتھ اور ایسے تحمل کے ساتھ جس کی نظیر ملنی مشکل ہے، برابر جھیلے رہے مگر یہ صدمہ اندر ہی اندر کام تمام کرتا جاتا تھا۔ جو تلخ اور ناگوار حالت اس زمانے میں اُن پر گزری اس کا کسی قدر اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مرض الموت میں ایک بڑے ڈاکٹر نے اُن کے ملاحظہ کے بعد لوگوں سے کہا کہ اگر یہ صدمہ اُن کو نہ پہنچتا تو اُن کے قویٰ ایسے عمدہ تھے کہ پندرہ بیس برس تک اور زندہ رہ سکتے تھے۔ باوجود ایسی تلخ حالت کے کبھی کسی نے اس کو وہ وقار شخص کی زبان سے کوئی شکایت یا افسوس کا کلمہ نہ سنا ہو گا۔ مرنے سے دو ڈیڑھ مہینے پہلے اُن کو چپ لگ گئی تھی، بولتے بہت کم تھے اور نہاں

اور نہیں کے سوا بات کا بہت کم جواب دیتے تھے۔ اُن کے بار غلام حسن الملک
 اور سید زین العابدین خاں گھنٹوں اُن کے پاس خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ محبت
 کا لطف بالکل جاتا رہا تھا۔ ایک دن سید زین العابدین خاں نے پوچھا کہ آپ
 ہر وقت خاموش کیوں رہتے ہیں؟ سر سید نے کہا ”اب وہ وقت قریب
 ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہو گا۔ اس لیے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں۔“
 بایں ہمہ قومی خدمات کی دھن اور خاص کر کالج کی بہبودی کا خیال کبھی اُن
 کے دل سے فراموش نہ ہوتا تھا۔ اُسی حالت میں انھوں نے متعدد آرٹیکل تعلیم پر
 لکھے۔ انھیں دنوں میں اردو زبان اور فارسی خط کے خلاف جب تیسری بار
 جھگڑا اٹھا تو انھوں نے اس معاملہ کی نسبت پھر اپنی قدیم رائے مرنے سے آٹھ
 دن پہلے ظاہر کی اور گورنمنٹ کو اس کی طرف توجہ دلائی اور جو کمیٹی اس آباد میں اردو
 زبان اور فارسی خط کی حمایت کے لیے قائم کی گئی تھی اُس سے خط و کتابت کی
 اور باوجود ہر طرح کی مفذوری کے تا بمقدور اس کی تائید کرنے کا وعدہ کیا
 انھیں دنوں میں ایک عیسائی نے رسالہ اُتھات المؤمنین اسلام کے برخلاف
 شائع کیا تھا جس میں آنحضرت صلیع کی ازواج اور آپ کے اخلاق پر نہایت دیدہ
 دہنی سے اعتراض کھے تھے۔ سر سید نے اول بطور تمہید کے ایک آرٹیکل اصول
 تنقید روایات پر اسی رسالہ کو دیکھ کر لکھا اس کے بعد اُس کا جواب لکھنا شروع
 کیا۔ یہ جواب ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ۲۴ مارچ ۱۸۷۷ء کو احتساب بول کا
 عارضہ ہوا۔ صاحب مول مرحن عبد گربہ بڑی توجہ سے علاج کرنے لگے اور میرٹھ
 کے مشہور میڈیکل آفیسر ڈاکٹر موریاٹی کو بھی مشورہ کے لیے بلایا گیا مگر چونکہ

وقت موعود آ پہنچا تھا کوئی نمد سیرکار گرنہ ہوئی ۲۶ کی شام کو علاماتِ رویتہ
ظاہر ہونے لگیں۔ ۲۷ مارچ کی صبح سے نہایت سخت درد سر لاحق ہوا جو اس
بات کی علامت تھی کہ یورک ایسڈ دورانِ خون میں شامل ہو کر جلدِ جسد
و ماغ پر اپنا اثر کر رہا ہے۔ اسی دن شام کو شدید لرزہ کے ساتھ تب
چر محی اور تھوڑی سی دیر میں ہذیان کی صورت پیدا ہو گئی۔ اُن کی عادت
تھی کہ ہمیشہ بیماری کی شدت میں ”حَسْبِيَ اللَّهُ وَكَفَى الْوَكِيلَ“ بار بار پڑھا کرتے
تھے۔ اس واقعہ بھی ہذیان کی حالت طاری ہونے سے پہلے قرآن کی یہ دو
آیتیں برابر اُن کی زبان پر جاری رہیں۔ حَسْبِيَ اللَّهُ وَكَفَى الْوَكِيلَ وَنِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ
النَّصِيرُ ۲۱ اِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَيْكَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ
وَقَبَلُوا وَسَلَامًا“ مگر تب کی شدت اور ہذیان کی حالت میں کوئی بات جو سمجھ
میں آئے اُن کی زبان سے نہیں نکلی۔ گویا کہ تب کے چڑھتے ہی تھوڑی دیر
بعد احتضار شروع ہو گیا تھا۔ تین گھنٹے سخت کرب اور بے چینی رہی اور اس
کے دس بجے حاجی اسماعیل خاں کی کونٹھیں میں جہاں مرنے سے دس بارہ روز پہلے
حالتِ صحت میں وہ سید محمود کی کونٹھی سے اٹھ گئے تھے، وفات پائی دوسرے
دن سارے پانچ بجے دن کے جنازہ اٹھایا گیا۔ مدرسۃ العلوم کاکل اسٹان
اور تمام طالب علم اسٹیشن کے یورپین اور ہندوستانی افسر اور اہل کار، علیگڑھ
کے رئیس اور سردار جبہ کے مسلمان ہندو اور عیسائی اس کثرت سے جنازہ
کے ساتھ تھے کہ غالباً علیگڑھ میں اس نوعیت کا ازدحام کسی نے نہ دیکھا ہو
سکا۔ جو راج مزدور رٹھنی اور سنگلاش ۲۵۔۲۶ برس سے کالج میں کام کرتے
تھے وہ اور اُن کی عورتیں اور بچے جو دیہانیت سے یہ خبر سن کر آنے تھے جنازہ
کی گزرگاہ کے ایک جانب کھڑے ہوئے نہایت حسرت بھری نگاہ سے

اپنے مربی کے جنازہ کو تک رہے تھے اور اکثر طالب علم ناز و قطار روتے جاتے تھے۔ الغرض ۶ بجے کے بعد کرکٹ فیلڈ میں جنازہ کی نماز ہوئی۔ منار کے بعد جب جنازہ فیلڈ سے بورڈنگ ہاؤس کے احاطہ میں داخل ہوا تو گاڑی آف آئر تے جو گورنمنٹ کی طرف سے مامور ہوا تھا۔ پریوینٹ اوف آفس کی سلامی اتاری اور قبیل مغرب مسجد مدرستہ العلوم کے شمالی پہلو پر جو تھوڑی سی جگہ مسجد کی حد سے خارج اس کے احاطہ کے اندر بے کاری پڑی تھی، وہاں اس قوم کی امید گاہ اور پشت پناہ کو دفن کیا گیا۔

قوم را سرما پیہ مجدد علا از دست رفتہ
بعد از ان کایں گنج را در خاکاں انداختند

تا قیامت گوئی از تاراج ما فارغ شدند

کایں مصیبت بر سر اسلامیان انداختند

اگرچہ سرستید کی وفات کی بے شمار تاربتیں کھم گئی ہیں لیکن دو عربی
لوے عجیب و غریب نکلے ہیں ایک "غَفَا لَکَ" اور دوسری قرآن مجید کی
یہ آیت "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیْ وَ مَطْهَرُکَ"

اس شخص کے مرنے پر جس غیر معمولی طریقے سے نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ
غیر قوموں نے اور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ غیر ملکوں میں بھی رنج و افسوس
کا اظہار کیا گیا ہے، اس کی مثال ملنی دشوار ہے۔ تعزیت کے کچھ کم دو سوتار جن
میں سے کسی قدر ذریعہ کالج میگزین کے شائع کیے گئے تھے، اطراف ہندوستان

۱۔ اس آیت میں عیسیٰ کی طرف خطاب ہے جس میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے عیسیٰ میں تجھ
کو موت دیتے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھالینے والا ہوں اور تجھ کو کافروں کے انجام سے
پاک کرنے والا ہوں ۲۔

سے اُن کے بیٹے کے نام پہنچے اور تمام ہندوستان میں شاید ہی کوئی اسلامی انجمن یا سوسائٹی ایسی رہ گئی ہوگی جس میں سرسید کی وفات پر ماتمی جلسہ اور رنج و ملال کا اظہار نہ کیا گیا ہو۔ حضور وائسرائے اور نواب لٹنٹ گورنر کے علاوہ اکثر لوید پین افسروں اور حاکموں نے بذریعہ تار یا تحریہ یا تقریر کے اس بزرگ کی موت پر رنج ظاہر کیا۔ نواب لٹنٹ گورنر نے صاحب کلکٹر علیگڑھ کو بذریعہ تار کے اطلاع دی کہ ہزار آخر کی طرف سے جنازہ کی مشابعت اور دفن میں شریک ہوں تاکہ میں کوئی انگریزی یا دیسی اخبار ایسا نہ ہوگا جس میں بار بار اس عالمگیر حادثہ پر آڑ کھل یا نوٹ نہ کھکھے گئے ہوں اور بہت سے اخباروں نے تو آج تک اپنے کالم اس مضمون کے لیے وقف کر رکھے ہیں، لندن کے بڑے بڑے نامور اخباروں میں ایسے ٹائمز آف لندن، پال مال گزٹ، ایوننگ سینڈرڈ، ایکو، پیپل، ڈیلی میل، لائٹنڈ، ایوننگ نیوز وغیرہ وغیرہ اس واقعہ کو ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک نہایت اعلیٰ درجے کی پوشکل طاقت کے زوال سے تعبیر کیا گیا اور اینگلو امڈین اور مسلمانوں دونوں کے لیے ایک عام مصیبت بیان کیا گیا۔

انگلستان میں جو ایک مسلمانوں کی سوسائٹی موسوم بہ ”مسلم پیٹر یا ملک لیگ“ ہے اُس میں بھی سرسید کی وفات پر ایک ماتمی جلسہ کیا گیا جس میں مولوی رفیع الدین احمد نے ایک ریزولوشن اس مضمون کا پیش کیا تھا کہ سرسید کی خدمات کا شکریہ اور اُن کی وفات پر رنج و افسوس اور اُن کے وارثوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جائے۔ ٹائمز آف لندن نے بھی اس جلسہ کا ذکر کیا تھا اور سرسید کی وفات پر ایک لمبا آرٹیکل چھاپا تھا جس میں لکھا تھا کہ توہ (یعنی سرسید) اپنے ہم مذہبوں کی حمایت میں اُن کو سائنس کے

حملوں سے بچانے کے لیے ہمیشہ تیار رہے ہیں اور خود ہمارے کالموں نے اور بعض بڑے بڑے میگزینوں نے ان کی اس علمی اور منطقی لیاقت کی شہادت دی ہے۔ جو انھوں نے اپنی قوم کی حمایت میں ظاہر کی۔ اس کے بعد اُس میں لکھا تھا کہ ”کسی شخص نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان کو اپنے تنزل اور خاص کر تعلیم کے ضروری معاملے کا خیال دلوانے میں ان کے کام کا دسواں حصہ بھی نہیں کیا۔ فی الحقیقت جب اس معاملے میں ان کی عمر بھر کی لگاتار کوششوں اور تعجب انگیز کامیابیوں کو دیکھا جاتا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کا پیغمبر کہا جائے۔ علیگڑھ کی سوسائٹی اس کا مطبع، اُس کا اخبار اور محمدن کالج جو کیمبرج اور آکسفورڈ کے کالجوں کے نمونے پر مسلمانوں کی شریف قوموں کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ سب اُن کی بہت عقل اور فراخ حوصلی کی شاندار یادگاریں ہیں۔“

پال مال گزٹ مورخہ ۲۹ مارچ میں سرسید کی نسبت لکھا تھا کہ ”سرکار انگلیزی اور باشندگان ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اس قدر مبارک باد دے سکیں جس قدر سرسید احمد خاں کی زندگی پر۔ وہ ابتدائے عمر سے آخر دم تک انگلیزی راج کا پکا دوست رہا اور جو خدمتیں اُس نے کیں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہو گا۔“

انگلستان کے اخباروں کے حوالہ سے یورپ کے اکثر اخباروں میں اور نیز ممالک اسلامیہ کے بعض عربی اخباروں میں بھی اس حادثہ پر افسوس کیا گیا تھا۔ چنانچہ الموبید میں انھیں کے حوالہ سے لکھا تھا کہ مسلمانوں میں سید مرحوم ایک بڑے زبردست پرورش تھے اس لیے مرحوم کی وفات اسلامی دنیا میں ایک عالمگیر مصیبت خیال کی گئی ہے۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور

مسلمانوں کو ان کا نعم البدل عنایت کرے۔

پابونیر سورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۷۷ء میں اس واقعہ کی خبر پہنچتے ہی یہ لکھا گیا تھا کہ ”سر سید احمد خاں جو ایک دور اندیش مدبر ہونے کی وجہ سے تعلیم کا نہایت سرگرم حامی تھا اُس کے انتقال کے ساتھ اُس نہایت مفید بار آور اور نہایت زبردست یوٹیل طاقیت کا خاتمہ ہو گیا ہے جس نے موجودہ صدی کے اخیر ربع میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کو متحرک کر دیا تھا۔“

ٹائمز آف انڈیا سورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۷۷ء میں جو ایک آرٹیکل کسی اینگلو آئین کا لکھا ہوا اس واقعہ کے متعلق چھپا تھا اُس میں سر سید کی نسبت لکھا تھا کہ ”اُس کا یہ خیال تھا کہ اسلام کو دوبارہ اس درجہ پر پہنچا دیا جائے جو بارہویں صدی عیسوی میں علم و حکمت کا مری ہوئے کی حیثیت سے اُس کو حاصل تھا جو اسپین، انگریزوں اور ہندوستانوں نے اطراف ہندوستان کے نامی جلسوں میں سر سید کی وفات پر کی ہیں وہ گنتی اور شمار سے خارج ہیں، یہاں ہم صرف دو معزز اور لائق انگریزوں کی تقریر کا خلاصہ لکھتے ہیں، جن کو مدت دراز تک علیگڑھ میں رہنے اور سر سید سے ملنے جلنے اور ان کے حالات پر غور کرنے کا اتفاق رہا۔“

مسٹر پوپٹر کلکٹر و مجسٹریٹ میرٹھ نے جو تقریر میرٹھ کے نامی جلسہ واقع ماہ اپریل ۱۸۹۸ء میں کی اُس میں انھوں نے کہا ”آج اس جلسہ میں ہم پر ایک غم کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ سر سید احمد کے انتقال سے نہ صرف ملک نے ایک بڑا رکن سلطنت اور قوم کا بڑا خیر اندیش کھودیا ہے بلکہ حاضرین جلسہ میں سے اکثر کا ایک ذاتی دوست ہاتھ سے جاتا رہا ہے۔۔۔۔۔ اگر میں نے اُس کی زندگی کے مطالعہ میں غلطی نہیں کی تو (میں کہہ سکتا ہوں) کہ جہاں اُس میں اور

بڑے بڑے اوصاف موجود تھے اُن میں دو بہت ہی اعلیٰ درجہ کے تھے۔
 اول اُس کی اعلیٰ درجہ کی حب الوطنی اور دوسری اعلیٰ درجہ کی دلیری اُس نے
 گویا ابتداء سے ہی میں معلوم کر لیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان بالواسطہ
 جہالت میں ڈوبتے جاتے ہیں اور اُن کو روشن ضمیر بنانے کی سخت ضرورت
 ہے۔ بڑی بڑی قومی ضرورتیں رفع کرنے کے لیے ہمیشہ بڑے آدمی درکار ہوتے
 ہیں اور یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ ایسا بڑا شخص اُن
 کی ضرورت رفع کرنے کو اٹھا۔ سر سید احمد نے مجبوری کے ساتھ اپنے
 تئیں تقدیر کے حوالہ نہیں کیا اور نہ اُس نے گورنمنٹ سے مدد چاہی کیونکہ وہ
 جانتا تھا کہ جو کام اس کو ہمیشہ ہے اگر اُس کو پورا کرنا ہے تو قوم ہی اس کو
 پورا کرے گی اور اس لیے اس نے زندگی کے ایک ایسے زمانے میں جب
 کہ ہم میں سے اکثر ہاتھ پاؤں ہلانے سے جی چراتے ہیں اور باقی عمر کو اپنی ذاتی
 آسائشوں اور ذاتی افزائشوں کے لیے مخصوص کر دیتے ہیں، اپنا وقت، اپنی
 طاقت، اپنا روپیہ، اور سچ پوچھو تو اپنا سب کچھ ہم جنسوں کی بھلائی کے لیے
 وقف کر دیا۔ ہم میں سے جو یہاں موجود ہیں کوئی شخص ان مشکلات کا جن کا
 اُس کو مقابلہ کرنا پڑا اور اس عزم جزم کا جو ان مشکلات کے مغلوب کرنے
 کے لیے مطلوب تھا، تصور اور اندازہ نہیں کر سکتا لیکن باوجود تمام مشکلات
 اور تمام ناامیدیوں کے وہ اپنے منصوبہ پر کامل وثوق رکھتا تھا اور اُس کو اپنی
 کوششوں کا ثمرہ مل گیا۔

اس کے بعد مسٹر پورٹرنے کالج کی ابتداء اور اُس کی ترقیات کا ذکر
 کرنے کے بعد کہا کہ "لندن کے سینٹ پال کییتھدرل میں سر کرٹوفرن

کی لاش مدفون ہے اور اُس کی قبر پر لٹین میں یہ مشہور کتبہ کندہ کیا ہوا ہے کہ اگر تم اُس کی یادگار تلاش کرنی چاہتے ہو تو اپنے چاروں طرف دیکھو جن لوگوں نے یہ کتبہ دہاں کندہ کرایا تھا انھوں نے خیال کیا اور صحیح خیال کیا کہ اس بڑے نقاش کی سب سے عمدہ یادگار یہی نامی گر جا ہے جو اُس کے مجوزہ نقشہ پر بنایا گیا ہے۔ اسی طرح جب تم سے لوگ مر سید کی یادگار پوچھیں تو تم بھی اُس عالیشان کالج کو بتا سکتے ہو جس کی بنیاد اُس نے ڈالی ہے اور کہہ سکتے ہو کہ اپنے چاروں طرف دیکھو۔ لیکن اگر تم اور تمہاری آیندہ نسلیں اپنے بڑے سید کی زندگی کے سبقوں کو خوب ذہن نشین کر لیں گی تو اُس سے بھی زیادہ عالیشان یادگار اُس کے لیے قائم کریں گی۔ تم نہ صرف سب سے جان پہچانینٹ اور سارے کو بلکہ ایک بڑے قومی کلچر کی زندہ اور زندگی بخش طاقت کو اور اُس کے تعلیم یافتہ گروہ کی بے سقم تربیت، حب الوطنی، خود اعتمادی اور سب سے بڑھ کر ان کی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی طاقت کو پیش کر سکو گے۔

”و صاحبو! ایک ایسے وقت میں جیسا کہ یہ وقت ہے میں جو ایک مختلف کونسل کا ممبر اور مختلف مذہب پر یقین رکھنے والوں آپ سے ایک درخواست کر سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم تمام اختلافات اور حسد اور عداوت کو جس نے تمہیں متفرق کر رکھا ہے اپنے مرحوم سید کی قبر میں دفن کرنے پر راضی ہو جاؤ۔ خفیہ خفیہ باتوں یا مذہبی خیالات میں تم مر سید کے ساتھ یا باہم گر کیسا ہی اختلاف رکھو مگر تم سب کو اُس عالیشان جانفشانی کی جو اُس نے اسلام کی حمایت میں ظاہر کی اور اُن اعلیٰ نتائج کی جو اس جانفشانی کی وجہ سے اُس نے حاصل کیے؛ فائدہ کرنی چاہیے۔ اگر تم صرف اُس کے کام ہی کو جاری رکھو گے تو یقیناً تم کو کامیابی حاصل ہوگی کیونکہ میں تم کو یاد دلانا ہوں کہ دنیا میں اتفاق

اور صرف اتفاق ہی کا نام طاقت ہے۔

مسٹر آرنلڈ نے جو انجمن اسلامیہ لاہور کے ہاتھی جلسہ واقع ۲۹ مارچ سنہ مذکور میں سرسید کی وفات پر تقریر کی اس کا ترجمہ ہم اول سے آخر تک نقل کرتے ہیں انھوں نے کہا، میں امید کرتا ہوں کہ اس موقع پر مجھ کو اس کا لحاظ سے کہ دس برس تک اس بزرگ اور شریف آدمی کی خدمت میں مجھے رہنا نصیب ہوا ہے جس کی مرثیہ پر ہم اس وقت رنج و الم ظاہر کرتے ہیں، چند الفاظ کہنے کی اجازت دی جائے گی۔

مجھ کو دس برس تک اس عجیب و غریب اور بالاترین شخص سے تقرب اور دوستی کی عزت حاصل رہی ہے۔ نہیں نہیں بلکہ فرزند کے شفقت بھرے لفظ سے انھوں نے مجھ کو مخاطب کیا ہے۔ اس دس برس میں سوئے زمانہ تعطیل کے مجھ کو سرسید سے روزانہ ملنے جلنے کا اتفاق رہا۔ ان کا مکان میرے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھا جس کا دروازہ ہر وقت میرے لیے کھلا رہتا تھا جس قدر سرسید سے کوئی شخص زیادہ واقف ہوتا تھا اسی قدر ان کی بزرگی اور عظمت کا زیادہ معترف ہوتا تھا کیونکہ حقیقی عظمت کا اگر کوئی انسان مستحق ہو سکتا ہے تو یقیناً سید احمد خاں اس کے مستحق تھے۔ تاریخ سے معلوم ہو گا کہ دنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں لیکن ان میں مہبت کم ایسے نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز اوصاف اولیاتیں مجتمع ہوں، وہ ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق، علم کا حامی، قوم کا سوشل ریفارمر، پولیٹیشن، مصنف اور مضمون نگار تھا، اس کا اثر اس سوچنے والے عالم کا سا نہ تھا جو گوشہ تنہائی میں بیٹھا اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل اکساٹے بلکہ علانیہ دنیا کے سامنے لوگوں میں لوگوں کا رہبر بن کر اس لیے آیا کہ جس بات کو صحیح اور صحیح سمجھے۔

اگر اس کی دنیا مخالف ہو تو ساری دنیا سے لڑنے کے لیے ہر وقت تیار اور آمادہ رہے۔ ہندوستان میں ہم کو ایسے شخص کی مثال جیسا کہ وہ ننھا کہاں مل سکتی ہے کہ نہ جاہ و مرتبہ تھا اور نہ دولت تھی باوجود اس کے ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم کا سردار بن کر ظاہر ہوا۔ یہ وہ مرتبہ ہے جو اس سے پہلے کسی شخص کو بغیر تلوار کے زور کے حاصل نہیں ہوا۔ سرسید نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ لاہری، غفلت، جہالت اور ذلت سے جن میں وہ مبتلا تھے اپنے تئیں نکالیں اور دیکھو اس کی پکار پہ ایک نئی نسل اٹھ کھڑی ہوئی۔ لوگوں نے سرسید کو چھوٹا سمجھا، ان کی باتوں کو بدعتی پر محمول کیا اور چاروں طرف سے ان پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہوئی مگر اس نے تمام مخالفوں کو سامنے سے ہٹایا اور رستے کی تمام خس و خاشاک کو صاف کرتا ہوا اس منزل کی طرف سیدھا ہویا جس پہ پہنچنا مقصود تھا۔ جو مضروبے وہ باندھتا تھا ان کی طرف سے اول گورنمنٹ کو اطمینان دلانا ہوتا تھا جو اہتدائیں اس اندیشہ سے کہ وہ کہیں سلطنت کے احکام اور پاک کے امن میں خلل اُٹانے نہ ہوں مطمئن نہ تھی اور پھر اپنے ہم مذہبوں کے تعصبات اور اوہام سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا جو سرسید سے اس لیے بدگمان تھے کہ اس نے مذہبی مسائل میں ایک نیا اسکول قائم کیا تھا جس کی وجہ سے وہ اس کو ملحد اور بے دین کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس میں ہم نہایت مضبوط شہادت سرسید کی طبیعت کی اس متفناطیسی قوت پر باتیں ہیں جس سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرتی تھی۔ وہ ایک ایسی قوم میں جس کی قومیت کی بنیاد صرف مذہب پر قائم ہو اور ایسی حالت میں جب کہ وہ نیچری اور کافر سمجھا جاتا ہو اپنی قوم کو مسلم سردار لگا لیا۔ تاریخ اسلام میں بہت سی مثالیں ایسی تحریکوں کی پائی جاتی ہیں جن کو مذہبی پیشواؤں نے

شروع کرتے تھیں تاکہ پہنچایا اور ہزاروں پیرانہ لوگوں میں سے جو مذہبی خیالات میں اشتراک رکھتے تھے پیدا کرے۔ لیکن کوئی شریک (جیسا کہ میں یقین کرتا ہوں) اسلام کی تاریخ میں ایسی نہ ملے گی جس میں ایک مسلمان شخص ایسے مسلمانوں کا سرکار تسلیم ہوا ہو جو اس کے مذہبی خیالات سے ہمدردی نہ رکھتے ہوں۔

”جب سر آرک لینڈ کالون ہندوستان سے جانے لگے تو علی گڑھ میں آئے اور اپنے دوست سید احمد خاں کے ذکر میں جن کو انھوں گریٹ ہین کے لفظ سے یاد کیا تھا غدر کے اس ہولناک زمانے کا ذکر کیا جب کہ لوگوں کے دل عداوتوں سے بھرے ہوئے اور انتقام کے خیالات دلوں میں موج زن تھے انھوں نے کہا کہ ”اس وقت کیا ہندوستانیوں میں اور کیا انگریزوں میں سرسید پہلے شخص تھے جنھوں نے اس سوال کی طرف توجہ کی کہ اس خرابی کا کیوں کر علاج ہوا اور حاکم و محکوم میں کس طرح آشتی پیدا ہو۔“

”سرسید نے قدرتشہ کے بعد سب سے پہلے انگریزوں اور ہندوستانیوں میں دوستی پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس وقت سے مرنے دم تک وہ اسی بات میں کوشش کرتے رہے کہ قلم سے زبان سے اور نصیحت و تنبیہ سے حاکم اور محکوم کے زخموں پر مرہم لگائیں اور ان میں ایک مضبوط اتفاق پیدا کریں۔“

”آپ کو معلوم ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے سرسید کی قدر و منزلت ہوئی لیکن یہ عزت اور خطاب ہمیشہ بے طلب آنے لگا۔ دنیا کے سبک طبیعت لوگ اس بات پر جس قدر ان کا جی چاہے بھونکے لیکن میں جو برہمنوں سے سرسید کو جانتا ہوں اس بات کو سچ سمجھتا ہوں ہیں آج تک کبھی کسی ایسے شخص سے نہیں ملا ہوں جس نے سرسید سے

زیادہ شریف و نیکو گانی بسر کی ہو جو جاہ طلبی میں ان سے زیادہ بے غرض ہو اور جو ان سے زیادہ سچ کا حامی اور دوسروں کی خدمت پر اپنے تئیں وقف کر دینے والا ہو یہی وجہ ہے کہ یہاں آج ہم اسکی ہوت پر رشتے ہیں اب اس جیسا کوئی کہا نہیں گاتا۔

”ایک اور بات یہ گئی ہے جس کو میں اس وقت کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ کے یہ انس و جنوں نہیں ہیں اور آپ جو سرسید کے ہم مذہب اور ثنا خواں ہیں اگر آپ کا یہ غم و الم سچا ہے تو کیا آپ کو رونے کے علاوہ کوئی اور کام باقی نہیں ہے؟ سمجھ لیجیے کہ یہ شخص جس کو آپ دوسرے ہیں یہ اس قدر مفلس تھا کہ نہ اس کے پاس رہے کہ گھر تنہا نہ مرنے کو، لیکن پھر بھی اس نے ایک دولت آپ کے لیے چھوڑی ہے وہ آپ ہی کیلئے یہ کام چھوڑ گیا ہے کہ تعصب اور جمالت کے مقابلہ میں شریفانہ لڑائی جاری رکھو اور آپ ہی کے پیرو یہ کام کر گیا ہے کہ اپنی افتادہ قوم کو اٹھاؤ اور موجودہ فرائض زندگی جو کچھ ہیں ان سے اپنی قوم کی مصالحت کراؤ۔ اس شخص نے آپ کے لیے ایک ایسی مثال چھوڑی ہے کہ اگر آپ نے اس کی پیروی کی تو وہ آپ کے اور آپ کی اولاد کے قبضہ میں سب سے بڑی دولت ہوگی۔“

جس قدر مرثیے اردو، فارسی اور انگریزی میں اس حادثہ پر لکھے گئے ہیں ظاہر واقعہ کہ بلا کے بعد کسی شخص کی موت پر نہ لکھے گئے ہوں گے کہتے ہیں کہ جعفر بن یحییٰ برمکی اور معن بن زائدہ شیبانی کے مرنے پر بھی شعرا نے عرب نے بے شمار مرثیے لکھے تھے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ تعداد میں سرسید کے مرثیوں سے کچھ کم نہ تھے تو بھی وہ مرثیے ان مرثیوں سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔ ان میں شعرا اپنے ذاتی فائدوں اور شخصی منفعتوں کو روتے تھے جو ان کی ذات کو جعفر اور معن کے بذل و عطا سے ہمیشہ پہنچتی تھیں اور ان میں اس نقصان عظیم پر

افسوس کیا گیا ہے جو قوم کے تمام افراد کو ایک شخص کے مرنے سے پہنچا ہے۔ وہ
ان شخصوں کی شان میں لکھے گئے تھے جو لوگوں کی جیبیں درہم و دینار سے بھرتے
تھے اور یہ اس شخص کے لیے لکھے گئے ہیں جو لوگوں کی جیبیں خالی کرتا تھا۔ ان
کا موضوع ایک خاندان یا ایک قبیلہ کی تباہی پر افسوس کرنا تھا اور ان کا موضوع
تمام قوم کی مصیبت پر رنج و افسوس کرتا ہے۔ عرب کے ایک شاعر اثنیع بن
عمر سلمی نے جو اشعار اپنے باپ کے مرثیہ میں بطور مبالغہ کے لکھے تھے سچ
یہ ہے کہ سرنبد سے بہتر ان کے مضمون کا کوئی مصداق نہیں ہو سکتا۔

مَضَى بِنِ سَجِيلٍ حِينَ لَمْ يَتَوَقَّ مَشْرِقُ وَلَا مَغْرِبُ إِلَّا لَعْنُ فِيهِ مَا دَخَ
وَمَا كُنْتُ أَذْرِي مَا فَرَّضَ كَفَّهُ عَلَى النَّاسِ حَتَّى عَيَّيْتَهُ الْفَضَائِلَ
كَأَنَّ لَمْ يَكُنْ حَتَّى سَوَاءٌ وَلَمْ تَعْلَمْ عَلَى أَحَدٍ إِلَّا عَلَيْهِ النَّوَاحِلُ

ترجمہ: ابن سعید گزر گیا جب کہ مشرق اور مغرب میں کوئی جگہ ایسی نہ رہی جہاں
اُس کا کوئی نہ کوئی ملاح نہ ہو جب تک کہ وہ قبر میں دفن نہ کیا گیا ہی نہیں جانتا
تھا کہ لوگوں پر اُس کے قدر احسانات ہیں گویا اس کے سوا دنیا نہ کوئی زندہ
آدمی سربے اور نہ کسی پر فوجہ کیا گیا ہے۔

مجموعہ ان بے شمار مرثیوں اور نوحوں کے جو اس حادثہ عظیم پر لکھے گئے ہیں
چند اشعار ایک یورپین فاضل میڈی نے بھی انگریزی زبان میں ترتیب
دیئے ہیں چونکہ شرمی دنیا میں شاید یہ پہلی ہی مثال ہے کہ ہندوستان کے
ایک مسلمان کی موت پر انگلستان کی ایک شریف لیڈی ایک نظم بطور مرثیہ
کے اپنی زبان میں لکھے اس لیے ہم اس لطیف سوٹ (مرثیہ) کا ترجمہ اس
مقام پر لکھتے ہیں:

وہ ایک تنادر درخت جہاں کھڑا تھا وہیں گر پڑا۔ اُس کی سایہ فاشائیں

جو چاروں طرف دور تک جھومتی تھیں صحت بخش شبنم ان سے ٹپکتی
تھی اور انھوں نے کثرت سے بیج بکیرے تھے، ان کے سایہ
میں بنجر زمین اصلاح پا گئی۔

بیج پھوٹ نکلے، شگفتہ و شاداب پھول کھلنے لگے اور خوب صورت
نوںہالوں نے جو طاقت اور حس سے آراستہ تھے اس ویرانِ رگستان
کو گلزار بنا دیا۔ روؤ! اب شاہانہ درخت کے لیے کہ اجل نے اُس
کو گرا دیا ہے۔

غم کرو: مگر امید کے ساتھ، کیونکہ اس کی بہری بھری کھیتیاں جو اُس کی
سالہا سال کی محنت کا ثمرہ ہیں اُس کی قبر کے گرد لہلہا رہی ہیں جن
نوںہالوں کو اُس نے اپنی چھالوں میں پرورش کیا تھا وہ پھول رہے ہیں
اور پھیک رہے ہیں۔ یہ نوںہال بھی اُسی کی ماتِ زندہ رہیں
گے تاکہ کسی ویرانہ کو گلزار بنا جائیں۔

سرسید کی ذہانت پر لوگوں نے صرف زبانی مدح و ثنا اور مرثیہ خوانی و
نوحہ خوانی ہی پر بس نہیں کی بلکہ علیٰ طوع و سر اس بات کا کافی ثبوت دیا ہے کہ
یہ شخص اپنی راست بازی اور خلوص سے ایک عالم کے دل میں اپنی عظمت کا
نقش بٹھا گیا ہے اور اپنی محبت کا بیج بو گیا ہے اور قومی ہمدردی کی چٹیک ایک
ایسی مردہ دل قوم کو لگا گیا ہے جو سرد مہری میں ضرب المثل اور نا اتفاقی میں
شہرہ آفاق تھی۔ سرسید کے مرتے ہی کچھ لوگ ان کی ایک عظیم الشان یادگار
یعنی محمدن یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے جن کا اپیل مسلمانوں نے
اور خاص کر پنجاب کے زندہ دل مسلمانوں نے بڑی توجہ اور نہایت دُور
شوق سے سنا اور اس کی تائید پر فوراً کمر بستہ ہو گئے۔ اہل پنجاب نے

سخت تقاضوں سے ان کو لاہور میں بلایا اور اٹھانے راہ میں اسی گرجہ پوشی کے ساتھ
 جیسی کہ سرسید کے استقبال میں ظاہر کی جاتی تھی، ان کی آؤ بھگت اور مدارات
 کی گئی۔ یونیورسٹی کے لیے مالیر کوٹلہ اور لاہور میں بڑی اسٹاک اور چافڑ سے لوگوں
 نے چندہ دیا اور صرف صوبہ پنجاب سے دو لاکھ روپیہ جمع کرنے کا وعدہ
 کیا گیا۔ لاہور کے جلسوں میں سرسید کی تصویریں جن کی آئینہ دو آنے سے زیادہ قیمت
 نہ تھی پانچ پانچ روپیہ کو لوگوں نے خریدیں بعض جواں مرد تاجروں نے اپنے
 منافع کا ایک معتد بہ حصہ سرسید کی یادگار کے لیے مخصوص کر دیا۔ اکثر تھوڑی
 تھوڑی تنخواہ کے ملازموں نے اپنی ایک ایک یوسی تنخواہ چندے میں دیدی۔
 کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ نے بڑے شوق سے چندہ جمع کیا۔ طالب علموں
 کی ایک جماعت نے خاص اس کام کے لیے دوکان لگائی تاکہ جو کچھ اُس سے
 فائدہ ہو اس فنڈ میں جمع کیا جائے پنجاب کے سوا اور اطراف میں بھی اس
 کی تحریک شروع ہو گئی ہے یہاں تک انگلستان میں جو مسلمان طلبہ کی
 ایک مختصر جماعت نے انجمن اسلامیہ قائم کر رکھی ہے اس میں بھی گرجہ پوشی
 سے چندہ کی تحریک ہوئی اور پہلے ہی جلسے میں حاضرین نے بیس پونڈ دینے
 کا وعدہ کیا اور آئندہ چندہ کے لیے کوشش کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اضلاع
 شمال و مغرب کے بعض مقامات میں بھی معقول چندہ کیا گیا ہے اور دکن میں
 بھی اس کے لیے تحریک ہو رہی ہے۔ چندہ کی تعداد صرف تین مہینے میں ہی
 پچاس ہزار تک پہنچ گئی ہے جس کی ہرگز توقع نہ تھی۔ نواب محسن الملک جنھوں
 نے درحقیقت سرسید کا جوا اپنے کندھے پر رکھا ہے ان کو مسلمان اسی
 نگاہ سے دیکھتے ہیں جس نگاہ سے کہ سرسید کو دیکھتے تھے اور ہر شخص کی نظر
 میں ان کی وقعت ویسی ہی ہے جیسی ان کے اُس بڑے پیش رو کی تھی۔

یہ تمام علامتیں اس بات کی ہیں کہ مسلمان قومی خدمات کی قدر کرنے لگے ہیں اور قومی ہمدردی کی آگ جو سرسید کے سینے میں شعل تھی اُس کو وہ اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے گئے بلکہ اُس کی آہ و بکا در پہنچ گئی ہے اور اُس ایک چراغ سے بہت سے چراغ روشن ہو گئے ہیں۔ اکثر لوگ اُن انگریزوں کی ہمدردی پر تعجب کرتے ہیں جو سرسید کی یادگار کے چندہ میں بہت خوشی سے شریک ہوئے ہیں خصوصاً لارڈ سٹیلی کا انگلستان سے دو سو پونڈ بھیجنا اور مسٹر آر نلڈ کی تحریک سے لاہور میں اسی مقصد کے لیے ایک یونیورسٹی کمیٹی کا قائم ہونا، بڑے بڑے افسروں کا اس میں شریک ہونا اور معقول رقمیں چندہ میں دینا بڑے استعجاب کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے مگر ہم کو اس سے کچھ تعجب نہیں ہوا، ان لوگوں کا ضمیر اس سرزمین کی خاک سے ہے جہاں بنی نوع کی بھلائی کے کاموں میں لوگ اڑ کر شریک ہوتے ہیں، انسانی ہمدردی اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، وہ اپنے قومی ریغاریروں کی کوشش سے اعلیٰ مدارج ترقی پر پہنچے ہیں اور اس لیے ہر قوم کے رفارمر اور ہر ملک کے ہیرو کی دل سے عزت کرتے ہیں اور اُس کی یادگار قائم کرنے کو منجملہ فرائض انسانی کے سمجھتے ہیں۔ پس اُن لوگوں کا ہماری بھلائی کے کاموں میں شریک ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہاں اگر تعجب ہے تو ہم کو اپنی مردہ دل قوم کی حالت پر ہے جو اب سے تیس برس پہلے ہمدردی، قومیت اور ریغاریت کے مفہوم تک سے واقف نہ تھے۔ جنہوں نے سلف کے اوصاف کاموں کو پورا کرنے کا کبھی سبق نہیں پڑھا تھا۔ جو اپنی ذاتی اغراض کے سوا کسی رفاه عام کے کام میں روپیہ خرچ کرنا مطلق نہ جانتے تھے اور بغیر حکام کے رعب و داب کے ایک پسیا ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے۔ ایسی قومیں اپنے ہیرو کی یادگار قائم کرنے کا جوش، یا اُس

کے منصوبہ پرے کرنے کا خیال، یا ایک قومی درسگاہ کو یونیورسٹی بنانے کا ارادہ کہاں سے پیدا ہو گیا؛ بیشک یہ فیج سرسید کے بابرکت ہاتھ کا بویا ہوا ہے جس کو ان کی مساعی جلیلہ کا سب سے اعلیٰ اور افضل نتیجہ سمجھنا چاہیے، کیونکہ اگر ان کی کوششیں انھیں کی ذات پر ختم نہ ہو جاتیں اور قوم میں یہ دلولہ پیدا نہ ہوتا تو ان کی تمام عمر کی جانفشانی اور محنت گویا بالکل رائیگاں جاتی اور اُس گھنگھڑ گھٹا کی طرح جو ایک ناقابلِ زراعت زمین میں خوب زور شور سے برس کر کھل جائے، درحقیقت سرسید کی کوئی پائیدار اور زندہ نشانی دنیا میں باقی نہ رہتی مگر خدا کا شکر ہے کہ اُس نے قوم میں اپنی زندہ یادگار چھوڑی ہے اور قوم کے محبت سے افراد میں وہ اپنا درو مرض متعدی کی طرح پھیلا گیا ہے۔

فَتَى عَيْشٍ فِي مَعْرِزِهِمْ بَعْدَ مَوْتِهِ كَمَا كَانَ بَعْدَ السَّيْلِ فَجْرًا الْفَرْدُ تَعَا
یعنی وہ ایک جہاں مرد تھا جو مرد مر گیا اُس کا فیض زندہ ہے جیسے رو کی گزر گاہ جب رو کا پانی نکل جاتا ہے تو موشی کے لیے ایک سرسبز چراگاہ بن جاتی ہے۔

مصر کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے اپنے سفر یورپ کا حال عربی زبان میں لکھا ہے۔ وہ اہل یورپ کی ملکی اور قومی ہمدردی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ ”اسی خصلت نے ان قوموں کو تمام دنیا کی قوموں سے بالاتر اور بزرگ تر کر دیا ہے۔ یہ لوگ وطن اور قوم کی خدمت کرنے والوں کی صرف اُن خدا کو دیکھتے ہیں جو انھوں نے عام بھلائی کے لیے کی ہیں اور ان کے عیسویں پر مطلق نظر نہیں کرتے۔“ اس کے بعد اُس نے اٹلی، فرانس، انگلینڈ اور روس کے چند وطن دوستوں کے نام لیے ہیں اور ان کے بڑے بڑے اخلاقی میوب جو تاریخ میں مذکور ہیں بیان کیے ہیں اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ ”اُن کے بہنوں۔ اُن عیسویں پر بالکل نظر نہیں کرتے بلکہ اُن کے احسانات کو جو انھوں نے

قوم پر کیے ہیں یاد کر کے اُن کے نام پر سر جھکاتے ہیں، اُن کے سپہجو ملک میں قائم کیے گئے ہیں اُن کی زیارت کے لیے اطراف و جوانب سے آتے ہیں اور اُن کی تعظیم کے لیے سروں سے ٹوپیاں اور تاج آمار لیتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں :

اگرچہ ہماری قوم میں ابھی تک یہ شریف خصلت کیاب ہے لیکن سرسید کی وفات کے بعد جو غیر معمولی جوش و ہمدردی لوگوں نے ظاہر کیا ہے اور جس مگر مجبوشی کے ساتھ سرسید کی یادگار قائم کرنے کا ولولہ قوم میں اٹھا ہے اور جس توجہ اور خوشی سے اُس کے محروں کا اپیل سنا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خصلت قوم میں رفتہ رفتہ ترقی کرتی جاتی ہے لوگ اپنی قومی ضرورتوں سے واقف ہوتے جاتے ہیں اور جو ان ضرورتوں کے رفع کرنے پر کمر باندھتے ہیں اُن کی عظمت دیوں میں بڑھتی جاتی ہے یہی قوموں کی زندہ دلی کی علامت ہے اور یہی وہ صفت ہے کہ جس قوم میں وہ معدوم ہو جاتی ہے وہ قوم جیتنے ہی سر جاتی ہے ۔ ۔ ۔ مجھے یہ ڈر ہے دلی زندہ تو نہ مر جائے کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

مذکورہ بالا تحریر کے بعد معلوم ہوا کہ ۲۳ جولائی ۱۹۰۹ء کو نواب نقشب گوندہ بہادر اضلاع شمال مغرب محض سرسید سمیوریل فنڈ کمیٹی کی تاسیس کے لیے علیگڑھ میں تشریف لائے اور ایک عام جلسہ میں جس میں علیگڑھ اور اس کے گرد و نواح کے رئیس و شریک تھے کمیٹی کے ایڈریس کا جواب دیتے وقت حضور لارڈ ایلگن وائسرائے کشور ہند کی چٹھی جو اس موقع پر اُن کے نام موصول ہوئی تھی، حاضرین کو پڑھ کر سنائی جس میں حضور محمد زین العابدین علیہ السلام کا لُح پر نہایت مُربیانہ توجہ اور کمیٹی کی ان کوششوں پر جو وہ کالج کی ترقی میں کر رہی

ہے۔ کمال نموشنودی عاہر فرمائی تھی اور مسلمانوں کو اور نیز غیر قوموں کو جو تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں اس تحریک کی اعانت پر توجہ دلائی تھی اور لکھا تھا کہ ”میں ہمیشہ اپنے تئیں اس وجہ سے خوش نصیب سمجھوں گا کہ سال گزشتہ میں مجھ کو علیگرہ جہانے کا موقع مل گیا اور سرسید سے ملاقات کرنے اور اس دارالعلوم کو دیکھنے کا جو سرسید کو نہایت عزیز تھا ایسی حالت میں کہ ان کی ذات کا حوصلہ بخش سایہ اُس پر چھایا ہوا تھا، امتیاز حاصل ہوا، اس کے بعد لکھا تھا کہ ”اُس دن کی یادگار میری اس خواہش کو قوی کرتی ہے کہ میں بھی اپنے تئیں اُس کالج کے دوستوں کے زمرہ میں شامل کروں اور اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جوفٹ اب جمع ہو رہا ہے اُس میں وہ ہزارہ کالجندہ شامل کر کے اپنی ہمدردی کا اعلیٰ اظہار کروں امید ہے کہ آپ اندر وہ مہربانی میری اس خواہش سے کبھی کو مطلع کر دیں گے۔“

اس کے بعد ہزارہ کی موجودگی میں حاضرین کے سامنے چٹہ کی خبر سن پیش کی گئی اور اُسی جلسے میں تقریباً پچیس ہزار کا چٹہ جس میں حضور وانسرا نے اور نواب افٹٹ گورنر کا چٹہ بھی شامل ہے، لکھا گیا۔

کسی بزرگ کا قول ہے کہ ”اچھے دوست کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گنجان میوہ دار درخت کہ جب تک سر سبز ہے اُس کے سایہ میں راحت ملتی ہے اور اُس کے پھل سے لذت حاصل ہوتی ہے اور جب خشک ہو گیا تو اپنی لکڑی سے طرح طرح کے فائدے پہنچاتا ہے۔ یہی مثال ہمارے ہیر و سرسید کی تھی۔ وہ بھی مسلمانوں کا ایسا ہی دوست تھا، جب تک زندہ رہا اپنے ہاتھ پاؤں زبان قلم جان اور مال سے اُن کی مدد کرتا رہا اور جب مر گیا تو اپنی محبت اور اپنے کام کی عظمت کا نقش لوگوں کے دلوں میں یادگار چھوڑ گیا تاکہ اُن

کی سچلائی کا کام جو اُس نے ادھر اچھوڑے اُس کو سب مل کر پورا کریں حق
یہ ہے کہ ایسے ہی لوگوں کی شان میں کہا گیا ہے :

جَمَالُ ذِي الْأَرْضِ كَانُوا فِي الْحَيَوَةِ وَهُمْ بَعْدَ الْمَمَاتِ جَمَالُ
الْكِتَابِ وَالسَّيِّ

سرسید کی لائف انکی تصنیفات اور انکے کاموں پر تحقیق

سرسید کی ترقی کے اسباب

ہمارے ملک میں ترقی کا لفظ زیادہ تر عہدہ یا منصب کی ترقی پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ مگر اس موقع پر یہ ایسی ترقی سے ہماری غرض متعلق ہے اور نہ ہمارے نزدیک سرسید نے عہدہ یا منصب کے لحاظ سے ترقی کا کوئی ایسا درجہ حاصل کیا ہے جو ان کی اعلیٰ لیاقتوں کے مقابلہ میں کچھ وزن رکھتا ہو۔ میرے ایک دوست سے ایک لائق انگلشمن نے سرسید کا ذکر کرتے وقت کہا کہ اگر یہ شخص یورپ میں پیدا ہوتا تو کسی بڑی ایمپائر میں وزیر اعظم کے درجہ تک پہنچتا کرنل گریم نے سرسید کی لائف میں ان کو باعتبار پولیٹیکل لیاقت کے سر سالانہ جنگ اول سے دوسرے درجہ پر رکھا ہے۔ مگر اخبار براڈ ایئر و مطبوعہ ۱۳ فروری ۱۸۵۶ء میں اس پر یہ ریمارک کیا گیا تھا کہ "سید احمد خاں کو سر سالانہ جنگ سے دوسرے درجہ پر رکھنے میں ایک ممتاز ہندوستانی جنٹلمین کی قدر و قابلیت کا غلط اندازہ کیا گیا ہے جس کی تمام زندگی ہندوستان کے واسطے برکت اور رحمت رہی ہے۔"

بہر حال یہاں سرسید کی جس ترقی کے اسباب بیان کرنے مقصود ہیں وہ عہدہ اور منصب کی ترقی نہیں بلکہ وہ ترقی ہے جو بعض اوقات کسی شخص کو نہ اور منصب کے لحاظ سے اور نہ مال و دولت و جاہ و حکومت کے اعتبار سے بلکہ اعلیٰ اور اشراف خصال انسانی کے لحاظ سے نہ صرف اپنے خاندان میں بلکہ تمام قوم اور ملک میں ممتاز کرتی ہے۔

سرسید کی زندگی کے واقعات جو پہلے حصہ میں بیان ہو چکے ہیں اگر اُن کو محض سرسری طور پر دیکھا جائے تو بھی ان سے اس قدر ضرورت ثابت ہوگا کہ ایک مسلمان جو قومی تنزل کے زمانہ میں پیدا ہوا جس نے ایک مردہ دار الخلافہ کی پڑمردہ سوسائٹی میں ہوش بنبھالا اور ہندوستان کی کمزور آب و ہوا میں نشوونما پائی، اس نے اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ نہایت جانناہ محنت و دل شوق اور بے نظیر استقلال کے ساتھ گورنمنٹ کی خیر اندیشی، ملک کی خیر خواہی، قوم کی خدمت اور مذہب کی حمایت میں بسر کر دی پس اس مقام پر ضرور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی چیز نے یہ غیر معمولی تحریک اس کے دل میں پیدا کی؟ اور کیونکر وہ اس قدر طول طویل زمانہ تک ایسے استقلال کے ساتھ اپنے ارادوں پر قائم رہا؟ اگرچہ اس سوال کے جواب میں صرف یہ کلام معجز نظام پیش کرنا کافی ہے کہ ”کُلُّ مَلِيَّةٍ لِّمَا خُلِقَ لَهَا“، یعنی ہر شخص کو اُس کام میں جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے آسانی دی گئی ہے، لیکن چونکہ سرسید کی بائوگرافی کو ہم آئینہ نسوں کے لیے ایک مثال قابل تقلید سمجھتے ہیں اس لیے اُن کی ترقی کے اسباب کی تفتیش کرنا غالباً فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

سرسید کی لائف میں جیسا کہ اُن کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے، بہت سی ایسی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن پر اُن کی ترقیات

کی بنیاد قائم کی جاسکتی ہے۔ قطع نظر اُن جسمانی اور اخلاقی قابلیتوں کے جن کے
 سمجھنے میں قدرت نے بہت بڑی عیاضی کی تھی اور جن کے بغیر کوئی شخص بڑا
 آدمی نہیں ہو سکتا۔ اتفاقاتِ حسنہ نے بھی اُن کے ساتھ کچھ کم مساعدت
 نہیں کی۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں قدیم خاندان کی نیکیاں
 اور نئے خاندان کی اولوالعزمی اور بہت مجتمع تھی۔ اُن کی دو خیال سلطنت کے
 ایک قدیم متوسل گھرانے کی یادگار تھی اور اُن کی تخیلیاں ایک ایسے خاندان سے
 علاقہ رکھتی تھی جس نے اپنی ذاتی لیاقت حسن تدبیر اور علم و فضل سے اپنے اقربان
 و اشال میں امتیاز حاصل کیا تھا اور اپنے تئیں زمانہ کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ
 خوش قسمتی سے بچپن میں زیادہ تر اپنی تخیلیاں ہی میں رہے اور وہیں تعلیم و تربیت
 پائی۔ انھوں نے اپنے نانا کا عہد اپنی آنکھ سے دیکھا اور اپنے لائق ماموؤں
 کی صحبت برقی۔ اُن کی ماں ایک نیک نہاد، سنجیدہ اور دانشمند بی بی تھیں جن
 کی تعلیم و تادیب سرسید جیسے جو بہر قابل کے لیے اُسیر کا حکم رکھتی تھی۔ انھوں
 نے حسن اتفاق سے ایسی حالت میں نشوونما پائی کہ نہ اُن کی مدد سے زیادہ
 روک ٹوک ہونی اور نہ ان کو بالکل مطلق العنان

بھوٹا گیا، وہ بڑھتے لکھتے بھی تھے اور ہر قسم کے کھیل بھی کھیلتے تھے مگر اپنے
 رشتہ داروں کے سوا غیر جنس کے لڑکوں سے کبھی نہ ملنے پاتے تھے۔ نہ
 اُن پر تعلیم کا ایسا بوجھ ڈالا گیا تھا کہ قوسِ جسمانی مضحک ہو جائیں اور نہ ان کی
 ڈھارس ایسی ڈھیلی چھوڑی گئی تھی کہ جدھر منہ اٹھ گیا چل سکے۔

اُن کے والد ایک اسناد و نقش اور تعلقاتِ دنیوی سے الگ نھلک رہنے
 والے آدمی تھے گھر کے انتظام اور اولاد کی پرورش اور تربیت کا کام زیادہ تر بلکہ

بالکل سرسید کی والدہ پر تھا جو باوجود طنطنہ اور رعب و اب کے نہایت متحل و
برہنہ تھیں پس وہ بجا تشدد اور سختی جو اولاد کی تعلیم و تربیت کے زمانہ میں
اکثر والدین سے ظہور میں آتی ہے اور جس سے رفتہ رفتہ اولاد کے دل میں خود
اپنی حقارت اور ذلت بٹھ جاتی ہے۔ سرسید پر کبھی نہیں گذری۔

جوانی کے آغاز میں سرسید کو بچپن کی نسبت کسی قدر زیادہ آزادی حاصل
ہوئی وہ اکثر رنگیں جلسوں میں شریک ہونے لگے اور شہر کے نوجوان امیرزادوں
سے ملنے جلنے لگے۔ سوسائٹی کا پرچھاواں اُن پر بھی پڑا اور بچے ناچا بیسے تھا مگر
ہو نہ بار نوجوانوں کی لغزشیں بھی اُن کی اصلاح کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ ایک
ٹھوکر کھا کر ایسے چوکنا ہو جاتے ہیں کہ پھر کبھی عمر بھر ٹھوکر نہیں کھاتے، بھائی
کی عبرت انگیز موت سے دل پر ایسی افسردگی چھائی کہ ہمیشہ کے لیے لہو و
لعب سے دست بردار ہو نا پڑا۔ مگر چونکہ طبیعت میں آتش گیر مادہ بھرا ہوا
تھا وہ آخر کار مشتعل ہونے بغیر نہ رہا۔ وہی سودا جو غفوان شباب میں ہوا
وہوں کی شکل میں ظاہر ہوا تھا ہیں برس بعد حُبِ قومی کے لباس میں جلوہ گر ہوا
اور میر کا یہ شعر سرسید کے حال پر منطبق ہو گیا۔

”دل عشق کا ہمیشہ حریمِ نبرد تھا“

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے ورد تھا“

جس حد تک سرسید کی تعلیم ہوئی اُس کو بھی اُن کی ترقی کا موبہ سمجھا جاسکتا
ہے۔ انھوں نے جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے قدیم یا جدید کسی طریقہ میں پوری
تعلیم نہیں پائی، اگر وہ پرانے طریقہ کی تعلیم پوری کر لیتے اور علومِ قدیمہ کا رنگ ان
پر چڑھ جاتا پھر ممکن نہ تھا کہ کسی دوسرے رنگ کے قبول کرنے کی تابیت اُن
میں باقی رہتی۔ وہ تعصب کی بندشوں میں جکڑ بند ہو جاتے اور تعصب کے

پہرے اُن کی آنکھوں پر چڑ جاتے۔ نئے طریقہ کی تعلیم بھی اُن نتائج تک پہنچانے والی نہ تھی جو سرسید سے ظہور میں آئے۔ یورپ کی اعلیٰ درجہ کی سولیزیشن اور حیرت انگیز ترقیات جو ایک ہندوستانی طالب علم کے دل پر تعلیم کے ساتھ ساتھ نقش ہوئی جاتی ہیں وہ آخر کار اس کو اپنے ملک کی ترقی سے مایوس کر دیتی ہیں یہاں تک کہ وہ اُن کوششوں کو جو ہندوستانیوں کی ترقی اور اصلاح کے لیے کی جاتی ہیں محض بے سود اور لا حاصل جاننے لگتا ہے پس کہا جاسکتا ہے کہ سرسید کا پُرانی تعلیم میں ادھور لارہنا اور فشی تعلیم سے آشنائے ہوئے منجملہ اُن اتفاقاتِ حسنہ کے تھا جنہوں نے قوم کی اصلاح کے عظیم الشان کام پر ہاتھ ڈالنے سے اُن کو جھجکنے نہیں دیا۔

اگرچہ یہ تمام باتیں جو اوپر بیان کی گئیں بلاشبہ ایسی ہیں جن کو سرسید کی ترقی میں بہت کچھ دخل معلوم ہوتا ہے مگر اُن میں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جس کو اُن کی ترقی کے اسباب میں شمار کیا جائے کیونکہ یہی باتیں اکثر اوقات ترقی کی سڑک دیکھی گئی ہیں۔ اس کے سوا ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے اور خاص کر ہماری مردہ قوم میں جس قسم کے حیرت انگیز اور عظیم الشان کام سرسید سے ظہور میں آئے ہیں اور جیسی جلیل القدر خدمتوں میں انہوں نے اپنی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ نہایت استقلال کے ساتھ بسر کیا ہے اُن کو محض اتفاقیہ امور کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

بعض اوقات خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید کا اپنی بی بی کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہ کرنا اور چالیس برس تجرد اور بے تعلقی کی حالت میں رہنا یہی اُن کے تمام بڑے بڑے کاموں کی بنیاد تھی اگر وہ دوسرا نکاح کر لیتے تو ہرگز اُن کو ان کاموں کے سرانجام کرنے کا موقع نہ ملتا۔ مگر اس نقطہ پر

پر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے ایک چالیس بیالیس برس کے تھانا
تندرست ذی استطاعت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان شخص کو نکاح طانی
سے باز رکھا اور تخر و کی ناگوار اندیشہ زندگی پر قانع کر دیا؟

البتہ ایک اور بات لحاظ کے قابل ہے جو سرسید کی لائف پر غور کرتے
وقت لوگوں کے ذہن میں ضرور تیار رہتی ہوگی، یعنی یہ کہ جب سے انگریزی تعلیم
ہندوستان میں پھیلی ہے اور یورپ کے اُن نامور لوگوں کے حالات سے
جنہوں نے ملک اور قوم پر اپنی جانیں قربان کی ہیں ہندوستان کے لوگ واقف
ہوئے ہیں اُس وقت سے ہندوستان میں بھی کم و بیش قومیت اور قومی ہمدردی
کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا جاتا ہے۔ پس یہ بات بالکل قرین قیاس
ہے کہ سرسید نے بھی جو کچھ ملک، باتوم یا مذہب کی خدمت میں کیا وہ انھیں
یورپ کے ریفارمرز اور وطن دوستوں کے حالات سن کر ان کی ریس سے
کیا ہو۔ لیکن اول تو جس وقت سرسید کو ملک اور قوم کی خدمت یا مذہب کی
حمایت کا خیال پیدا ہوا اُس وقت تک انگریزی تعلیم ہندوستان میں نہایت
محدود تھی اور مسلمانوں میں بالکل نہ تھی دوسرے اگر بالفرض یہ بات مان بھی لی
جائے تو صرف اسی قدر مافی جا سکتی ہے کہ یورپ کی تاریخ سے اُن
کے دل میں بھی حب وطن اور قومیت کا خیال ایسا ہی پیدا ہو گیا ہو جیسا کہ
ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں ایک دودھ کا سا اُبال پیدا
ہو جاتا ہے مگر اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خیال ایسا پک جائے کہ ایک
ہندوستان کا مسلمان قوم کی دشمن میں اپنے دشمنی فنا کر دے جس طرح حالات
موجودہ میں یہ ممکن نہیں کہ یورپ کے موجدوں اور مخترعوں کے حالات
سن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی موجد اور مخترع پیدا ہونے لگیں۔

اسی طرح یہ بھی اسکان سے خارج سے کہ یورپ کے ریفارمرز اور وطن دوستوں کے حالات کتابوں میں پڑھ کر یازبانی سنکر ہندوستان میں بھی ویسے ہی ملک کے جاں نثار اور قوم کے مصلح پیدا ہو جائیں۔

اصل یہ ہے کہ ایٹلیائی طرز حکومت جو ایک طاقت کو اعتدال سے زیادہ بڑھانے والی اور اس کے سوا تمام طاقتوں کو فنا کرنے والی ہے اور جو ہندوستان میں بھی تمام ایٹلیائی ملکوں کی طرح ابتدائے آفرینش سے ایک عنوان پر چلی آتی تھی اس نے ایٹلیا کی کسی قوم بلکہ کسی شخص میں قومیت کی روح باقی نہیں چھوڑی۔ ایک بڑے حکیم کا قول ہے کہ شخصی حکومت میں صرف ایک شخص یعنی بادشاہ ملک کا خیر خواہ ہو سکتا ہے اور بس۔ جان سٹوارٹ لکھتے ہیں کہ ”اگر رعیت کو ایسا بنا دو کہ وہ ملک کے لیے کچھ نہ کر سکے تو اس کو ملک کی کچھ پروا نہ رہے گی۔“ اگرچہ ہندوستان میں سو برس سے طرز حکومت بدل گئی ہے۔ جس کا مقتضایہ ہونا چاہیے کہ لوگوں میں ملک اور قوم کی بھلائی کا خیال اور جوش پیدا ہو مگر جو سکون اور انجاء ہندوستان کی قوموں میں صد ہا پشت سے متوارث چلا آتا ہے اور جوان کے آب و گل میں خمیر ہو گیا ہے اس کو بڑش طرز حکومت جیسی کہ وہ ہندوستان میں ہے ایک صدی میں ترائی نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی نظیریں سن سن کر جو اکثر ہندوستانوں کے دل میں بعض اوقات ملک اور قوم کی بھلائی کا جوش و فتنہ اٹھتا ہے کچھ زیادہ دن نہیں گزرتے کہ وہ آوے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔

البتہ مذہب ایک ایسی چیز ہے جو ہر ملک میں اور خاص کر ایٹلیائی ملکوں میں مذہبی آدمیوں کو نہایت استقلال کے ساتھ تمام عمر اپنے ارادوں پر ثابت قدم رکھ سکتا ہے یہ مذہب ہی میں طاقت ہے کہ انسان نہایت سخت

ریاضتوں میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے، تمام لذت کو اپنے اوپر حرام کر دیتا ہے۔ آگ میں تپتا ہے، برت میں گھٹا ہے، گھر بار لٹا دیتا ہے اور ہر ناقابلِ برداشت تکلیف اٹھاتا ہے، مگر مذہب بھی کیسا ہی سچا اور خدا کا بھیجا ہوا بہو طرز حکومت کا تابع ہوتا ہے۔ اُس میں جتنی باتیں طرز حکومت کے منقضاء کے موافق ہوتی ہیں وہ رواج پاتی ہیں اور باقی حصہ ناقابلِ عمل سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مثلاً خود مختار سلطنت جس میں کوئی بات شخصیت سے خالی نہیں ہوتی اس میں مذہب بھی ذاتی اور شخصی بھلائیوں کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتا، وہ صرف ایسی نیکیاں سکھاتا ہے جن کا نفع یا تو نیکی کرنے والے کی ذات پر ختم ہو جاتا ہے اور یا صرف خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے۔ وہ کبھی ایسی نیکیوں کی ترغیب نہیں دیتا جن سے بلا واسطہ تمام ملک یا تمام بنی نوع کو فائدہ پہنچے۔ مذہب کی یہ حالت ایسی پائیدار اور مستحکم ہو جاتی ہے کہ خود مختار سلطنت کا دورہ ختم ہو جانے کے بعد بھی صدیوں تک وہ اسی حالت پر قائم رہتا ہے پچھلے جس شاہراہ بدراگلوں کو چلتا دیکھتے ہیں آپ بھی آنکھیں بند کر کے اُسی شاہراہ پر چڑھنے میں، وائیں بائیں آنکھاٹھا کر نہیں دیکھتے، مگر بعض اوقات زمانہ کی ضرورتیں خود مذہبی فرقہ میں کوئی ایسا شخص پیدا کر دیتی ہیں جس کو مذہب کی چھان بین کرنی پڑتی ہے اور مذہب کا وہ متروک حصہ جو موجودہ زمانہ کے موافق ہوتا ہے اس پر عمل کرنا احساس کو رواج دینا پڑتا ہے زمانہ کی ضرورتیں اُس کی آنکھیں کھولتی ہیں اور انی مذہب کی محبت اور عقیدت اس کو مذہب کی حقیقت کھولنے پر مجبور کرتی ہے اور خود مذہب اُس میں استقلال پیدا کرتا ہے جس کی بدولت وہ قوم کی شاہراہ کے خلافت اپنی کٹھن منزل طے کرتا ہے۔ میں سے اس چیز کا سراغ چلتا ہے جس نے سرسید سے تمام ملکی اور قومی خدشیں

سراجام کوئی ہیں۔ ہمارے نزدیک جہاں تک کہ اُن کی لائق شہادت دیتی ہے اور جس قدر کہ اُن کے حالات، افعال اور اقوال سے ظاہر ہوتا ہے اُن کی تمام ترقیات کا منبع، اُن کے کل مقاصد عالیہ کا محرک اور اُن کی ہر منزل کا رہبر مذہب ہے۔ سوائے کوئی چیز قرار نہیں پاسکتی۔

اسلام کی حقیقت کا یقین اور بانی اسلام کی محبت اور عقیدت گویا سرسید کی گھٹی میں پڑی تھی۔ دار الخلافہ کا اخیر وعدہ تھا اور مسلمانوں کو آخرت کی امیدوں کے سوا جن کا اسلام وعدہ کرتا تھا کوئی امید دنیا میں باقی نہ رہی تھی اس لیے وہ مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے۔ خصوصاً شریف اور ممتاز خاندانوں میں مذہبی فرائض کی پابندی اور مذہبی باتوں کا چرچا بہت زیادہ تھا۔ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ جو اُس زمانہ میں دیندار مسلمانوں کا ملجا یا ولی تھی، اس کے ساتھ سرسید کو ایک خاص تعلق تھا ان کے والدین خانقاہ کے مشائخ سے کمال عقیدت و ارادت رکھتے تھے اور اس لیے سرسید بچپن ہی سے اپنے والد کے ساتھ خانقاہ میں جانے لگے تھے اور ایک مدت ولایت انہوں نے وہاں کا رنگِ صحت اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اُن کی والدہ کے سوا اُن کے خیمیاں والے جہاں انہوں نے نشوونما پائی شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان کے معتقد تھے۔ پس سرسید نے آنکھ کھول کر اپنے سارے گھر میں مذہب ہی کا دورہ دیکھا تھا، گویا مذہب ہی کی آغوش میں انہوں نے پرورش پائی تھی اور مذہب ہی کی گود میں ہوش سنبھالا تھا۔ علوم جدیدہ جس عمر میں مذہب سے دل اچاٹ کر سکتے ہیں اس عمر میں سرسید پر اُن کی پرچھائیں تک نہیں پڑی تھی بلکہ زیادہ تر اُن کی لے اس وقت کھلی شروع ہوئی جب مذہب کی جھڑپیاں تک پہنچ چکی تھی اور جب کہ سائنس کو

بجائے اس کے کہ مذہب کے ساتھ جنگ کرے اس سے صلح کرنی ضرور تھی۔
 چونکہ سرسید کا تعلق خاندان دو ایسے خاندانوں سے عقیدت رکھتا تھا جو
 نہ صرف دلی بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں جامع شریعت و طریقت
 سمجھے جاتے تھے اس لیے اُن کا گھر بہت سی ایسی جاہلانہ رسموں اور یہودہ
 ادہام اور لغو عقاید سے پاک تھا جن میں اکثر جاہل مسلمانوں کے خاندان گرفتار
 ہوتے ہیں، چنانچہ سرسید کہتے تھے کہ ”اس زمانہ میں بھی جب کہ میرے مذہبی
 خیالات متفقانہ اصول پر مبنی ہیں، میں اپنی والدہ کے عقاید میں ایک آدھ بات
 کے سوا کوئی عقیدہ اپنے اصول کے خلاف نہیں پاتا“ یہی عقائد اب اس
 سرسید کے دل میں ڈالے گئے تھے اور اسلام کی یہی صورت انھوں نے
 آنکھ کھول کر دیکھی تھی، گویا ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے اپنا قدم تحقیق کی پہلی
 سیڑھی پر پایا تھا۔ پھر مولانا سمیع شہید کی تصنیفات نے اُن کے خیالات
 کی اور زیادہ اصلاح کی اور اُن کو کسی قدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا۔ مگر
 جب تک قدیم سوسائٹی کا رنگ اُن پر غالب رہا مذہبی خیالات میں کوئی
 بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا۔ وہ انھیں سنت و بدعت و تقلید و عدم تقلید
 کے جھگڑوں میں الجھے رہے اور اسلام کے اشرف و اعلیٰ مقاصد کو صرف
 انھیں شخصی کاموں میں منحصر جانتے رہے جن کا نفع یا تو خود کام کرنے والے
 کی ذات کو اور یا خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے۔ مگر آخر کار زمانہ کی ضرورتوں
 نے اُن کی آنکھیں کھولیں اور خود اس یقین نے جو اسلام کی حقیقت کی نسبت
 اُن کی گھٹی میں پڑا تھا، اُن کو اسلام کی حقیقت اور اس کے اصلی مقاصد تک
 پہنچا دیا۔ جو باتیں دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے خلاف معلوم ہوئیں اُن کو
 چھوڑا اور جو اس کے مطابق پائیں اُن کو پکڑا اور زبرد و عمر کی مخالفت کا

خوف یک قلم دل سے اٹھا دیا۔ ہر ایک معاملہ میں خود مذہب کو نہ کہ زبرد و عمر کو اپنا رہبر بنایا۔ جو سوال پیش آیا اس کو بلا واسطہ مذہب ہی سے پوچھا اور جو کچھ وہاں سے جواب ملا اس کو سر پر رکھا۔ لوگ انگریزی نوکری پر اعتراض کرتے تھے۔ مگر مذہب نے اجازت دی کہ اس لیے انگریزی نوکری بے تامل اختیار کر لی۔ مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ غیر قوم اور غیر مذہب گورنمنٹ کی نوکری محض دفع الوقتی وایام گذاری کے طور پر کرنی چاہیے؛ یا تہ دل سے اس کے فرائض ادا کرنے چاہئیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ نوکری کا پورا معاوضہ لینا اور اس کے فرائض تہ دل سے ادا نہ کرنا خدا اور رسول کی مرضی کے خلاف ہے۔ اس لیے نوکری کے فرائض نہایت ایمان داری اور سچائی کے ساتھ سرانجام کیے۔ مذہب ہی سے پوچھا کہ غیر قوم کی حکومت میں رعیت کو اس کی خیر خواہ اور وفادار رعایا بن کر رہنا ضروری ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ جس گورنمنٹ کے سایہ حمایت میں رعیت کو ہر طرح کا انصاف و آزادی حاصل ہو اس کی رعیت اپنی گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ نہ ہو، لہذا اپنی تمام زندگی گورنمنٹ کی وفاداری اور خیر خواہی میں صرف کر دے۔ مذہب ہی سے یہ پوچھا کہ غیر مذہب قوموں کے ساتھ صدق دل سے دوستی میل جول اور کھانا پینا دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے موافق ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ موافق ہی نہیں بلکہ نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اسلام نفاق سے بدتر اور رذیل تر خصلت کو نہیں بتاتا اس لیے ہمیشہ انگریزوں اور تمام غیر مذہب قوموں کے ساتھ اسی صداقت اور خلوص کے ساتھ میل جول رکھا جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ رکھنا چاہیے۔

واقعہ ۱۸۵۷ء نے جپ ہندوستان کے مسلمانوں کو نہایت سخت

صدور پہنچایا اور اُن کے سپنے کی بالکل امید نہ رہی اس سے سرستید کے دل پر ایسی افسردگی اور مایوسی چھائی کہ اُن کا ارادہ ہندوستان سے تعلقات قطع کر کے کسی دوسرے ملک میں جا کر رہنے کا ہو گیا۔ اُس وقت بھی انھوں نے مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ قوم کی آگ میں کودنا بہتر ہے یا اپنی جان بچا کر اور کسی گوشہ میں بیٹھ کر خدا کی یاد کرنی بہتر ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ اسلام کا اصل اصول بلکہ خود اسلام محض قوم کی خیر خواہی اور مہمدی ہے اور بس۔ مذہب نے اُن کو بتایا کہ باقی اسلام جس کی اطاعت اور اتباع تمام امت پر فرض ہے اور جس کی نسبت قرآن ناطق ہے کہ ”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ“ اُس نے دنیا میں آکر کیا کیا؟ اپنی تمام عمر ملک اور قوم کی خیر خواہی میں بسر کی۔ وہ گمراہ تھے اُن کو ہدایت کی، وہ وحشی تھے اُن کو انسان بنایا، وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے اُن میں اخوت اور دوستی کی بنیاد ڈالی۔ وہ آپس کی خانہ جنگیوں میں پھنسے ہوئے تھے اُن میں ملک گیری اور کشور کشائی کا مادہ پیدا کیا۔ ان کا دین اور دنیا دونوں درست کیے، ان کی خیر خواہی اور اصلاح میں سخت شہائد اور شہیدین اپنے نفس پر برداشت کیں۔ ملک کی محبت کو جزو ایمان قرار دیا اور کہا کہ ”حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْإِيمَانِ“ قوم کی محبت پر تمام امت کو مجبور کیا اور فرمایا کہ ”حُبُّ الْعَرَبِ مِنَ الْإِيمَانِ“ قوم کی سرداری کو قوم کی خدمت میں منحصر سمجھرایا اور کہا کہ ”رَبِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ“ اخیر دم تک امت یعنی قوم ہی کا خیال رکھا اور امتی امتی کہتا و نوب سے رخصت ہوا۔

سرستید نے مذہب کی یہ ہدایت سن کر تمام ارادے فسخ کیے اور اس اصول کو مضبوط پکڑ لیا۔ انھوں نے دیوی تعلقات کو جن کے بغیر قوم کی خیر خواہی

اور قوم کو نفع پہنچانا غیر ممکن تھا قطع تعلق سے ہزار درجہ بہتر سمجھا اور اپنی تمام
زندگی اور طاقت اور استطاعت ادا اپنے تمام قومی کو نفس واپس تک
قومی خدمت اور قومی خیر خواہی کے لیے وقف کر دیا انھوں نے مذہب
ہی سے یہ پوچھا کہ قوم کی اصلی اور حقیقی خیر خواہی کس چیز میں ہے؟ مذہب
نے جواب دیا کہ مسلمانوں کے اعتراف سے اسلام کو معزز کرنا اور دنیا کے
ذریعہ سے دین کو تقویت دینی۔ مذہب ہی نے ان کے دل میں ڈالا کہ مسلمان
دنوی عزت میں حد سے زیادہ گرے ہونے ہیں اور گرتے چلتے جاتے ہیں اور
مسلمانوں کی دولت بعینہ اسلام کی دولت ہے۔ اگرچہ یہ زمانہ ان کا یہی حال
رہا تو بندوستان میں ان کا عدم اور وجود برابر ہو جائے گا اور اسلام اس ملک
سے رخصت ہو جائے گا۔ اس لیے انھوں نے قوم کو اول دنیا ہی کی طرف
متوجہ کیا اور جوڑے لیے ان کی دنیوی ترقیات کے تھے ان کے لیے مہیا کیے
مسب سے زیادہ ان کی ترقی کا مدار انگریزی تسلیم پر سمجھا۔ اس لیے گو ایک
زمانے نے انگریزی تسلیم کی مخالفت اور مزاحمت کی۔ مگر انھوں نے اس
کو قوم میں جاری کر کے چھوڑا۔ مذہبی وہام اور غلط خیالات جو دنیوی ترقی کے
مانع تھے اپنی پُر زور تحریروں سے ان کی غلطی ثابت کی۔ سوشل اور اخلاقی
خوابان جو قوم میں شائع تھیں جن پر غیر قومی ہستی تھیں اور جو دنیوی عزت
اور وقار کی منافی تھیں ان کی اصلاح میں جہاں تک ممکن تھا کوشش کی قوم
کی طرف سے جو گورنمنٹ کو پورے شکل بدگمانیاں تھیں ان کو رفع کیا۔ گورنمنٹ
کی طرف سے جو قوم کے دل میں منہایت یا دبشت یا جھجک تھی اس کو دور
کیا۔ انگریز جو اسلام کو ایک نہایت ہیبت اور خوفناک مذہب خیال کرتے
تھے اور اس لیے مسلمانوں کی طرف سے مطمئن نہ تھے، ان کو اسلام کی اصلی

صوت دکھائی اور ثابت کیا اگر دنیا میں کوئی مذہب عیسائیوں کا دوست عیسائی مذہب کا حامی، بائبل کی تصدیق کرنے والا اور اس کے اصول سے مطابقت رکھنے والا ہے تو وہ صرف اسلام ہے اور پس، ہندو مسلمانوں میں جہاں تک ممکن تھا اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں کوشش کی کیونکہ دونوں قوموں کی عزت اسی بات پر موقوف تھی اور موقوف ہے کہ آپس میں مل جل کر رہیں جتنے مدرسے اور انسٹیٹیوشن قائم کیے اُن میں دونوں قوموں کو شریک کیا اور اُن سے دونوں کے فوائد محفوظ رکھے، ہمیشہ اپنی ہلک-اسپیچوں میں دونوں قوموں کو اسی بات کی نصیحت کی کہ ہندوستان کی عزت اتفاق میں ہے، مسلمانوں کے مختلف فرقے جن میں مذہبی نزاع اور جھگڑوں نے پھوٹ ڈال رکھی ہے اور اس لیے وہ روز بروز ضعیف اور حقیر ہوتے جاتے ہیں جہاں تک ممکن تھا اُن میں اتفاق و التیام کی بنیاد ڈالی۔ مدرسۃ العلوم میں ہر مسلمان فرقہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور ہر فرقہ کے طالب علموں کو ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی ہدایت کی۔ اپنے سنی دوستوں کو شیعوں کے خلاف کتابیں لکھنے سے روکا اور خود جو ابتدائے عمر میں اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کی تھی اُس سے ہمیشہ کے لیے اجتناب کیا۔ باوجودیکہ اُن کو اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے مذہب سے متعلق صد بابائی جمہور کے خلاف لکھنی پڑیں مگر بغیر سخت ضرورت کے کبھی کوئی نئی بات نہ بولی سے نہیں نکالی کبھی جمہور اہل اسلام سے مقابل کوئی جدید فرقہ کھڑا کرنا اور آپ اس کا سرگروہ بننا نہیں چاہا، کبھی منافقین کے اعتراضات کا جواب پٹ کر نہیں دیا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ قوم میں اختلاف اور نزاع بڑھنے نہ پائے اور میل کاہل نہ بن جائے۔

جس وقت سرسید نے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم جاری کرنے کا ارادہ کیا

اس وقت مذہب ہی نے اُن کو اس یقین پر قائم رکھا جو صدہ لیروپ میں عیسائی مذہب کو تعلیم سے پہنچا ہے وہ اسلام کو برگز نہیں پہنچ سکتا۔ اور جب کہ انگریزی تعلیم اُن میں جاری ہو گئی اور اُس کو روز بروز ترقی ہونے لگی اس وقت بھی مذہب ہی نے اُن کو یہ سمجھا یا کہ جب تک سائنس اور اصول اسلام میں تطبیق نہ کی جائے تب ان کو رہے اور سادہ لوح طائیفہ علموں کی طرف سے اطمینان نہیں ہو سکتا جو مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اس لیے اُن کے دل میں مذہب کی طرف سے سو ذلن پیدا ہو جاتا بالکل قرین قیاس ہے۔ مذہب نے اُن کو ڈرا یا کہ اگر تعلیم سے اسلام کو کچھ صدہ پہنچا تو اس کا منظرہ خاص کر اُس شخص پر ہو گا جس نے قوم میں تعلیم جاری کی۔ چنانچہ اس عظیم الشان کام کو بھی انھوں نے اپنے ذمہ لیا اور اپنی سمجھ اور علم و عقل کے موافق قرآن مجید کی تفسیر لکھ کر شریعت کی۔ یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا یہ محض بے سرو پا تیا سات نہیں ہیں بلکہ خود سرسید نے اپنی تحریروں میں جا بجا اس معنون کی طرف اشارہ کیا ہے خصوصاً وہ آرٹیکل جو تہذیب الاخلاق مورخہ یکم ربیع الاول ۱۲۸۸ھ ہجری میں "ایک نادان خدا پرست اور نادانیا دار" کے عنوان سے لکھا ہے اُس سے ہمارے مذکورہ بیانات کی بخوبی تائید ہوتی ہے اس کے علاوہ ہم ہمیشہ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے کہ سرسید قومی خدمت اسی سرگرمی اور ذوق و شوق کے ساتھ انجام دیتے تھے جیسے ایک مترجم اور نفس کش زاہد عبادت الہی بجا لاتا ہے۔ نہ بیماری اور ضعیفی اُن کے ذوق و شوق کو کم کرتی تھی اور نہ گزرمی یا سردی کی شدت یا اور کسی ہرج مرج سے اُن کی بہت قاصر ہوتی تھی۔ چالیس برس برابر انھوں نے مخالفتیں جھیلیں، اُن کے کفر کے لیے ہتھیار فتوے کھمے گئے، انکو دہری، ملحد، کافر اور دجال سب کچھ کہا گیا، اُن کو بلدہا

قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ صدمہ ہاگنام خطوں میں منتقل گالیباں مکھ کر بھیجی گئیں۔ اخباروں اور رسالوں میں جہاں تک مہوسکا اُن کی زمین کی گئی، مگر وہ اپنی دھن میں اسی طرح لگے رہے اور اپنا کام اُسی فوج و شوق کے ساتھ کیے گئے۔ بلکہ جس قدر مخالفت بڑھتی گئی اُسی قدر اُن کا جوش اور سرگرمی زیادہ ہوتی گئی۔ لوگ اُن کو بُرا کہہ کر اور گالیاں دے کر اس قدر خوش نہ ہوتے ہوں گے جس قدر کہ وہ بُرا سُکرا اور گالیاں کھا کر خوش ہوتے رہے۔ ان کی بہن کے انتقال کی خبر اُن کو اُس وقت پہنچی جب کہ وہ قومی کانفرنس کی کاروائی میں مصروف تھے۔ جب تک جلسہ اپنے معمولی وقت پر برخواست نہ ہوا وہ بہن کی تجویز و تکفین میں شریک نہ ہوئے۔ جوان بیٹے کی موت سے اُن کو سخت صدمہ پہنچا۔ پندرہ برس روز تک قلب کی حرکت نہایت سست رہی اور یہ صدمہ آخر تک فراموش نہ ہوا۔ یا اینہم وہ اپنی قومی خدمات میں برابر مصروف رہے اور ایک رات امریکہ دن سے زیادہ جو کہ دلی کی آمدورفت میں صرف ہوا انھوں نے باوجود ایسے سخت صدمہ کے کوئی قومی کام ملتوی نہیں کیا اور ایسے مواقع کو تا بمقدور کبھی پاس نہیں آنے دیا جن سے بیٹے کا داغ تازہ ہو اور قومی خدمات میں جرح واقع ہو۔ دلی میں انھیں خیالات سے وہ جنازہ کے ساتھ نہ گئے اور دفن کرنے میں شریک نہیں ہوئے۔ لوگوں کو سخت تعجب ہوا اور بعضوں نے بڑے بڑے اعتراض کیے اور حق یہ ہے کہ اُن کے اعتراض بالکل بجا تھے کیونکہ ”من جہل شیئا اعدا“ الغرض یہ سب باتیں شہادت دیتی ہیں کہ اُن کے تمام کاموں کی محرک کوئی ایسی روحانی انگ تھی جس پر دنیا کے معمولی ظلمان غالب نہیں آ سکتے تھے اور جس قدر جسمانی انگلیں کم ہوتی جاتی تھیں وہ انگ بڑھتی جاتی تھی۔

اس مقام پر یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ سرسید کی فطرت میں جیسا کہ اُن کے حالات اور اُن کے کاموں سے معلوم ہوتا ہے، غایت درجہ کی فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی تھی یہاں تک کہ بعض اشخاص غلطی سے اُن کو حسد سے زیادہ مسرت اور فضول خرچ خیال کرتے تھے جو لوگ ان کے حالات سے واقف ہیں اُن کو معلوم ہے کہ جب تک مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کا خیال اُن کے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا وہ ہمیشہ اپنی بساط سے بہت بڑھ کر غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ سلوک کرتے تھے اور کبھی اُن کی آمدنی میں سے ایک حبہ پس انداز نہ ہوتا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے اُن کو تعلیم اہل اسلام کا خیال ہوا انھوں نے اس قسم کے شخصی سلوک اور احسان بالکل بند کر دیئے۔ جو کچھ اُن کے ضروری اخراجات سے بچاؤ انھوں نے مدرسہ کے سوا اور کہیں صرف نہیں کیا سائل اُن کے دروازہ سے ہمیشہ ناکام پھرتے تھے تعلیم کے سوا کسی اور رفاہ عام کے چندہ میں ہمیں وہ شریک نہیں ہوتے تھے بخلاف اس کے مدرسہ کی امداد میں وہ اپنی طاقت اور استطاعت سے بہرہ بڑھ کر خرچ کرتے رہتے تھے۔ مدرسہ سے پہلے جب کہ وہ بجنور میں مدرسہ میں تھے

۱۔ مروج سنہ ۱۲۸۵ میں جبکہ مشیر موہاں بہادر رئیس اہل پور کالج کے ملاحظہ کو علی گڑھ میں آئے اور ریٹیلوں کی طرف سے سرسید نے ان کو ایڈمٹ کیا، اُن وقت کالج کی غیر خدائی کے توجہ میں سرسید نے ایک ایسا کام کیا جس کو سن کر شخص بوجھ بھرا نہیں ہو جیسا کہ چھوٹے بچوں کو سرسید کے پوتے سید محمود کو اور پچاس گز پتھر کا جو نواب حسن الملک کا عزیز ہے اور پچاس روپے دونوں صاحبوں کے ملازموں کو علاوہ پانچ سو روپے چندہ کالج کے دیئے تھے، دونوں بچوں نے نو خوشی سے کہہ دیا کہ ہم دونوں کے سوا دوسرے کالج کی مسجد کی تعمیر میں صرف کیے جانے لگے سرسید نے نو کروں کا دوسرے بھی دینا چاہا نواب حسن الملک نے تو اپنے نو کروں کے انعام کو اُن سے لینا برگزینہ کیا اور پچاس روپے انھیں کو دیدیے مگر سرسید نے حجت شرعی تمام کرنے کو نو کروں سے کہا کہ اگر تم کو ہماری نوکری منظور ہے تو جو انعام نواب صاحب نے تم کو دیا ہے وہ کالج میں دیدو ورنہ ابھی اپنا حساب کرو۔ وہ بھی اسے نوکری کو نہ چھوڑ سکتے تھے انھوں نے مجبور پچاس روپے سرسید کو دیدیے اور سرسید نے پانچ روپے اُن سے دوسرے کے کالج فنڈ میں جمع کر لیا ۱۲

انہوں نے کئی مسجدوں کی تعمیر اور مرمت کرائی، اپنے پاس سے بھی روپیہ صرف کیا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں سے بھی کئے کر دکایا۔ مگر غدر کے بعد جب سہارنپور کی جامع مسجد کے لیے اُن سے چندہ طلب کیا گیا تو انہوں نے چندہ دینے سے صاف انکار کیا اور لکھ بھیجا کہ ”میں خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر کی فکر میں ہوں اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھر کی تعمیر کا خیال ہے۔“ ان باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ سرسید کی کل مذہب کے ہاتھ میں تھی۔ مذہب جہاں چاہتا تھا ان سے خرچ کراتا تھا اور جہاں چاہتا تھا اُن کا ہاتھ روک دیتا تھا کیونکہ مذہب کے سوا کوئی ایسا زبردست حاکم نہیں ہے جو انسان کی طبیعت کے اقتدار پر غالب آجائے اور ایک ہی شخص کو ہمیشہ کے لیے ایک جگہ غایت درجہ کا فیاض اور دوسری جگہ حد سے زیادہ محسوس اور تنگدل بنا دے۔ جیسا کہ بعض صحابہ کا حال تھا کہ کہیں اُن کی داد و دہش کے آگے ماتم کی فیاضی پہنچ معلوم ہوتی تھی اور کہیں ان کی کفایت شعاری اور جبررسی پر حد سے زیادہ تعجب ہوتا تھا۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے جتنے بڑے بڑے کام کیے وہ عقل سلیم اور رائے صائب کی ہدایت سے کیے اور اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اُن کے کارہائے نمایاں اُن کی دانشمندی اور رائے صائب کے نتیجے تھے نہ مذہب کے۔ لیکن اول تو جو شخص مذہب اور عقل کو لازم و ملزوم جانتا ہو اس کے کسی کام کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عقل کا نتیجہ تھا نہ مذہب کا۔ دوسرے عقل کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ راہِ راست بتا دیتی ہے مگر اس راہ پر چلنا اور ثابت قدم رہنا اور نہایت استقلال کے ساتھ اُس کی تمام منزلیں طے کرنا جب تک کہ مذہب کا سہارا نہ ہو غیر ممکن ہے۔

اس بحث کو جو ہم نے اس قدر طول دیا ہے اس سے شاید لوگوں کو یہ خیال ہو کہ ہم سرسید کے مخالفوں کو ان کے مسلمان یا پابند مذہب ہونے کا یقین دلانا چاہتے ہیں مگر فی الواقع ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کیونکہ جس مذہب کو سرسید مذہب سمجھتے تھے اور جس اسلام کو وہ اسلام جانتے تھے مخالفوں کے نزدیک نہ وہ مذہب مذہب تھا اور نہ وہ اسلام اسلام۔ بلکہ ہمارا مقصد اس طولانی بحث سے صرف اس بات کا ظاہر کرنا ہے کہ ایشیائی ممالک میں جہاں وطنیت اور قومیت کا خیال بالکل نہیں ہے جو شخص مذہب کا پابند نہ ہو وہ ہرگز ملک یا قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ پس ہماری قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو قومی جد روی کا دم بھرتے ہیں، یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک وہ اسلام پر ثابت قدم نہ ہوں گے ممکن نہیں کہ قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام کر سکیں۔ یہ آپ اور امریکائی اب تک جس قدر ترقیات اور اصلاحات ظہور میں آئی ہیں ان کے بانی بانی تقریباً تمام وہی لوگ نکلیں گے جو مذہب کے سخت پابند تھے، لوتھر، کالون، بیکن، ملٹن، نیوٹن، کو لمبس، بنجمن، فرنکلین، جارج سیٹن، واشنگٹن، ہمپڈن، میٹھی وغیرہ وغیرہ سب مذہب کے نہایت پابند تھے۔

سرسید کی ملکی خدمات اور ان کے نتائج

اس عنوان کے تحت میں ہم سرسید کی سرکاری، ملکی اور قومی، تینوں قسم کی خدمات کا ذکر کریں گے مگر پیشانی پر ہم نے ان تمام خدمات کو ملکی خدمات کی لفظ سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ سرسید کو گورنمنٹ کی خیر خواہی اور حسن خدمت کی بدولت ملک اور قوم کی بھلائی کرنے میں بے انتہا مدد پہنچی ہے۔ اصل اس لیے ہم ایسی سرکاری خدمات کو بھی ملکی خدمات میں شمار کرتے ہیں، جیسی طرح ملک کے کسی فرقہ کو جزمانہ کے انقلابات سے پتہ ہو گیا ہو، اُجھارنا اور اس کے ہم وطنوں میں اس کا اعزاز اور سربو قائم کرنے میں کوشش کرنا، حقیقت ملک کے ایک ایسے عضوِ موقوف کی اصلاح کرنا ہے جس کے سبب سے اس کے تمام صحیح اعضاء معرضِ خطر میں ہوں۔

سرکاری خدمات

سب سے پہلے ہم سرسید کی سرکاری خدمات پر جو ان کی تمام ترقیات کی پہلی سیڑھی اور ان کے تمام کارناموں کا ایک زبردست آئینہ رہی ہیں، نظر ڈالتے ہیں، اور اپنی قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو گورنمنٹ سروس کے ذریعہ سے غزاز حاصل کرنا چاہتے ہیں، نصیحت کرتے ہیں کہ ان کو سرسید کی راستبازی، دیانت، وفاداری اور شریفانہ، نہ غلامانہ، اطاعت سے

جس پر وہ ملازمت کے زمانہ میں اور اُس کے بعد ہمیشہ کاربند رہے، سبق لینا چاہیے کیونکہ حسن خدمت کی کوئی مثال اور کوئی نمونہ اُن کو اس سے بہتر دستیاب نہیں ہو سکتا۔

سرکاری ملازمت کی ابتدا

جس زمانہ میں سرسید نے انگریزی نوکری اختیار کی اس وقت مسلمانوں کو انگریزوں کے اخلاق، عادات، طرز معاشرت اور اننگلٹن گورنمنٹ کی طرز حکومت سے بہت ہی کم واقفیت تھی اور دلی اور اُس کے نواح کے مسلمان عموماً انگریزی نوکری اور انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ خصوصاً جو خاندان قلعہ دہلی سے کچھ تعلق رکھتے تھے ان کو انگریزی نوکری کا بھی خواب بھی نظر نہ آتا ہو گا۔ چنانچہ سرسید نے جب سرکاری ملازمت کی خواہش ظاہر کی تو اُن کے تمام عزیز اور رشتہ دار اس ارادہ سے مانع آئے مگر چونکہ اُن کے تانا د بیر الدولہ نے بعض سرکاری خدمات انجام دی تھی اور اُن کے خالو خلیل اللہ خاں اس وقت ایک ممتاز انگریزی خدمت پر مامور تھے اس لیے انھوں نے قلعہ دہلی کے تبرک پرفراز نے کی بلکہ انگریزی نوکری اختیار کر لی۔

کام سیکھنے کا شوق

سرسید نے ابتداء ملازمت ہی میں یہ نکتہ بخوبی ذہن نشین کر لیا تھا کہ کسی کام کے ملنے سے پہلے اُس کام کی لیاقت اور اس کے فرائض کی اطلاع حاصل کرنی ضرور ہے۔ چنانچہ سائنس میں جب مسٹر رابرٹ سمپلٹن نے ان کو عدالت ششمن کا سٹڈنٹ قرار مقرر کرنا چاہا تو انھوں نے اُس کے

(حاشیہ اگلے صفحہ)

قبول کرنے سے انکار کیا اور صاف کہہ دیا کہ جس کام کی میں اپنے میں بیانت نہیں پاتا اس کو کیونکہ قبول اور اس کے فرائض ادا کر سکتا ہوں؛ جب وہ اگرہ کی کمشنری میں نائب منشی کے عہدہ پر مقرر ہوئے تو انھوں نے بہت جلد قوانین مالی سے واقفیت حاصل کر لی اور ترتیب دفتر کا ایک دستور العمل بنایا جس کے مطابق تمام دفتر کمشنری اگرہ کا مرتب کیا گیا۔ پھر عداوت منصفی کے متعلق قوانین کا ایک خلاصہ تیار کیا جس کو صاحب کمشنری اگرہ نے گورنمنٹ میں پیش کر کے ان کے لیے عہدہ منصفی کی سفارش کی۔

حسن خدمت

اس کے بعد انھوں نے اپنے تمام زمانہ ملازمت میں اس قاعدہ کو ہمیشہ نصب العین رکھا کہ جو کام سرکار کی طرف سے ان کو تفویض ہوا اس کے متعلق کافی واقفیت بہم پہنچانی اور اس کے فرائض بڑے تجربہ کار آدمیوں کی طرح سر انجام کیے۔ یہاں تک کہ سرورس کا زمانہ ختم ہونے کے بعد بھی جتنے کام گورنمنٹ نے ان سے لینے چاہیے ان کو کمال جانفشانی اور محنت سے اور نہایت بصیرت اور اطلاع کے ساتھ انجام دیا۔ لیجس لیٹو کنسل کی ممبری انھوں نے ایسی بیانت کے ساتھ کی کہ ان سے پہلے کسی بندوستانی ممبر نے

بے چارہ سرورثہ داری عداوت کشش کے قبول کرنے سے سبب نے اس خوف سے انکار کیا تھا کہ بلوچستان کے فرائض ان سے ادا نہ ہو سکیں اس لیے سرورثہ بہت مہینے بھر سناوش کی جتنی مشورتنہی کے نام لکھ کر سرورثہ کو ابھارتا تھا اس میں ان کو عالیٰ خاندان اور ہوشیار ہونے کے علاوہ ڈر پوک بھی لکھا تھا۔ اس چلی کو کرنگی گریم سرورثہ کی لائٹ میں نقل کر کے گتے میں لکھ کر سرورثہ میں اب کوئی علامت ڈر پوک ہونے کی نہیں ہے اس کے بعد وہ عداوت جنگ کے معنی ماشر اوت دار لکھ کر کہتے ہیں کہ غدار کے موقع پر سرورثہ اس خطاب کا کافی ثبوت دے گا۔

نہیں کی تھی۔ اُن سے پہلے ظاہر کسی میٹرو میئر نے کوئی مسودہ قانون پیش نہیں کیا تھا۔ انھوں نے تین مفید قانون بنائے جن میں سے صرف دو پیش ہوئے اور دونوں پاس ہو گئے کونسل کے اکثر مباحثوں میں باوجود انگریزی نہ جانتے کے نہایت سنجیدہ اور سیکل اسپیں کیں اور محض اپنی اعلیٰ بیافت کے سبب دو وائسرائوں کے عہد میں دوبارہ منتخب ہوئے۔ اُن کی ایک اسپچ کی نسبت جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے خود لارڈ لٹن نے اپنی زبان سے کہا کہ میں نے ایسی قابلانہ اسپچ کبھی نہیں سنی۔ اسی طرح ماسچو کیشنل کمیشن میں جیسی مضبوط اور مفصل شہادت انھوں نے دی اور جو روشنی تعلیمی معاملات پر اُن کی شہادت نے ڈالی اس سے زیادہ کسی شہادت میں نہیں سنی گئی۔ غرض کہ انھوں نے سرکاری کام کو کبھی ہیکار یوں کی طرح نہیں کیا بلکہ ہر ایک خدمت کے فرائض نہایت تندہی اور جانفشانی سے ادا کیے اسی سبب سے اُن کے انسر ہمیشہ ان کے مداح اور شکر گزار رہے۔

بے غرضی

جہاں تک ہم کو معلوم ہے انھوں نے کبھی اپنی ترقی یا کسی خدمت کے صلہ کی صراحت یا کیا یا اپنے منافردی سے درخواست نہیں کی بلکہ ہمیشہ اپنی کار گذاری اور حسن خدمت سے اُن کے دل میں جگہ کی اور خود اپنے کاموں کو اپنا سفارشی بنایا۔ ۱۸۸۸ء میں جب کہ سرسید کو مقام علیگزہ کے بی۔ ایس۔ آئی کا خطاب دیا گیا اس وقت صاحب کلکٹر علیگزہ مسٹر کینڈی نے سرسید کی تعریف میں جو لمبی تقریر کی تھی اس میں یہ بھی کہا تھا کہ "یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے واسطے کبھی کچھ نہیں چاہا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے

کبھی کچھ نہیں چاہا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی۔“ پر و فسر آرنلڈ ایم اے جو دس برس علیگڑھ کالج میں سرسید کے پاس رہے انہوں نے لاہور کے مائمی جلسہ میں جو سرسید کی ذات پر اسپچ دی تھی اس میں یہ بھی کہا تھا کہ گورنمنٹ کی طرف سے جو اعزاز یا خطاب ان کو ملا وہ ہمیشہ بے طلب ملا اور میں آج تک کسی ایسے شخص سے نہیں ملا جو ان سے زیادہ شریفانہ زندگی بسر کرنے والا اور ان سے زیادہ بے لگ اور بے غرض ہو۔“

دیانت داری کی صفت ان کی تمام پہلو سے سروں میں ایسی نمایاں رہی ہے جیسے آفتاب میں روشنی صہیب رومی کی نسبت آنحضرت نے فرمایا ہے کہ ”فَوَلَعْبُدُ صَہِیْبَ لَوْ كَذَّبَ یُخَفِّفُ ۝ اَللّٰهُ لَذِ یَعُوضُهُ ۝“ (یعنی صہیب ایسا نیک بندہ ہے کہ اگر وہ خدا سے نہ ڈرتا تو بھی اس کی نافرمانی نہ کرتا، یہی حال سرسید کے تدین کا تھا وہ نہ کس حاکم کے خوف سے اور نہ شرعی امتناع کی وجہ سے بلکہ محض اپنی طبیعت کے اقتضائے کوئی کام دیانت داری کے خلاف نہیں کر سکتے تھے، غدر سے پہلے ان کا تدین بہت خوفناک صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ اہل مقدمہ کو یہ جرات تو نہ ہوتی تھی کہ ان کے سامنے کچھ مسئلہ پیش کریں، یا ایسا پیغام بھیجیں۔ البتہ کبھی کبھی ناواقف لوگ دوران مقدمہ میں ان کے مکان پر سرگٹھنے کے بہانے یا کوئی سوغات لے کر چلے جاتے تھے۔ سوغات کا قبول کرنا تو درکنار ہم نے مناسب ہے کہ وہ سوغات لانے والے سے اس قدر گمان ہو جاتے تھے کہ اس کا اثر مقدمہ کے فیصلہ تک پہنچتا تھا۔ آخر اہل مقدمہ نے اثنائے تحقیقات میں ان سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ جھوٹے مقدمے بنانے والے اور چھوٹی گواہیاں دینے والے ان کے نام سے کا پتے تھے۔ نہ ان سے اپنوں کو رعایت کی توقع تھی اور نہ غیروں کو صاحب جج بنارس نے سالانہ رپورٹ میں ان کی نسبت

لکھا تھا کہ "شہر اور صنایع بخاریں کو سید احمد خاں ایک ایسا شخص ملا ہے جس پر
 وہ منہایت اعتماد رکھتے ہیں اور جس کو فریب یا دھوکا نہیں دے سکتے۔"
 قدر سے پہلے جو اکثر یورپین افسروں نے سرسید کی نسبت اپنی چٹھٹ
 میں رائے ظاہر کی ہے اس میں زیادہ تر ان کے علو خاندان لیاقت اور دیانت
 داری کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس سے زیادہ وہ ہندوستانیوں کے کیرکٹر سے اسی وقت
 بخوبی واقف ہو سکتے ہیں جب کوئی ایمان کا موقع پیش آئے یہاں ہم صرف
 ٹامس مڈکات صاحب رنڈیڈنٹ وکشنر دہلی کی چٹھی مورخہ ۱۴ جولائی ۱۸۵۸ء
 کا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "سید احمد خان معزز خاندان کے ممبر ہیں
 اور نواب دیرالمدلہ خواجہ فرید خان مرحوم کے جو شاہنشاہ اکبر شاہ مرحوم کے
 وزیر اعظم تھے، لوائے ہیں۔ اور میں اپنے فائق تجربہ سے اس بات کی شہادت
 دیتا ہوں کہ ایماندار می اور لیاقت میں بہت اعلیٰ درجہ کا کیرکٹر رکھتے ہیں۔"
 اس باب میں سرسید کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ ان کی سرکس ختم ہونے پر یاد ہو گیا
 گورنمنٹ بہت محشی سے ان کو کام کرنے کی مہلت دینی چاہتی تھی۔
 مگر انھوں نے زیادہ مہلت یعنی مناسب نہ سمجھی کیونکہ مدرسہ العلوم قائم
 ہو چکا تھا جس کے لیے چندہ جمع کرنے کی ازلیں ضرورت تھی اور وہ عام
 طور پر چندہ وصول کرنا ملازمت کی حالت میں غلاف احتیاط سمجھتے تھے۔
 چنانچہ جب تک انھوں نے پیش نہیں لی بخاریں میں اپنے دوستوں کے سوا
 کسی سے چندہ طلب نہیں کیا۔

آزادی

اگرچہ سرسید نے اس دربار کے سایہ میں پرورش پائی تھی جو ایک
 قدیم و سپاکم گورنمنٹ کی یادگار تھا، جہاں آزادی کے پر جلتے تھے اور

خوشامد کا بازار گرم تھا، نیز اُس وقت شمالی ہندوستان میں انگریزی عملداری کا
 اہتدائی زمانہ تھا اور اس لیے برٹش گورنمنٹ میں بھی اُس وقت تک
 ایشیائی طرز حکومت کی تمام غاصبتیں موجود تھیں۔ اہل کار خوشامد کو اہلکاری کا
 زیور سمجھتے تھے اور اس وجہ سے یورپین حکام اور ہندوستان میں آکر خوشامد پسند بن
 جاتے تھے۔ باوجود اس کے سرسید کا تبراؤ اپنے افسروں کے ساتھ ابتدا
 سے اخیر تک نہایت آراو اند رہا۔ وہ اپنے افسروں کا ادب اور تعظیم اور
 سرکار میں ان کی اطاعت جیسی کہ چاہیے ہمیشہ کرتے تھے مگر ان کا لبہ یا دباؤ
 کبھی نہیں ملا اور بے موقع کبھی ان کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی۔ غدر سے بہت
 پہلے جب کہ دلی میں جان پاشن گبنس سشن جج اور سرسید معصفت تھے قنصل
 دہلی کے دو جاگیردار بھائیوں میں جن میں سے ایک سرسید کا گہرا دوست تھا
 جاگیر کی بابت سخت نزاع تھا اور ان کا جھگڑا گورنمنٹ میں پیش تھا۔ دوسرے
 بھائی نے صاحب جج سے شکایت کی کہ میرے بھائی کو سبدا احمد خاں بھگاتا
 اور ہر قسم کی مدد دیتا ہے اس کو آپ سمجھادیں کہ جب تک بھلا جھگڑا عدالت
 سے طے نہ ہو جائے، وہ میرے بھائی سے ملنا چھوڑ دے جان پاشن گبنس کے
 طعننے اور رعب و طاب کی تمام قنصلت میں دھاک تھی اور ان کے کسی ماتحت کی
 یہ مجال نہ تھی کہ ان کا کہنا نہ مانے۔ انھوں نے ایک روز سرسید کو بلا کر سمجھایا کہ
 جب تک یہ نزاع رفع نہ ہو تم اپنے دوست سے ملنا چھوڑ دو۔ سرسید نے
 صاف کہہ دیا کہ میں بیشک آپ کا ماتحت ہوں، سرکاری معاملات میں جو کچھ
 آپ ہدایت کریں گے اس کی بسر و چشم تعمیل کروں گا مگر میرے ذاتی تعلقات
 میں آپ کو دخل دنیا نہیں چاہیے، اگر آپ کہیں کہ تم چند روزہ کو اپنی مس
 یا بہن سے ملنا چھوڑ دو تو میں کیونکر آپ کے حکم کی تعمیل کر سکتا ہوں۔ اگرچہ

انگریزوں میں ہندوستان کی آب و ہوا محکم اور خوشامد پسندی پیدا کر دیتی ہے۔ مگر چونکہ آزادی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہوتی ہے وہ ایسے آزاد ٹٹھلوں کی آخر کار قدر کرنے لگتے ہیں اور برخلاف عام اشخاص کے ان کے ساتھ خاص طور کا برتاؤ برتتے ہیں جب صاحب گج نے یہ معقول غدر سنا پھر کبھی ان پر ایسا بے جا دباؤ نہیں ڈالا۔

۱۸۵۱ء میں جب کہ وہ پہلی بار مسٹر کرک کی جگہ صدر امین مقرر ہو کر رہ گیا۔ گئے ہیں اس وقت رہتک میں عجب کھل بلی پڑی ہوئی تھی۔ مسٹر گتری قائم مقام مجسٹریٹ نے ہیشمار مقدمے بد اعمالی اور رشوت ستانی کے مسٹر کرک پر دائر کر رکھے تھے۔ مخبری کا بازار گرم تھا۔ جو لوگ گتری صاحب کے ہاں کرک کے برخلاف مخبری کرتے تھے ان سے سب لوگ دہنے تھے۔ خان بہادر غلام نبی خان مرحوم جو اس وقت وہاں نائب سررشتہ دار کلکٹری تھے ان کا بیان ہے کہ "سید صاحب نے وہاں جا کر کئی کام صاحب مجسٹریٹ کی مرضی کے بالکل برخلاف کیے اور کبھی ان کا دباؤ نہیں مانا۔ ایک شخص بابر خاں نامی قصبہ رہتک کا نمبردار جس کو اقم بھی جانتا ہے۔ گتری صاحب کا بڑا منقرب تھا جس نے کرک کے برخلاف ان کو بہت مدد دی تھی، اُس نے کسی دیوانی کے مقدمے میں سید صاحب کے اجلاس میں چھوٹی گواہی دی۔ انھوں نے فوراً اس کو ماخوذ کیا۔ ہر چند گتری صاحب نے اُس کی رہائی کے لیے سفارش کی مگر سید صاحب نے سفارش نہیں مانی اور اُس کو ودرہ سپرد کر دیا جہاں سے اُس کو تین برس کی قید کا حکم ہوا۔"

پھر میونسپل کمیٹی کے ایک مقدمہ میں گتری صاحب ایک ٹھیکہ دار کی جائیداد بعلت مطالبہ کمیٹی نیلام کرنی چاہتے تھے اور تمام ممبران کمیٹی

سوائے بید صاحب کے اُن سے متفق رائے تھے۔ سرسید نے اُس وقت کے بلائز کے مطابق یہ مانے دی کہ کمیٹی بدون حاصل کرنے ڈگری دیوانی کے اپنے اختیار سے ٹھیکہ دار کی جائیداد نیلام کرنے کی مجاز نہیں ہے جب سب نے اس رائے سے اختلاف کیا تو انہوں نے اپنی رائے مدلل تحریر کر کے کمیٹی میں بھیج دی۔ آخر گتھی صاحب کر بعد اکراہ انھیں کی رائے کے موافق عمل کرنا پڑا۔

منشی صاحب ہی کا یہ بیان ہے کہ "مجبب سے گتھی صاحب نے مسٹر کرک کوڑک دی تھی صدرا مینی کی کچھ وقت لوگوں کی نظر میں نہیں رہی تھی خصوصاً ملازمان کچھری ضلع اُس کو رائے محض سمجھنے لگے تھے۔ اتفاق یہ کہ ایک شخص جس کا باپ صاحب ضلع کے محکمہ میں سررشتہ دار تھا، صدرا مینی میں بزمہ تحریران نوکر تھا اور اس گمنام پر کہ میرا باپ صاحب بمسٹر کرک کی ناک کا بال ہے اپنا کام نہایت بے پروائی سے کرتا تھا۔ سرسید نے اُس کو بعلت غفلت و بے پروائی کے معطل کر دیا۔ ہر چند ضلع والوں نے سفارش کے لیے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر انہوں نے کچھ اتفاقات نہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ دیوانی کی تعطیل میں دلی چلے گئے۔ مگر تعطیل سے واپس آکر کسی کے کہنے سے نہیں بلکہ اُس کے باپ کے بڑے پالے کا خیال کر کے اُس کو پھر بھل کر دیا۔ یہ واقعات اُس زمانے کے ہیں جب کہ سرسید یور وپی حکام کی نظر میں ایک ہندوستانی عہدیدار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے اور جو وقت ادراغبار اُن کو ایام غدر کی خدمات کے بعد انگلش حکام اور خود انگلش گورنمنٹ میں حاصل ہوا اُس کا عشر عشر بھی اُس وقت حاصل نہ تھا۔ مگر اُس حالت میں بھی انہوں نے اپنی آن کو کبھی ہاتھ سے نہیں

جائے دیا اور اپنے فرائض منصبی نہایت آزادی اور دلیری سے ادا کرتے رہے۔ منشی غلام نبی خاں مرحوم کہتے تھے کہ ”منی صاحب جو ستر کرک کے مفدمات کی تحقیقات کے لیے اڈیشنل کمشنر ہو کر رہتک گئے تھے۔ جب سرسیدان سے ملے تو وہ ان کی ملاقات سے نہایت خوش ہوئے اور ان کی غیبت میں لوگوں سے کہا کہ ہم نے ہندوستانی افسروں میں ایسا صاف اور آثا و طبیعت کوئی افسر نہیں دیکھا۔ اسی وجہ سے سرسید کا منی صاحب سے اس قدر ربط بڑھ گیا تھا کہ آثار الصنادید کا انگریزی ترجمہ جو ستر بارٹس جنٹ مجسٹریٹ دہلی نے ناتمام چھوڑ دیا تھا اس کے پورا کرنے کا وعدہ انھوں نے سرسید سے کیا۔ چنانچہ جب صاحب موصوف مراد آباد میں حج ہو کر گئے تو ہیبت سا ترجمہ انھوں نے کرایا۔“

تھیوڈور مارلین اس آرٹیکل میں جو انھوں نے سرسید کی وفات کے بعد ان کے پورٹریٹ پر کھینچا، ترکی اور مسلمانوں کے تعلقات کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”اس مضمون پر سرسید نے کوئی مذہب اور مشتمل آواز نہیں نکالی۔ اس نے بھی اور مسلمانوں کی طرح سلطان ترکی کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی اور اس کے تشریل پر افسوس کیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ عمارت سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا جائے اور اس کو یہ خیریت تھا کہ مبادا مسلمان بھی پورٹریٹ کے بے وقعت کی اس حالت تک پہنچ جائیں جو یورپ میں یہودیوں کی حالت ہے۔ اسی لیے ترکی کے ہر ایک صدر پر وہ ویسے ہی پتے دل سے رنج و الم کرتا تھا جیسا کہ ہر مسلمان کرتا ہے لیکن اس ہمدردی کی بدولت جو اس کو اپنے معزز ہم مذہبوں کے ساتھ تھی، وہ قیصرینہ کی وفاداری اور احسانندی سے سبکدوش نہیں ہو سکا۔“

بے تعصبی اور انصاف

اس کے سوا سرسید نے اپنی تمام ملازمت کا زمانہ جس بے تعصبی اور کشادہ دلی سے بسر کیا وہ فی الحقیقت ہمارے ملک میں ایک ایسی مثال ہے جو نایاب نہیں تو کیا بضرور ہے۔ انھوں نے عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر ہر قوم اور ہر مذہب کے آدمی کو ہمیشہ ایک نگاہ سے دیکھا اور کبھی ایک جج ہونے کی حیثیت سے اپنی قوم اور اپنے مذہب کے آدمی کو دوسری قوم اور دوسرے مذہب کے آدمی پر ترجیح نہیں دی۔ بلکہ ایسی ترجیح دینے کو ایک نہایت کمینہ نصبت اور تنگ انسانیت تصور کیا ان کی بے تعصبی کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ غدر کے موقع پر جیسا کہ پہلے حصہ میں مفصل بیان ہو چکا ہے، باوجودیکہ ضلع بجنور کے ہندو مسلمانوں میں کمال عداوت تھی، وہاں کے تمام ہندو تعلقہ داروں نے خود سرکار سے کمال غموشی اور آرزو کے ساتھ یہ درخواست کی کہ جب تک ضلع میں امن نہ ہو سید احمد خاں اور ڈپٹی رجمنٹ خاں کو ضلع سپر دیکھا جائے اور انھیں کو ضلع کا حاکم بنایا جائے۔ تاریخ سرکشی بجنور میں سرسید نے جہاں ہندو چودھریوں کا حال لکھا ہے اُس سے ان کی غایت و رجہ کی بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔۔۔

باوجودیکہ ہندو چودھریوں اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے مسلمانوں پر سخت ظلم اور زیادتیاں ہوئی تھیں اس پر بھی چونکہ وہ فی الواقع بغاوت کے الزام سے پاک تھے اس لیے ان کو اس الزام سے بالکل ہری کیا ہے، اور واقعات کے بیان کرنے میں مذہبی یا قومی تعصبات کو جو اس وقت تمام ملک میں وبا کی طرح پھیلے ہوئے تھے مطلق کام نہیں فرمایا۔

جب سرسید ملازمت سے کنارہ کش ہو کر بنارس سے روانہ ہونے کو

تھے تو وہاں کے ہندو اور مسلمان رؤساء نے بشمول یوروپین حکام کے ان کو ایک حکام کے ان کو ایک دواسی ایڈریس دیا تھا جس میں ان کی سرکاری ملکی اور قومی خدمات کے علاوہ خاص کر ان کے بے لاگ انصاف اور بے تعصبانہ فیصلوں کی نہایت تعریف تھی۔ سر سید نے اس کے جواب میں کہا کہ "اگر میں نے قانون کی تعمیل انصاف کے ساتھ بلا لحاظ کسی کے رقبہ اور قوم اور رنگ یا مذہب کے کی تو اس کے لحاظ سے میں کسی شکر یہ کا مستحق نہیں ہوں مجھ کو تمام عمر اس بات کی فکر رہی ہے کہ جو بڑا فرض مجھ کو تفویض ہوا ہے اس کو ایمانداری کے ساتھ انجام دوں۔ میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو ہمیشہ خوب سمجھتا رہا ہوں اور دنیا کی دولت اور عزت پر سچ بات کو اور خدا تعالیٰ کی خوشنودی کو انسان کی قدر وانی اور تعریف پر ہمیشہ ترجیح دیتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنے تئیں خدا تعالیٰ کا جواب دہ سمجھا ہے، نہ کہ انسان کا گو میں نے اپنی راستے میں غلطی کی ہو، مگر ہمیشہ اپنے ایمان کی ہدایت پر عمل کیا ہے باوجود اس کے مجھ کو اس بات کے دیکھنے سے کچھ کم خوشی حاصل نہیں ہونی کہ جو کوششیں میں نے سب لوگوں کے حق میں انصاف کرنے میں کی تھیں ان کی قدر شناسی میرے ہم وطنوں نے کی ہے۔"

انھیں دنوں میں جب کہ سر سید بنارس سے رخصت ہونے والے تھے شہر کے ہندو اور مسلمان شرفاء نے ان کی یادگار قائم کرنے کے لیے ایک کمیٹی منعقد کی تھی جس کے پریسڈنٹ راجہ شمشون رائے سنگھ بہادر تھے۔ اس کمیٹی میں راجہ صاحب موصوف نے سر سید کی یادگار کے طور پر بنارس کالج میں طبیعات کی تحصیل کے لیے ایک سکالرشپ ہمیشہ کے واسطے "سید احمد شاہ سکالرشپ" کے نام سے مقرر کی تھی جو اب تک برابر جاری ہے۔

انتظام قحط ضلع مراد آباد کا مفصل حال ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں اسی کے ضمن میں وہ واقعہ جو راجہ جیکشن واس صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا تھا اور جس سے اُن کو سرسید کی بے تعصبی کا یقین ہوا تھا ملاحظہ کے قابل ہے کہ رسالہ "لائل محمد نزاد" انڈیا کو دیکھ کر انھوں نے سرسید کو ایک سخت متعصب مسلمان خیال کیا تھا مگر مراد آباد کے محتاج خاندان میں ہر مذہب اور ہر ملت کے ادنیٰ ادنیٰ لنگھوں کی خدمت گزاری میں اُن کو دیوانہ وار سرگرم دیکھ کر وہ حیران اور اُن کی بے تعصبی کے دل سے قائل ہو گئے۔

وفاداری

غدر کے زمانہ میں جس خلوص اور سچائی کے ساتھ گورنمنٹ کی وفاداری خیر خواہی اور بورد میں مردوں عورتوں اور بچوں کی جان کی حفاظت اُن سے بن آئی اُس کو ہم مفصل پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں یہاں صرف سر جان اسٹریچی کے چند الفاظ نقل کیے جاتے ہیں جو انھوں نے شملہ میں ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت محمد ن کا لچ کیشی کے ایڈریس کے جواب میں سرسید کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہے تھے انھوں نے کہا کہ "کس شخص نے اُس سے زیادہ شرفیاء طور پر ولیری اور وفاداری کا ثبوت برٹش گورنمنٹ کے ساتھ نہیں دیا جیسا کہ شملہ میں انھوں نے (یعنی سید احمد خاں نے) دیا، میں کوئی لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کر سکتا جس سے ان کی مبالغہ نشداری کا کافی طور پر اظہار ہو سکے" اسی اسٹیج میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ "شمال مغربی اضلاع میں اُن سے زیادہ کوئی روشن منہیج نہیں ہوا۔ اور اسٹریٹسپیر نے اپنی رپورٹ میں اقرار کیا تھا کہ "اگر صدر امین (یعنی

سید احمد خاں ایچ میں واسطہ نہ ہوتا تو ہماری جانیں نواب محمود خاں کی شکار ہو جاتیں۔
 ایسی رپورٹ میں انھوں نے سرسید کی دانشمندی بے مثل ایمانداری اور
 سرگرمی پر شہادت دی تھی۔

بنارس کی سول جسٹس ایڈمنسٹریشن رپورٹ ۱۸۶۷ء میں صاحبِ جج
 بنارس نے اُن کی نسبت لکھا کہ "شہر اور ضلع بنارس کو سید احمد خاں
 ایک ایسا شخص ملا ہے جس پر وہ نہایت اعتماد رکھتے ہیں اور جس کو فریب
 یا دھوکا نہیں دے سکتے۔ وہ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں نہایت باقاعدہ
 اور ان کی طرف متوجہ رہنے والا ہے اور اس کے فیصلے نہایت احتیاط اور غور
 سے کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ مقدمہ کے ہر ایک پہلو اور ہر ایک جانب
 پر اس طرح غور کرتا ہے کہ عدالت اپیل کے فیصلہ کے واسطے کچھ باقی نہیں
 رہتا۔ اُن کے اس بہت بڑے تجربہ سے جو ہر قسم کے جوڈیشل امور میں
 حاصل ہے میں نے خود بہت فائدہ اٹھایا ہے۔"

ہائی کورٹ کے ججوں نے سرسید کی درخواست پٹنن گورنٹ میں بھیجے
 وقت حسبِ ذیل رپورٹ کی تھی "سید احمد خاں کے اوصاف اور قابلیت
 بحیثیت ایک پبلک سرورنٹ کے ہزار آنر پر بخوبی روشن ہیں مگر یہ عدالت
 لہجہ بالا دست عدالت ہونے کے جس کے سید احمد خاں ماتحت رہے
 ہیں، اُن کی وفائیت، محنت، قابلیت اور ہوشیاری کی بلند اور بے داغ
 شہرت کو جو انھوں نے اپنے طولِ طویل زمانہ ملازمت میں تمام جماعتوں
 کے درمیان حاصل کی ہے بطور شہادت کے درج کر دینا چاہتی ہے اور نیز
 اس نقصان پر افسوس ظاہر کرنا چاہتی ہے جو پبلک سرکس کو جو انھوں نے
 اعلیٰ عزت اور شرافت کے ساتھ انجام دی ہے، اُن کی کنارہ کسی سے

پہنچے گا۔

نواب لفٹنٹ گورنر کی طرف سے جو اس رپورٹ کا جواب موصول ہوا وہ یہ ہے ”سید احمد خاں کا استعفا منظور کرنے میں سبز آنر لفٹنٹ گورنر نے مجھ کو ہدایت کی ہے کہ ان کی جانب سے میں ان کی ہائی اپینین سید احمد خاں کی اس قابلیت اور ہوشیاری کی نسبت ظاہر کروں جو پبلک سروس میں ان کے امتیاز کا باعث رہی ہے اور نیز ان کی اس روشن، مہذب اور بے غرضانہ محنت کی نسبت بھی جو انھوں نے اپنی پرائیویٹ لائف میں اپنے ہموطنوں کے فائدے کے واسطے کی ہے۔“

استحقاق

اس موقع پر ہائی کورٹ نے چاہا تھا کہ سر سید کی خدمات کی نسبت ایک خاص شکریہ گورنمنٹ گزٹ میں مشتہر کرایا جائے مگر چونکہ یہ ایک غیر معمولی طریقہ تھا اس لیے عمل میں نہیں آنے پایا لیکن پائیونیر نے غالباً رجسٹرار ہائی کورٹ کے اشارے سے اس شکریہ کے الفاظ چھاپ کر مشتہر کر دیے تھے۔

کتاب ”پرنسپل آف دی انڈین اسپاٹرز“ جس میں سر سید کو ارکان سلطنت ہندوستان میں سے ایک رکن شمار کیا گیا ہے، ان کی ممبری کو نسل کے زمانہ کی طرف اشارہ کر کے یہ لکھا ہے کہ ”ان طریقوں میں سے جو لارڈ لٹن نے ہندوستانیوں کو عزت اور ذمہ داری کے مناصب پر ترقی دینے کے لیے اختیار کیے تھے کوئی طریقہ انہیں اس قدر ہر دل عزیز نہیں ہوا جیسا کہ

شایستہ مسلمانوں کے اس واجب التحظیم سید راہی سید احمد خاں کالجی
 بیٹو کونسل میں مقرر کرنا ہوگا ہے۔ اس اعزاز کو بہت دور مسلمانوں نے
 مساوی طور پر سید احمد خاں کی دیانت داری۔ بے غرضانہ اور شرفیابہ برتاؤ
 اور ان کی قابلیتوں کا حسلہ تسلیم کیا ہے۔

پولشکل خدمات

سٹراپیج جی کین ممبر پارلیمنٹ نے اخبار ”ہوم ورڈ میل“ میں سرسید کی نسبت اپنی یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ”سید احمد خاں جس سے میں تے شہ میں جب کہ وہ لیجیس بیٹو کونسل کا ممبر تھا، واقفیت حاصل کی تھی، ٹھیک اس قسم کا شخص ہے جس کو ہندوستان کا انگلش منتظم اپنے ساتھ رکھنے کی خاطر شکل او خطہ کے وقت میں خواہش کرے گا۔ وہ ایک خاندانی، تعلیم یافتہ، لائق، دفاہ ارادہ پوری ارجنل اور مستقل طبیعت کا آدمی ہے۔ وہ تاج برطانیہ کا ایک خیر خواہ اور دوست سمجھا جاتا ہے، مگر با اینہم وہ انگریزی گورنمنٹ کے نقطوں سے بخوبی واقف ہے۔“

سٹراپیج ڈورکس نے جو ۲۹ مارچ ۱۹۱۰ء کو سرسید کی وفات پر اسٹیج دی تھی اس میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ”دس برس کا عرصہ ہوا کہ سر آکلنڈ کالون نے جب کہ وہ گورنمنٹ گورنر تھے مجھ سے یہ کہا تھا کہ ”کسی زندہ شخص نے عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی، برٹش گورنمنٹ کا استحکام سلطنت ہندوستان کے بارہ میں اس قدر کوشش نہیں کی ہے جس قدر کہ سرسید نے کی ہے۔“

مسائل اسباب بغاوت اور اس پر لوگوں کی رائیں

رسالہ اسباب بغاوت جس کا لکنا ایک حیثیت سے ملک اور قوم کی

بے نظیر خدمت اور دوسری حیثیت سے تاج برطانیہ کی حقیقی خیر خواہی کا کام
 تھا، سرستیدہ کی اُن جلیل القدر خدمات میں سے بے جن سے وہ ارکان سلطنت
 میں شمار کیے جانے کے مستحق ہوئے ہیں، وہ اپنے ایک خط میں جو ولایت سے
 مولوی سید مہدی علی خاں کو بھیجا ہے لکھتے ہیں کہ ”میں انڈیا اوفس میں صاحب
 سکریٹری وزیر ہند کے پاس گیا تھا، انھوں نے مجھ کو کنسل کے کاغذات میں
 میری کتاب ”اسباب بغاوت“ مع تامل و کمال انگریزی ترجمہ کے دکھلائی۔ اچھے
 دیکھ کر میرا بیت دل خوش ہوا، جو کچھ رائیں اس کی بدولت قرامہ پائیں اُن کا بیان
 بے فائدہ ہے، اہل ہند ناقدر دان، دوست کش اور اپنے خیر خواہ کے دشمن ہیں
 مگر میں خوش ہوں کہ میرے سموطنوں کی بھلائی ہوئی۔“

اسی حال کو انھوں نے زبانی مجھ سے اس طرح بیان کیا کہ ”ولایت میں
 سر جان کے فارن سکریٹری وزیر ہند سے پرائیویٹ ملاقات ہوئی تو اُن کی میز پر
 ایک دفتر کاغذات کا موجود تھا، انھوں نے ہنس کر کہا کہ ”تم جانتے ہو یہ کیا
 چیز ہے؟ یہ تمہارا رسالہ اسباب بغاوت اصل اور اس کا انگریزی ترجمہ ہے
 اور اُس کے ساتھ وہ تمام مباحثات ہیں جو اُس پر پارلیمنٹ میں ہوئے مگر چونکہ
 وہ تمام مباحثے کا فیڈنشل تھے اس لیے وہ نہ چھپے اور نہ اُن کا ولایت کے
 کسی اخبار میں تذکرہ ہوا۔“

سر آکلنڈ کالون کی رائے

اسی کتاب کی نسبت مشہور میں سر آکلنڈ کالون لفٹنٹ گورنر نے
 ٹرسٹیان مٹن کالج کی ایڈریس کے جواب میں یہ الفاظ کہے تھے کہ ”جو واقعات
 سب سے پہلے مجھ کو اُس وقت پیش آئے جب کہ میں اول مرتبہ ہندوستان

میں آیا تھا۔ منجملہ اُن کے ایک یہ بات تھی کہ میرے دوست سر سید احمد خاں نے ایک ایسے معاملہ میں مجھ سے اعانت کی خواہش کی جو اُس وقت انھوں نے شروع کیا تھا اور جس کی طرف اُن کی دلی توجہ مائل تھی۔ انھوں نے مجھ سے یہ فرمائش کی تھی کہ میں اُن کو ہندوستانی زبان سے انگریزی زبان میں اس رسالہ کا ترجمہ کرنے میں مدد دوں جو انھوں نے اُن افسوسناک واقعات کے اسباب کی نسبت تحریر کیا تھا جو عہد میں ظہور میں آئے ہیں کہہ سکتا ہوں کہ آپ میں سے اکثر صاحبوں نے اُس رسالہ کو دیکھا ہوگا انھوں نے مجھ سے اس امداد کی درخواست کر کے مجھ پر ایک ایسا احسان کیا ہندوستان میں میرے دورِ ملازمت کے خاتمہ تک قائم رہیگا کیونکہ انھوں نے اس رسالہ میں خاص کر بعض ایسے خیالات پر زور دیا تھا جن کی پوری قوت کو میں اس کے بعد اپنے تجربہ کی رو سے بخوبی سمجھ سکا ہوں۔ سر سید احمد نے اس میں اشارہ کیا تھا کہ جو باتیں انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے خیالات اور حالت کو بخوبی سمجھیں۔ انھوں نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ زیادہ تر اُن واقعات کی بنیاد جن پر وہ بحث کر رہے تھے، سبھلے ناراضی کے غلط فہمی تھی۔ پس اگر انگریز اور ہندوستانی ایک دوسرے کے خیالات کے سمجھنے میں ثابت قدمی کے ساتھ کوشش کریں گے تو اُن کے باہمی تعلقات بہت زیادہ مربوط و مستحکم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ ”انھیں خیالات سے ہمارے ہندوستان کے انتظامی مسائل حل ہوں گے اور انھیں خیالات کی دوسری صورت علی گڑھ کالج ہے۔“

مسٹر مارلین کی رائے

مسٹر تھیوڈور مارلین نے جو سرسید کی وفات کے بعد اُن کے پوئلش کرکس پر ایک آرٹیکل لکھا تھا اس میں وہ اسی رسالہ اسباب بغاوت کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”انگریزوں میں بہت سے اس بات کے بڑے خواہش مند تھے کہ فتح کے بعد (ہندوستان میں) دل کھول کر انتقام لیں اور اُن کے غصہ کی آگ مسلمانوں کے برخلاف خاص کر بھڑکی ہوئی تھی جن کی نسبت بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ غدر کے محرک ہوئے ہیں۔ اُس وحشیانہ حالت میں جبکہ شدید تر خیالات کے پھیلنے کا احتمال تھا ایک ایسی حق بات کا جو عام پسند نہ تھی، منہ سے نکالنا کوئی آسان بات نہ تھی... شہدے میں یہ دلیری کے الفاظ تھے، باوجود اس کے سرسید کے دلائل کے عام منہ سے کی سچائی اُسی وقت سے تسلیم کر لی گئی ہے اور جو لوگ سرسید کے اس برتاؤ پر جو اُس نے نیشنل کانگریس کے ساتھ کیا، الزام لگاتے ہیں اُن کے لیے اس بات پر غور تا مفید ہو گا کہ اس نے اتنی مدت پہلے جتنی کہ شہدے سے اب تک گزری ہے گورنمنٹ پر زبرد والاتھا کہ جس بیٹو کنسل میں دسیوں کے داخل کرنے کی نہایت ضرورت ہے۔“

، میوم نیوز کی رائے

انگلستان کے مشہور اخبار ”ہوم نیوز“ نے اس کتاب کی نسبت لکھا تھا کہ ”سید احمد خاں نے جو غدر کے اسباب تخریر کیے تھے اُن میں سے بعض نہایت قیمتی اور عمدہ آمد کے قابل تجویز ہیں پیش کی تھیں جو حکام

ہندوستان نے کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں کیں۔ اس نے نہایت ولیری کے ساتھ اپنی رائے اس مضمون پر ظاہر کی۔ یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ حکمران گروہ میں اس کی رائے نے نہایت اثر پیدا کیا۔ وہ ان اسباب کے بیان کرنے سے خائف نہیں ہوا جن کی طرف غدر کو بخوبی منسوب کیا جاسکتا ہے اور جن کی صحت تجربہ سے پورے طور پر ثابت ہو چکی ہے۔

برمنگھم ڈیلی گزٹ کی رائے

”برمنگھم ڈیلی گزٹ“ نے سرسید کی اسی کتاب کا اس قدر خلاصہ لکھ کر یہ تحریر کیا تھا کہ ”ان شکایتوں کو اس طرح رفع کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر تاج برطانیہ سے متعلق کی گئی اور ہندوستانی اہل بورڈ میں جو ملازم سرکار نہ تھے وہ وائسرائے اور پریزیڈنسیوں کی لیجس لیٹو کوئٹوں میں شریک کیے گئے۔“

سینٹ جمس بجٹ کی رائے

اخبار ”سینٹ جمس بجٹ“ نے اسی کتاب پر زیرِ بار کہا تھا کہ ”سید احمد خاں کی مستحکم وفاداری جو اس یقین پر مبنی ہے کہ انگریزی حکومت اس کے

لے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسباب بغاوت کے دیکھنے کے بعد یہ تبدیلی عمل میں آئی ہے کیونکہ کھمٹر کا اشتہاد میں اس تبدیلی کا اعلان کیا گیا تھا سرسید کی کتاب چھپنے سے پہلے شائع ہو چکا تھا پس اس سے یہ مراد ہے کہ جس بات کی آرزو سرسید نے اس کتاب میں ظاہر کی تھی وہ ان کی کتاب کے پیش ہونے سے پہلے ہی پوری کر دی گئی ۱۲ -

ملک کے واسطے سراسر مفید ہے، وہ اُس کے اُن خیالات اور رایوں کو نہایت سنگین کر دیتی ہے جو اُس نے بڑے جوش اور فصاحت کے ساتھ کتاب ”اسباب بغاوت“ میں بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب انگریزوں کے واسطے اب تک نہایت دلچسپ اور فائدہ مند ہے۔ خود سر سید احمد خاں دو دفعہ وائسرائے کی کونسل میں لارڈ لٹن اور لارڈ رین کے عہد میں ممبر رہا ہے اور اس کی وہ خواہش جو بند دستانیوں کے کونسل میں شریک ہونے کی تھی پوری ہوئی ہے۔ لیکن ابھی اُس کی اس شکایت میں زور ہے کہ حاکم اور محکوم دونوں طرف داری اور غلط فہمی ہونے کے سبب ہنوز ایک دوسرے سے جدا ہیں اور یہ اکثر صورتوں میں عدم ہمدردی یا بالاتر قوم کی طرف سے عمدہ اخلاق ظاہر نہ ہونے کے سبب سے ہوتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک خیالی شکایت ہے۔ لیکن اگر ہم یہ خیال کریں کہ ہم علی لوگ ہیں، اس لیے ہم کو خیالی شکایتوں پر زحیم نہ کرنی چاہیے تو بے شک ہم اُس غلطی میں گھر جائیں گے جس کی سید احمد خاں شکایت کرتا ہے، ہمارے نزدیک سید احمد خاں کی شکایتوں کا اثر بہت جلد اور بہت وسعت کے ساتھ پھیلا ہے۔ بہ نسبت اُن شکایتوں کے جو لال موہن گھوس اور اُس کے اسکول کے نوجوان آدمی نہایت فصاحت کے ساتھ کرتے ہیں۔

کرنل گریم کی رائے

کرنل گریم جنھوں نے سر سید کی لائف لکھی ہے، وہ اس کتاب کی نسبت لکھتے ہیں کہ ”اگرچہ ہم میں سے بعض لوگ سید احمد کی ”اسباب بغاوت“ سے متفق نہ ہوں مگر یہ رسالہ جس کو ہماری خیر خواہ اور وفادار

مسلمان شرفا ہیں سب سے لائق ترین شخص نے لکھا ہے، فی نفسہ بدرجہ غایت مفید ہے، کہ اس سے ہندوستانی طرز خیالات کے اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔

رسالہ اسباب بغاوت کے بعض نتائج

اگرچہ کرنل موصوف کے بیان کے موافق ممکن ہے کہ کچھ انگریز ایسے ہوں جو اس رسالہ کے مضامین یا لکھ نہ تسلیم کرتے ہوں یا اس کے بعض مضامین سے اختلاف رکھتے ہوں، لیکن اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ نے جیسا کہ مذکورہ بالا انگریزی اخباروں میں تصریح کی گئی ہے، سرسید کی بہت سی تجویزوں کے موافق عمل و اقدام اکثر شکایتوں کا تدارک کیا، مثلاً سب سے پوری چیز جس کو سرسید نے کتاب مذکور میں بغاوت کا اصل سبب قرار دیا تھا وہ ہندوستانیوں کا قانونی کونسل میں شریک نہ ہونا تھا جس کے سبب سے گورنمنٹ کے خیالات رعایا پر عیاں ہوئے اور رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر نہ ہونے پاتے تھے۔ گورنمنٹ نے خود اس شکایت کا تدارک کیا، یعنی ۱۸۶۱ء میں یہ رسالہ گورنمنٹ میں پیش ہوا اور ۱۸۶۱ء میں ہندوستانی ریش لیجنس لیٹو کونسل کی ممبری پر نامزد کیے کیے چنانچہ جنوری ۱۸۶۲ء کے اجلاس کونسل میں ہم پہلی ہی بار مہاراجہ نرندر سنگھ ریش پٹیلہ راجہ دیو انراہن سنگھ ریش بندس اور راجہ ڈنکر رائے دیوان ریاست گوالیار کو شریک پاتے ہیں اگرچہ اس وقت ہندوستانیوں کا کونسل میں شریک ہونا محض برائے نام تھا، مگر سرسید نے درحقیقت یہ بیج بویا تھا اس پودے کا جواب کسی قدر بار آور ہونے لگا ہے۔ اور ان کا یہ احسان تمام ملک پر ہمیشہ رہے گا۔ یا

مثلاً کتاب مذکور میں یہ بھی شکایت کی گئی تھی کہ ہندوستانیوں کو بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدہ پر مقرر نہیں کیا جاتا۔ اس شکایت کا دفعیہ بھی گورنمنٹ نے بہت جلد کیا۔ کتاب مذکور کے پیش ہونے سے ایک برس بعد یعنی ۱۸۶۲ء میں پہلی ہی بار پینڈت شبو ناتھ ہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے جو پہلے بھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوئے تھے ملنے لگے۔

پولٹکل خدمات پر پال مال گزٹ کی رائے

لندن کے نامور اخبار پال مال گزٹ میں سرسید کی وفات پر ان کی پولٹکل خدمات کی نسبت یہ ریمارک کیا تھا کہ ”سرکار انگریزی اور باشندگان ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اس قدر مبارکباد دے سکیں جس قدر کہ سرسید احمد خاں کی لائف پر وہ ابتداء سے آخر دم تک سرکار انگریزی کے راج کا پکا دوست رہا اور جو ضد متین اُس نے، کہیں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہو گا۔“

یہاں تک ہم نے سرسید کی سرکاری خدمات، اور جو وقعت اور اعتبار انھوں نے ان خدمات کی بدولت ایک ایسی قوم کی حکومت میں حاصل کیا جس کی نظر میں ہندوستانیوں کا جتنا شاید خیال سے کچھ ہی کم ہو گا، اس کو بطور مشتے نمونہ از خروار سے بیان کر دیا ہے۔ اب ہم ان کی ملکی اور قومی خدمات پر نظر ڈالتے ہیں جن کی نظیر کم سے کم ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے دستیاب ہوگی۔

اگرچہ پہلے حصہ میں سرسید کے بر قسم کے واقعات زندگی کے ضمن میں

ان کی ملکی و قومی خدمات کا ذکر اپنی اپنی جگہ تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ مگر ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ان کو ایک سلسلہ میں منہایت اختصار کے ساتھ منظم کر کے ناظرین کو خاص طور پر ان کی طرف متوجہ کیا جائے اور ان کے متعلق جو امور پہلے حصہ میں بیان نہیں ہو سکے وہ جو تالیف ان خدمات پر مترتب ہونے ان کو بھی اس سلسلہ میں شامل کر دیا جائے۔

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ہم اس کتاب میں ایک ایسے شخص کی خدمات کا ذکر کر رہے ہیں جس کے اختیار میں اپنی طاقت کے موافق کوشش و تدبیر کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ ان کے ہاتھ میں سلطنت اور حکومت کی باگ ڈور تھی کہ اپنے ملک اور قوم کے واسطے جو چاہے سو کر گزرے اور نہ ملک اور قوم کے دل اس کے قبضے میں تھے کہ جو نیک صلاح ان کو بتائے اُس سے کسی کو اختلاف یا انکار نہ ہو۔ پس ہم کو سرسید کی لائف میں یہ نسبت اس کے کہ اُس کی کوششوں سے ملک اور قوم کو کیا فائدے پہنچے، زیادہ تسریہ دیکھنا چاہیے کہ اُس نے ان کے فائدے کے واسطے کیا کیا کوششیں کیں۔ اسی لیے ہم نے سرسید کی کامیاب اور بالآخر کوششوں کے ساتھ ان کاموں کا بھی ذکر کیا ہے جن سے کوئی معتد بہ نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔ یا جو سبب نامساعدت و فتنہ کے ادھر رہ گئے، تاکہ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اس شخص کی ساری عمر کس دھن اور کس ادھیڑ میں گزری ہے۔

ملکی و قومی خدمات

ہمدردی

ہمدردی کا اصل مادہ ظاہر انسان اور تمام حیوانات میں یکساں پیدا کیا گیا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ دیگر حیوانات کی ہمدردی اس حد سے جو ان کی فطرت میں رکھی گئی ہے، کبھی آگے نہیں بڑھ سکتی جو خلاف انسان کے کہ کبھی اس کی ہمدردی ایک چھوٹے سے حلقہ میں محدود رہتی ہے اور کبھی بیرونی اسباب سے وہ نہایت وسیع ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ اس کا تعلق ادل گھر کی چار دیواری سے شروع ہوتا ہے، پھر جس قدر انسان میں بیرونی اسباب سے متاثر ہونے کی قابلیت زیادہ ہوتی ہے اسی قدر وہ تعلق بڑھتا جاتا ہے۔ سرسید کے واقعات زندگی سے یہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان میں ہمدردی کا مادہ اور بیرونی اسباب سے منفصل ہونے کی قابلیت معمولی آدمیوں سے ہر رتبہ بڑھ کر پیدا کی گئی تھی۔ محبت جو کہ ہمدردی کی ماں ہے ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

خاندان کی محبت

محبت کی پہلی سیڑھی خاندان کی محبت ہے، سو اس کی شہادتیں اس کتاب میں حاصل ہوں گی۔ خاندان کے بعد وطن کی محبت ہے سو وہی کے ساتھ جو دستگی

اُن کو تھی اور جو آخر کو حسرت کے ساتھ بدل گئی تھی۔ اس کا ثبوت بھی اس کتاب میں متعدد مقامات پر ملے گا۔

وطن کی محبت

اس وطن کی محبت کا اقتضا تھا جس نے اُن کو اُس اُجڑے دیار کے پرانے کھنڈروں اور قدیم یادگاروں کی تحقیقات میں بے انتہا مشقتیں اٹھانے پر مجبور کیا اور آئین اکبری کی تصحیح میں جس سے دلی کے افضل ترین بادشاہ کی ایک دھندلی تصویر کا اجا لانا مقصود تھا، اُن سے فوق العادہ محنت کرانی لیکن یہ سب کام ایسے تھے کہ اگر سرسید کی کوشش انھیں کاموں پر ختم ہو جاتی تو شاید اُن کو ایک محب وطن کی خدمات کا درجہ نہ دیا جاتا، مگر جب اُن کی آئندہ مسلسل خدمات پر جن کا سلسلہ اُن کے اخیر دم تک برابر جاری رہا، نظر کیجاتی ہے تو لامحالہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اُن کے یہ معمولی کام اُسی ظلالی زنجیر کی ابتدائی کڑیاں تھیں جو رشتہ مستقبل میں اُن کی ملکی اور قومی خدمات کے ترتیب پانے والی تھی۔

عملی قوت

پہلے حصہ میں جو سرسید کے ہر قسم کے کام تاریخ وار بیان کیے گئے ہیں اُن پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص میں جس درجہ کی عملی قوت ہمدلی گئی تھی وہ اُن کاموں پر بس کر نیوالی نہ تھی جو وہ ابتداء میں وقتاً فوقتاً سرانجام کرتے رہے، باوجودیکہ عدالت کا کام جوان کو سپرد تھا اور جس کو وہ کمال تہدیبی اور نہایت غور و فکر سے انجام کرتے دیتے تھے، فی نفسہ

ایک تھکا دینے والا کام تھا یا اینہد وہ بعینہ ایک سستی کی طرح جس کی پیاس چلو
دو چلو پانی سے نہیں بکھتی اور وہ کنویں یا در کی طرف دھڑکتا ہے ہمیشہ کسی بڑے
کام کی تلاش میں رہتے تھے۔ غدر سے پہلے جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا
ہے۔ انھوں نے مختلف قسم کے بہت سے کام سرانجام کیے مگر ان کی پیاس
کسی طرح نہ بجھی۔

خارجی اسباب سے متاثر ہونا

آخر وہ وقت آپہنچا جب کہ ان کی طبیعت کے اصلی جوہر ظاہر ہونے
والے تھے۔ شمس کے بنگامہ نے جیسا کہ سرسید کے کسی دوست کا قول ہے
ان کے دل پر وہ کام کیا جو تو تھر کے دل پر بجلی کے گرنے نے کیا تھا جس
طرح سورج کی گرمی سے پانی کا ایک خاص حصہ اپنے خیر طبعی سے بلند ہو جاتا
ہے۔ اسی طرح غدر کی آہٹ نے سرسید کو اپنے طبقہ کی سطح سے بالاتر کر دیا، دلی،
مراو آباد اور بجنور کے مسلمان خاندانوں کی متبہا اور بربادی دیکھ کر جس جوش
کے ساتھ ہندوؤں کی لہر ان کے دل میں اٹھی وہ فی الواقع حیرت انگیز تھی اس
وقت ان کا حال بعینہ اس شخص کا سا تھا جس کے گھر میں آگ لگ کر گھر کا ایک
حصہ جل گیا ہو اور باقی حصوں کے بچانے کے لیے دیوانہ وار ادھر ادھر ہاتھ
پالو مارتا پھرتا ہو۔ انھوں نے خیال کیا کہ جو مسلمان غدر کی روندن میں آچکے اور
جو خاندان بگڑ چکے ان کو مدد پہنچانی تو اب اسکان سے خارج ہے مگر جو باقی ہیں
اور جو ہندوستان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہیں ان کو کس طرح غدر کے
آئندہ خوفناک نتیجوں سے بچایا جائے؛ گورنمنٹ تمام ہندوستان کے
مسلمانوں سے بدگمان ہو گئی ہے مسلمان گورنمنٹ کے شاید انتقام اور

سخت سزاؤں سے جو غدر کے بعد ظہور میں آئیں اُس کی مہربانی اور شفقت سے بالکل مایوس ہو گئے ہیں جن غلط فہمیوں کے ہندوستانی شکار ہوئے ہیں اُن کی سوتیلی بدستور جاری ہیں جس جہالت اور تعصب نے یہاں تک نوبت پہنچائی وہ اسی طرح ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کے سر پر سوار ہے۔ حکمران قوم مسلمانوں کی دشمنی کی نگاہ سے دیکھتی ہے، انگریزی اخباروں میں برابر مسلمانوں کے برخلاف آئینہ کشی کئے جاتے ہیں جن سے انگریزوں کا دل روز بروز مسلمانوں سے زیادہ پھٹتا جاتا ہے۔ کچھ ہاں اور دفتر مسلمانوں سے خالی ہوتے جاتے ہیں، فوج میں اُن کی بھرتی موقوف ہو گئی ہے۔ وہ درباروں میں کم بلائے جاتے ہیں، غرض کہ تمام آثار اس بات پر گواہی دیتے ہیں کہ اب مسلمانوں کا ہندوستان میں عزت اور اعتبار کے ساتھ رہنا غیر ممکن ہے۔

ان تمام باتوں پر نظر کر کے اول اول تو سرسید کا جی چھوٹ گیا تھا یہاں تک کہ انھوں نے ہندوستان سے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جا کر بود و باش کرنے کا سختہ ارادہ کر لیا تھا، مگر آخر کار اُن کو وہ ارادہ فسخ کرنا اور قوم کی آگ میں کودنا پڑا۔ اس وقت جو کیفیت ان کے دل پر طاری تھی اُس کا کسی قدر اندازہ اُس بار دو مناجات کے پورے الفاظ سے ہو سکتا ہے جو ملکہ معظمہ کا اشتہار معانی شائع ہونے کے وقت انھوں نے بعد اداۃ دوائے دوکانہ شکر الہی کے پندرہ ہزار مسلمانوں کے مجمع میں بمقام مراد آباد پڑھی تھی، اور جس کو ہم پہلے حصہ میں بحفہ نقل کر چکے ہیں۔

الغرض اس مہم کے سر کرنے کے لیے جب کبھی خود تہذیبِ اُمت کے خیال میں گزری اس کو انھوں نے کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں اُن کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جب تک ہندوستان میں مغربی

طریقہ تسلیم عام نہ ہوگا اُس وقت تک رعایا اور گورنمنٹ میں جو منافرت
حسلی آتی ہے وہ رفع نہ ہوگی۔

مدرسہ مراد آباد

چنانچہ مراد آباد میں آتے ہی انھوں نے اول ایک اسکول جس کو
تعلیم کے میدان میں اُن کا پہلا قدم سمجھنا چاہیے قائم کیا پھر انھیں دنوں میں
جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے۔

سرکاری طریقہ تعلیم پر اعتراض

ایک رائے جس میں درنیکلاسکوں پر سخت اعتراض کیے تھے اور
گورنمنٹ کو نہایت شدد کے ساتھ مسترد دیا تھا کہ اگر وہ ہندوستان کے
ساتھ فی الواقع بھلائی کرنی چاہتی ہے تو اُن کو انگریزی زبان میں تسلیم دے،
اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھاپ کر شائع کی۔

بغاوت کے اسباب سے گورنمنٹ کو مطلع کرنا

پھر رسالہ اسباب بغاوت کے ذریعہ سے گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ
کو اُن تمام شکایتوں سے جو ازراہ غلط فہمی یا واجبی طور پر گورنمنٹ کی طرف سے
ہندوستانیوں کے دلوں میں شگن تھیں اور اُن کے ظاہر ہونے کی کوئی سبیل
نہ تھی نہایت دلیری اور صفائی کے ساتھ ظاہر کیا۔

انتظام قحط اور یتیموں کی حفاظت

اُسی ہمدردی کے جوش میں جو اس وقت اُن کے دل میں موج زن تھا، انھوں نے صاحب کلکٹر مراد آباد سے خود درخواست کر کے قحط کا انتظام اپنے ذمہ لیا اور جہاں تک اُن کی دسترس تھی ہندو مسلمانوں کے یتیم بچوں کو مشنریوں کے چنگل سے بچانے میں کوشش کی۔ پھر اُسی زمانہ میں جب کہ مسلمانوں کے برصغارت انگریزی اخباروں میں زیادہ بوجھاڑ ہونے لگی تو انھوں نے ایک ماہی رسالہ موسوم بہ

رسائل لائل محمد نراف انڈیا

لائل محمد نراف انڈیا اردو اور انگریزی میں جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان

ابقہ حاشیہ) اس اعتراض کا جواب کہ ہندوستانی جو جاہل اور بے تربیت تھے کونسل میں کیونکہ شریک کیے جاسکتے تھے اس طرح دیا جنکہ کونسل میں رعایا کے شریک کرنے کا طریقہ ہم نے عینہ بیان کیا ہے اس کو ملاحظہ کرنا چاہیے۔ پھر جو نقطہ سرسید نے ولایت سے سید مہدی علی خاں کو لکھے ہیں اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولایت ہی میں طریقہ انتظام سلطنت ہندوستان پر ایک مبسوط کتاب لکھنی چاہتے تھے مگر جب راقم نے بعد میں تحریر کے ان سے اس کتاب کا حال نہ یافت کیا تو انھوں نے ایک ایسی تحریر بھی بھیجی تھی جس کا مضمون یہ تھا کہ اس کتاب کے لکھنے وقت یہ ارادہ تھا کہ انڈیا کونسل کے ممبروں سے بھی ہر ایک پوائنٹ پر اس باب میں گفتگو کی جائے مگر کونسل مذکور کے تمام ممبر انگریزی میں گفتگو کرتے تھے اور میں اردو میں نہ دھڑیری بات سمجھتے تھے اور نہ میں اُن کی اس لیے کافی معلومات ملنے کا کافی سامان میسر نہ آیا۔ پھر ہر ایک ممبر سے گفتگو کرنے کے لیے کرایہ کی گاڑی پر جاننا پڑتا تھا اور جب تک گفتگو ہو گاڑی کو باہر نکھڑا رکھنا پڑتا تھا اور ان اصرارات کا تحمل ناممکن تھا، اس لیے جو چند یادداشتیں احمد مسودے لکھے تھے وہ سب معدوم کر دیے گئے۔ ۱۲۔

ہو چکا ہے۔ مکان شروع کیا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے سنا کہ ایک مسلمان کو

شرح لفظ نصاریٰ

اس جرم میں کہ اُن نے انگریزوں کو لفظ نصاریٰ سے تعبیر کیا تھا سخت سزا دی گئی ہے۔ یہ سننے ہی انھوں نے ایک رسالہ اس لفظ کی تحقیق پر لکھ کر اردو اور انگریزی میں شائع کیا جس میں نہایت خوبی سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مسلمان انگریزوں کو ازراہ تفسیر کے نصاریٰ نہیں کہتے بلکہ قرآن کی رو سے اُن کے ہاں کوئی لقب انگریزوں کے لیے اس سے زیادہ معزز نہیں ہے۔

تفسیر بائبل

مراد آباد ہی میں سرسید کو یہ خیال ہوا کہ جو غلط فہمیاں عیسائی ملکوں میں اسلام اور بائیبل اسلام کی نسبت ابتداء سے شروع اسلام سے آج تک چلی آتی ہیں۔ اور جو تیرہ سو برس تک پکتے پکتے تمام دنیا کے عیسائیوں کی طرح انگریزوں کے نزدیک بھی مثل علوم متعارفہ کے مسلم الثبوت ٹھہر گئی ہیں جب تک وہ رفع نہ ہوں گی (اور اُن کا رفع ہونا ہنسی کیل نہیں ہے) اُن وقت تک مسلمان ہمیشہ انگریزوں کی نظر میں کھٹکتے رہیں گے اور جو تہذیبیں مسلمانوں کی صفائی کے لیے کی جانے لگی وہ اس دعا کی طرح جو بغیر زائلہ سبب کے کسی مرض میں علاج میں استعمال کی جانے لے بے سود ثابت ہوگی۔ اگرچہ یہ بہت بڑا کام تھا جس کا بوجھ سید احمد خاں جیسی حیثیت کے آدمی سے اٹھانا ناممکن معلوم ہوتا تھا لیکن وہ جو شہرہ ہے کہ بہت کا حامی خدا ہوتا ہے جوں ہی سرسید کو یہ خیال پیدا ہوا سانس کار سے اُن کی مدتوں کی چڑھی ہوئی تنخواہ جو غنہ کے زمانہ میں

بند رہی تھی اور لٹے ہوئے اسباب کا معاوضہ اُن کو مل گیا۔ انھوں نے فوراً
 جیسا کہ پہلے حصہ میں مفصل مذکور ہے اس عظیم الشان کام کی بنیاد مراد آباد ہی میں
 ڈال دی اور سائیل کی تفسیر لکھنی اور ساتھ کے ساتھ چھپوانی شروع کر دی جس
 بنیاد پر اور جس غرض سے سرسید نے اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور جو
 اثر اُس کے شائع ہونے سے عیسائیوں کے دل پر ہوا اُس کا ذکر مجلاً ہم پہلے حصہ
 میں کر چکے ہیں اُس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کام خاص کر ہندوستان کے
 مسلمانوں کے حق میں کس قدر مفید اور نتیجہ خیز تھا لیکن کچھ تو اس لیے کہ مسلمانوں
 میں اُس کی کچھ قدر نہ ہوئی اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ سرسید کی توجہ اُس
 سے مفید تر اور اعلیٰ تر کاموں کی طرف منعطف ہو گئی اس تفسیر کی صرف دو
 جلدیں چھپ کر رہ گئیں۔

سائنسک سوسائٹی

غارتہ پور پونج کراٹھوں نے دوسری طرح ہے ہندوستانیوں اور انگریزوں
 میں میل جول بڑھانے اور اُس منافرت کے دور کرنے کی جو مشد کی بغاوت
 نے حاکم و محکوم میں پیدا کر دی تھی۔ بنیاد ڈالی اس سے ہماری مراد سائنسک
 سوسائٹی کا قائم کرنا ہے جو اس غرض سے قائم کی گئی تھی کہ لٹریچر اور علمی کتابیں
 انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں
 پیدا کیا جائے علمی مضامین پر سوسائٹی میں لکچر دیئے جائیں، رعایا کے خیالات
 گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے
 ذریعہ سے ظاہر کیے جائیں جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے
 ہندو، مسلمان اور انگریز تینوں قوموں کے ممبر اُس میں شامل کیے جائیں

اور اس طرح قومی مغایرت اور مذہبی تعصبات اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اس کو آہستہ آہستہ کم کیا جائے۔

سوسائٹی کے نتائج

قطع نظر ان اہم مقاصد کے جن کے لیے یہ سوسائٹی قائم ہوئی تھی اس سے اور بہت سے ضمنی فائدے نہ صرف شمالی ہندوستان بلکہ ملک کے اکثر حصوں کو پہنچے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے کرنی انسٹی ٹیوشن یا قومی مجلس جو ذکر کے قابل ہو اس سوسائٹی سے پہلے قائم نہیں ہوئی تھی۔

انجمنوں کا قائم ہونا

پھر ۳۵ برس کے عرصہ میں جس قدر سوسائٹیاں، انجمنیں اور سبھائیں تمام ملک میں پھیلیں وہ سب اس کے بعد اور ساسی کی ریس سے قائم ہوئیں اور اسی سوسائٹی کے اخبار نے تمام ویسی اخباروں کا رنگ بالکل بدل دیا۔ ان میں بجائے اس کے کہ کچھ سچی اور اکثر بے سرو پا بعید از قیاس خبریں درج ہوتی تھیں، پورے شکل سوشل اور علمی و اخلاقی مضامین بھی خبروں کے ساتھ چھپنے لگے۔

اخباروں کی اصلاح

لگے اور بجائے اس کے کہ وہ محض دیسیوں کے دل بہلانے کے اوتار تھے، ان کو یہ دن نصیب ہوا کہ گورنمنٹ ان کی آواز پر کان لگا لگی۔

اردو لٹریچر کی ترقی

پھر اسی سوسائٹی کی درخواست پر جو کہ اس نے ایڈریس مورخہ ۹ مئی ۱۹۰۷ء میں بحضور سر ولیم میور لٹرنٹ گورنر بمقام علی گڑھ پیش کی تھی۔ ہنر آئرن نے وعدہ کیا کہ جو کتابیں ویسی زبان میں تصنیف و تالیف ہاں ترجمہ کی جائیں گی ان میں گورنمنٹ ضرور امداد دے گی۔ چنانچہ ۲۶ اگست ۱۹۰۷ء کو یعنی ایڈریس کے پیش ہونے سے ساڑھے تین مہینے بعد گورنمنٹ شمال مغرب نے وہ انعامی اشتہار جاری کیا جس کا ہندوستان پر ہمیشہ احسان رہے گا اور جس نے تیس برس کے عرصہ میں ملک کو اس سرے سے اس سرے تک ویسی زبانوں کی تصنیفات سے مالا مال کر دیا۔ اگرچہ انعام سے کچھ زیادہ آدمی مستفید نہیں ہوئے اور اشتہار کی مبیاد چند سال بعد گزر گئی لیکن اس اشتہار کا اثر اس تمام گروہ میں جو ویسی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی کم و بیش لیاقت رکھتا تھا مگر اس لیاقت کو کام میں لانا نہیں جانتا تھا۔ برقی قوت کی طرح دوڑ گیا۔ انھوں نے اپنی تصنیفات سے ملک کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود بھی حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا سیکھ گئے خصوصاً اردو لٹریچر صرف اسی تحریک کی بدولت جو کہ اشتہار نہ کورنے ملک میں عموماً پیدا کردی تھی تھوڑے عرصہ میں توقع سے بہت زیادہ ترقی کر گیا۔

اسی ایڈریس میں جو کہ سر ولیم میور کی حضور میں پیش کیا گیا تھا یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ منجملہ ان کتابوں کے جو اردو زبان میں سوسائٹی تیار کر رہی ہے۔ دو کتابیں سید احمد خاں لائف انگریزی سکرٹری تیار کر رہے ہیں، ایک اردو لٹریچر کی تاریخ یا قبرست جس میں تمام کتابوں کا جواب بتا دے آج تک چھپی ہیں۔ نام اس کے مصنف کا حال۔ تصنیف کا زمانہ، طرزِ بیان اور مختلف

مقامات سے اُس کی مہارت کے چند نمونے اور بعض مضامین کا خلاصہ ہو گا۔ دوسری اُردو ڈکشنری، مگر معلوم ہوتا ہے کہ پہلی کتاب کی شروع کرنے کی نوبت نہیں پہنچی لیکن اُردو ڈکشنری جو سرستید نے لکھنی شروع کی تھی اُس کا نمونہ سوسائٹی کے اخبار میں چھپا ہوا اس پر بعض پورٹریٹ فاضلوں کے عمدہ ریمارکس موجود ہیں۔ اگرچہ سرستید نے ان دونوں کاموں میں سے کوئی کام پورا نہیں کیا لیکن اس سے اتنی بات ضرور معلوم ہوتی ہے کہ ملک اور قوم کی تمام مقدم ضرورتیں جن میں سے بعضی اب تک بھی لوگوں کو محسوس نہیں ہوئیں، اس شخص نے اب سے تیس بلکہ چالیس برس پہلے بخوبی محسوس کر لی تھیں۔ یہاں تک کہ جب کوئی اُن ضرورتوں کا پورا کرنے والا نظر نہ آتا تھا تو یادِ وجود یک سر و ہزار مودا ہونے کے خود ہی اس کام کے سرانجام کرنے کو کھڑا ہو جاتا تھا۔

مگر درحقیقت یہ سب سوسائٹی کے ضمنی نتائج تھے اور جس بڑے مقصد کے لیے وہ قائم کی گئی تھی اُس کا گھرا بھی بہت دور تھا اور محض سوسائٹی اُس در و کی دوا نہیں ہو سکتی تھی

سوسائٹی کی ترقی میں کوشش

! انہیہ سر سید نے سوسائٹی کے ترقی دینے میں --- کوئی دقیقہ کوشش و تدبیر کا فرو گذاشت نہیں کیا یہاں تک کہ سالانہ چند، اور قیمت اختیار کی تعداد دس ہزار آٹھ سو پچاس روپیہ سالانہ تک پہنچ گئی۔ مصلع کے رعیتوں کو اس کی امداد پر آمادہ کیا، گورنمنٹ کو اس کی طرف سے توجہ دلائی، خود اپنی لباط سے بڑھ کر اُس کو مالی مدد پہنچائی، اُس کی عالیشان عمارت اپنے اہتمام اور نگرانی میں بنوائی، اُس کی مستقل آمدنی کے لیے عمدہ عمدہ تنظیمیں کیں، لائق لائق آدمی ترجمہ کے کام کے لیے مقرر کیے، قریب چالیس

کے چھوٹی بٹری علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی اردو میں ترجمہ کرائیں، غازیپور ۷
 علیگڑھ بنارس جہاں کہیں رہے سوسائٹی کے اخبار کو اپنے عمدہ مضامین سے
 برابر مدد پہنچاتے رہے یہاں تک کہ ہندوستان چھوڑنے کے بعد بھی سوسائٹی
 کی دھن برابر لگی رہی۔ چنانچہ ولایت ہاتے ہوئے جو خط کہ انھوں نے مولوی
 مہدی علیخان کو عدن سے بھیجا تھا اُس میں لکھتے ہیں کہ مجھ کو علاوہ سفارت احباب
 کے ہر رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی
 کی بٹری مخالفت کریں گے اور کوئی درجہ سعی و کوشش کا واسطے شکست کر
 دینے کے باقی نہ رکھیں گے پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ
 متوجہ ہوں اور اُس کے منہ لانے اور لمبروں کے بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمائیں
 سوسائٹی قائم کرنے کے بعد جب تک کہ سرسید اپنی منزل مقصود تک
 نہیں پہنچے جو کام ملک اور قوم کی بھلائی کا اُن کو معلوم ہوا اسی ذوق و شوق اور
 سرگرمی کے ساتھ جو ان کی جبلت میں داخل تھا اُس کو سرا انجام دیا۔

غازیپور کا مدرسہ

۱۸۷۷ء میں انھوں نے غازیپور میں محض قومی چندہ سے بٹری و صوم و هام
 کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کیا جس کی اٹھان مدرسۃ العلوم کی ابتدا سے کچھ
 ہی کم سمجھنی چاہیے اور جواب تک و کثور یا اسکول کے نام سے غازیپور میں
 جاری ہے۔

برٹش انڈین ایسوسی ایشن

پھر ۱۸۸۵ء میں انھوں نے علیگڑھ آکر "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" جس

نے اب "نیشنل کانگریس" کی صورت میں جنم لیا ہے قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق کی خواہش اور اپنے درد دل اور اپنی ہی شکایتوں کے اظہار کے لیے براہ راست پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہند سے تعلق پیدا کریں۔ اگرچہ جس مقصد کے لیے یہ ایسوسی ایشن قائم ہوئی تھی وہ اس سبب سے کہ ملک میں اس کے چلانے کی قابلیت نہ تھی اور سرسید جو اُس کے بانی بانی تھے وہ ایک اتار و صدمہ بیمار کے مصداق تھے، حاصل نہ ہوا۔ مگر اُس کے ذریعہ سے اکثر مفید تحریکیں کی گئیں اور ان میں سے اکثر میں کامیابی ہوئی جیسے مسافران ریل کی شکایات کی شکایت بہت کم ہونے کے محمول میں تخفیف کی درخواست۔ ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کی سلسلہ جنوبی وغیرہ۔

ہومیوپیتھک کی تائید

پھر شہ میں تمام بنارس اُن کو یہ خیال ہوا کہ ہومیوپیتھک سے زیادہ کوئی طریقہ علاج کا ملک کے لیے مفید نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے جہاں تک اُن کی قدرت میں تھا، اُس کی حمایت اور ترویج و اشاعت میں کوشش کی۔ اُس کی تائید کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جس کے وہ خود سرکاری تھے ایک ہومیوپیتھک ہسپتال کھولا۔ اس طریقہ علاج کی ہسٹری اور اُس کے اصول پر لکچر دیے اور ایک رسالہ لکھ کر شائع کیا۔

تعلیمی کمیٹیاں

پھر شہ میں سرسید ہی کی سلسلہ جنوبی سے تمام اضلاع شمال مغرب

میں تعلیمی کمیٹیاں مقرر کی گئیں جن میں ہر ضلع کے زمینداروں کو تعلیم کے انتظام
نگرانی اور اخراجات پر بحث اور گفتگو کرنے کا اختیار دیا گیا۔

اردو زبان کی حمایت

پھر بنارس ہی میں انھوں نے اردو زبان اور فارسی خط کی حمایت میں
جو بظاہر خاص مسلمانوں کی طرفدار ہی کا، مگر درحقیقت تمام شمالی ہندوستان کی
بھلائی کا کام تھا۔ اہل انتہا کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہندوستان کے
دفاتر سرکاری میں اردو زبان اور فارسی خط دستور بحال و برقرار رکھا گیا اور ہندو
ہندو مسلمان جو بدلیعہ اردو تحریر اور فارسی خط کے سرکاری نوکری کرتے
تھے یا نوکری کے امیدوار تھے اور جن کو بڑھے طوطے کی طرح اب بھاشا
زبان اور ناگرمی حرفوں کا سیکھنا اور اس میں امتحان دینا ایسا ہی مشکل تھا جیسا
نیچر کا بدلتا، اس ناگہانی طوفان کے ریلے سے بچ گئے اور اردو زبان جس
نے کئی صدیوں کی ترقی کے بعد ایک مستقل زبان کا درجہ حاصل کیا تھا اور
جو ہندوستان کے ہر صوبہ اور ہر محکمے میں برابر بولی اور سمجھی جاتی تھی وہ اس
صدمے سے جو کورٹ کی زبان اور خط کے بدلنے سے اس کو پہنچنے والا تھا،
محفوظ رہی۔

مسلمانوں اور انگریزوں میں میل جول پیدا کرنا

اس کے سوا بنارس ہی میں انھوں نے احکام طعام اہل کتاب پر ایک
رسالہ اس غرض سے لکھا کہ مسلمان جن کا مذہب انگریزوں کے ساتھ کھانا
کھانے سے مانع نہیں ہے، بلکہ محض رسم و رواج کی قید نے ان کو آج

تک انگریزوں سے دور دور رکھا ہے ان کی یہ جھجک اور رکاوٹ جاتی رہے
 ان کو حکمران قوم کے ساتھ زیادہ میل جول کا موقع ملے، ہر ایک قوم دوسری
 قوم کے اصلی خیالات سے بلا واسطہ اطلاع حاصل کرے اور بدگمانی اور خوف
 صفائی اور اطمینان کے ساتھ بدل جلے۔ اگرچہ اس وقت اس رسالہ پر بہت
 سے دے ہوئی اور سرسید کو اس کے کھننے پر جیسی کہ اسید تھی سب کچھ کہا گیا مگر
 آخر کار اُس کا نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے جن کی انگریزوں تک
 رسائی اور ان کے ساتھ ربط مضبوط تھا، یہ آں بالکل توڑ ڈالی۔

اس رسالہ کے علاوہ سرسید نے اور طرح طرح سے انگریزوں اور مسلمانوں
 میں موانعت پیدا کرنے کی کوشش کی مسلمانوں کی جھجک نکلنے کے لیے
 انھوں نے اولاً خود انگریزوں کے ساتھ معاشرت اور مواصلت اختیار کر کے
 قوم کے واسطے ایک مثال قائم کی اور رفتہ رفتہ اپنے دوستوں کی سوسائٹی
 میں اس طریقہ کو وسعت دے کر اس کا اثر دور تک پھیلا دیا۔ تنہدیب الاخلاق
 اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں انھوں نے بہت سے آرٹیکل ایسی مضمون پر
 لکھے۔ انگریزوں کو انھوں نے سب سے پہلے نہایت شد و مد کے ساتھ
 رسالہ اسباب بغاوت میں مقننہ کیا تھا کہ ان کو ہندوستانیوں کے ساتھ دوستی
 اور صداقت کا برتاؤ رکھنا ضرور ہے۔ اس کے بعد ہمیشہ اپنی تحریروں اور پبک
 اسپچوں میں اس بات کی تمنا ظاہر کرتے رہے کہ ہمارے اور انگریزوں کے
 موشل تعلقات پر امداد اور دوستانہ ہونے چاہییں نہ حاکم محکومانہ۔

مسٹر بلنٹ کی دعوت میں اسپچ

اس موقع پر ہم سرسید کی ایک مختصر اسپچ جو انھوں نے علیگڑھ میں ایک

ڈونر پریسٹر لینٹ ممبر پارلیمنٹ کا جامِ صحت پر دلوزہ کرنے کے وقت سٹم میں
کی تھی اور جس میں یہی تمنا خاص مسلمانوں کی طرف سے ایک لطیف پیرایہ
میں ظاہر کی گئی تھی، بحسبہ نقل کرتے ہیں سر سید نے کہا "ہم کو نہایت
خوشی ہے کہ سٹریٹنٹ نے ہمارے ملک کو دیکھا، ہماری قوم کے مختلف
گروہوں سے ملے جو ہم کو اسید ہے کہ انھوں نے ہر جگہ ہماری قوم کو تاجِ برطانیہ
کا لائل اور کوئین و کٹوریا ایمپریس اور انڈیا کا دلی غیر خواہ پایا ہو گا۔ اگر
ہماری کسی آرزو سے وہ واقف ہوئے ہوں گے تو وہ صرف انگریزوں کی
طرف سے سمجھتی کی خواہش ہوگی جس کی نسبت بلاشبہ میں کہوں گا کہ ہماری
وہ خواہش پورے طور پر پوری نہیں ہوئی۔"

اور مسلمانوں کی یہ خواہش کہ مسلمانوں میں اور انگلش نیشن میں سمجھتی قائم
ہو، کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کبھی کوئی ایسا زمانہ نہیں گذرا کہ ہم مسلمانوں
میں اور انگلش نیشن میں کوئی معرکہ ایسا گذرا ہو کہ ہم میں اور ان میں کوئی بنانے
مخاصمت قائم ہوئی ہو۔ ان کو ہم سے بدلا لیتے کی رغبت ہو اور ہم کو ان کے
عروجِ اقبال سے رشک و حسد ہو کہ وسیڈ کے زمانہ میں جو ایک زمانہ ہر قسم
کی عداوتوں کے براہِ گنہتہ ہونے کا تھا، انگلش نیشن کو بہت ہی کم ان معرکوں
سے تعلق تھا۔"

"یہ بات سچ ہے کہ ہم نے ہندوستان میں کئی صدیوں تک شاہشاہی
کی، یہ بھی سچ ہے کہ ہم اپنے باپ مادا کی شان و شوکت کو بھول نہیں سکتے
لیکن اگر یہ خیال کسی شخص کے دل میں ہو کہ ہم مسلمانوں کو انگلش نیشن کے
ساتھ اس وجہ سے کہ انھوں نے ہمدی جگہ ہندوستان کی حکومت حاصل
کی، کچھ حسد و رشک ہے تو وہ خیال محض بے بنیاد ہو گا۔ وہ زمانہ جس میں

انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی ایسا زمانہ تھا کہ بچہری انڈیا
 بیوہ ہو چکی تھی اس کو ایک شوہر کی ضرورت تھی اس نے خود انگلش نیشن
 کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تھا تاکہ گاسپل کے عہد نامہ کے مطابق وہ دونوں مل
 کر ایک تین ہوں مگر اس وقت اس پر کچھ کبت ضرور نہ تھیں ہے کہ انگلش نیشن
 نے اس پاک وعدہ کو کہاں تک پورا کیا۔

”ہندوستان میں ہم نے اپنے ملک کی بھلائی کے واسطے انگلش حکومت
 قائم کی۔ ہندوستان میں انگلش حکومت قائم ہونے میں ہم اور وہ مثل قینچی کے
 دو پرشے کے شریک تھے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں میں کس نے زیادہ
 کام کیا۔ پس ہم مسلمانوں کی نسبت ایسا خیال کرنا کہ ہم انگلش حکومت کو ایک
 ناگواری سے دیکھتے ہیں محض ایک غلط خیال ہو گا۔“

”انگلش نیشن ہمارے مفتوحہ ملک میں آئی مگر مثل ایک دوست کے نہ
 بطور ایک دشمن کے ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش حکومت صرف
 ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل ہونی چاہیے۔ ہماری یہ خواہش انگلش
 قوم کے لیے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کے لیے ہماری یہ آرزو انگریزوں کی
 بھلائی یا ان کی خوشامد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کی بھلائی اور بہتری
 کے لیے پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم میں اور ان میں سمجھتی ہو۔ سمجھتی سے میری
 مراد پولٹیکل سمجھتی نہیں ہے پولٹیکل سمجھتی تانبے کے برتن پر چاندی کے طبع
 سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتی اس کا اثر دونوں افریقہ کے دلوں میں
 کچھ نہیں ہوتا ایک فرق جانتا ہے کہ وہ تانبے کا برتن ہے دوسرا فریق سمجھتا ہے
 کہ وہ جھوٹے طبع کی قلعی ہے۔ سمجھتی سے میری مراد برادرانہ دوستانہ سمجھتی ہے۔
 سرسید کہتے تھے کہ ”یہ اسپرچ جوب اخبار میں سرالیفر ڈلائ لٹنٹ گورنر

کی نظر سے گندی اور اس کے بعد میں اُن سے ملا تو انہوں نے فرمایا کہ تم نے یہ عجیب طرح کی اسپچ دی تھی، میں نے کہا شاید عجیب ہو مگر غلط نہیں تھی۔ غالباً خبر آنر کو اسپچ مذکور کے اس فقرہ پر تعجب ہوا ہو گا کہ ”انگلش حکومت کے قائم ہونے میں ہم اور وہ مثل قلعی کے دو پلڑوں کے شریک تھے“ شاید عام لوگ سرسید کی اس تلمیح سے آگاہ نہ ہوں۔ اس لیے اس کا جو مطلب ہم سمجھے ہیں اس کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔ غالباً سرسید نے اس فقرہ میں ہندوؤں کے اُن تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ملک ہندوستان کی ابتدائی انگریزی فتوحات اور سرکاری کمپنی کے رعب و داب اور اس کی پالیسی کو مسلمان امیروں اور حکمرانوں کی تائید اور آسٹری سے بہت مدد ملی ہے، جیسے پلاسی کی لڑائی میں میر جعفر کا بمقابلہ سراج الدولہ کے لارڈ کلونبو کا ساتھ دینا، شاہ عالم کامرہٹوں کے مقابلے کے وقت اپنے تئیں لارڈ بیک کی حفاظت میں سپرد کر دینا اور نظام حیدر آباد کا لارڈ ولزلی کی صلاح ملنے اور تمام فرانسیسیوں کی فوج کو اپنی قلمروں سے یک قلم موقوف کرنا وغیرہ وغیرہ۔

نمائش آگرہ کے دربار میں یورپین افسروں کے جھگڑا

ایک اور موقع پر اسی سووا کے جوش میں کہ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا برتاؤ اچھا نہیں ہے سرسید ایک ایسی جرأت کر بیٹھے جس کی بدولت آخر کار اُن کو گورنمنٹ سے معافی مانگنی پڑی۔ فردوسی شہ میں جب کہ ڈیرمینڈ صاحب اضلاع شمالی مغرب میں گورنمنٹ گورنر تھے، آگرہ میں ایک بہت بڑی نمائش ہوئی تھی اور سرسید بھی منتظم کمیٹی کے ایک ممبر تھے۔ اس کمیٹی میں اُن کے سوا اور بھی چند معزز ہندوستانی انگریزوں

کے ساتھ شامل تھے اور تمام ممبروں کو یکساں اختیار دیے گئے تھے، کسی طرح کا تفاوت انگریزوں اور ہندوستانی ممبروں میں نہ تھا، نمائش کی اخیر تاریخ دوبارہ کے لیے مقرر تھی اور دوبارہ کا انتظام مسٹر پالک گلڈر ضلع آگرہ کے سپرد تھا۔ صاحب موصوف نے نمائش گاہ کے قریب ایک میدان میں درباریوں کے لیے کرسیاں اس طرح بچھوائیں کہ جو مقام کسی قدر بلند تھا کرسیوں کی ایک لائن تو اس مقام پر لگائی اور اس پر ایک شامیانہ بھی جس سے دھوپ کی روک ہو، کھجوا دیا اور دوسری لائن اسی کے متوازی مگر اس سے ذرا نیچی جگہ پر لگوائی جس پر شامیانہ وغیرہ کچھ نہ تھا۔ سرسید نے اکثر ہندوستانی درباریوں کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ اس موقع پر گورنمنٹ کو یہ منظور ہے کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں کچھ تمیز نہ رکھی جائے اور سب کے ساتھ یکساں تراؤ کیا جائے۔ درباریوں میں سے ایک معزز ہندوستانی شاید دوبارہ سے ایک دن پہلے چلتے پھرتے دوبارہ کے میدان کی طرف جانکے اور اتفاق سے اوپر کی لائن میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایک بابو نے آکر ان کو وہاں سے اٹھا دیا اور کہا کہ آپ کے واسطے نیچے کی لائن لگائی گئی ہے، وہ وہاں سے میسر سرسید کے پاس آئے اور حال بیان کیا اور یہ کہا کہ آپ کا خیال انگریزوں اور ہندوستانیوں کی مساوات کے باب میں صحیح ہے تھا۔ سرسید کو نہایت تعجب اور اس کے ساتھ سخت تداست ہوئی کہ جو کچھ لوگوں کو یقین دلایا گیا تھا۔ وہ غلط ہو گیا۔ یہ اسی وقت دوبارہ کے میدان میں پہنچے اور قصداً اوپر کی لائن میں ایک کرسی پر جا بیٹھے۔ بابو نے آکر ان کو بھی ٹوکا یہ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مسٹر جیمس مسٹر ٹری گورنمنٹ سے جو وہیں دوبارہ کے ٹکٹ بانٹ رہے تھے، سارا حال بیان کیا، انھوں نے بھی اس امر کو

نا پسند کیا اور سرسید سے کہا کہ آپ اس کا ذکر سٹرپالکٹ سے کریں۔ اتنے ہی میں سٹر تھارن ہل صدر بورڈ کے حاکم اعلیٰ وہیں چلے آئے۔ جب ان کو یہ قصہ معلوم ہوا تو وہ سرسید پر نہایت افروختہ ہوئے اور کہا کہ تم لوگوں نے غدر میں کونسی برائی تھی جو ہمارے ساتھ نہیں کی؟ اب تم یہ چاہتے ہو کہ ہمارے اور ہماری سورتوں کے ساتھ پہلو پہلو دربار میں بیٹھو؟ سرسید نے کہا اسی سبب سے تو یہ ساری خرابیاں پیدا ہوئیں کہ آپ لوگ ہندوستانیوں کو ذلیل سمجھتے رہے۔ اگر ان کو اس طرح ذلیل نہ سمجھا جاتا تو کیوں یہاں تک نوبت پہنچتی۔ تھارن ہل صاحب اور زیادہ برہم ہوئے، آخر سٹر جمیس ہمتس نے سرسید کو سمجھایا کہ اس گفتگو سے کچھ فائدہ نہیں۔ سرسید وہاں سے اپنے ڈیرے میں چلے آئے اور دربار میں شریک نہیں ہونے لیکن یہ خبر نواب افشٹ گورنر کو پہنچی تو انھوں نے بھی دربار کی ترتیب اور انتظام کو نا پسند کیا اور یہ حکم دیا کہ اس وقت زیادہ تبدیلی تو نہیں ہو سکتی لیکن ہر ضلع اور وقت کے حکام کو چاہیے کہ اپنے اپنے ضلع اور وقت کے ہندوستانی رئیسوں اور قسروں کے ساتھ نیچے کی لائن میں بیٹھیں۔ دربار کے بعد جو یوروپین افسر سرسید سے ملتا تھا اس واقعہ کو پوچھتا تھا اور جب وہ بیان کرتے تھے تو بگڑتا تھا۔ لاچار۔ انھوں نے وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور رات کو وہاں سے سوار ہو کر علیگڑھ چلے آئے مگر چند روز بعد لوکل گورنمنٹ کے سکرٹری کی چٹھی سرسید کے نام پہنچی جس میں ان سے اس بات کا جواب طلب کیا گیا تھا کہ تم دربار میں کیوں نہیں شریک ہوئے؟ اور بلا اجازت کس لیے علیگڑھ چلے گئے۔ سرسید نے اگر وہ سے بلا اجازت چلے آنے کا سبب لکھ بھیجا اور دربار میں شریک نہ ہونے کی معافی چاہی اس کے بعد پھر وہاں سے کچھ باز پرس نہیں

ہوئی، مگر اس نمائش سے پہلے جو لارڈ لائیس مرحوم وائسرائے و گورنر جنرل نے
 آگرہ میں دوبارہ کیا تھا وہاں سرسید کو ایک طلائی تمغہ دینے والے کا حکم دیا
 تھا اور وہ تمغہ اب تیار ہوا تھا۔ چونکہ سرسید نمائش کے دربار میں شریک
 نہیں ہوئے تھے اس لیے نواب لغٹ گورنر نے وہ تمغہ صاحب کشنر
 قسمت میٹر کو دیدیا تاکہ وہ میٹر جاتے ہوئے علیگڑھ میں سرسید کو اپنے
 ہاتھ سے پہناتے جائیں۔ صاحب کشنر جب علیگڑھ کے ریلوے اسٹیشن
 پر پہنچے تو سرسید صاحب الحکم وہاں موجود تھے ان کو ایک طرف لیجا کر سب
 اُس رنجش کے جو تھانہ بل صاحب سے انھوں نے سخت گفتگو کی تھی یہ
 کہا کہ اگرچہ میں اپنے ہاتھ سے تم کو تمغہ پہنانا پسند نہیں کرتا لیکن گورنمنٹ کے
 حکم سے مجبور ہوں۔ یہ کہہ کر سرسید کو تمغہ پہنانا چاہا سرسید نے یہ کہہ کر کہ میں بھی
 گورنمنٹ کے حکم سے مجبور ہوں اُن کے آگے سر جھکا دیا اور تمغہ پہن کر چلے
 آئے۔ ہم نے معتبر ذریعہ سے سنا ہے کہ انھیں دلوں میں گورنمنٹ کا ارادہ
 سب بھجوں کی تنخواہ میں معقول اضافہ کر کے کا تھا مگر سرسید کی اس کارروائی سے
 وہ اضافہ مدت تک ظہور میں نہیں آیا اور سرسید کے ساتھ وہ لوگ بھی جو
 اُن کے ہم عہدہ تھے، اُس سے محروم رہے۔ نواب محسن الملک کا بیان
 ہے کہ اس واقعہ کے بہت دن بعد سٹرپالک سے جب کہ وہ کشنر تھے
 ایک دن سرسید کا ذکر آیا انھوں نے نہایت چسپہ چسپہ ہو کر کہا کہ وہ بڑا
 مفسد اور باغی ہے اور آگرہ کی نمائش گاہ کا وہ تمام قصہ بیان کیا ہیں
 یہ حال سید صاحب کو لکھا بھیجا انھوں نے سٹرپالک کو ایک مفصل چٹھی
 لکھ کر بھیجی جس میں اصل منشا اپنی اس جسارت کا بیان کیا تھا۔ اس چٹھی کے آنے کے
 بعد پھر سٹرپالک اُن کی طرف سے بالکل صاف ہو گئے تھے۔

الغرض سرسید کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ہندوستان کے ساتھ کوئی برتاؤ انگریزوں کی طرف سے ایسا نہ ہو جو ہندوستانیوں کی دولت کا باعث ہو خصوصاً مسلمانوں کی جانب سے انگریزوں کی بدگمانی رفع کرنے میں انھوں نے کوئی دقیقہ کوشش و تدبیر کافر و گلاشت نہیں کیا انسٹی ٹیوٹ گرنٹ کی سالانہ جلدوں میں شاید ہی کوئی جلد ایسی نکلے جس میں ان کے متعدد اشکال اس مضمون پر لکھے ہوئے موجود نہ ہوں۔

ڈاکٹر منٹر کی کتاب پر ریویو

خصوصاً ڈاکٹر منٹر کی کتاب کا ریویو جو انھوں نے سنگھ میں بمقام بنارس لکھا تھا اور جس کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے، سرسید کی ان علیل القصد خدمات میں سے ہے جس کے شک سے ہندوستان کے تمام مسلمان عموماً اور وہابی مسلمان خصوصاً کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے چونکہ اس ریویو میں سرسید نے اپنے وہابی ہونے کا اقرار کیا تھا اس لیے انگریزوں کی بدگمانی وہابیوں کی بالکل جاتی رہی تھی، منشی غلام نبی خاں مرحوم کہتے تھے کہ ”غائباً سنگھ میں جب سٹرگریفن و پٹی کمشنر لاہور نے منشی قادر بخش خاں تحصیلدار چوئیاں کو ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ پر بھرم وہابیت زریعہ مواخذہ کر کے صاحب فنانشل کمشنر کے پاس بھیجا اور کرنل ڈیوس کو جو اس وقت کمشنر تھے، یہ معلوم ہوا کہ قادر بخش خاں کا وہی مذہب ہے جو سید احمد خاں کا ہے تو انھوں نے فنانشل کمشنر سے سفارش کر کے ان کی تبدیلی قصور میں کروا دی، اس کے بعد جب ان کی تبدیلی قصور سے ہونے لگی تو سٹربراٹن اسٹنٹ کمشنر قصور نے ان کو جو سرٹیفکیٹ بغرض صفائی کے دیا تھا اس میں بڑا

بڑت اُن کی صفائی کا یہ کلمہ تھا کہ یہ شخص وہی مذہب رکھتا ہے جو سید احمد خاں
صدر الصدور اصطلاح شمال مغرب کا مذہب ہے اور اس لیے اُس کی نسبت
بدخطابی سرکار کا اشتباہ محض لغو ہے۔

ولایت میں مسلمانوں کی خیر خواہی کے خیالات

ولایت کا سفر جو سرسید نے ۱۸۶۹ء میں کیا اگرچہ یہ ظاہر اس غرض
سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کو تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا کر اُس کے آداب و
آسائش و تعلیم و تربیت کا انتظام اپنی آنکھوں کے سامنے کریں اور اُس کی
طرف سے ہر طرح کا اطمینان حاصل کر کے واپس چلے آئیں مگر جن مشغلوں اور
جن منصوبوں میں انھوں نے سترہ مہینے لندن میں بسر کیے اُن سے صاف
پایا جاتا ہے کہ بیٹے کی تعلیم کا صرف ایک بہانہ تھا ورنہ اصل مقصد اس
سفر دروازہ کا قوم کی خیر خواہی اور اسلام کی حمایت کے جوش کے سوا
کچھ نہ تھا، اُس وقت اسلام اور مسلمانوں کی نگاہ میں سرسید کا حال بعینہ
اس شعر کا مصداق تھا۔

”تَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَدِينِهِ“ شَعْلًا لِحَيْكَ يَا دِينِي وَدُنْيَانِي
مذہب اسلام کی خدمت جو کچھ کہہ دوں اُن سے بن آئی اس کا ذکر ہم اگلے عنوان
میں کریں گے، یہاں صرف یہ دکھانا منظور ہے کہ اس سفر کے آغاز سے
کرا انجام تک برابر اُن کو مسلمانوں کی یہ لو کس قدر لگی رہی ہے۔

۱۔ شاعر اپنے محبوب کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لوگوں کو اُن کی دنیا

اور اُن کا دین مبارک ہو، میرا تو دین بھی تو ہی ہے اور دنیا بھی تو ہی ۱۲۔

دلسوزی کے آرٹیکل

اُن کے سفر نامہ سے جس کا نمونہ پہلے حصہ میں دکھایا جا چکا ہے اور اُن کے آرٹیکلوں سے جو وقتاً فوقتاً وہ سوسائٹی کے اہلکاروں میں پھیلنے کے لیے دلا بیت سے ہندوستان میں بھیجے رہے ہر شخص آسانی سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان سے جاتے وقت جو حالت کہ وہ مسلمانوں کی دیکھ گئے تھے اُس سے اُن کے دل پر عجب بے چینی اور قلق کا عالم تھا خصوصاً اُن کے دل کی کیفیت اور تلامی۔

دلسوزی کے پرائیویٹ خطوط

ان پرائیویٹ خطوں کے دیکھنے سے بالکل آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے جو انھوں نے اپنے ہمدر اور دلی دوست سید مہدی علی خاں کو دلا بیت سے بھیجے ہیں اور جو اس کتاب کے کچھ وقت مخدومی مولوی سید زین العابدین خاں نے راقم کو عنایت کیے ہیں۔ صاف پایا جاتا ہے کہ ایک شخص قوم کے سوز میں انگاموں پر لوٹ رہا ہے۔ کبھی یورپ کی ترقی کے مقابلہ میں مسلمانوں کی پستی و تنزل کا اندازہ کر کے نہایت مایوسی کے الفاظ لکھتا ہے۔ کبھی کسی انگریزی اخبار میں کوئی مضمون مسلمانوں کے برخلاف دیکھ کر ہیچ و تاب کھاتا ہے۔ کہیں یہ صلاح دیتا ہے کہ ہندوستان میں کوئی انجمن مسلمانوں کی طرز معاشرت کی اصلاح کے لیے جلد قائم کرنی چاہیے۔ کبھی اسی غرض سے کوئی قومی اخبار یا میگزین ہندوستان میں جاری کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔ کبھی انگریزی میں ایسی کتابیں لکھوانے پر کمر باندھتا ہے جن میں یورپ کے مورخوں کے اُن بیجا اعترافات کا جواب دیا جائے جو انھوں نے

مسلمانوں باوشاہوں یا خلیفوں پر وارو کیے ہیں اور جن کا اثر ہندوستان کے مسلمانوں کی پوشاک حالت پر بہت بُرا پڑتا ہے اور اس کام کے لیے ہندوستان سے ہندو طلب کرتا ہے کبھی ایسی کتابیں لکھوانے کا ارادہ کرتا ہے جن سے مسلمانوں کو اپنی گزشتہ عظمت کا خیال پیدا ہو اور ان کو سلف کی ترقی اور اپنے تنزل کا اندازہ کرنے سے بغیرت آنے کبھی کسی ہندوستان کے مسلمان کے اعزاز کی خبر سن کر نہایت خوشی ظاہر کرتا ہے اور کبھی کسی ایسے قانون کے نافذ ہونے پر جس سے ہندوستانیوں کے حقوق کو مدد پہنچنے کا اندیشہ ہے افسوس کرتا ہے۔ یہاں ہم چند فقرے مذکورہ بالا خطوں میں سے ناظرین کی اطلاع کے لیے بطور نمونہ کے نقل کرتے ہیں۔

ایک خط میں اس غریب مدرسہ کا جو دلی میں منشی اموجان مرحوم کے مکان میں قائم کیا گیا تھا، ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں ”جان من و جناب من! ایسے ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکانے والا نہیں ہائے افسوس! امرت ٹھوکتے ہیں اور زہر بنگلتے ہیں۔ ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور گھر گھر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی کچھ فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آ گیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے! اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے! اور علم کیونکر آتا ہے! اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آ کر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا مگر مجھ کا فر، مردود، گردن سر ڈی ہوئی سرخی کھانے والے کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سے گا۔“

ایک اور خط میں اس طرح لکھتے ہیں: "جس کتاب کے چھاپے ہوئے کا اشتہار میں نے بھیجا تھا وہ تمام ہو گئی۔ ہفتہ یا دو ہفتہ کے بعد اس کے نسخے آپ کے پاس بھیجوں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے کیا انصاف اور کیا سچ اختیار کیا ہے، گو بعض خیالات اس کے ہمارے خیالات کے مطابق نہ ہوں وہ مسلمان نہیں ہے اگر نیز ہے جب آپ اس کی کتاب دیکھیں گے تو جانیے گے کہ وہ انگریز ہزاروں مسلمانوں سے بہتر ہے۔"

اب ایک اور بات ضروری ہے جو لکھتا ہوں انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت نا انصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی بُرائی نہیں۔ جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو، ہماری قوم کے جوان اس کے انگریزی میں انھیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ انہ راہ نا انصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں، اس لیے ایسی قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے۔

"دوسرے واقعے دنیا میں ہوئے ہیں جن سے مسلمانوں کو نہایت

نہ یہ اس کتاب کا ذکر ہے جو جان ڈیون پورٹ نے اسلام کی حمایت میں لکھی تھی اور جس کو لندن میں کوئی پبلشر نہیں چھاپتا تھا مگر سر سید نے وہاں پہنچ کر اسے روپیہ سے اس کو چھپوا کر ہندوستان میں بھیجا اور یہاں دو شخصوں نے اس کے الگ الگ ترجمے کیے۔ اگرچہ ڈیون پورٹ کی انگلستان میں کچھ وقعت نہ تھی اور اس کی کتاب میں اور مصنفوں کے اقوال نقل کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا مگر چونکہ سر سید نے اس سے پہلے کئی دوسری مصنف کی ایسی تحریریں جس میں اسلام کی اس قدر حمایت کی گئی ہو نہیں دیکھی تھی اس لیے ان کو اس کے شائع کرنے کا خیال ہوا۔"

بڑا تعلق ہے، ایک واقعہ فتح اندلس کا ہے جس میں سات سو برس تک مسلمانوں کی عیسائیوں پر حکومت رہی اور جو انصاف اور تعلیم و تربیت مسلمانوں نے اُس قوم کی کی نہایت ہی عجیب اور قابلِ فخر ہے۔ دوسرا واقعہ کروسیڈ کا ہے یعنی آٹھ لاکھ لڑائیاں جو مسلمانوں اور عیسائی قوموں سے بیت المقدس پر ہوئیں۔ میں نے اُن عالم صاحب (یعنی جان ٹولین پورٹ) سے کہا ہے کہ ان دونوں واقعوں کی دو مختصر تاریخیں وہ لکھ دیں اور اُن کی رائے میں جو سچ اور انصاف ہو اور جس کا تصور اُن کی منصفانہ رائے میں ہو سب لکھیں اور چونکہ وہ نہایت منصف اور بہت بڑا عالم ہے اور حدین بیٹن، فریچ، گرگت زبان جانتا ہے اور سب مصنفوں کی کتابیں پڑھ کر رائے قائم کرتا ہے، صرف انگریزی کتابوں پر اُس کو بھروسہ نہیں ہے۔ اس لیے امید ہے کہ جیسی بلا تعصب اُس نے یہ کتاب (یعنی اپالوجی) لکھی ہے ویسی ہی وہ بھی لکھے گا۔ ان دونوں کتابوں کے چھپنے اور تیار ہونے میں آٹھ سو روپیہ تخمیناً صرف ہو گا، فی کتاب چار سو روپیہ، بس میں چاہتا ہوں کہ آپ وہاں کے اجاب سے آٹھ سو روپیہ چھپو کہ میرے پاس بھیج دیں چندہ کرنے میں شہرت نہیں چاہیے صرف اجاب مخلصین سے چندہ ہو، مثلاً آپ سیر ظہور حسین، زمین العابدین، مرزا رحمت اللہ اور اجاب سے ملاقات کریں اور زبانی بات چیت کریں اور جس کی توفیق ہو اس کے کر جمع کریں۔ مولوی سید مہدی علی خاں کے لیے ہندوستان میں صاحب کشن نے خلعت کے لیے گورنمنٹ میں رپورٹ کی ہے اس کی مبادیہ کبار کے بعد سرسید اُن کو لکھتے ہیں ”مجاہد مہدی! تم پانویس اخبار الہ آباد کے آرٹیکل ترجمہ سنو وہ لکھا ہے کہ آج کل ہندوستان میں خاندان مسلمانوں

کے روز بروز گھٹنے جاتے ہیں۔ چنانچہ صرف بنگالہ میں تمام سلطنت کے ملازمین میں چن دمسلمان ہیں وہ بھی ضعیف ہیں۔ جلد نشن لیں گے اور ان کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا اور آئندہ بھر چہرہ اسی اور دقتی کے کے کوئی مسلمان معزز عہدہ پر نہیں ہوگا۔ دیکھو جو میں کہتا تھا اور جس کاظم کرتا تھا اب سب لوگ وہی کہتے ہیں۔ یہ آرٹیکل بہت بڑا ہے کہیں سے دستیاب ہو تو منگا کر ہائل سنو بہر حال جو عزت تم کو خدا دے وہ تمام قوم کی عزت ہے اور مجھ کو دوسری خوشی ہے ایک قومی دوسری خاص محبت و محبوبیت کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ با اقبال رکھے۔

مولوی امداد العلی جو سرسید کے سخت مخالف تھے ان کو ہندوستان میں سٹارٹ انڈیا کا خطاب ملنا تجویز ہوا ہے، یہ خبر سکر سرسید مولوی مہدی علیخاں کو لکھتے ہیں، بلا تضحیح میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ مولوی امداد العلی صاحب کی نسبت سٹارٹ انڈیا تجویز ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی۔ عین آزد مسلمانوں کی ترقی اور عزت کی ہے۔ چشم بادشہن و دل ماشادہ ان کا یہ فرمانا کہ سید احمد نے انگریزوں کا چھوٹا کھا کر سٹارٹ انڈیا لیا اور انھوں نے موچھوں پر تادے کر انہیں نہیں بھول گیا ان کے موچھیں منہیں ہیں داڑھی پر ہاتھ پھیر کر، میرے سر اور آنکھوں پر خدا کرے ایک ان کو اور ہزار اور مسلمانوں کو یہ دن نصیب ہو۔

اور کئی خطوں میں مولوی مہدی علیخاں کو اس بات کی تاکید لکھی ہے کہ میرے والیں آنے سے پہلے ایک ایسوشیشن مسلمانوں کی طرز معاشرت

کی اصلاح کے لیے قائم کرو اور ایک اخبار اسی مقصد کے لیے ایسوسی ایشن کی طرف سے ایسا اور ایسا نکالو اور چناں کر دو اور چنیں کرو۔ پھر جب اس سے بھی کچھ کامیابی ہوتی نہیں دیکھی تو مخالفت کر دی۔ بعد ممانعت کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اگر بالتخصیص مسلمانوں کی تربیت کے لیے جداگانہ مدرسہ مقرر ہو جائے تو ایک رحمت ہمارے لیے ہے۔ کوئی رات ہمیں حباتی کہ ایسے مدرسے تقریر کی باتیں اور تجویزیں یہاں نہیں ہوتیں۔ مگر بغیر دس لاکھ روپیہ نقد کے ممکن نہیں ہے۔" اسی طرح سرسید کے تمام خطوں میں جو ولایت سے انھوں نے سید مہدی علیخاں کو لکھے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کا ذکر اوردنہ کے سوا کوئی مضمون نظر نہیں آتا۔

مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کی تدبیریں

الغرض سرسید کے تمام منصوبے جو وہ ابتداء سے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے برابر باندھتے رہتے تھے۔ اس سلسلے پر آکر ختم ہو گئے کہ ہندوستان میں چکر قوم کی تعلیم کے لیے ایک محکمہ کالج یا محکمہ یونیورسٹی قائم کیا جائے انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سوشل اور پولیٹیکل حالت درست کر لے کے بے ایسوسی ایشن قائم کرنی یا کاغذ کی ناوے سے اس دریا کو عبور کرنا کسی طرح ممکن نہیں بلکہ جب تک ان میں انگریزی تعلیم نہ پھیلائی جائے گی ان کی بھلائی کی تمام تدبیریں ایسی ہی فضول اور بیکار ثابت ہوں گی جیسے کسی کھیت میں تخم بربری سے پہلے آبپاشی کرنا۔

ولایت میں ہندوستان کے طریقہ پر پمفلٹ لکھنا

انھوں نے سخت ارادہ کر لیا اپنی تمام زندگی اس کام پر

وقف کر دیجیے چنانچہ اس مقصد کے متعلق تمام استبدادی مدارج جو ولایت میں طے ہوئے ممکن تھے انھوں نے وہیں طے کر لیے، ایک پمفلٹ جس میں ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیم پر اعتراض اور بجائے اُس کے جو طریقہ تعلیم اُن کے نزدیک ہندوستان کی حالت کے مناسب تھا اس کو بیان کیا تھا، لندن میں شائع کیا تاکہ جن کی رائے اس کے خلاف ہو وہ اخباروں کے ذریعہ سے ظاہر کریں۔

کیمبرج یونیورسٹی کو دیکھنا

نیز کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر نہایت توجہ سے دیکھا اور اُس کے تمام جزئی و کلی حالات پر غور کی۔

اشتہار جاری کرنا

پھر مسلمانوں اور نیز گورنمنٹ کی اطلاع کے لیے اردو اور انگریزی میں اشتہار چھپوا کر سید مہدی علیخان کے پاس اشاعت کی غرض سے ہندوستان میں بھیجے اور ہندوستان میں آکر نہایت باقاعدہ اور دانشمندانہ طریقہ سے اُس منصوبہ کے پورا کرنے پر کمر باندھی جوان کی سالہا سال کی غور و فکر کا آخری نتیجہ تھا۔

انجمن خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان

ادھر تو انجمن خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم کی جس کی کوششوں سے آخر کار مدرسہ العلوم قائم ہو گیا اور ادھر قوم کو جگانے اور تعلیم کی طرف

مائل کرنے کے لیے پرچہ تہذیب الاخلاق کھالا۔

تہذیب الاخلاق نکالتا

مرسید کے ان دونوں کاموں کا مفصل حال ہم پہلے حصہ میں لکھ چکے ہیں یہاں ہم کو صرف یہ دکھانا ہے کہ تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں پر کیا اثر کیا اور سترہ علوم سے ان کو اب تک کیا فائدہ پہنچا اور آئندہ کن فائدوں کے پہنچنے کی توقع ہے؟

تہذیب الاخلاق کے نتائج

ہندوستان میں ویسی اخباروں اور میگزینوں کی حالت کچھ تو اس وجہ سے کہ ان میں کوئی ایسا کرشمہ نہیں ہوتا جو پاک میں کچھ جنبش پیدا کرے اور زیادہ تر ہندوستانیوں کی مردہ دلی کے سبب جیسی کہ اب تک رہی ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ یورپ میں ویسی اخبار اور میگزین قوموں کے دلوں کے مالک ہیں اور ان کے جذبات اور خیالات پر حکومت کرتے ہیں، مگر ہمارے ملک میں سوا اس کے کہ لوگ ان کو ایک دل کا پہلا وا جانتے ہیں وہ کسی مرضی کی دوا نہیں سمجھے جاتے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ تہذیب الاخلاق سے جو ایک سب سے زیادہ اثر مردہ اور دل مردہ قوم کے بیدار کرنے کے لیے کھالا گیا تھا، کیا امید ہو سکتی تھی؛ باوجود اس کے جو نتیجے اس سے پیدا ہوئے وہ نہایت تعجب انگیز ہیں۔

بات یہ ہے کہ جس وقت یہ پرچہ جاری ہوا اس وقت مسلمانوں پر بسبب اس انقلاب کے جس نے غم کے بعد ان کی حالت دگرگوں کر دی تھی، دو مختلف حالتیں طاری تھیں ایک طرف مذہبی تعصبات اور

مذہبی جوش و خروش. جو ادھار اور تنزل کے درمانہ کے ہتھیار ہیں، نہایت
 ضروروں پر تھے اور تہذیب الاخلاق کا جزو اعظم وہ مضامین تھے جن کو مذہبی
 تعصبات کے ساتھ وہی نسبت تھی جو آگ کو بارود کے ساتھ ہوتی ہے۔
 پس جیسی کہ امید تھی تہذیب الاخلاق نے متعصب مولویوں کے گروہ
 میں تلامطم پیدا کر دیا اور مذہبی مناظرہ کے ہتھیار جو مدت دراز سے کام
 میں نہ آئے کے سبب زنگ خوردہ پڑے تھے ان کو کام میں لانے کا موقع ملا۔
 دوسری طرف مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ ایسا بھی تھا جن کی افزہ
 اور مالوس طبیعتیں اپنے روز افزوں کے تنزل کے سبب ڈوبتی ہوئی ناو کی
 طرح کوئی ایسا سہارا ڈھونڈ ہی نہیں جس سے ان کی ڈھارس بندھے لیکن
 کوئی امید کی صورت نظر نہ آئی۔ تہذیب الاخلاق نے اس گروہ کے دل
 پر فی الواقع وہ کام کیا جو مرہم زخم پر یا ٹھنڈا پانی پیاسے پر کرتا ہے اس
 گروہ نے جبکہ وہ اپنے دشمن ناچیز اور ایک نہایت کس پیرس حالت میں
 سمجھ رہا تھا اور دیوبند ترقیات کے دروازے اپنے پاروں طرف مسدود
 پاتا تھا۔ دیکھا کہ ایک ناصح شفیق کمال دسوزی سے ان کو نیند سے جگاتا ہے،
 ان کی غفلت پر ملامت کرتا ہے، ان کے اسلاف کے کارنامے سنا کر
 ان کو غیرت دلاتا ہے اور ان کو ترقی کرنے کا گڑھ بتاتا ہے یہ گروہ اس
 کی آواز پر اس طرح دوڑا جیسے کسی بے سری فوج کا کوئی سردار پیدا ہو
 جائے اور وہ اس کے اشارہ پر ادھر ادھر سے سمکھ اس کے گرد جمع ہو جائے
 غرض کہ موافق اور مخالف دونوں فریق ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو گئے دوسرا
 اس لیے کہ اس کی آواز غور سے سنیں اور پہلا اس لیے کہ اس کی آواز کسی
 کو سننے نہ دیں۔ تعجب یہ ہے کہ جس قدر اس کی موافقت سے قوم کو فائدہ

پہنچا اسی کے قریب قریب اس کی مخالفت نے لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔

مدارس اسلامیہ کا قائم ہونا

جوں جوں تہذیب الاخلاق "مدرسۃ العلوم" کی طرف لوگوں کو بلاتا تھا اور جس قدر انگریزی تعلیم کی ضرورتیں ان کے ذہن نشین کرتا تھا اسی قدر مدارس اسلامیہ قائم کرنے کا جوش مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی کی تحریک سے بے شمار اسلامی مدرسے ہندوستان میں قائم ہو گئے اور برابر ہوتے جاتے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کو جاری ہوئے شاید تین برس گزرے تھے کہ مولوی سخاوت علی صاحب نے انہدام میں ایک اسلامی مدرسہ قائم کیا۔ مدرسہ قائم کرنے کے بعد انھوں نے جیسا کہ تہذیب الاخلاق نمبر اولہ میں منقول ہے ایک موقع پر کہا کہ "اگرچہ پہلے بھی ہم کو اپنی قوم کی بھلائی کی فکر تھی مگر کوئی تقاضا کرنے والا اور بار بار جگانے والا نہ تھا۔ اب تہذیب الاخلاق نے میرا ہیک چمکنا اوج گاہ کیا جس کے سبب اس قصبہ میں بھی ایک مدرسہ قائم ہو گیا، خدا اس پرچہ تہذیب الاخلاق کو ہمارے لیے ہمیشہ مبارک رکھے" انھوں نے یہ بھی کہا کہ "ہمارے مدرسہ انہدام اور صلح کے کل مدارس دیوبند، سہارنپور اور گنگوہہ کو بڑی تسلی ہے کہ یہ سب مدرسے اس مدرسۃ العلوم مسلمانان سے جس کے قائم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، مستفیض ہوں گے، گویا علی گڑھ ہمارے مدرسوں کے طلبہ کا قصر امید ہے۔ اگر درحقیقت ہم اپنی ترقی کریں گے تو وہ قصر ہمارے ہی لیے ہے پس کس قدر ہم کو اس کے بانیوں کا شکر گزارنا چاہیے۔"

اس قول کے نقل کرنے کے بعد سرسید تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں

کہ ”سب سے اخیر مدرسہ جو ہماری تحریروں کے اثر سے قائم ہوا وہ مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ ہے جس میں بشمول دیگر علوم معینہ کے مذہب شیعہ اثنا عشریہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ ہماری کوششوں نے شیعہ اور سنی دونوں کے دل کو جگا دیا ہے۔ سرسید نے جس مضمون میں یہ حال لکھا ہے وہ ۱۸۷۷ء کا لکھا ہوا ہے جس کو اب چوبیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس عرصہ میں اور بے شمار مدارس اسلامیہ زیادہ تر اسی خیال سے قائم ہوئے ہیں کہ انگریزی تعلیم جس کی بنیاد مسلمانوں میں تہذیب الاخلاق نے ڈالی ہے اس کے اثر سے مسلمانوں کو سچا یا جانے۔ یہ خیال فی نفسہ صحیح ہو یا غلط مگر اس میں شک نہیں کہ تہذیب الاخلاق ہی نے مسلمانوں میں یہ جوش پیدا کیا ہے اور اس طرح سرسید کی چیخ و پکار نے اپنے مخالفوں میں بھی وہ اسپرٹ پیدا کر دی ہے جس پر قومی ترقی کا دار و مدار ہے۔

اگرچہ تمام مدارس اسلامیہ جو ہندوستان میں اب تک قائم ہوئے ہیں ان میں آج تک کوئی تبدیلی زمانہ کے مقتضا کے موافق ظہور میں نہیں آئی اور وہ قدیم دگر بنجک نہیں چھوڑی گئی جو اس زمانہ کے ہرگز مناسب نہیں ہے لیکن چند سال سے ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ زمانہ جو سب سے بڑا ریفاہ مر ہے ان کی اصلاح کے بغیر نہ رہے گا۔ چنانچہ ندوۃ العلماء جس کا پانچواں اجلاس سال گذشتہ میں ہو چکا ہے اس غرض سے قائم ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے قدیم سلسلہ درس کی زمانہ حال کی ضروریات کے موافق اصلاح کرے۔ اور اگر ذرا غور کر کے دیکھا جائے تو خود ندوۃ العلماء کا وجود اسی نتیجہ کی ایک شان ہے جس کے لیے تہذیب الاخلاق جاری کیا گیا تھا۔ وہی کانپور جو تہذیب الاخلاق اور سرسید کی مخالفت کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جہاں سے۔

تہذیب الاخلاق کے برخلاف نور الانوار نور الافاق اور امداد الافاق امدکیا اور
کیا مدت و راز تک شایع ہوتے رہے، وہیں سے علما کی یہ جماعت اس
غرض سے اٹھی ہے کہ مسلمانوں کی قدیم طرز تعلیم زمانہ حال کی طرز تعلیم
کے سانچے میں ڈھا بیجاٹے اور اسی لیے اکثر علماء اس سے بدگمان ہو گئے
ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ مجلس سید احمد خاں کے اشارہ سے قائم ہوئی ہے، ہم
ایسا تو نہیں سمجھتے لیکن اتنا ضرور کہتے ہیں کہ ”هذا ايضا من بدعات البوامكة“
بے شک مسلمانوں کی اصلاح کا خیال ان کے دل میں سید کی چیخ پکار نے پیدا کیا

مخالف مولویوں کی رایوں میں انقلاب

اور اگر وہ اپنے امدادوں پر ثابت قدم رہے اور لومۃ لاگم سے خوف زدہ
نہ ہونے تو رفتہ ضرور وہ اپنے موجودہ خیالات سے آگے بڑھیں گے اور
جن باتوں کی درحقیقت قوم کو ضرورت ہے ان کی طرف متوجہ ہوں گے۔
نواب محسن الملک نے ایجوکیشنل کالفرنس کے ایک اجلاس میں گفتگو
کرتے وقت ندوۃ العلماء کی روٹا دو میں سے اس کے بعض ممبروں کی تقریر کا
خلاصہ نقل کیا تھا جو تہذیب الاخلاص حبیبہ کی پہلی جلد میں چھپ گیا ہے اس
کے دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ سرستید نے تہذیب الاخلاق
کی استدائی جلدوں میں علوم جدیدہ کی ضرورت کے متعلق لکھا تھا، یا قرآن
کی بعض آیتوں کی تفسیر علوم جدیدہ کے مطابق کی تھی اور جس پر ان کی تکفیر
کیجاتی تھی، ہمارے علماء کی رایوں پر اس نے کس قدر اثر کیا ہے اور ان کے
خیالات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔ اب وہ تسلیم کرتے ہیں کہ
مجلد قدیم علم کلام جو اس زمانہ کے فلاسفہ کے مقابلہ کے لیے مڈوں ہوا تھا اس

زمانہ میں اس کا مدارس اسلامیہ میں پڑھانا بے فائدہ ہے۔ اب فلاسفہ زمانہ
 حال کے مقابلہ کی ضرورت ہے اور اس لیے انگریزی زبان کا سیکھنا اور
 علوم جدیدہ سے واقف ہونا ضرور ہے۔ پہلے جو سہارے علماء علوم جدیدہ
 کے پڑھنے سے اس لیے منع کرتے تھے کہ ان سے اصول اسلام میں تہیات
 پیدا ہوں گے اور اتحاد اور دہریت پھیلے گی، اب برخلاف اس کے وہ
 بھی وہی کہنے لگے ہیں جو میں ہر سہ سے برابر سرسید کہتے چلے آتے تھے۔ چنانچہ
 ایک عالم نے ندوۃ العلماء میں یہ کہا کہ ”مذہب اسلام ایسا ریتے گھر کا نہیں
 جس پر نئے فلسفہ کا ریل کا کچھ اثر کرے اور نہ کبھی کچھلی صدیوں میں کچھ اثر کیا ہے
 فلسفہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا۔ پھر آسمانی مذہب کبھی نہ بدے گا۔
 اسلام کا کوئی دنیاوی فلسفہ نہیں نہ کوئی ہیئت و ریاضی ہے وہ تو صرف انسان
 کی اخلاقی و روحانی تعلیم کرنے والا ہے۔ پھر کہا کہ ”اسلام نے تاریخ کا بھی
 بظرفہ مورخانہ ذمہ نہیں لیا ہے بلکہ انھیں واقعات کا ذکر کیا ہے جو انسان کے
 لیے عبرت و حیرت پیدا کر دیں۔ اگر بطلیموس کی ہیئت ثابت ہو جائے
 تو کیا اور فیثاغورس کی قائم ہو جائے تو کیا، جزو لاینفک بنی باطل ہو تو کیا اور ثابت
 ہوا تو کیا، خلا کا لٹلوان ہوا تو کیا اور اثبات ہوا تو کیا، ہمارے بزرگوں نے
 یونانی فلسفہ کے حملے روکنے کے لیے ایسے ایسے مسائل علم کلام میں داخل
 کیے تھے جن کو آج کل محض حموت طبع کے لیے ہم لوگ پڑھتے ہیں، نہ
 وہ ہمارا مذہب تھا نہ کتاب و سنت اور شکوۃ نبوت کا فرمودہ تھا۔ سب
 کچھ بگڑ جانے کو ہماری بلا ہے۔“

اگر تہذیب الاخلاق لوگوں کی مخالفت کے خوف سے صلح کل کا طریقہ
 اختیار کرتا اور جو رکاوٹیں مسلمانوں کی ترقی کی سزاہ تھیں ان کے دور

کہنے پر علی الاعلان کرنے ہاندھنا تو ظاہر ہے کہ اس کی مخالفت بالکل نہ ہوتی
اور اس لیے جو عمدہ نتیجے اُس کی مخالفت سے پیدا ہوئے وہ ظہور میں نہ
آتے۔ نیز جس قدر اس کی مخالفت کم ہوتی اسی قدر اس کے مددگاروں کا
جوش کم رہتا اور اس لیے وہ مخالفت اور موافق دونوں کے حق میں کوئی معتدبہ
نتیجہ پیدا نہ کر سکتا۔ یہی سبب تھا کہ جوں جوں اُس کی مخالفت زیادہ ہوتی گئی
اُسی قدر لوگ اس کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے گئے اور اُسی قدر اس کا سنتر
زیادہ کارگر ہوتا گیا۔

مسلمانوں کا اسلاف کی ترقیات سُنکر متنبہ ہونا

اُس نے جب کہ مسلمان اپنے اسلاف کے حال سے بے خبر تھے
نہایت موثر طریقوں کے ساتھ اُن کو ان کے بندہ گوں کی علمی اور عقلی فتومات
سے آگاہ کیا تاکہ اُن میں وہ حمیت پیدا ہو جو اولاد کے دل میں اپنے آباء
احباب کی لڑائی سُنانے سے پیدا ہونی چاہیے اور وہ اپنے موجود تنزل کا مقابلہ
زائد سلف کی ترقیات کے ساتھ کر کے خود ترقی کی طرف مائل ہوں، اگرچہ
تہذیب الاخلاق کو اس مقصد میں پوری کامیابی ہوئی کہ اُس نے مسلمانوں
میں مخدوم بہانت کا جوش توقع سے زیادہ پیدا کر دیا لیکن ان نیچرل موانع
کے سبب جو گری ہوئی قوموں کی مدت تک اُگنے نہیں دیتے، ابھی تک
اُن میں وہ حرکت پیدا نہیں ہوئی جو سلف کے کارنامے سنکر ایک غیور
قوم میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اور اُن کو پستی و تنزل کے ننگ و عار
سے نکلنے پر آمادہ کر دیتی ہے تاہم جس قدر ہمیں بائیس کے عرصہ میں کم و بیش
ترقی کا خیال ہندوستان کے مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے اُس کو اسی تہذیب

الاخلاق کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے، ورنہ مسلمانوں نے زمانہ کی مخالفت پر جس شد و مد کے ساتھ کمر باندھ ہی تھی وہ اُس وقت تک کہ زمانہ اُن کو پیس نہ ڈالے، ہرگز کھٹنے والی نہ تھی۔ تہذیب الاخلاق جس کو ٹھے پر چڑھنے کی تاکید کرتا تھا صرف اُس کے بتانے ہی پر اکتفا نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا نہ مینہ بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے لوگوں کو ترقی کی طرف بلاتا تھا اور دوسرے ہاتھ سے مدرسۃ العلوم کی تصویر اُن کے سامنے پیش کرتا تھا۔ اسی لیے اُس کی کوششیں بالکل اکلوت نہیں گئیں۔

مسلمانوں میں عیسائی موزخوں کے الزامات رفع کرنے کا خیال پیدا ہونا

تہذیب الاخلاق ہی نے لوگوں میں یہ خیال پیدا کیا کہ یورپ کے مصنفوں نے جو غلطیاں اسلام کی حقیقت ظاہر کرنے یا اسلام کی تاریخ لکھنے میں کی ہیں اُن غلطیوں کو رفع کیا جائے اور ان کا منشا ظاہر کیا جائے۔ اگرچہ سرسید اپنی متعدد تصنیفات میں جیسا کہ اس کتاب میں جا بجا ظاہر کیا گیا ہے، اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکے تھے اور آئندہ مصنفوں کے لیے یہ رستہ صاف کر چکے تھے مگر اُن کی اکثر تحریرات عام طور پر شائع نہیں ہوئی تھیں۔ تہذیب الاخلاق ہی کی تحریک سے لائق لائق مسلمان اس کام پر کھڑے ہوئے بہت سے سفایں تہذیب الاخلاق میں اسی موضوع پر کلمے گئے اور ان کے سوا عمدہ عمدہ متعدد کتابیں انگریزی اور اردو میں علیحدہ شائع کی گئیں۔ اس تحریک کا سب سے عمدہ نتیجہ مسلمانوں کے حق میں یہ ہوا کہ بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان

جن سے ہم خود واقف ہیں یا جن کا حال معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے۔ اُن
اعتراضوں کو دیکھ کر جو انگریزی کتابوں میں اسلام اور مسلمانوں پر وارد کیے گئے
ہیں اسلام سے برگشتہ ہو چلے تھے، کوئی عیسائی مہرنے کا ارادہ رکھتا تھا
اور کوئی سرے سے مذہب ہی کو لغو سمجھنے لگا تھا، مگر تہذیب الاخلاق
کے مضامین دیکھ کر جو شبہات اسلام کی طرف سے اُن کے ذہن میں منظور
کرتے تھے وہ یک قلم زائل ہو گئے اور اُن کے دل کا دغہ بالکل جاتا رہا۔
اب وہ اسلام پر سچے یقین رکھتے ہیں اور اپنے اُن پر اگتہ خیالات ناام ہیں

تعصب قلبی توکل قناعت اور تقدیر

کی مزاحمتوں کا کم ہونا

تہذیب الاخلاق نے تعصبات کو بہت کم کر دیا، تقلید کی بندشیں
ڈھیلی کر دیں، توکل، قناعت اور تقدیر کے جو غلط معنی لوگ سمجھے ہوئے
تھے اور جس غلطی نے اُن کو نکما اور کاہل اور حماطت کی طرح بنے جس وحالت
کر دیا تھا اُس سے اُن کو مطلع کیا اور صرف مطلع ہی نہیں کیا بلکہ لاکھوں کے
خیالات بدل دیتے اور مذہب و کوشش کی طرف اُن کا رخ پھیر دیا۔

سیلف بیلپ کا خیال پیدا ہونا

اسی پرچہ نے اُن کو اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرنا اور گورنمنٹ کا مہارا چھوڑنا
سکھایا اور سیلف بیلپ کا اصول جس کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی اُن
کے ذہن نشین کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ قومی کاموں میں ایک پیسہ

صرف کرنا نہیں جانتے تھے وہ سیکڑوں اور ہزاروں صرف کرنے لگے۔ کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ قومی کاموں میں چہندہ دینا کم سے کم ہندوستان کے مسلمانوں کو صرف تہذیب الاخلاق نے یا دوسرے نفلوں میں سید احمد خاں کی تحریروں اور سپیچوں نے سکھایا ہے اور اس بات کا بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمان جو روپیہ دوسرے مہینے سے زیادہ اولاد کی تعلیم پر خرچ کرنا نہیں جانتے تھے وہ اسی شخص کی پیروی سے اب پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ روپیہ مہینہ بے مد لیغ اپنے بچوں کی تعلیم میں خرچ کرتے ہیں اور ولایت کی تعلیم کے لیے ایک ایک لڑکے پر بیس بیس تیس تیس ہزار صرف کمر دیتے ہیں۔ ہر سید کے مخالف جو ہمیشہ مستثنیٰ نیتوں کو اعتراض کا ذریعہ گردانتے ہیں اس مقام پر ضرور مسلمان لڑکوں کی وہ مثالیں پیش کریں گے جن کو ولایت جانے سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچا ہے مگر ایسے مستثنیات سے تو خدا کے کام بھی خالی نہیں پائے جاتے۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
درباغ لاله روید و در شومہ یوم خس

ہم کو اس باب میں ان شاذ و نادر مثالوں پر نظر کرنی نہیں چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سرسید نے مسلمانوں کے خیالات میں کس قدر تبدیلی پیدا کر دی ہے کہ جو روپیہ وہ پہلے اولاد کی بیاہ شادیوں کی بیوہ رسموں میں خرچ کرنے کے عادی تھے یا جس روپیہ سے جاہل اور نالائق اولاد کے لیے حباب زاد خرید کر ان کی عیاشی اور بد چلنی یا کاہلی اور سستی کا سامان مہیا کر جاتے تھے اب وہ روپیہ ان کی لیاقت اور اصلی عزت اور اقتدار میں بھانے میں صرف کرنا سیکھ گئے ہیں۔

تمہذیب الاخلاق ہی نے اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کو مدت
دراز کے بعد قومیت کے معنی یاد دلانے ہیں

قومیت کا خیال پیدا ہونا

قومیت جو درحقیقت ایک لفظ اسلامی اخوت کا مترادف ہے اس کے مفہم سے ہندوستان کے
مسلمانوں کو بالکل ذہول ہو گیا تھا ان میں بھی مثل ہندوؤں کے ذاتوں کی تفریق
پیدا ہو گئی تھی اور ایک ذات کو دوسری ذات کے ساتھ قومی حیثیت
سے کچھ تعلق نہ سمجھا جاتا تھا۔ پٹھانوں کو یہ استحقاق نہ تھا کہ وہ متعلو کی فتوحات
پر فخر کر سکیں اور سادات اس بات کا حق نہیں رکھتے تھے کہ بنی امیہ یا بنی
عباس کے کارناموں پر نازاں ہوں اس کے مذہبی فرقوں کے سوا اختلاف
نے ان میں ایک دوسری طرح کا تفرقہ ڈال دیا تھا جس کے سبب سے وہ رابطہ
جو تمام اہل قبلہ میں بسبب اتحاد اسلامی کے متحقق ہونا چاہیے باقی نہ رہا تھا۔
تمہذیب الاخلاق نے ان دونوں تفرقوں کے دور کرنے کی بنیاد ڈالی اور
ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں میں کم سے کم یہ خیال ضرور پیدا کر دیا کہ ذاتوں
کے تفرقہ یا مذہبی حریفوں کے اختلاف سے قومی اتحاد میں کچھ فرق نہیں آتا
اور ہمارے نزدیک یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ قوم و قومیت و قومی ہمہ دی
اور قومی عزت کے الفاظ جن وسیع معنوں میں کہ اب ہندوستان میں عام
طرح پر بولے جاتے ہیں یہ درحقیقت سرسید ہی کی تحریروں نے جواہر
سوسائٹی اخبار میں اور اس کے بعد تمہذیب الاخلاق میں شایع ہوئیں لوگوں
کو بولنے سکھائے ہیں۔

اُردو لٹریچر میں انقلاب پیدا ہونا

اُردو لٹریچر کو بھی اس پرچہ سے کچھ کم فائدہ نہیں پہنچا۔ یہ پرچہ جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے۔ چھبیس برس کے عرصہ میں تین دفعہ مختلف وقتوں میں جاری ہوا مگر سب سے زیادہ عرصہ تک صرف پہلی دفعہ یعنی سات برس برابر نکلتا رہا۔ لٹریچر کی خوبی کے لحاظ سے جس قدر عمدہ مضامین ان سات برس کے پرچوں میں شائع ہوئے پھر ویسے نہیں ہوئے اور جو نتائج کہ ہم نے ادھر بیان کیے ہیں وہ زیادہ تر انھیں سات برس کے پرچوں سے علاقہ رکھتے ہیں۔

اس پرچہ کو جاری ہونے صرف تین برس کا عرصہ گزرا تھا کہ سرسید کے ایک انگریز دوست نے جیسا کہ جلد ۴ نمبر میں مذکور ہے ان کو لکھا تھا کہ "تہذیب الاخلاق نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ثابت کیا کہ مذہب اسلام ایسا تنگ و تاریک رستہ نہیں ہے جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا ہے۔"

مذہبی لٹریچر میں آزادی کا پیدا ہونا

یہ کہنا کچھ مبالغہ میں داخل نہیں ہے کہ سوشل اخلاق اور مذہبی مضامین جس سادگی اور لطافت اور شائستگی سے ساتھ اس پرچہ میں لکھے گئے ویسے کبھی کسی اردو زبان کے پرچہ میں نہیں لکھے گئے۔

اسی پرچہ نے مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر میں جو صدیوں سے بند پانی کی طرح سچس و حرکت چلا آتا تھا دعتہٴ فوج پیدا کر دیا۔ تہذیب الاخلاق

سے پہلے ہندوستان میں جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا گیا تھا اُس میں سرشید کے سوا بہت ہی کم لوگوں کی تحریروں میں آزادی کا عنصر پایا جاتا تھا۔ تعصب اور تقلید نے اُرنہیلیٹی کی سوتیں بالکل بست کر دی تھیں، علمائے سلف کے اقوال اور اُن کی راہوں کو نقل کر دینا ہی تصنیف و تالیف کی معراج تھی۔

مذہبی مناظرہ کے طریقہ کی اصلاح

غیر مفید جو بہت آڑی کا دم بھرتے تھے اُن کی جو لادگاہ بھی صرف چند مسائل فقہیہ متعلق یہ عبادات تھے اور اُس پادریوں کے مقابلے میں اسلام کی حمایت کرنے کا طریقہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جو اعتراضات وہ مذہب اسلام پر قرآن اور حدیث کے حوالوں سے کرتے تھے اُسی قسم کے اعتراضات عیسائی مذہب پر توریت و انجیل کے حوالوں سے کیے جاتے تھے، یونین سولیریشن اور یورپین سائنس کے حملے جو اسلام پر ہو رہے تھے اول تو اُن سے مسلمان عالم محض بے خبر تھے اور اگر اُن کو خبر بھی ہوتی تو تسلیم کی بدولت اُن میں یہ قابلیت باقی نہ رہی تھی کہ ان نئے حملوں کو دفع کرنے کے لیے نئے ہتھیار ایجاد کریں۔ مناظرہ کا طریقہ اس قدر نامہذب اور خراب ہو گیا تھا کہ کتابوں کے نام لٹھ جوت آ رہ، ورہ، قنقاب اور کنشاپ رکھے جاتے تھے، مذہب الاخلاق نے جہان تک کہ اُس سے ہو سکا تعصب کی جڑ کاٹی، تقلید کی بندشیں توڑیں، مذہبی تحریروں میں آزادی کی روح پھونکی، مذہبی حمایت کا فرسودہ طریقہ جو اس زمانے میں کچھ بکار آمد نہ تھا اُس کی جگہ دوسرا طریقہ جو زمانے کے مناسب حال تھا جاری کیا، مناظرہ کے ناپسندیدہ طریقہ کی اصلاح کی اور اپنے طرز بیان سے اس طریقہ کی ایک مثال قائم کی جس کی قرآن نے۔

ہدایت کی تھی کہ ”وَجَادِلْهُمْ بَالَّتٰیٰ هِیَ اَحْسَنُ“

اردو شاعری میں انقلاب

اردو شاعری جس میں دو سو برس سے ایک ہی قسم کے خیالات برابر دہرائے جا رہے تھے اُس نے بھی زیادہ تر اسی پرچہ کی تحریک سے کروٹ بدلی نئے میدانوں میں شعرا قدم رکھنے لگے۔ مبالغہ اور جھوٹ کی جگہ حقائق و واقعات کے خاکے کھینچنے لگے اور شاعری بجائے اس کے کہ محض ایک دل لگی کی چیز سمجھی جاتی تھی ایک کام کی چیز بننے لگی۔

محمدن کالج کا ہونا

سب سے عمدہ نتیجہ جو اس پرچہ کے اجرا سے مترتب ہوا اور جس کے لیے درحقیقت یہ پرچہ جاری کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمان جو قدیم سے انگریزی تعلیم کی سخت مخالفت کرتے چلے آتے تھے آہستہ آہستہ ان کی جھجک نکلی شروع ہوئی یہاں تک کہ لاکھوں مسلمان ہندوستان میں اب ایسے موجود ہیں جو انگریزی تعلیم کو اپنی اولاد کے حق میں نہایت ضروری جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بغیر اس کے ملک میں عزت سے رہنا ناممکن ہے۔

محمدن کالج کے نتائج

سب سے بڑی ملکی اور قومی خدمت جو سرسید سے بن آئی اور جس کا احسان بظاہر صرف مسلمانوں کی قوم پر مگر درحقیقت ہندوستان کی تمام اقوام پر ہے، وہ مدرسۃ العلوم کا قائم کرنا ہے۔ ہندوستان کی ایک ایسی قوم کا جس کی تعداد

قریب چھ کروڑ کے ہے تعلیم سے محروم رہنا تمام ملک کے لیے جیسا کہ ہم اوپر
لکھ آئے ہیں ایسا ہی مضر تھا جیسا کہ ایک محضوری میں کا ماؤنٹ ہونا

ہندوؤں میں تحریک کا پیدا ہونا

انسان کے تمام اعضا ریشہ کیلئے خطرناک ہونا ہے اس کے سوا صرف مدرستہ العلوم
کی رئیس سے شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں قومی تعلیم کا جوش حد سے
زیادہ پیدا ہو گیا اور انھوں نے قومی چندہ سے متعدد کالج کھول لیے۔ پھر
خود مدرستہ العلوم میں کوئی قلعہ ایسا نہیں رکھا گیا جس کی رو سے وہ مسلمانوں
کے لیے مخصوص سمجھا جائے اس میں ابتدا سے آج تک ہندو مسلمان عیسائی
بنگالی پارسی سب قوموں کے طالب علم برابر پڑھتے رہے ہیں چنانچہ
۱۸۶۶ء سے اب تک جس قدر ہندو طالب علم محمدن کالج اور اس کی لاکلاس
سے مختلف امتحانوں میں کامیاب ہوئے ان کی تعداد یہ ہے گریجویٹ ۲۲،
انڈر گریجویٹ ۶۷، انٹرنیس ۷۸، ال ای بی ۸، وکالت ہائی کورٹ ۲، وکالت
ضلع ۵ میزان ۱۹۲ اور متعدد ہندو گریجویٹ اسی کالج کے بیرٹری یا میڈلین
میں ولایت جا کر کامیاب ہو چکے ہیں پس یہ کہنا کچھ بناوٹ میں داخل نہیں ہے
کہ محمدن کالج نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ تمام ہندوستان کی بھلائی کے لیے قائم
کیا گیا ہے اور اس سے غیر قوموں کو بھی برابر فائدہ پہنچتا رہا ہے۔ لیکن اس
میں شک نہیں کہ سرسید کا اثر مفید اس کالج کے قائم کرنے سے یہی تھا

مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے موانع

کہ کسی طرح مسلمانوں کی حالت درست ہو اور وہ انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ

ہوں مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ قطع نظر اُن سخت مخالفتوں کے جو مدرسۃ العلوم قائم کرنے وقت پیش آئیں اور جس کا حال ہم آئندہ عنوان میں لکھیں گے مسلمان پہلے ہی انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ ابتدا سے ہندو اور مسلمانوں کے خیالات میں جو تفاوت انگریزی تعلیم کے متعلق تھا اس کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۶۲ء میں جبکہ گورنمنٹ نے کلکتہ میں ہندوؤں کے لیے ایک سنسکرت کالج قائم کیا تو ہندوؤں نے ایک عرضداشت اس مضمون کی گذرالی کہ ہم کو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ گورنمنٹ ہمارے لیے سنسکرت کی تعلیم کا سامان مہیا کرے بلکہ اس کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو انگریزی تعلیم کی اشاعت میں کوشش کرے۔ برخلاف اس کے ۱۸۴۵ء میں جب کہ واقعہ مذکورہ پہ گیارہ برس گزر چکے تھے اور ہندوؤں کا شوق دوبالا ہو گیا تھا کلکتہ کے مسلمانوں نے جس وقت یہ سنا کہ گورنمنٹ تمام ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو انھوں نے ایک عرض تیار کی جس پر آٹھ ہزار مسلمان ریشیوں اور عالموں کے دستخط تھے اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف ولایت کرتا ہے کہ اس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔

قطع نظر مذہبی خیالات کے مسلمان زیادہ تر اس وجہ سے بھی انگریزی تعلیم کے مخالف تھے کہ ابتدائے اشاعت اسلام سے وہ جس ملک میں گئے اور جہاں جا کر رہے مستثنیٰ صورتوں کے سوا کبھی ان کو غیر ملک اور غیر قوم کی زبان سیکھنے کی طرف توجہ نہیں ہوئی وہ جہاں جاتے تھے اپنی زبان اور اپنا علم ادب اپنے ساتھ لیجاتے تھے جس طرح اسپین میں جا کر انھوں نے اسپینش زبان یا ایران میں ژند زبان نہیں سیکھی اسی طرح

ہندوستان میں آکر اس ملک کی زبانوں کے سیکھنے کی طرف توجہ نہیں کی اور اس لیے غیر زبانوں کے سیکھنے کی فی الواقع اُن میں قابلیت نہ رہی تھی۔ برخلاف اس کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے عہد میں غیر زبان سیکھنے کا ملک اپنے میں بخوبی پیدا کر لیا تھا جو قومیں ملازمت پیشہ تھیں وہ اپنی اولاد کو کم سے کم فارسی زبان سکھانا نہایت ضروری جانتی تھیں اور اکثر شوقین لوگ فارسی کی تکمیل کے لیے عربی بھی سیکھتے تھے۔

پس مسلمانوں کو جس قدر کہ مذہبی خیالات انگریزی تعلیم سے مانع تھے اُس سے زیادہ اُن کی طبعی نامناسبیت جو تیرہ سو برس سے اُن میں متواتر چلی آتی تھی ایک اجنبی زبان کے سیکھنے کی اُن کو اجازت نہ دیتی تھی۔ مدارس انگریزی میں انگریزی زبان کے سوا اور بھی بعض سبکٹ ایسے تھے جن سے ہندوستان کے مسلمانوں کو کچھ مناسبت نہ رہی تھی۔ جغرافیہ جس میں اُن کے اسلاف نے اگلے زمانہ میں بے انتہا ترقی کی تھی اب وہ اُس کو محض لغو جانتے لگے تھے تاریخ کا حال بھی اسی کے قریب قریب تھا۔ ریاضی سے فی الواقع مسلمانوں کو کچھ لگاؤ باقی نہ رہا تھا۔ مسلمانوں کے ذہن میں عموماً یہ بات تہ نشین تھی اور اب تک ہے کہ انگریزی زبان میں منطق اور حکمت و فلسفہ بالکل نہیں ہے اور دنیا میں عربی کے سوا کوئی علمی زبان نہیں ہے۔

اس کے سوا اور بہت سے موانع تھے جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس سے بخوبی اعلازہ ہو سکتا ہے کہ جس وقت سرسید نے محمدین کالج قائم کرنے کا ارادہ کیا اس وقت مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کیا حالت ہوگی! چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۸ء یعنی اس وقت سے جبکہ کلکتہ، مدارس اور بمبئی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں،

۱۸۵۷ء تک مسلمانوں کی تعلیم کی کیا حالت تھی،

۱۸۴۵ء یعنی اُس وقت تک کہ علیگرہ میں ابتدائی اسکول کھولا گیا، تمام ہندوستان میں مسلمان گریجوٹس کی تعداد صرف بیس تک پہنچی تھی جن میں ۱۷ بی اے اور ۳ ایم اے تھے حالانکہ اُس وقت تک ہندو گریجوٹس کی تعداد ۸۴۶ تک پہنچ گئی تھی جن میں ۱۵ بی اے اور ۱۲ ایم اے تھے نیز جو نفرت یا نامناسبیت اور اجنبیت مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے چلی آتی تھی اُس بات کا اندازہ بھی اچھی طرح ہو سکتا ہے کہ اگر بالفرض اُن کو تعلیم کا خیال پیدا بھی ہو جاتا تو بھی اُن میں انگریزی تعلیم کے ساتھ وابستگی اور مناسبیت پیدا کرنے کے لیے کس قدر عرصہ درکار تھا! اور وہ کتنی مدت میں اس قابل ہو سکتے تھے کہ اپنی ہموطن قوموں کے ساتھ جو چالیں برسرِ پہلے سے انگریزی تعلیم پر دلدادہ اور اُس کے حاصل کرنے میں سرگرم تھیں تعلیمی دوش میں شریک ہوں۔

علیگرہ کالج نے ۱۹ سال میں کتنے مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم دی

ان تمام باتوں پر نظر کرنے کے بعد جو نتائج نہایت قلیل عرصہ میں علیگرہ محمدن کالج سے ظہور میں آئے اُنکو نہایت غنیمت سمجھنا چاہیے علیگرہ محمدن اسکول ۱۸۴۵ء میں اور محمدن کالج ۱۸۴۸ء میں کھولا گیا تھا اور کالج کے نتائج ۱۸۵۷ء سے نکلنے شروع ہوئے اُس وقت سے ۱۸۹۸ء

تک کہ جس کو ۱۹ برس سے زیادہ مدت نہیں گزری اس نے صرف اپنے مسلمان طلبہ میں سے ۱۲۶ گریجویٹ اور ۱۷۴ انڈر گریجویٹ پیدا کیے ہیں۔ جو طالب علم کہ محمدن کالج کی لاکھاس میں پھر سنتے ہیں وہ مسئلہ سے قانونی امتحانوں میں شریک ہونے لگے ہیں اس وقت سے اب تک صرف مسلمانوں میں سے ۱۲ ال ال بی کے امتحان میں اور ۵ وکالت کے امتحان میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

اور اگر اس سخت گیری پر جو آٹھ سات برس سے قانونی امتحانوں میں ہونے لگا ہے۔ نظر کی جائے تو اس قلیل عرصہ میں مذکورہ بالا نتائج خاص کر مسلمانوں کے حق میں بہت غنیمت ہیں۔

محمدن کالج کا اثر ملک کے دیگر حصوں پر

مگر محمدن کالج کے فوائد کو صرف اُن نتائج ہی میں منحصر نہ سمجھنا چاہیے جو خاص کر اُس کے طالب علموں نے یونیورسٹی کے مذکورہ بالا امتحانوں میں حاصل کیے ہیں بلکہ اُس کا اثر ہندوستان کے تمام حصوں اور تمام صوبوں تک پہنچا ہے اور اس کا کسی قدر اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ لفٹنٹ گورنر بنگال نے ۱۸۹۶ء کے آغاز میں ایک موقع پر مسلمانان بنگالہ کی تعلیم کے متعلق یہ کہا تھا کہ "۱۸۸۱ء میں جبکہ میں نے بنگال کو چھوڑا تھا تو صوبہ مذکور کے تمام مدرسوں اور کالجوں میں ایک لاکھ پچاسی ہزار مسلمان طالب علم تھے اور اپنے والپس آنے پر محبکہ معلوم ہوا ہے کہ اس تعداد کی نویت قریب چار لاکھ نوے ہزار کے پہنچ گئی ہے۔ چونکہ ۱۸۸۱ء ہی سے زیادہ محمدن کالج کا چرچا ہندوستان میں ہوا ہے اور صوبہ بنگال

میں ظاہر کوئی زبردست تحریک مسلمانوں کی تعلیم کیلئے نہیں ہوئی اسلئے سوا اس کہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت اور محمدن کالج کی شہرت سے یہ نتیجہ پیدا ہوا ہے اور کوئی بات خیال میں نہیں آتی۔

نیز اسی کالج کی ریس اور اسی کے بانی کی چیخ پکار سے متعدد کالج اور بے شمار اسکول خاص مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کے لیے ہندوستان میں کھول لیے جس کا ایک صریح نتیجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۸ء سے لیکر اس وقت تک کہ محمدن کالج کے طالب علم یونیورسٹی کے اعلیٰ امتحانوں میں شریک ہونے لگے اصل اس کی شہرت سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا دلولہ پیدا ہوا۔ یعنی ۱۸۸۱ء تک جو کہ چوبیس برس کا زمانہ ہوئے تمام ہندوستان میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد صرف ۴۲ تک پہنچی تھی مگر ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۳ء تک یعنی صرف بارہ سال میں تمام ہندوستان کے مسلمان گریجویٹس کی تعداد ۴۳ سے بڑھ کر ۲۲۹ تک پہنچ گئی اور ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۶ء تک یعنی تین سال میں صرف الہ آباد یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی سے ۱۸۵ مسلمان بی اے اور ایم اے کے امتحانوں میں کامیاب ہوئے اور اگر بدقسمتی سے وہ مشکلات جو گذشتہ دس برس سے طالب علموں کو پیش آرہی ہیں اور جنہوں نے خاص کر مسلمانوں کی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکادیا ہے پیش نہ آتیں تو اور بھی زیادہ عمدہ اور بہتر نتیجہ ظہور میں آتے۔

تعلیم کی ابتدائی مشکلات

اس کے سوا جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے یہ باعث بھی لحاظ کے قابل ہے

کہ قومی تعلیم کی چال اہستہ میں نہایت سست اور دھیمی ہوتی ہے۔ کم عمر لڑکے جن سے قومی تعلیم کی بنیاد قائم ہوتی ہے، باوجودیکہ ان کو حسد سے زیادہ ترغیب اور اشتعال کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اپنے دائیں بائیں کوئی مسلمان ایسا نہیں دیکھتے جس سے ان کو تعلیم میں کچھ مدد مل سکے، یا اس کی طرف کافی توجہ ہو۔ نہ تو قومی سوسائٹی میں ان باتوں کا چرچا ہوتا ہے جن سے تعلیم کا شوق اور اس کے ساتھ لگاؤ پیدا ہو۔ اور نہ خاندان کے چھوٹے بڑوں میں کوئی ایسا نظر آتا ہے جس سے مدرسہ کی پڑھائی میں کسی قسم کی اعانت کی توقع ہو۔ یہ خلاف اس کے جب قوم میں تعلیم کی بنیاد پڑ جاتی ہے تو ان کو گلی کوچہ اور گھر کے در و دیوار سے یہی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ اگر مسلمانوں میں تعلیم کا شوق اسی نسبت سے آمینہ بھی بڑھتا رہا جیسا کہ گذشتہ ۲۳ برس میں بڑھتا رہا ہے تو ان کی ترقی کی رفتار روز بروز تیز ہوتی جائے گی۔

ولایت کی تعلیم کا خیال شمالی ہندوستان

میں پیدا ہونا

ولایت کی تعلیم کا خیالی شمالی ہندوستان کے ہندو مسلمانوں میں درحقیقت اس وقت سے پیدا ہوا ہے جبکہ سرسید اپنے بیڑوں کو ساتھ لے کر انگلستان گئے ہیں۔ اس سے پہلے ہندوستان سے کوئی مسلمان اور شمالی ہند سے کوئی ہندو یا مسلمان ولایت میں تعلیم کے لیے نہیں گیا تھا۔ اگرچہ سرسید کو اس سفر کی جرات زیادہ تر اس اسکالر شپ کے سہارے سے ہوئی تھی جو سید محمود کی

تعلیم کے لیے گورنمنٹ نے عنایت کیا تھا لیکن چونکہ وہ خود بھی مع اپنے بڑے بیٹے کے، اپنے ولایت میں ٹھہرے تھے اور سید محمود کی تعلیم ختم ہونے تک ایک خدمت گار برابر پانچ برس ان کے ساتھ رہا تھا اور بعض ایسے اخراجات بھی جو اوروں کو اٹھانے نہیں پڑتے تھے سید کو برداشت کرنے پڑے تھے۔ اس لیے علاوہ دس ہزار روپیہ کے جو گورنمنٹ نے عطا کیا تھا پاس ہزار روپیہ ان کو اپنی جائیداد اور کتابیں بیچ کر اور رخصت کے زمانے کی تنخواہ کٹوا کر گویا اپنے پاس سے خرچ کہ نا پڑا۔ اگرچہ سید کو اس سے بہت بڑی نریہ یاری ہوئی مگر ہندوستان کے لیے آئندہ ولایت جانے کی راہ کھل گئی۔ سید نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ بیٹے کو ولایت میں تعلیم دلا کر ملک کے لیے ایک مثال قائم کر دی بلکہ جیسا پہلے حصہ میں مذکور ہو چکا ہے انہوں نے متعدد تدبیریں ہندوستانوں کے اور غاصکر مسلمانوں کے ولایت بھیجنے کے لیے کیں جن کا نتیجہ ہر شخص اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ کلکتہ، ممبئی اور مدراس کے علاوہ شمالی ہندوستان میں کوئی سال ایسا نہیں جاتا جس میں کچھ ہندو یا مسلمان طالب علم تعلیم کے لیے ولایت نہ جاتے ہوں ایک معتد بہ تعداد ولایت کے تعلیم یافتہ بیرسٹروں اور مول سروٹس وغیرہ کی جن کا پہلے بنگالیوں اور پارسیوں کے سوا کسی قوم میں وجود نہ تھا، اکثر قوموں میں پیدا ہو گئی۔ ہجو، ہندو، ہندوستانی جاتی ہے اور جیسا کہ نواب محسن الملک نے اپنے لاہور کے گھر میں بیان کیا ہے اس وقت صرف مہٹن کالج کے ۱۶ طالب علم بیرسٹریٹ لاء میں اور ۴ ولایت میں وکٹوری کی تعلیم پا رہے ہیں۔ اس حالت کا مقابلہ جب شمال ہندوستان کی اس حالت سے کیا جاتا ہے جبکہ سید نے پہلی ہی بار ولایت جانے کا ارادہ کیا تھا اور جس کے

ہمارے ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں مذہبی خیالات کے سبب یورپ جان کر عیسائی ہو جانے سے کم نہیں سمجھتے تھے اور غیر ملکوں کے مفسر کے بالکل عادی نہ تھے تو دونوں حالتوں میں زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اور اس میں شک کرنے کی ظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جس طرح مسلمانوں میں ولایت کی تعلیم کا خیال صرف سرسید کی تحریک سے پیدا ہوا ہے اسی طرح شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں یہ خیال اسی شخص کی بدولت پھیلا ہے۔

بادیو دیکھ ہندو مسئلہ سے انگریزی تعلیم میں مصروف تھے مگر وہ ایسے چپ چاپ بہ رستہ طے کر رہے تھے جیسے تناخوہ آدمی ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے اور پڑوسیوں کو خبر نہیں ہونے دیتا۔ یہاں تک کہ پچاس برس گزر گئے اور مسلمانوں میں کسی قسم کی جنبش پیدا نہیں ہوئی مگر سرسید کی چیخ پکار صرف مسلمانوں ہی کو جگانے والی نہ تھی بلکہ اُس نے شمالی ہندوستان کے دونوں صوبوں میں اس سرے سے اس سرے تک تعلیم کا غل ڈال دیا۔ اگرچہ ہندوستان کی تعلیم پر ہندو پہلے ہی سے متوجہ تھے اور سرسید کی تحریک نے سوا اس کے کہ اُن کی ترقی کی رفتار کسی قدر تیز کر دی کوئی بڑا نمایاں اثر اُس پر نہیں کیا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ولایت کی تعلیم کا خیال اُن میں صرف مسلمانوں کی رہا اور سرسید کے شور و غل سے پیدا ہوا۔ مذہبی رکاوٹیں ہمارے ملک کے ہندوؤں میں اور ہندوؤں سے بہت زیادہ تھیں، چنانچہ بعض شریف ہندو اسی جرم میں کہ انھوں نے ولایت میں جا کر تعلیم پائی، براہِ مری سے خارج کر دیے گئے لیکن چونکہ تعلیم نے انکو ذکی الحس کر دیا تھا اور زمانہ کا ساتھ نہ دینے کے مضر نتائج سے وہ خوب واقف تھے، اس لیے انھوں نے وہ تمام قیدیوں جو

ترقی کے مانع تھیں توڑ ڈالیں اور مسلمانوں کو ولایت کی تعلیم میں بھی اپنے سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کی تعداد کا بڑھنا

سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت میں جس قدر ترقی مسلمانوں نے محمدن کالج کی تعلیم کے ذریعہ سے بواسطہ یا بلاواسطہ کی ہے اس کا اندازہ اس طرح پر کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ اس کالج کے قائم ہونے سے پہلے مسلمان ملازموں کی تعداد کیا تھی اور اس کے قائم ہونے کے بعد کہاں تک پہنچ گئی! یا یہ کہ ہندوستان کی دیگر قوموں کے ساتھ صیغہ ملازمت میں ان کو پہلے کیا نسبت تھی اور اب کیا ہے! بلکہ ہمارے نزدیک اس کا اندازہ اس طرح ہونا چاہیے کہ اگر محمدن کالج قائم نہ ہوتا اور سرسید کی تحریک سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو تعلیم کا خیال پیدا نہ ہو جاتا تو آج کے مسلمان سرکاری محکموں یا ہندوستانی ریاستوں میں ملازم پائے جاتے!

سرکاری ملازمت کی جو شرطیں گزشتہ بیس سال میں وقتاً فوقتاً قرار پاتی رہی ہیں اور انھیں کے قریب قریب ہندوستانی ریاستوں میں بھی قیدیں لگتی جاتی ہیں ان پر لحاظ کرنے سے اس بات میں کچھ شبہ باقی نہیں رہتا کہ اگر اب تک مسلمان اسی خواب غفلت میں رہتے اور انگریزی تعلیم سے جس قدر حصہ کہ انھوں نے اس عرصہ میں لیا ہے وہ حصہ نہ لیتے تو آج سرکاری فتر اور محکمے ان سے گویا بالکل خالی پاتے اور ہندوستانی ریاستوں میں بھی وہ شاید خال خال ہی نظر آتے۔

نومہ داری کے عہدے جو پہلے ہندوستانیوں کو ادنیٰ درجہ کی تعلیم یا سعی

سفارش وغیرہ کے ذریعہ سے مجااتے تھے۔ اب سوا اس کے کہ گورنمنٹ اپنے خاص اختیار سے کسی مستثنیٰ آدمی کو دیدے، گریجویٹس کے سوا کسی کو نہیں مل سکتے۔ کومیشن کے قاعدے نے ایجوکٹیو کلاس کے سوا ہر درجہ کے آدمیوں کو عمدہ خدمات سے گویا بالکل محروم کر دیا ہے اور جس قدر ملازمت کے کے امیدواروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اسی قدر ملازمت کی شرطیں روز بروز زیادہ سخت ہوئی جاتی ہیں۔ سیکڑوں مل پاس اور انٹرنس پاس آٹھ آٹھ دس دس روپیہ ماہوار کی نوکری ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور شکل سے فیصدی دس کامیاب ہوتے ہیں۔

۱۸۸۸ء میں جبکہ محمدن کالج کی عمر دو تین برس سے زیادہ کی نہ تھی سرسید نے جو متعدد مضامین پنجاب یونیورسٹی اور مشرقی تعلیم کے خلاف لکھے تھے ان میں ایک جگہ لکھتے ہیں، وجہ صدر عدالت دیوانی ہائیکورٹ نہیں ہوئی تھی مشرقی علوم اور مشرقی زبان کے نہایت ذی علم و لائق شخص وکالت کرتے تھے اور ایسے کامیاب تھے کہ زمانہ ان پر رشک کرتا تھا دفعۃً ۱۸۹۶ء میں صدر عدالت دیوانی ہائی کورٹ ہو گئی اور یورپین زبان نے اپنا راج کیا۔ دوبارہ آؤ درخت علوم مشرقی اور مشرقی زبان کے جن کی پھینک آسمان تک پہنچی تھی اس طرح کھلا کر زمین پر گر پڑے جیسے کوئی نیا ناکہ پودا پائے کے صدمے سے جھلس جائے اب ہائیکورٹ میں جا کر علمائے علوم مشرقی کا حال دیکھو کہ ان پر کھیاں بھٹکتی ہیں۔ نہ وہ اپنی ذات کا کچھ فائدہ کر سکتے ہیں، نہ ملک کا نہ قوم کا تمام عہدوں میں میں سے مشرقی علوم و مشرقی زبان خارج ہو گئی ہے۔ دیوانی عہدوں میں جن کی بنیاد وکالت کے امتحان پر قائم ہوئی ہے مشرقی علوم و مشرقی زبان کی قدر و پریش نہیں رہی ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ ہائی کورٹ کی وکالت کے

امیدواروں کی فہرست میں ایک بھی مسلمان نہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ ایک لائق تحصیلدار عالم علوم مشرقی کو امیدواران ڈپٹی کلکٹری کی فہرست میں اس لیے جگہ نہیں مل سکی کہ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔

سرینید کا یہ مضمون سننے کا لکھا ہوا ہے جس کو سترہ برس کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اور جس کے بعد سرکاری عہدوں کی شرطیں آج تک برابر سخت ہوتی چلی آتی ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس عرصہ میں جو تھوڑی بہت ترقی مسلمانوں نے انگریزی تعلیم میں کی ہے اگر اس کا اب تک کچھ ظہور نہ ہوتا تو سرکاری معزز عہدوں پر شان و نادرہ ہی کسی مسلمان کی صورت نظر آتی اور پالیسیز نے جو سنہ ۱۸۸۰ء میں صوبہ بنگال کی نسبت لکھا تھا کہ ”تمام بنگالہ میں چند مسلمان عہدہ دار ہیں جو جلد پیشی لیں گے اور ان کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا اور آئندہ بجوچرپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدہ پر نہیں دکھائی دے گا۔“ بعینہ وہی حال صوبہ پنجاب اور اضلاع شمال مغرب و اوڈھ کا ہو جاتا کہ سرکاری عہدوں پر کسی مسلمان کی شکل دکھائی نہ دیتی پس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کم سے کم شمالی ہندوستان میں جس قدر تعلیم یافتہ نوجواں مسلمان سرکاری عہدوں پر نظر آتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ محض کالج کے تعلیم یافتہ ہوں یا کسی اور کالج کے یہ سب اسی شور و غل کا نتیجہ ہے جو سرسید نے ولایت سے آکر محمدن کالج قائم کرنے اور مسلمانوں کو اس کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے تمام ملک میں ڈال دیا۔

ملازمت میں محمدن کالج کے طالب علموں کی تعداد

اگرچہ اس صاف اور صریح نتیجہ پر خیال کرنے کے بعد اس بات کی

ضرورت باقی نہیں رہتی کہ خاص کر محمدن کالج کے جن مسلمان طالب علموں نے گورنمنٹ سروس یا ہندوستانی ریاستوں کی ملازمت میں امتیاز حاصل کیا ہے ان کی گنتی بتائی جائے تاہم ان لوگوں کو اطلاع کے لیے جو انگریزی تعلیم یا محمدن کالج کی علت غائی ملازمت کے سوا اور کسی چیز کو نہیں سمجھتے محمدن کالج کے ان طالب علموں کی فہرست جو بالفعل سرکاری یا غیر سرکاری عہدوں پر ہندوستان کے مختلف حصوں میں مامور ہیں یا عنقریب مامور ہونے والے ہیں نواب محسن الملک کی ایک تحریر سے اس مقام پر نقل کرتے ہیں :

امیر بل سروس	۱	جو پولیس اسکول آباد میں	اسٹنٹ پرنسپلٹ محکمہ
سول سروس	۲	تعلیم پارے ہیں	۵
بیرسٹریٹ لا	۳۱	جج	۲
سول سرجن	۱	مضف	۷
جو ڈاکٹری کیلے ولایت میں		انکپٹر و سب انسپٹر پولیس	۲۹
تعلیم پارے ہیں	۴	نائب تحصیلدار	۱۶
جو ڈاکٹری کیلے لاہور تعلیم		اسٹنٹ سب ڈپٹی	۲۰
پارے ہیں	۵	اوپیم ایجنٹ	۲
ڈپٹی کلکٹر و اکٹرا	۱۱	سرشتہ دار و سبڈ	۶۴
اسٹنٹ کمشنر		کلرک وغیرہ	۳۳۴
		ملازمان فوج	۷
		مختصیلدار	۲۰
		وکلا	۲۷
		ہندوستانی	۲۹
		ملازمان ریاستہائے	
		ملازمان سرشتہ تعلیم	۳۱
		واسیشن ماسٹر وغیرہ	۱۰
		اسٹنٹ پرنسپلٹ محکمہ	

ملہ اس فہرست میں جندو اور مسلمان سب شامل ہیں مگر ہندوغل خال ہیں باقی مکمل مسلمان ہیں صرف وکلا میں ہندوؤں کی تعداد کسی قدر زیادہ ہے ۱۲۔

ملہ منجملہ ان کے ایک جج ہائیکورٹ اور ایک سکریٹری جوم ڈپارٹمنٹ حیدر آباد ہے ۱۲۔

مٹن کالج کی خصوصیات

علیگڑھ مٹن کالج کے جو نتائج اور پر بیان کیے گئے اگرچہ اُن کو مسلمانوں کی اس پست حالت کے لحاظ سے جو ہیں بائیس برس پہلے تھی اور جو سترہویں زیادہ پست ہوتی جاتی تھی بہت غنیمت سمجھنا چاہیے لیکن ان نتائج سے مٹن کالج کی کوئی ایسی خصوصیت ظاہر نہیں ہوتی کہ جس کی رو سے اس کو ہندوستان کے اور کالجوں پر ترجیح دیا جاسکے یا اُس کو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید سمجھا جائے۔ سو اس کے کلاس کالج میں ہندوستان کے اور کالجوں کی نسبت مسلمان طلبہ کی تعداد کس قدر زیادہ پائی جاتی ہے کوئی تفادیت تعلیم اور نتائج تعلیم کے لحاظ سے محسوس نہیں ہوتا نہ یہاں کے طالب علموں نے آج تک فضیلت اور علمی یافتہ میں اور کالجوں کے طلبہ پر کوئی صریح فوقیت دکھائی ہے اور نہ یہ ثابت کیا ہے کہ یونیورسٹی کے نتائج امتحان میں اس کالج کے تعلیم یافتہ بہ نسبت دیگر کالجوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں پس تا وقتیکہ کوئی وجہ امتیاز کی نہ بتائی جانے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر اور اس سے مفید تر کوئی انشٹیویشن نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ نفس تعلیم کے لحاظ سے ہمارے ملک کے کالجوں کو جب تک کہ ان کی باگ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے ہاتھ میں ہے ایک دوسرے پر ترجیح دینی ناممکن ہے ایک سلجھے سے ایک ہی سے پرزے سے ڈھل کر نکلتے ہیں اور جس قسم کا بیج بویا جاتا ہے ویسی ہی جنس پیدا ہوتی ہے

دریں آئندہ طوطی صفت داشتہ اند

انچہ استاد ازل گفت ہماں میگوریم

بارہا خود مدبران سلطنت نے ایجوکیشنل ورکروں میں کہا ہے کہ سرکاری کالج اور یونیورسٹیاں کامل تعلیم دینے سے قاصر ہیں۔ پس جو تعلیم کا اصلی مقصد ہونا چاہیے اُس کو سر درست ہندوستان کے کسی کالج میں ڈھونڈنا حاصل ہے ہاں اگر ہندوستانیوں میں اتنی محنت اور اس کے ساتھ قدرت بھی ہو کہ وہ بھی یورپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرح اپنے پرائیویٹ کالجوں میں فیسو سٹم جلدی کریں یا اپنی یونیورسٹی الگ قائم کریں تو ممکن ہے کہ اس ملک میں بھی ویسے ہی محقق اور موجد و مخترع پیدا ہونے لگیں۔ جیسے انگلستان، فرانس اور جرمنی میں پیدا ہوتے ہیں مگر یہ سب ناشدنی باتیں ہیں جن کو ہندوستان کی آب و ہوا اس آتی معلوم نہیں ہوتی۔

لیکن اگر تعلیمی نتائج سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو محمدن کالج میں غمزدہ ایسی خصوصیتیں موجود ہیں جن کے لحاظ سے اُس کو ہندوستان کے دیگر کالجوں کی نسبت زیادہ مفید کہا جاسکتا ہے از انجملہ ایک نہایت صاف اور صریح خصوصیت کالج مذکور کی یہ ہے کہ اُس میں ہر ماں جس قدر روپیہ اسکالرشپوں میں خرچ کیا جاتا ہے ظاہراً ہندوستان کے کسی گورنمنٹ کالج یا پرائیویٹ کالج میں صرف نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ مسلمانوں کی مالی حالت کے لحاظ سے یہاں سب جگہ سے زیادہ اس بات میں کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو غریب طالب علموں کو جو شوقین اور ہونہار ملام ہوتے ہوں اسکالرشپوں کے ذریعہ سے تعلیم میں مدد دی جائے اور تا بقدر غریب اور آسودہ حال طلبہ تقریباً یکساں حالت میں طالب علمی کا زمانہ بسر کریں۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء سے لیکر ۱۸۹۶ء تک یعنی چھ سال میں کچھ کم تنائیں ہزار روپیہ اس کالج کے طلبہ کو اسکالرشپوں اور وظیفوں میں دیا گیا ہے۔ اگر ذی مقدور مسلمانوں

کو منتظرانِ کالج کی نسبت ایک سو اسی حصہ بھی قوم میں تعلیم پھیلانے کا خیال ہو تو مذکورہ بالا رقم سے دس حصہ زیادہ روپیہ اس مد میں صرف ہو سکتا ہے۔

سامانِ تربیت

لیکن بڑی خصوصیت اس کالج کی سامانِ تربیت ہے جس کو بانی کالج نے ہمیشہ تعلیم سے زیادہ اہم اور ضروری سمجھا ہے اور جس کے بغیر فی الواقع تعلیم کا عدم اور وجود برابر ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا ہماری درس گاہوں میں کبھی خیال نہیں کیا گیا اور اسی لیے ہم لوگ تربیت کے مفہوم سے جیسی کہ چلبے واقفیت نہیں رکھتے۔ اگرچہ کالج کے بانیوں نے تربیت کے متعلق بہت کچھ تحریروں اور تقریروں میں بیان کیا ہے باوجود اس کے اکثر لوگ تربیت کے مفہوم سے اب تک ناواقف ہیں اور اسی واسطے محدث کالج کے کھیلوں پر اور طالب علموں کے لباس وغیرہ پر غور کرتے ہیں۔ اسی خیال سے ہم چلتے ہیں کہ اس سلسلے کو زیادہ وضاحت سے بیان کریں۔ کیونکہ سرسید کی لائف میں اس سے زیادہ کوئی مہتمم با اشراف واقعہ نہیں ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی درس گاہ میں تربیت کی بنیاد ڈالی ہے۔

ہمارے ہاں تربیت اولاد کا آلہ زیادہ تر تعلیم و تلقین، نصیحت و پند، زجر و توبیخ یا زور و کوب کو سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ تمام وسائل جب تک کہ لڑکے ایک معتدبہ زمانہ تک عمدہ سوسائٹی میں نہ رہیں اکثر صورتوں میں محض فضول اور بیکار ثابت ہونے میں۔ مذکورہ بالا وسائل سے اول تو اکثر صورتوں میں مضرت نائج پیدا ہوتے ہیں اور اگر کوئی عمدہ اثر دلوں پر ہوتا بھی ہے تو وہ برآب کی طرح جلد نائل ہو جاتا ہے۔ لیکن سوسائٹی کے اثر سے عمدہ

اخلاق رفتہ رفتہ طبیعت ثانی بن جاتے ہیں اسی سوسائٹی کے اثر سے ایسا
یورپ کے اخلاق اصولاً ایک سلسلے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور
اسی سوسائٹی کے سیرے ہونے سے ہم لوگوں کے اخلاق و عادات میں باہم
زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے لوگ جب کسی درگاہ میں آتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ان
کو کچھ سکھایا اور یاد کرایا جائے زیادہ تر اس بات کی ضرورت ہوتی ہے
کہ جو کچھ وہ اپنے گھروں سے سیکھ کر آئے ہیں اس کو بالکل ان کے دلوں سے
سے بھلا دیا جائے۔ قطع نظر ان عام خرابیوں کے جو ہندوستانیوں کے اخلاق
اور معاشرت میں عموماً پائی جاتی ہیں، ہم غامکر ان چند خصلتوں کا ذکر کرتے
ہیں جو بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں، جیسے مذہبی تعصبات
باہمی نزاع، رشک و حسد، غیبت، بدگالی، کالی، تن آسانی، تفسیع اوقات
ادائے فرائض میں سستی کرنا، غصہ، بے اعتدالی، نافرمانی وغیرہ اور کچھ
شک نہیں کہ ان میں سے اکثر خصلتیں مسلمانوں میں بہ نسبت دیگر اقوام کے
زیادہ دیکھی جاتی ہیں۔ یہی باتیں جب چھوٹے بڑوں میں دیکھتے ہیں تو ان کی
طبیعتوں میں آہستہ آہستہ سرایت کرتی جاتی ہیں اور آخر کار ان کی طبیعت
ثانی بن جاتی ہیں۔

انہیں خرابیوں کے تدارک کے لیے محمدن کالج میں بورڈنگ سسٹم قائم
کیا گیا ہے۔ مگر پہلے اس سے کہ ہم اس سسٹم کے فوائد اور یہ کہ اس کو طلبہ کی
تربیت میں کیا دخل ہے، بیان کریں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جن طرح تعلیم کے
نتیجہ اعداد کے ذریعے دکھائے جاسکتے ہیں اس طرح تربیت کے نتائج
نہیں دکھائے جاسکتے۔ نیز تعلیم کے کا اثر دفعۃً اور نمایاں ہوتا ہے اور تربیت

کا اثر نامعلوم اور بتدریج ہوتا ہے جس طرح دھوپ اور ہوا اور پانی کی تاثیر سے پودے جو آہستہ آہستہ نشوونما پاتے ہیں ان کو نمو کرنا مالی کے سوا ہر شخص کو فوراً محسوس نہیں ہوتا اسی طرح تربیت کے نتائج بدیہی طور پر ایک مدت کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ چونکہ کالج اور بورڈنگ ہاؤس کو قائم ہونے کے کچھ بہت عرصہ نہیں گزرا اس لیے یہاں ہم کو زیادہ تر یہ دکھانا مقصود ہے کہ محمدن کالج میں مسلمان طلبہ کی تربیت کا کیا سامان مہیا کیا گیا ہے؛ وہ کہاں تک ان کی حالت کے مناسب ہے؛ اور اس سے آئندہ کن نتائج کی توقع ہو سکتی ہے؛ نہ یہ کہ اس طریقہ تربیت سے اب تک کیا نتیجے مترتب ہو چکے ہیں؛

قومیت کا خیال

سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں میں اتفاق و یک جہتی و قومی ہمدردی پیدا کرنے کی ہے جس کے نہ ہونے سے تمام قوم روز بروز منہمک اور تنہا و سیر یاد ہوتی جاتی ہے۔ یہ امید رکھنی کہ عظیم نصیحت سے یا اخباروں اور رسالوں میں اتفاق کے فوائد پر بڑے بڑے آرٹیکل لکھنے سے یا اس مضمون پر زور وار اور موثر نطیس شایع کرنے سے مسلمانوں میں اتفاق پیدا ہو جائے گا۔ ایسی ہی بات ہے جیسے حب کے عمل سے دشمنوں میں دوستی پیدا کرنی۔ ان میں اتفاق پیدا ہونے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ان کی نسلیں اتفاق کے سایہ میں نشوونما پائیں اور ایک مدت تک ایسی سوسائٹی میں زندگی بسر کریں جہاں مختلف فاندانوں مختلف صوبوں اور مختلف مذہبوں کے لڑکے ایک ہال میں کھانا کھائیں۔

ایک مسجد میں نماز پڑھیں، ایک قید میں مردانہ کھیل کھیلیں، ایک میدان میں گھوڑے دوڑائیں، ایک کلب میں ڈبیٹ کریں، ایک کالج میں پڑھیں اور ایک احاطہ میں دن مات لگے بھائیوں کی طرح شیر ڈنکر سو کر رہیں، اور اس طرح اتفاق کی حلاوت ماں کے دودھ کی طرح ان کی رگ و پے میں سرایت کر جائے۔

ریاضت جسمانی

ریاضت جسمانی جس کا سامان مٹھن کالج میں ہندوستان کے تمام کالجوں سے زیادہ مہیا کیا گیا ہے اور جس میں یہاں کے طالب علموں نے تمام ملک میں بڑی شہرت حاصل کی ہے، اکثر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے طالب علم کی طبیعت تعلیم سے اچاٹ ہو جاتی ہے اور کالج میں رہنے سے جو اصل مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوتا، مگر جس قوم کی تقلید سے ہم اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم دلواتے ہیں ان کے ہاں ریاضت جسمانی تعلیم کا جزو غیر متنازع سمجھی جاتی ہے، لیکن صرف ان کی تقلید ہی سے ریاضت جسمانی کو محض کالج میں ضروری نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ اس لیے اس کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کہ جو طالب علم یہاں سے نکلیں وہ قوم میں مستعدی اور بے فکاشی کی مثال ہوں اور سستی اور کاہلی جو مسلمانوں کی ایک قومی خصیئت سمجھی جانے لگی ہے بجائے اس کے وہ ان میں چستی و چالاکی کی بنیاد ڈالیں، وہ برہمچاری ان تمام کتاب کے کیڑوں کے جو اپنے تمام قوائے دماغی کتاب کی تندہ کر دیتے ہیں اور زندہ دلی و شگفتگی اور تمام اسٹیکس اور چاؤ بلکہ بعض صورتوں میں اپنی زندگی تک تعلیم پر قربان کر دیتے ہیں، جب کالج کو چھوڑیں تو کھنے پینے کے سوا وہ دنیا کے تمام کاموں کے لائق ثابت ہوں

وہ ہندوستان کی عام حالت کے برخلاف جہاں ایک شخص کا سپاہی اور
عالم ہونا گویا اجتماعِ ضدین سمجھا جاتا ہے، تعلیم یافتہ بھی ہوں اور سپاہی بھی وہ
اُن فرسودہ دماغوں کی طرح جن میں کثرتِ مطالعہ سے تخیل اور برداشت کی طاقت
نہیں رہتی، چڑچڑھے، نازک مزاج اور بد و ماح نہ بنجائیں۔ اگر ان کو یورپین لوگوں
کی مانتھی میں رہنے کا اتفاق ہو تو محنت اور جفاکشی کے موقعوں پر اُن کا ساتھ
دینے سے عاجز اور اُن کی نظر میں ذلیل نہ ہوں۔ وہ ملکی اور فوجی دونوں قسم کی
خدمات کے لیے انتخاب ہو سکیں۔ اگر اُن کو نوکری میسر نہ آئے تو اپنے دست
و بازو پر بھروسہ کر کے ہر کام پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کر سکیں۔ اُن میں ایسی استعداد
پیدا ہو جائے کہ یہ کاری اور آسام طلبی جو مسلمانوں کی قومی خصیت بن گئی ہے
اور جس کے سبب سے عرب میں ”ہندی بھال“ ایک مثال ہو گئی ہے ان کو
وبال معلوم ہونے لگے وہ غیر ملکیوں کے سفر سے نہ ہچکچائیں، وہ سختیوں کے جھیلنے
کے عادی ہو جائیں۔ انھیں اغراض کے لیے محمدن کالج میں ریاضت جسمانی پر
زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ محض تعلیم سے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی
جب تک کہ اُس میں دلیری اور مستندی کا عنصر پیدا نہ ہو۔ لارڈ ڈفرن اپنے عہد
حکومت میں جب محمدن کالج کے ملاحظہ کو آئے اور ایڈریس میں کرکٹ وغیرہ
کا ذکر سنا تو اس کا جواب دیتے وقت انھوں نے طالب علموں سے منام
ہو کر کہا تھا کہ ”ہماری قوم نے پہلی فتح کرکٹ کے میدان میں حاصل کی تھی ایک
حکیم کا قول ہے کہ ”قومی قوتِ صحت پر منحصر ہے“ اور چونکہ صحت بغیر ریاضت
جسمانی کے قائم نہیں رہ سکتی اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ قومی قوتِ ریاضت
جسمانی پر منحصر ہے۔

نصوصاً ہمیں قوم کو خدا نے ہم پر حکمران کیا ہے اور جن کی پسند اور انتخاب

کے ساتھ بیماری تمام امیدیں وابستہ ہیں ان کے برابر کوئی قوم روئے زمین پر ریاضت جسمانی کی فریضہ نہیں۔ ان کو شیر خوارگی کے زمانہ سے ریاضت کے قابل بنایا جاتا ہے اور جب تک مرض الموت میں مبتلا نہیں ہوتے کبھی ریاضت ترک نہیں کرتے۔ علاوہ معمولی کھیلوں اور ریاضتوں کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں کوس گھوڑے یا ہائیکل پیرا پیادہ پاسفر کرتے ہیں۔ کشتیاں کھیتے ہیں، گاڑیاں ہانکتے ہیں، برف پر دوڑتے ہیں، پیاروں پر چڑھتے ہیں، کانوں میں اترتے ہیں، کڑیاں چیرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مصر کا ایک لائق مسلمان اپنے سفرنامہ یورپ میں لکھتا ہے کہ درمخاطر وہاں تک میں گھس جاتا۔ اخیر دم تک اپنے ارادہ پر ثابت قدم رہنا اور جس قدر زیادہ مشکلات پیش آئیں اسی قدر زیادہ ثبات اور استقامت سے ان کا مقابلہ کرنا دنیا کی کسی قوم میں ایسا نہیں پایا جاتا جیسا انگریزوں کی قوم میں پایا جاتا ہے۔ اسی قوم کی نظر میں کیا ہمارے نوجوان جب تک کہ انھیں کی برابر بلکہ ان سے زیادہ جفاکش محنتی، دلیر اور مستعد نہ ہوں محض کتاب کا شیرازہ سے کچھ اقتدار یا وقعت حاصل کر سکتے ہیں؟

برگز نہیں۔
جو لوگ گورنمنٹ سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو والیٹر بنایا جائے اور ہم کو فوج میں معزز عہدے دیئے جائیں۔ جب تک کہ وہ بھی مثل انگریزوں کے اپنے تئیں ایجوکیشن سپاہی نہ بنائیں برگز ایسی خواہش کرنے کا استحقاق نہیں رکھتے اور اسی لیے محمدن کالج کے بانیوں نے ریاضت جسمانی کو تسلیم کا جزد غیر منفک قرار دیا ہے۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ کرکٹ، فٹ بال اور جیناٹک وغیرہ کے شوقین تعلیم میں کوشش نہیں کرتے یا کھنٹے پڑھنے سے ان کا دل اچاٹ ہو

جاتا ہے۔ کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ جس کالج ٹیم نے پچھلے دنوں میں بمبئی اور پاریس ٹیم اور پٹیل ٹیم پر دونوں فحش ماحصل کی تھیں ان میں کئی گریجویٹ تھے۔ اور باقی جتنے کالج کلاسوں میں پڑھتے تھے وہ سب تعلیم کے لحاظ سے بھی اپنی جماعتوں میں اچھے سمجھے جاتے تھے۔

وقت کا خیال

ایک اور فائدہ بوردنگ سسٹم سے طالب علموں کے لیے یہ سمجھا گیا ہے کہ بوردنگ ہاؤس میں رہنے سے ان کو ضبط اوقات کی عادت پڑتی ہے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کی اولاد تقضیع اوقات کرنے والی مشہور ہے، حالانکہ جس قوم کی گورنمنٹ سے ہمارے نوجوان ٹوکر یوں کے خواستگار ہیں اس کا ایک ایک فرد وقت کو اپنی دولت بلکہ اپنا دین و ایمان بکھتا ہے اور فی الحقیقت جو لوگ وقت کی کچھ قدر نہیں کرتے نہ وہ دین کے فرائض ادا کر سکتے ہیں نہ دنیا کے۔

وقت کی پابندی بھی وعظ و نصیحت سے یا کتابوں میں اسکی خوبیاں پڑھنے سے یا کسی نفع کی امید یا نقصان کے خوف سے نہیں ہوتی، بلکہ ایک مدت تک اس کی مشق کرنے سے ہوتی ہے۔ بوردنگ کالج کے بوردنگ ہاؤس میں جو صغیر سن لڑکے ایک الگ وارڈ میں رہتے ہیں ان کی ابتدا ایسی ہوتی ہے جس سے امید ہوتی ہے کہ وہ کالج سے نکل کر ہمیشہ اوقات کے پابند رہیں گے۔

صبح کے پانچ بجے سے رات کے نو بجے تک وہ مختلف فرائض میں جکڑے رہتے ہیں نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا، ہوا خوری کرنا، یا گیند بلا کھیلنا، از رنگ اسکول ٹائٹ اسکول اور بڑے اسکول میں پڑھنا، کھانا کھانا، مطالعہ دیکھنا

اور سونا یا سوکرا ٹھننا۔ غرض ہر ایک کام کے لیے خاص اوقات مقرر ہیں جن میں بیماری کے سوا کبھی فرق نہیں آنے پاتا۔ ظاہر ہے کہ آٹھ دس برس تک جب ان کی زندگی اس پابندی اوقات کے ساتھ گزرے گی تو امید نہیں کہ وہ عمر بھر اس عادت کو چھوڑ سکیں۔ اگرچہ بڑی عمر کے لڑکوں کے لیے بھی فائز اور اوقات مقرر ہیں مگر جو عادت بچپن میں ڈالی جاتی ہے۔ وہ طبیعت ثانی ہو جاتی ہے۔ بخلات بڑی عمر کے لڑکوں کے کہ اول تو ان کو بچوں برابر کالج میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوتا، دوسرے جو عادتیں وہ باہر سے سیکھ کر آتے ہیں ان کا مائل ہوتا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے محمدن کالج میں بچپن سے رہنا بہ نسبت بڑی عمر کے لڑکوں کے زیادہ مفید ہے۔

اطاعت کی مشق

شرعیہ اور باقاعدہ اطاعت و فرمانبرداری جو ہر قوم کا اور خاص کر محکوم قوم کا زیور ہے اس کی عادت ڈالوانے اور مشق کرانے کے جو ذریعے اس بورڈنگ ہوس میں موجود ہیں ظاہر ابندوستان کے کسی انسٹیٹیوشن میں موجود نہیں ہیں۔ علاوہ کالج اور ہائی اسکول اور ماننگ اسکول اسکول کے جہاں طالب علموں کو برابر پروفیسروں اور اسٹروں کی آرڈر میں رہنا ضرور ہے وہ ہر وقت اپنے تئیں کسی نہ کسی ریڈ یا افسر کے زیر حکم پاتے ہیں جب تک وہ بورڈنگ ہاوس میں ہیں پراکٹر کے محکوم ہیں جب تک ڈائینگ ہال میں رہتے ہیں ایک یورمین پروفیسران کا لگراں رہتا ہے۔ اسی طرح لیب میں پروفیسر یا کیپٹن، یونین کلب میں پریسیڈنٹ یا اس کا قائم مقام، جینٹل اور قواعد کے وقت ڈن ماسٹر، گھوڑے کی سواری کے وقت رائڈنگ

ماسٹر بیماری کی حالت میں ڈاکٹر اور مسجد میں ایک دین دار عالم اُن کی روک
لوگ کے لیے مقرر ہیں جن کا حکم ماننا اُن کو ضرور ہے۔

ظاہر ہے کہ جب برابر آٹھ سات برس طالب علموں کی زندگی ان ضوابط
کے ساتھ بسر ہوگی تو کس قدر باقاعدگی اور اطاعت اُن کی طبیعت میں پیدا
ہو جائے گی! اور کس قدر وہ دنیا میں ہر جگہ بر دل عزیز ہو کر رہنا سیکھ جائیں گے!
ایسی اطاعت جو قواعد و اصول پر مبنی ہو اُس کی عادت اولاد کو ابتدائے
عمر میں ڈلوانی ایسی ہی ضروری ہے جیسے ایل پچھڑے کو سدھا کر اور باگوں پر
صاف کر کے سواری کے قابل بنانا جس طرح اوکھے اور سرکش گھوڑے کا کوئی
ضرعیار نہیں ہوتا اسی طرح نافرمان آدمی کہیں عزیز نہیں سمجھا جاتا، اکثر انگریز
افسروں نے لوگوں سے یہ شکایت کی ہے کہ مسلمان لیے فرماں بردار
نہیں ہوتے جیسے ہندو اور اسی لیے یورپین افسران کی نسبت ہندوؤں کو
زیادہ پسند کرتے ہیں، اگر فی الواقع یہ شکایت صحیح ہے تو مسلمانوں کی اولاد
جن کا مدار معاش اب تک صرف نوکری پر رہا ہے اُن کو سب سے زیادہ
اطاعت اور فرمانبرداری سکھانے کی ضرورت ہے۔ یہ سمجھنا کہ آزادی
اور اطاعت میں منافات ہے صحیح نہیں ہے۔ انگریزوں کی قوم دنیا میں
سب سے زیادہ آزاد خیال اور آزاد طبع سمجھی جاتی ہے، حالانکہ اُن سے بڑھ
کر کوئی اپنے امیر کا حکم ماننے والا اور قانون پر چلنے والا اور قواعد کی پابندی
کرنے والا نہیں ہوتا۔ پس مٹھن کالج کے بورڈنگ ہوس میں رہنے سے
مسلمانوں کی اولاد ایک ایسی خصلت سیکھتی ہے جس پر اُن کی تمام آئندہ
کامیابیاں منحصر ہیں۔

قومی لباس کا خیال

اس کے سوا مسلمانوں میں قومیت کا خیال پیدا کرنے کے لیے ایک اور چیز کی ضرورت ہے جس کو آج تک ہندوستان کے عام مسلمانوں نے قابل التفات نہیں سمجھا۔ حالانکہ وہ ایک نہایت مہتمم باشان مسند ہے۔ لباس جس کی نسبت مجاہد بزرگوں کا یہ قول تھا کہ "اَلْقَائُ بِاللِّبَاسِ" اور جس سے ایک قوم کی دوسری قوم سے تمیز کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس میں کوئی امتیاز باقی نہیں رکھا۔ انگریزوں کا جاسہ، لڑی، عمامہ، پگڑی یا جوتہ غرض کہ کوئی چیز مسلمانوں کے لباس میں ایسی نہیں ہے جس پر قومی خصوصیت کا اطلاق ہو سکے۔ ہندو مسلمانوں میں پہلے صرف اگلے اور سیدھے پردہ کی تمیز تھی مگر جب سے اچکن کا رواج ہوا ہے یہ تمیز بھی باقی نہیں رہی۔ قطع نظر اور ملکوں کے جہاں ہر قوم ایک خاص لباس رکھتی ہے خود ہندوستان میں اکثر معزز قومیں ہیں جو صرف اپنے قومی لباس سے پہچانی جاتی ہیں۔ جیسے پارسی، ہریجن، بنگالی، راجپوت وغیرہ۔ مگر مسلمانوں کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں پائی جاتی، لباس کا متحد ہونا قومی یکگانیت کے بڑھانے اور متاثریت کے دور کرنے میں ویسا ہی دخل رکھتا ہے جیسا زبان، نسل اور مذہب کا متحد ہونا۔ اس کے سوا جس قوم کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں ہوتی ان کی مجلسیں، ان کے میلے اور ان کی جماعتیں دوسری قوموں کی نظر میں ایک گویا رہے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

اسی سبب سے سرسید کو ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی اور قوموں کی طرح اپنے لباس میں کوئی خصوصیت اور ماہر امتیاز پیدا

کریں، اور چونکہ بقول اُن کے آج ہندوستان میں کوئی مسلمان اتھارٹی ایسی موجود نہیں ہے جو ایک نیشنل لباس اختراع کرے اور اس کے رواج دینے پر زور دے، اس لیے انھوں نے مسلمانوں کی ایک معزز ترین قوم یعنی ترکوں کا لباس اول خود اختیار کر کے قوم میں ایک مثال قائم کی اور پھر محمدن کالج کے بورڈروں کے لیے اُس قاعدہ کے موافق جس پر قسطنطنیہ کی درسگاہوں میں عمل درآمد ہے یونی فارم کا قاعدہ جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر بعض موانع کے سبب وہ قاعدہ جاری نہیں ہو سکا۔ لیکن محمدن کالج کے طالب علم جو بورڈنگ ہاؤس میں آکر رہتے ہیں بغیر کسی جبر کے اپنے ہچکچاہٹوں کو دیکھ کر خود بخود ٹرکس لباس اختیار کر لیتے ہیں جو علاوہ خوش قطع اور خوش نما ہونے کے ہر موسم اور ہر حالت کے مناسب اور قواعد حفظ صحت کے بھی موافق بنے، اور جب وہ کالج چھوڑ کر وہی لباس اپنے وطن میں جا کر پہنتے ہیں تو اکثر قوم کے نوجوان اُن کی دیکھا دیکھی وہی لباس اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح محمدن کالج ہندوستان کے مسلمانوں میں آہستہ آہستہ ایک قومی لباس کو رواج دے رہا ہے۔

اگرچہ بعض تنگ دل انگریز جو ہندوستانیوں کو ہمیشہ پست اور ذلیل حالت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں وہ اس لباس سے ناراض ہوتے ہیں لیکن چونکہ گورنمنٹ نے ہم کو بر قسم کا لباس پہننے کی آزادی دی ہے اور انگریزوں میں بھی زیادہ تر وہی فیاض اور آزاد طبع لوگ ہیں جن کے لیے متعصبانہ خیالات نہیں ہیں اس لیے محمدن کالج کے طالب علم نہایت آزادی سے ٹرکس لباس پہنتے ہیں اور کسی کی بیجا ناخوشی یا ناگواری کا خیال نہیں کرتے۔

کالج کی سوسائٹیاں

نیز بورڈروں نے کالج کے احاطہ میں متعدد سوسائٹیاں قائم کر رکھی ہیں
 انہیں ایک کالج یونین کلب اور دوسری اسکول یونین کلب ہے۔ کالج اور
 اسکول کے طلبہ ہفتہ میں ایک روز مختلف مضامین پر اپنے اپنے صدر انجمن کے
 روبرو انگریزی یا اردو میں معارفی بحث کرتے ہیں مگر کون بات آداب مناظرہ
 اور تہذیب کے خلاف زبان پر نہیں لاسکتے جو امر کے ڈبیٹ یا اسپیکنگ
 میں عمدہ لیاقت ظاہر کرتے ہیں ان کو انعام دیے جاتے ہیں۔ اس سے علاوہ
 اسپیکنگ اور استدلال کا ملکہ پیدا ہونے کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہندوستان
 کے مسلمانوں میں جو محاذیہ کا نا پسندیدہ طریقہ عموماً جاری ہے اس کی اصلاح
 کی ان میں بنیاد پڑتی ہے اور طالب علموں کو مختلف سوالات پر بحث کرنے
 کے لیے مختلف کتابیں دیکھنے اور ہر ایک سوال پر رائے قائم کرنے کا موقع
 ملتا ہے۔

طالب علموں ہی نے ایک دوکان ڈیوٹی شاپ کے نام سے بوڈنگ
 ہاؤس میں کھول رکھی ہے جو مختلف طریقوں سے روپیہ جمع کر کے کالج اور
 طلبہ کی مدد کرتی ہے اس سے ان کے دل میں کالج کے ساتھ سمجھداری اور اس کی
 امداد کے لیے عملی کام کرنے کی خود بخود ترغیب ہوتی ہے۔

ایک اور سوسائٹی براؤن ہڈ کے نام سے قائم کی گئی ہے جس میں ان تمام
 طالب علموں نے جو تعلیم ختم کرنے کے بعد کہیں نوکری ہو گئے ہیں اپنی آمدنی
 میں سے فیصدی ایک روپیہ ماہوار چھپتہ حصہ کالج کی امداد کے لیے
 دینے کا وعدہ کیا ہے۔

اس کے سوا اور سوسائٹیاں ہیں ایک انجمن اخوان الصفا جس میں اُس کے ممبر آزادی کے ساتھ مختلف عنوانوں پر مضامین لکھ کر پیش کرتے ہیں، دوسری بختہ الادب جو عربی زبان میں تقریر یا تحریر کی مشق کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔

ایک اور سوسائٹی ماں جی میں سائنس پر کچھ دینے والا اس کے تجربے دکھانے کے لیے طالب علموں نے قائم کی ہے جس کا مقصد ہندوستانیوں میں علمی مذاق پیدا کرنا ہے۔ یہ سوسائٹی گوا بھی ابتدائی حالت میں ہے مگر چونکہ وہ زمانہ کے مقتضا کے موافق ہے اس لیے اُس کے ترقی کرنے کی بہت کچھ امید کی جاتی ہے۔

اب سب سوسائٹیوں کے علاوہ ریاضت جسمانی کے لیے کرکٹ اور فٹ بال اور جمناسٹک کلب اور گھوڑے کی سواری کیفے ریڈنگ اسکول ہے اگرچہ ریڈنگ اسکول نے مسلمانوں کی کم بہتی یا بے مقدوری کے سبب ابھی تک کچھ زیادہ ترقی نہیں کی مگر جو کلب ریاضت جسمانی کے لیے قائم ہیں ان میں توقع سے بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے جس کی وجہ سے کالج ٹیم نے تمام ہندوستان کی یونیورسٹی اور ہندوستانی ٹیموں میں جیسا کہ کالج کی سالانہ رپورٹوں سے ظاہر ہے۔ توقع سے بہت زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔

مذہبی تعلیم

مذہبی تعلیم و تربیت بھی اس کالج کی خصوصیات میں سے ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ شاخ جیسی کہ ایک محدث کالج میں ہونی چاہیے ابھی تک اس درجہ پر نہیں پہنچی لیکن اس کا الزام سرسید یا کالج کے اوتھارٹھوں پر عائد

نہیں ہوتا۔ اول تو وہ مذہبی کمیٹیاں جو شیعہ اور سنی دونوں کی مذہبی تعلیم کی نگرانی اور انتظام کے لیے جدا جدا مقرر ہیں اور جن سے سرسید نے لوگوں کی بدگمانی کے خیال سے خود علیحدگی اختیار کی تھی، انہوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی دوسرے دنیوی تعلیم کے کورس جو یونیورسٹی وقتاً فوقتاً مقرر کرتی ہے۔ وہ اس قدر مشکل اور طویل الذیل ہوتے ہیں کہ ان کے پورا کرنے میں طلبہ کو دوسری طرف متوجہ ہونے کا بہت ہی کم موقع ملتا ہے، یہ باتناک کہ اگر ان بد مذہبی تعلیم کا زیادہ بوجھ ڈالا جائے تو وہ حال سے خالی نہیں، یا تو وہ کالج چھوڑ دیں گے یا یونیورسٹی کے امتحانوں میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ با اینہم جس قدر مسلمانوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا اہتمام اس کالج میں کیا جاتا ہے اور جس کی تفصیل اس کی سالانہ رپورٹوں میں ہمیشہ چھپتی ہے، ہندوستان کے کسی کالج میں اس کا وجود نہیں ہے۔

یہ سچ ہے کہ انگلستان کے جن کالجوں کی تقلید سے اس کالج میں تربیت کا مذکورہ بالا سامان مہیا کیا گیا ہے ان کے مقابلہ میں اس کالج کو مشکل سے ایک خاک یا ایک ادھورا نمونہ ان کالجوں کا کہا جاسکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ انگلستان کے مذکورہ بالا کالج کتنی کتنی مدت میں موجودہ حالت تک پہنچے ہیں تو جس حد تک علی گڑھ محمدن کالج میں بائیس برس کے عرصہ میں پہنچ گیا ہے، اس سے کچھ کم تعجب نہیں ہوتا۔ انگلستان کے بڑے بڑے نامور کالج اور یونیورسٹیاں جو آج تمام یورپ میں مشہور و معروف ہیں کئی کئی سو برس تک نہایت گمنامی اور پسندی کی حالت میں رہی ہیں اور جس طرح بتدریج قوم میں تعلیم بڑھتی گئی اسی طرح آہستہ آہستہ ان کی حالت ترقی کرتی گئی۔ پس ہم کو اس کالج کی موجودہ حالت

پر نظر کرنی نہیں چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ جن اصول پر وہ قائم کیا گیا ہے۔ اگر انہیں اصول کے موافق وہ ترقی کرتا چلا گیا تو پچاس ساٹھ ہی برس وہ کس درجہ پر پہنچ جائے گا۔

یشک کالج کے اندرونی انتظامات میں بہت سی باتیں قابل اعتراض موجود ہیں جن کو سرسید کی خود رائی اور ضد اور مبطل کا نتیجہ کہا جاتا تھا اور کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ کہنا بالکل غلط نہ تھا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ صدیوں کے کام مہینوں اور دونوں میں پورے نہیں ہو سکتے اور ایک شخص کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک قومی انسٹی ٹیوشن کو اس حد تک پہنچا جائے جس کے بعد کسی اصلاح یا ترقی کی ضرورت باقی نہ رہے اور ایک ریفارمر جس نے اگلے وقتوں کے بہت سے خیالات اور بہت سی رایوں کی اصلاح کی جو اس کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ساتھ کے ساتھ اپنے خیالات اور اپنی رایوں کی بھی اصلاح کرتا جائے۔

یورپین اسٹاف

ایک اور خصوصیت اس کالج کی یورپین اسٹاف ہے جس کو بانی کالج نے متعدد وجوہ سے نہایت اہم اور ضروری سمجھا ہے۔ ان کی رائے تھی کہ اول تو ہندوستانی تعلیم یافتہ علمی بیادت اور طنز تسلیم کے لحاظ سے بھی یورپین پروفیسروں کی برابری نہیں کر سکتے اور اگر بالفرض ایسے لائق ہندوستانی پروفیسر بھی آجائیں تو ان کا اثر طلبہ کی تربیت پر جو اس کالج کا اصلی مقصود ہے ویسا برکز نہیں پڑ سکتا جیسا انگریز پروفیسر کا پڑ سکتا ہے۔ ٹیوٹی کا خیال وقت کی قدر، قواعد حفظ صحت کی پابندی، سیلف ڈسپلین

مستعدی اور ریاضت جسمانی کی عادت بہ تمام خصلتیں یورپ میں بھی انگلش قوم کی خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں، خصوصاً انگلستان کی مشہور یونیورسٹیوں کے گریجویٹ شریفانہ اخلاق کے لحاظ سے تمام قوم میں ممتاز گئے جاتے ہیں۔ اس کے سوا کالج کا نظم و نسق اور انسرانہ رعب و داب جیسا کہ ایک انگریز معلم کالج یا اسکول میں قائم رکھ سکتا ہے، ہندوستانی معلموں سے اس کی ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسی لیے کالج کے قواعد میں یہ اصول قرار دیا گیا ہے کہ کم سے کم ایک پرنسپل اور دو پروفیسر کالج میں اور ایک ہیڈ ماسٹر اسکول میں ہمیشہ یوروپین ہونا چاہیے اور جتنا کالج کی آمدنی میں گنجائش ہو اس تعداد میں اور اضافہ کیا جائے اور جب کسی یوروپین پروفیسر کی ضرورت ہو تو انگلستان کی کسی مشہور یونیورسٹی کا گریجویٹ جس کی علمی اور اخلاقی قضیات پر اس کے استادوں نے شہادت دی ہو ایک ہزار روپیہ سفر خرچہ دے کر بلایا جائے۔ چنانچہ اب تک چار چار پانچ پانچ یوروپین انٹر کالج اور اسکول ہیں بلا بر مقرر رہے ہیں اور اگر کالج فنڈ میں گنجائش ہو تو ممکن ہے کہ عند الضرورة ان کی تعداد اس سے زیادہ بڑھ جائے۔

اگرچہ بظاہر جو پیش قرار تنخواہیں یوروپین عہدہ داروں کو دیکھائی ہیں وہ کالج کی مالی حیثیت سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حق یہ ہے کہ یوروپین اسٹاٹ نے عام طور پر اس ضرورت کو بخوبی ثابت کر دیا ہے جس کی بنا پر سرسید نے ان کالج کا جزو اعظم قرار دیا ہے۔ وہ باوجود قومی مذہبی اور ملکی مغایرات کے محمدان کالج کو گویا اپنا قومی انسٹیٹیوشن سمجھتے ہیں وہ اپنے علیہ کے ساتھ مشفقانہ اور برادرانہ برتاؤ رکھتے ہیں، ان کی دعوتوں اور پارٹیوں میں ان کی مجلسوں میں اور ان کے مباحثوں میں خود بھی شریک

ہوتے ہیں۔ اور اسٹیشن کے یوروپین مسدوں اور اُن کی لیڈیوں کو شریک کر کے ہیں اور اُن کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ گورنمنٹ اور انگریزوں کی نظر میں اُن کا اعتبار زیادہ ہو، اُن کو گورنمنٹ کا ادب اور انگریزوں کی محبت سکھاتے ہیں۔ خود اُن کا بڑا ذوق ہندوستانی طالب علموں کے ساتھ ہے انگلش نیشن کی محبت اور وقعت اُن کے دل میں پیدا کرتا ہے۔ وہ طرح طرح سے اُن کو غیرت دلاتے ہیں اور اُن کی غفلت کے نتائج سے اُن کو خبردار کرتے ہیں۔ وہ اپنی عمدہ خصلتوں، شانستہ عادتوں، فرائض کی پابندی، صفائی ضبط اوقات اور دیگر خوبیوں سے طالب علموں کے کیرئیر پر نہایت قوی اور پائیدار اثر پیدا کر دیتے ہیں جو کسی اور طریقہ سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا وہ غریب طالب علموں کی طرح طرح سے امداد اور تقویت کرتے ہیں، بیماری کی خبر لیتے ہیں، کالج کے چندوں میں شریک ہوتے ہیں، اس کی ترقی کی تدبیریں سوچتے ہیں، اس کی محبت طالب علموں کے دل میں پیدا کرتے ہیں اور اس میں وہ تمام انتظامات اور تربیت کے طریقے جو انگلستان کے کالجوں میں جاری ہیں آج کل آہستہ آہستہ جاری کرنے جاتے ہیں وہ باوجود مذہبی اختلاف کے مسلمان لوگوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا خیال خود مسلمانوں سے زیادہ رکھتے ہیں مسجد کی غیر حاضری پر اُن کو سزا دی دیتے ہیں، مذہبی تعلیم اور قرآن خوانی کی اُن کا ہم کبہ کرتے ہیں، مولود کی مجلسوں اور اُن کے دیگر مذہبی اجتماعوں میں شریک ہوتے ہیں ایک بڑا بڑا یہی ثبوت اس بات کا کہ وہ محمدؐ کالج میں کس وقعت اور محبت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، یہ ہے کہ مسٹر آرنلڈ پروفیسر آف لاسفی جو کالج کی بہ قسمتی سے یہاں کا تعلق ترک کر کے لاہور کالج میں چلے گئے ہیں اُن کی روانگی کے زمانہ میں ہر شخص کو جو کالج سے تعلق رکھتا تھا اس قدر افسوس ہوا تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا خصوصاً کالج کلاسوں کے طالب علم جو اُن کا کچھ

سنتے تھے اُن کو مسٹر آرنلڈ کی اور مسٹر آرنلڈ کو ان کی جہاں کا جس قدر رنج اور
 قلق ہوا تھا اُس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان سے پہلے جب مسٹر والس پروفیسر
 اور مسٹر بورسٹ ہیڈ ماسٹر نے کالج سے قطع تعلق کیا تھا اس وقت بھی تمام
 کالج کو اسی کے قریب قریب رنج ہوا تھا جیسا کہ اس سال مسٹر آرنلڈ کے
 جلنے سے ہوا اور اسی طرح مسٹر ڈنٹن مرحوم ہیڈ ماسٹر کے قبل از وقت مرجانے
 پر کالج کے تمام متعلقین نے مثل اپنے عزیزوں کے رنج و ماتم کیا ہے۔ اگرچہ
 یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کالج کو ہمیشہ ایسے ہی دلسوز اور مسلمانوں کے ہمدرد
 پروفیسر ملتے رہیں گے جن کا ذکر اوپر ہوا یا جیسے کہ اب کالج میں موجود ہیں
 لیکن بہر حال یورپین اسٹاٹ کا اس کالج میں ہونا خاص کر مسلمانوں کی حالت
 کے لحاظ سے نہایت ضروری ہے۔

غدر ۱۹۴۷ء سے۔ بکر اس وقت سے جبکہ ہندوستان کی سلطنت مسلمانوں
 کے ہاتھ نکل کر انگلش قوم کے ہاتھ میں گئی، ہندوستان کے مسلمانوں کا حاصل
 بعینہ ایک نوجوان بیوہ کا سارہا ہے کہ کیسی ہی عقیقہ اور پاک دامن ہو مگر
 بدگمانیوں سے کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں کو جس
 طرح اپنے مذہب کی رو سے اس بات کی ضرورت ہے کہ بچے دل سے
 انگلش گورنمنٹ کے وفادار ہیں۔ اسی طرح ملکی مصلحت سے یہ بھی ضرور
 ہے کہ حکمران قوم کو کبھی اپنی طرف سے بدگمان ہونے کا موقع نہ دیں۔ آج
 کل انگریزی تعلیم سے انگریزوں میں تفریباً ویسی ہی بدگمانی پائی جاتی ہے جیسی
 کسی زمانہ میں جہالت اور تعصب سے پائی جاتی تھی۔ پس ایک ایسا ہوں
 انسٹیٹیوشن جہاں چار چار سو مسلمان ایک وقت میں انگریزی تعلیم پاتے ہیں
 اور کئی کئی برس تک دن رات وہیں زندگی بسر کرتے ہوں، جب تک

کہ اُس میں متعدد یورپین افسران کے نگران اور اُن کے خیالات کی اصلاح کرنے والے موجود نہ ہوں حکمران قوم کے اطمینان کے لائق نہیں ہو سکتا۔ انھیں خیالات سے سرسید نے کم سے کم چار یورپین افسروں کا ہمیشہ کالج اور اسکول میں رہنا کالج کے قواعد میں داخل کر دیا ہے اور اس تدبیر سے کالج کو بہت فائدہ پہنچا ہے اور اس سے بہت زیادہ فائدے پہنچنے کی آئندہ توقع ہے۔ زیادہ تر اسی خصوصیت کی وجہ سے گورنمنٹ ہند ہزار چھ سو روپیہ سالانہ کی امداد اس کالج میں دیتی ہے اور اسی سبب سے تمام اینگلو انڈین افسر اور حکام عموماً اس کالج کی نسبت عمدہ خیال رکھتے ہیں، دورے سے نابالغ سردار زادوں اور رئیس زادوں کو تعلیم کے لیے یہاں بھیجتے ہیں ہر صوبہ میں یہاں کے طالب علموں کو خوشی سے نوکریاں دیتے ہیں۔ بعض اوقات پرنسپل سے خود درخواست کر کے یہاں کے طلبہ کو نوکری کے لیے بلاتے ہیں، بڑے بڑے جلیل القدر انگریز کالج کو آ کر دیکھتے ہیں، چار وائسرائے اور چھ سات لفٹنٹ گورنر اب تک یہاں آچکے ہیں۔ ہارڈ ناٹھ برادک نے دس ہزار روپیہ اسکارشپوں کے لیے اس کالج کو عنایت کیا ہے اور اُن کے سوانحی و ایسراڈن اور لفٹنٹ گورنروں نے اس میں چہندہ یا تحفے دیئے ہیں خصوصاً سرسید کی وفات کے بعد جو خاص توجہ اور سرمایہ سرپرستی حضور لارڈ ایلگن اور آئریل مسٹر لاٹوش اور خاص کر سرانٹونی مکڈانیلے کالج کی نسبت ظاہر فرمائی ہے اس کی شکر گزاری سے ہندوستان کے تمام مسلمان عموماً اور متقدمان کالج خصوصاً کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے اور کچھ شک نہیں کہ یہ تمام اقبالیات زیادہ تر یورپین اسٹاٹ اور خاص کر مسٹر تھیوڈور بک پرنسپل کالج کی بدولت اس انسٹیٹیوشن کو حاصل

ہونے ہیں۔ انہیں وجوہات سے سرسید کالج کی جگہ کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں جانی نہیں چاہتے تھے جس سے یورپین اسٹاٹ کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ رکھنے کی جیسا کہ وہ خود ان کے ساتھ رکھتے تھے، توقع نہ ہو۔

کالج کی نسبت مدبران سلطنت کی راتیں

جو راتیں اور خیالات محمدن کالج یا اس کے طلبہ اور اس کے بانی کی نسبت مدبران سلطنت نے وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں یا تقریروں میں ظاہر کیے ہیں ان میں سے کچھ فقرے انتخاب کر کے ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

سرجان اسٹریچی

۱۸۸۰ء میں سرجان اسٹریچی نے اس ایڈیٹس کے جواب میں جو ہندوستان سے جاتے وقت ان کو کالج میں دیا گیا تھا کہا کہ ”سب سے بڑا اور اخیر کام جس میں انہوں نے یعنی سید احمد خاں نے اپنی زندگی اور اپنے تمام وسائل کو صرف کیا ہے یعنی اپنے ہم وطنوں کی تعلیم اور ان کی حالت کو ترقی دینے اور مسلمانوں اور گریزوں کے درمیان زیادہ تر اتحاد اور ہم روی پیدا کرنے کا وہ کام ہے جس کے بعض نتیجوں کو ہم مشاہدہ کر رہے ہیں مجھ کو کچھ شبہ نہیں کہ یہ نتیجے آئندہ زمانہ میں اور بھی زیادہ عجیب و غریب ہوں گے لیکن اب بھی میں اس کالج کی ترقی کو شمالی ہندوستان کی پچھلی توارینج کے نہایت عظیم اور دلچسپ واقعات میں سے تصور کرتا ہوں۔“

پھر صاحب ممدوح نے اپنی کتاب ”انڈیا“ میں اول ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ کا یہ فقرہ جو محمدن کالج کے متعلق ہے نقل کیا ہے کہ ”بعض

اقتدار سے یہ کالج ہندوستان میں سب انسٹیٹیوشنوں سے اعلیٰ درجہ کا انسٹیٹیوشن ہے جو تعلیمی اور ملکی دونوں حیثیتوں سے بڑی عظمت اور وقعت کا وعدہ کرتا ہے۔ انگریزی حکومت کے آغاز سے لے کر اب تک مسلمانوں کی ذاتی کوشش کا یہ پہلا اظہار ہے۔ علیگر ٹھہ کی جماعت نے ایک مثال پیدا کی ہے جس کی اگر اچھی طرح سے پیروی کی جائے تو قومی تعلیم کا مسئلہ حل کر دے گی۔ ان لوگوں کی جنہوں نے ایسی دوسری سے محنت کی ہے اور اس بدترقہ کی جو سرکار کو تسلیم اور ترقی کے کام میں ملا ہے جہاں تک قدر و منزلت کی جائے نامناسب نہ ہوگی۔ اس کے بعد وہ اپنی کتاب "انڈیا" میں اہل انگلستان سے محمدن کالج کی سفارش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "انھیں (یعنی اہل انگلستان کو) اپنی مدد سید احمد خان کے کالج کے واسطے بھیجی چاہیے۔ ان کو اس سے زیادہ طمانیت بخش موقع نیک کرنے کا نہیں ملے گا۔"

ڈاکٹر بہتر

ڈاکٹر بہتر نے ۱۸۸۲ء میں جبکہ وہ ایجوکیشن کمیشن کے پریسڈنٹ تھے اصلاح شمال مغرب کے دورہ کے وقت صرف محمدن کالج کی عظمت و شان کے لحاظ سے کمیشن کا پہلا اجلاس علیگر ٹھہ میں کیا اور اپنی اخیر اسپچ جو ایجوکیشن کے باب میں تھی وہ کالج کے بڑے ہال میں آکر کی اور کالج کی نسبت کہا تھا جو یہ کالج جس میں ہم جمع ہوئے ہیں، چونکہ یہ ایک نہایت عظیم اور شریف کوشش کا نتیجہ ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے کی گئی ہے اس کمیشن کا پہلا اجلاس جو اصلاح شمال مغرب میں ہونا چاہیے تھا علیگر ٹھہ میں تجویز ہوا ہے ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری موجودگی اور اس مقام پر آنا اس سیلف ہیلپ

کی عظیم انسان مثال کی خوبی کا ایک ثبوت خیال کیا جائے گا۔ اگر ایسی ہی چند مثالیں سیلف ہیڈپ کی اور ہوں تو ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کی ضرورت نہ رہے گی۔ پھر کہا کہ ”یہ ایک نہایت شریف کام ہے جو کسی فانی انسان کے ہاتھوں سے دنیا کے پردہ پر ہوا ہو اور یہ میرے پاس موجود ہے وہ بہادر اور فیاض دل شخص جس نے میں برہمن کی پڑھیں اور پڑا استقلال کو ششوں سے اس کام کو انجام دیا ہے۔“ پھر کہا کہ ”پہلے دس برسوں میں میرے دوست سید کو اکثر مایوسیوں کا منہ دیکھنا پڑا اور اس کے اختیار کیے ہوئے کام میں بہت کم ترقی ہوئی۔ اس کو اپنے بعض خیالات چھوڑ کر نئی تجویزیں اختیار کرنی پڑیں اور لوگوں کی مخالفت اور ناراضی اور اپنے پرانے دوستوں کی سرد مہری اور جاہل دشمنوں کی پر ضرر شورش نہایت تحمل سے برداشت کرنی پڑی مگر اس نے ایک لمحہ کے واسطے ہمت نہ ہاری۔ رفتہ رفتہ مگر مضبوطی سے اس کے مقصد نے ترقی پائی۔ لوگوں نے اس پر اعتماد کیا کیونکہ وہ اپنے کام پر اعتماد رکھتا تھا۔“

سرایفروڈ لائل

سرایفروڈ لائل نے اس کالج کی نسبت کہا کہ ”اس نظیر کے قائم کرنے سے کالج کے بانیوں نے گورنمنٹ اور علایا اور علی العموم ہندوستان کی تعلیم کے حق میں ایک عمدہ خدمت کی ہے۔ کیونکہ وہ ہم کو ایک ایسے مسئلہ کے حل کرنے میں مدد دے رہے ہیں جو اب تک شاید ہی دنیا کے کسی حصہ میں خاطر خواہ طور پر حل ہوا ہو۔“

مسٹر آکلنڈ کالون

مسٹر آکلنڈ کالون نے محمدن کالج کے طالب علموں کی نسبت کہا کہ جو شخص ان نوجوان آدمیوں سے واقف ہے جو اس کالج سے پاس ہو کر نکلتے ہیں وہ غالباً اس امر میں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی علامتیں ایسی ہی صاف صاف ظاہر کرتے ہیں جیسی کہ انگلستان میں ہمارے پاک اسکولوں اور ہماری یونیورسٹی کے گریجویٹ ظاہر کرتے ہیں۔ علیگرہ کالج کا طالب علم دنیا مانہ خیالات اور ترقی یافتہ تعلیم و تربیت اور آزادانہ مصلحت رکھنے والا شخص خیال کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ ہندوستانیوں کے اس فرقہ کا ایک نمونہ ہو گیا ہے جو انگریزوں کی خواہش کی بخوبی داد دینے کے واسطے کوشش کرتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی چاہتا ہے کہ ہم بھی ان کی خواہشوں کی اسی طرح داد دیں۔

مسٹر کین ممبر پارلیمنٹ

مسٹر کین جو پارلیمنٹ کے ایک نامور اور اپنی نوع کے خیر خواہ ممبر ہیں اور جو پچھلے برسوں میں شراب اور سکرات کے استعمال کے خلاف ہندوستان میں کچھ دینے اور اصلی حالات تحقیق کرنے کے لیے آئے تھے، انھوں نے سفر ہندوستان کے متعلق ایک کتاب موسوم بہ کچھ رسک انڈیا لکھی ہے جس کے ایک باب میں علیگرہ کالج کی نسبت نہایت عمدہ اور مفصل خیالات ظاہر کیے ہیں ان میں سے ہم چند فقرہوں کا خلاصہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ”محمدن ایگور اوٹیل کالج دوسرے کالجوں سے اس بات میں امتیاز رکھتا ہے کہ وہ ایک خاص تعلیمی جوش کی نسبت زیادہ تر ایک پرمکمل جوش

پھیلانے والا ہے۔ اسی فیدنگ کا یعنی اس بات کا کہ قومی بہبودی اسی اصول پر منحصر ہے جس کا وہ پابند ہے، یہ نتیجہ ہے کہ اُس کی بڑی امداد کی گئی ہے۔ نہ صرف مسلمانوں کا ترقی یافتہ کردہ بلکہ گورنمنٹ انگریزی بھی نہایت توجہ اور شوق سے اُس کی جانب نظر رکھتی ہے۔ دوسری جگہ وہ کہتے ہیں کہ "گورنمنٹ کالجوں سے یہ کالج دو خاص باتوں میں مختلف ہے۔ اول تو اس میں مسلمان طالب علموں کی مذہبی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ اذان کی آواز سن کر طالب علم اسی وسیع احاطہ کی تمام اطراف سے اپنے آبا و اجداد کے عقیدہ کے موافق عبارت کرنے کیلئے مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں، نماز کے علاوہ قرآن اور دینیات اور اخلاق کی کتابوں کا پڑھنا کالج کے سلسلہ خواندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس سے اس پر کیجاتی ہے کہ جو طالب علم اس کالج سے نکلیں گے وہ قدیم خیالات پر نئے علوم کا پیوند لگا دیں گے اور اُس کے ذریعہ سے پُرانے خیالات کے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں گے کہ وہ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلیں اور جو طریقہ قوم کو اس کی ذلیل حالت سے نجات دینے کا موجود ہے اس کو اختیار کریں۔ دوسرا اصول جس میں یہ کالج سرکاری مدارس سے ممتاز ہے یہ ہے کہ اس میں سچلانت سرکاری مدارس کے صرف عقلی تعلیم ہی پر توجہ نہیں کیجاتی، بلکہ وہ اہمیت ان کی یونیورسٹیوں کے نمونہ پر قائم کیا گیا ہے۔ سب طالب علم ایک احاطہ میں رہتے ہیں، ایک جگہ کھانا کھاتے ہیں اور ایک صحت بخش کالج لائف سے خط اٹھاتے ہیں کسی ملک میں ایک ایسے انسٹیٹوشن کا پایا جانا مشکل ہے جو اس کالج کی یہ نسبت زیادہ تر زیر دست جوش باہمی اتحاد کا پیدا کرتا ہو۔ قوم کی امیدیں اس انسٹیٹوشن کی کامیابی کے ساتھ وابستہ ہیں اور یہ ایک بڑی کوشش ہے جو ترقی اور اصلاح کے باب میں ایسی قوم نے کی ہے جس میں تقدیر پر بھروسہ کرنے کے عقیدہ نے تمام جہتیں اور ارادے پست

کر رہے ہیں۔ پھر کرکٹ کلب کے منتقل کھتے ہیں کہ "کالج کی ایک ٹیم تمام اسپر
 انڈیا میں ہندوستانی ٹیموں سے گونے بہت یجاتی ہے اور اسٹیشن کی نہایت
 عمدہ ایونوں کا مقابلہ کرتی ہے" پھر یونین کلب وغیرہ کی نسبت لکھتے ہیں
 کہ "ڈبلیگ سوسائٹی جو کیمبرج یونین کلب کے نوٹہ پرنٹائم کی گئی ہے لڑکوں
 کو جلسہ عام میں گفتگو کرنے اور انگریزی طریقہ پر کاروبار انجام دینے کا سبق دیتی
 ہے کالج کی دعوتوں اور جلسوں، مذہبی تہواروں، شاعرانہ صحبتوں، کرکٹ،
 فٹ بال اور جسمانی ورزشوں کے باعث نوجوان مسلمانوں کو اپنی زندگی کے
 مختلف طریقوں میں دل بہلانے کے لیے مدد ملتی ہے اور ان کی مختلف
 لیائٹیں ظاہر ہوتی ہیں۔ علموں اور طالب علموں میں کسی قسم کا تفرقہ جو قومی
 اختلاف سے پیدا ہوتا ہے مطلق نہیں ہے۔ علیگڑھ میں انگریزوں اور
 ہندوستانیوں کے درمیان جو صفائی قلب اور ولی میل جول دیکھا جاتا ہے،
 ویسا شاذ و نادر ہی ہندوستان میں کہیں اور دیکھا جاتا ہے، اسٹیشن کے انگریز
 جٹلمین اور لیسٹریاں کالج کے طالب علموں کی پنج پر دعوت کرنے ہیں
 اور کالج کے ہال میں ان کے ساتھ دعوتوں میں شریک ہوتے ہیں، اس طرح
 پر محبت کی فیملنگ کی ایک ایسی بنیاد قائم کی گئی ہے کہ اگر اس کو ترقی ہو
 جائے تو وہ ہندوستان کے باطنیوں اور انگریزی حکومت دونوں کے
 حق میں بیشمار فائدوں کا باعث ہوگی ایسے موقعوں پر معزز بزرگ سید نے
 اکثر اوقات پُر جوش سرگرمی کے ساتھ اپنی یہ دلی آرزو ظاہر کی ہے کہ انگریز
 اور مسلمان سچے دوست ہو جائیں اور ایک دوسرے کے اتفاق سے کام
 کیا کریں اور انھیں موقعوں پر اس نے کالج کے اس نشان کی طرف اشارہ
 کیا ہے جس میں بلال پر ایک صلیب لگی ہوئی ہے۔"

سرایٹونی مکڈانل

سرایٹونی مکڈانل نے جو ۱۹۱۶ء میں ٹرسٹیان کالج کی ایڈریس کا جواب دیا تھا اس میں انھوں نے کالج کا ذکر کرتے وقت فرمایا "ایک بڑے شاعر کا قول ہے کہ صلح کی فتوحات ٹرائی کی فتوحات کی نسبت کچھ کم نہیں ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں ہمارے عہد کی مصالحت آمیز فتوحات میں اس کالج کا قائم ہونا یقیناً ایک فتح ہے جس سے سب کے دلوں کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور کسی کے دل کو تکلیف یا رنج نہیں پہنچتا۔ یہ ایک ایسی فتح ہے جس کی رونق روزِ زمانہ کی وجہ سے کم نہیں ہو سکتی۔" پھر فرمایا کہ "میں اس انسٹیٹیوشن کو نہایت عزت کے لائق سمجھتا ہوں جس طرح پر کہ میں کسی شخص کو پسند کرتا ہوں اس طرح پر میں اس انسٹیٹیوشن کو پسند کرتا ہوں جو آپ اپنے اوپر بھروسہ رکھتا ہو اور فخر یہ طور پر آزاد ہوا ساسی کے ساتھ گورنمنٹ کی لیاضمانہ مہربانی کی راجسی طور پر قدر کرتا ہو۔" پھر اسپینچ کے خاتمہ پر یہ الفاظ کہے اس بات کی امید کرنا کچھ مبالغہ نہیں کہ یہ کالج ترقی پزیر آئندہ مسلمانوں کی بڑی مددگار ہو جائیگا اور یہ مقام شرق کا قریب ہو جائیگا۔

لارڈ ایلگن نے نومبر ۱۹۱۶ء میں جبکہ سرحد پر سرکاری فوج آفریدیوں سے لڑ رہی تھی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی نسبت انٹیگلو ایٹھ بن اخبارات حکمران گروہ میں ہر گمانی پھیلا رہے تھے، محمدن کالج میں آنے کی خود خواہش ظاہر کی اور جوابدہ ایس ٹرسٹیان کالج کی طرف سے ان کی خدمت میں پیش کی گئی اس کے جواب میں انھوں نے اس وقت جبکہ کالج کے تمام طالب علم ان کے سامنے حاضر تھے یہ فرمایا "صاحب کوئی وقت ایسا نہیں ہے جبکہ اس قسم کا مجمع میری طبیعت کو اس قدر خوش معلوم ہو سکے جیسا کہ یہ معلوم ہوتا ہے پچھلے چند

مہینوں میں اور اس وقت گورنمنٹ ہند بالکل اپنی خواہش کے برخلاف
 اُن قوموں کے ساتھ جو تمہارے ہم مذہب ہیں۔ علانیہ لڑنے پر مجبور
 ہوتی ہے اور ایسے شخصوں کی کچھ کمی نہیں ہے جنہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ
 ہندوستان میں انگریزی حکومت اور اُن کی مسلمان رعایا کے درمیان
 مخالفت روز بروز ترقی ہے۔ صاحبان قابل امنوں ہنگاموں میں ہم
 بے پھر اُن بات کو دیکھا ہے کہ جو ہم اکثر اوقات سابق میں دیکھ چکے ہیں۔
 یعنی حضور مکہ معظمہ کی نسبت مسلمان رعایا کی غیر خواہی اور ہواہمی کو اور میں
 اس جگہ پر ایک زیادہ تر پر امن موقع پر اس بات کو تسلیم کرنے اور معلوم
 ہونے سے خوش ہوں کہ اس کالج کے اندر پرائمن صورتوں میں خیر خواہی اور
 وفاداری کا وہی جوش ترقی پر ہے جیسا کہ میدان جنگ میں ظاہر کیا گیا ہے۔
 یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے عمدہ خیالات مدبران سلطنت
 انگلیش اس کالج کی موجودہ حالت دیکھ کر وقتاً فوقتاً ظاہر کرتے رہتے ہیں
 اور کچھ شبہ نہیں کہ ایک تعلیمی انسٹیٹیوشن کی مددگی پر ان لوگوں کی شہادت
 سے بہتر کسی کی شہادت نہیں ہو سکتی۔

یہ ہے سید احمد خاں کی زندگی کا وہ کارنامہ جس کی اگرچہ مسلمانوں نے
 عام طور پر اب تک کچھ قدر نہیں کی لیکن یوہپ کے نامور اخبار نامزدات لندن
 نے گذشتہ اپریل میں اسی کارنامہ پر سرسید کی نسبت لکھا تھا کہ ”اس
 شخص کو ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں تعلیم کا پرفٹ کہا جائے تو سجا
 ہے۔“ اگرچہ اس عظیم الشان کام کی ابتداءئی شکلات اُس مرحوم کی جانفشانی اور
 استقلال سے تقریباً بالکل مل رہی ہیں، مذہبی مخالفتوں اور بدگمانیوں کا
 طوفان فرد ہو گیا ہے کالج کی سالانہ آمدنی اور خرچ کی نسبت پون لاکھ کے

قریب پہنچ گئی ہے۔ عمارتیں جس اعلیٰ اور وسیع پیمانے پر بنائی منظور نہیں مگر ابھی ان کی تکمیل نہیں ہوئی مگر قوم کی تھوڑی سی توجہ سے پوری ہو سکتی ہے یونین اور میٹرو اسٹاف توقع سے زیادہ عمدہ اور قابل اطمینان بہم پہنچ گیا ہے۔ یونیورسٹی کے نتائج امتحان کالج اور اسکول کی وقعت اور اعتبار لوگوں کی نظر میں روز بروز زیادہ کرتے جاتے ہیں، بورڈنگ ہاؤس ایک بے نظیر نمونہ پر جیسا کہ کبھی ہندوستان میں نہیں دیکھا گیا تھا طلبہ کی تربیت کے لیے قائم ہو گیا ہے مذہبی تعلیم و تربیت کا سامان بھی جہاں تک کہ منتظمان کالج کی قدرت میں تھا مہیا کیا گیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ گورنمنٹ نے اس کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی ہے، مگر درحقیقت اس کا تھا مٹا اس کی اصلاح کرنا اور اس کو ترقی دینا قوم کا اور صرف قوم ہی کا کام ہے، اگرچہ سرسید کی زندگی میں تو لوگ قوم کی طرف سے بالکل مایوس تھے اور سمجھتے تھے کہ اعلیٰ انھیں بند ہوتے ہی کالج کی حالت و گرگوں ہو جائے گی مگر خدا کا شکر ہے کہ سرسید کے بعد مسلمانوں نے بالکل غلات توقع اور غلات امید کالج کی طرف توجہ ظاہر کی ہے کہ بقول ایک نظریہ کے اگر سرسید کو یہ خبر ہوتی کہ میرے بعد لوگ ایسی سرگرمی ظاہر کریں گے تو وہ بن آئی موت مری جاتے۔

ترقی تعلیم کی دیگر تدبیریں

سرسید نے ترقی تعلیم کی غرض سے صرف محمدن کالج قائم کرنے اور اس میں تعلیم و تربیت کا سامان کا مہیا کرنے ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ یونیورسٹی کے طریقہ تعلیم کی اصلاح اور ہائی ایجوکیشن کی ضرورت پر وہ اخیر دم تک اپنی تحریروں اور اسپیچوں میں براہِ روز دیتے رہے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں

کے نظام تعلیم کو وہ ہمیشہ ہندوستان کے حق میں غیر منفید خیال کرتے تھے اور جب سے لکس میں یہ خیال پھیل گیا تھا کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن سو قوت کرنا چاہتی ہے اُن کو سخت اندیشہ ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے جو ممبر تعلیم کے وسائل مہیا کیے گئے ہیں، کہیں یہ تمام کوششیں برباد نہ ہو جائیں اور سرحد اُن ہی اوے نہ پڑ جائیں۔ اس لیے وہ ہمیشہ یونیورسٹیوں کے نظام پر نکتہ چینی کرتے تھے اور جب کبھی اُن کو گورنمنٹ کے تہور ہائی ایجوکیشن کے برخلاف معلوم ہوئے انھوں نے فوراً اُس کی حمایت پر قلم اٹھایا اور نہایت دلیری اور سہے باکی سے اس پالیسی کی تغلیط کی۔ ۱۸۸۳ء میں انھوں نے ایجوکیشن کمیشن میں شہادت دیتے وقت یونیورسٹی کے قواعد پر خوب دل کھول کر اعتراض کیے اس کے سوا ہمیشہ بذریعہ تحریر اور تقریر کے یونیورسٹی کے نقص اور مستقیم طابہر کرتے رہے۔

ہائی ایجوکیشن کی حمایت

ہائی ایجوکیشن کے متعلق انھوں نے کمیشن کو آگاہ کیا کہ لوگوں میں عموماً یہ خیال پھیل گیا ہے کہ گورنمنٹ ہائی ایجوکیشن بند کرنا چاہتی ہے پس اگر گورنمنٹ کوئی کالج توڑے گی خواہ اُس کے توڑنے کی کیسی ہی معقول وجوہات ہوں لوگ یہی سمجھیں گے کہ سرکار ہم کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے محروم رکھنا چاہتی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت

اس سے پہلے ۱۸۸۱ء میں جس شد و مد کے ساتھ انھوں نے اسی بنا پر پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی وہ اکثر لوگوں کو یاد ہوگی۔ اس مخالفت کی بنیاد

یہ تھی کہ اول لارڈ لٹن نے پنجاب کے بعض مقامات میں جو اسپتالیں کیں ان سے مشرقی علوم کی ترقی و تشریح کی ہوا تھی۔ اس کے بعد جو ایڈریس اہل پنجاب نے لارڈ رین کی حضور میں گزارنے اور جو جواب حضور ممدوح نے ان پر دیے ان سے یہ احتمال قوی ہو گیا کہ اگر پنجاب یونیورسٹی کالج کو یونیورسٹی کے اختیارات مل گئے تو پنجاب میں ہائی ایجوکیشن کا نام و نشان باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ ہذا کلسنس کے جواب میں یہ الفاظ موجود تھے کہ "ترقی و اشاعت زبانہائے مشرق و علوم مشرقی نہایت ہی کا راجح ہے۔ اور جہاں میری محدود واقفیت معاملات ہندوستان میں ہے میں ان خیالات سے اتفاق رکھتا ہوں جو میرے نزدیک آپ لوگ رکھتے ہیں کہ اس ملک میں صرف زبانہائے دیسی کے توسل سے علوم و فنون کی ترقی و اشاعت بہترین ہو سکتی ہے۔" اور جس ایڈریس کے جواب میں ہذا کلسنس نے یہ ارشاد فرمایا تھا اس میں صاف لکھا تھا کہ "ساتھ سے تین لاکھ روپیہ جو سرمایہ یونیورسٹی کالج ہے والیان ریاست ہماچل و دیگر ریاستوں نے پنجاب نے حاصل زبانہائے دیسی کی تکمیل سے تعلیم کو رواج دینے کی غرض سے عطا کیا تھا۔ سینٹ کو اس بارہ میں کچھ بھی شک نہیں کہ علم کو زبانہائے دیسی کے توسل سے ترقی دینا تقسیم کی ضروریات کو ملک کے حال بنانے کا بہترین طریقہ ہے اور سینٹ اور گورنمنٹ ہند کا بھی یہی مقصد ہے۔"

جب یہ ایڈریس اور اس کا جواب شائع ہوا اور سرسید کی نظر سے گزرا تو ان کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا اور جیسا کہ ان کی طرز تحریر سے پایا جاتا ہے عنانِ صبر ان کے ہاتھ سے جاتی رہی انھوں نے حد سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ پے در پے تین آرٹیکل پنجاب یونیورسٹی کے خلاف

لکھ کر شائع کیے جن کا تمام پنجاب میں نقل پڑ گیا تعلیم یافتہ گروہ نے جن میں زیادہ تر ہندو ایجوکٹڈ شامل تھے تینوں آرٹیکلوں کو ایک جگہ جمع کر کے چھپوا دیا اور تمام پنجاب میں ان کو عام طور پر شائع کر دیا جس سے پنجاب یونیورسٹی کے اکثر حامیوں کی رائیں بدل گئیں اور ڈاکٹر لائسنز جو مشرقی علوم اور ویسی زبانوں کے نہایت سرگرم حامی تھے اور پنجاب یونیورسٹی کو گویا دشمن یا اونیٹیل یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے انھوں نے سرسید کے آرٹیکلوں کا انگلیزی اور اردو دونوں ہی زبانوں میں جواب لکھ کر شہر کیا مگر اس عربی مثل کے موافق "قَدْ سَبَقَ الشَّيْطَانُ اَلْعَدْلَ" سرسید کی تحریریں اپنا کام کر چکی تھیں اور اس لیے اب ان کا جواب لکھنا اور ان کی تردید چھاپنی سب سے سودھھی، اگرچہ یہ تینوں آرٹیکل بہت جلد ہی اور یہاں ان کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن چونکہ یہ بھی سرسید کی علمی خدمات میں سے ایک خدمت ہے اور اس کی وقعت کا اندازہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ ان تحریروں میں سے کچھ فقرے بطور نمونہ کے ناظرین کو دکھائے جائیں اس لیے ہم تینوں آرٹیکلوں میں سے بعض بعض مقامات اس موقع پر نقل کرتے ہیں:

پہلے آرٹیکل کو جس کا عنوان "مشرقى علوم و فنون" ہے وہ اس طرح شروع کرتے ہیں: "ہم کو نہایت ہرشیاری سے دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ کیا جاتا ہے اس کا کیا جانا ہے کہ ہمارے اور ہمارے ملک کی بےبودی اور ترقی کے لیے ہے، ایسا نہ ہو کہ صرف دھوکا ہو، ہم کو اس وقت پچھلے زمانہ کے قصے اور کہانیوں کو یاد دلانا اور کہنا کہ ایشیا میں ایشیائی سلطنت کے زمانہ میں علوم و فنون کیا تھے اور ان

کے وقت میں اُن کو کیسی ترقی اور کیسی سرسبزی تھی محض سببہ فائدہ ہے۔ ہم کو اپنے زمانہ کے حالات پر جو گورنمنٹ انگلیٹیر کی حکومت کا زمانہ ہے، غور کرنا اور اس کو ہندوستان ہی کی حدود میں محدود رکھنا ہمارے لیے زیادہ مفید اور زیادہ نربکار آمد ہے۔“

اس کے بعد انھوں نے وہ مختلف طریقے جو ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق ابتدائے عملداروں سے اختیار کرتی رہی (یعنی اول ہندوستانیوں کی تعلیم کے فرض سے غافل رہنا، پھر ان میں علوم مشرقی کے رواج دینے میں کوشش کرنا اور آخر کار لارڈ مکالے کے اصرار سے اہل ہند کو یورپ کے علم و حکمت کی تعلیم دینا) بیان کیے ہیں پھر انھوں نے درمیان کرستہ کرنے کے بعد مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر کی جس کو پنجاب یونیورسٹی از سر نو زندہ کرنا چاہتی تھی، خوب قلمی کھول ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”ہم صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کو مشرقی علوم کی ترقی کے پھندے میں پھنسانا ہندوستانیوں کے ساتھ ٹیکلی کرنا نہیں ہے بلکہ دھوکے میں ڈالنا ہے۔ ہم لارڈ مکالے کو دوسرا دیتے ہیں کہ خدا اس کو بہشت نصیب کرے کہ اس نے اس دھوکے کی ٹٹی کو اٹھا دیا تھا، کیا وہ ٹٹی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر لگائی جاتی ہے؛ ایڈریس کے ساتھ (جو لارڈ پرن کو دیا گیا تھا) بڑے بڑے ہندوستانی سرداروں کا ہونا اور بہت بڑی فیاضی سے بڑے بڑے چندوں کا دیدینا مثل اسی فیاضی کے ہے جو ہمیشہ وہ اصلی مقصد سے نادانف رہ کر دیگر اسباب سے کیا کرتے ہیں۔ اُن کی شان و شوکت ایسے امر کی جو فی الحقیقہ کچھ وقت نہیں رکھتا، وقت نہیں بڑھا سکتی، چند عاقبت اندیش ہندوستانی شاید ان باتوں سے خوش ہوتے ہوں گے اور گورنمنٹ کا احسان مانتے ہوں گے، مگر وہ اندیش آدمی

ان تمام باتوں سے نہایت رنجیدہ ہوتے ہیں اور نہایت افسوس واپس
 سے گورنمنٹ کی اور اُن یورپین اعلیٰ درجہ کے حکام کی کارروائی کو جو اس میں شریک ہیں سمجھتے ہیں
 ہم نہایت سچائی سے اور گورنمنٹ کی دلی خیر خواہی سے بتانا چاہتے ہیں
 کہ سمجھا رہے ہیں اور دو اندیش ہندوستانی ان تمام کارروائیوں سے گورنمنٹ کی نسبت
 کیا خیال رکھتے ہیں: نہایت بد خیال اُن کے دل پیدا ہوتا ہے۔ چند سال
 گذرے (یعنی یونیورسٹیاں قائم ہونے سے پہلے جبکہ مشرقی علوم کی تعلیم پر زور
 دیا جاتا تھا) کہ اُن کو یقین کامل تھا کہ گورنمنٹ کو درحقیقت ہم کو واقعی تسلیم
 دینا منظور نہیں ہے اور وہ ہم کو اسی قدر تعلیم دینا چاہتی ہے جس قدر کہ اس کو
 ضرورت ہے۔ وہ ہم کو ایسا مرکب بنانا چاہتی ہے کہ اسباب لاؤ کر ایک
 جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دے۔ اس کو انتظام ملک اور انتظام دفتر کے لیے چند
 ایسی تیلیاں درکار ہیں جو انگریزی لکھ سکتی ہوں مگر سمجھ نہ سکتی ہوں جیسے کہ
 ماسخیر میں سوت کا تنے کے لیے تیلیوں کی ضرورت ہے۔ جو کچھ کہ وہ (یعنی
 گورنمنٹ) ہندوستان میں تعلیم کی نسبت کرتی تھی کوئی اس کا شکر گزار نہ
 تھا اس لیے کہ اُس کو خود غرضی پر محمول کیا جاتا تھا۔ رعایا پروری پر۔“

”کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا (یعنی جب کہ ہندوستان میں کلکتہ بمبئی اور
 مدارس یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں) کہ ہندوستانیوں میں سے یہ خیال دور ہوا
 تھا اور ہندوستانی یہ یقین کرتے تھے کہ گورنمنٹ نے اپنی پالیسی بدل دی
 ہے اور درحقیقت اُسکو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینا اور ہندوستانیوں کو انھیں کے فائدہ کیلئے تعلیم دینا مقصود
 ہے۔ مگر ہندوستانی خوب سمجھتے ہیں کہ تھوڑے دنوں سے بعض مدبران
 سلطنت کی پالیسی پھر بدل ہے اور ہندوستانیوں کو اب اعلیٰ درجہ کی حقیقی
 تعلیم دینا وہ مناسب نہیں سمجھتی۔ اُن کو (یعنی ہندوستانیوں کو) اب تک یقین

نہیں ہے کہ یہ پالیسی درحقیقت مستحکم ہو گئی ہے اور اس پر عمل کرنا فی الواقع
 قرار ہوا چکا ہے۔ مگر ایسے واقعات جو پیش آتے جاتے ہیں، جیسے کہ حصہ
 عالی لارڈ لٹن کے وقت میں انڈین سول سروس کے قواعد قرار پانے اور جیسے
 کہ جناب ممدوح نے بعض اسپیشوں میں علوم مشرقی کی ترقی کی ترغیب
 دی، یا جیسے کہ یہ حال میں واقعہ پنجاب یونیورسٹی کالج کو کامل یونیورسٹی بنانے
 کی درخواست کے وقت پیش آیا، اور اندیشہ ہندوستانیوں کو نہایت
 تردد میں ڈالتا ہے اور وہ خوف زدہ ہو کر خیال کرتے ہیں کہ شاید وہ پالیسی
 مستحکم ہو گئی ہے اور وہی دھوکے کی ٹٹی پھر ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑی
 کیجاتی ہے جس کو ہمارے محسن لارڈ مکالے نے اپنی نہایت سچی تحریروں
 اور زبردست باتوں سے اٹھایا تھا۔ ہم نے کوئی مجلس لائق ہندوستانیوں
 کی ایسی نہیں پائی جس میں ان خیالات کی روش بردہ ترقی نہ ہوتی ہو۔ ہمارا
 دلی مقصد ہے کہ ہم اصلی حال ان ہندوستانیوں کی فیلنگ کا جن کی فیلنگ
 درحقیقت قدر خود کے لائق ہے گورنمنٹ سے مخفی نہ رکھیں اور اس
 میں کوشش کریں کہ گورنمنٹ ایسی جماعت کی باتوں سے جن کے ظاہری
 بدن زدہ و جواہر سے جگمگاتے ہیں اور جن کے تمام کام درحقیقت دیگر
 اسباب پر مبنی ہیں، نہ واقعی واقعات پر، دھوکے میں نہ آوے۔

دوسرے آرٹیکل میں جس کا عنوان "دریکٹر یعنی ہماری زبان" ہے۔
 انھوں نے اول ان مشکلات کو بیان کیا ہے جو مغربی علوم کو ویسی زبانوں
 میں ترجمہ کر کے شایع کرنے میں پیش آتی رہیں اور ایٹ انڈیا کمپنی

کا کلکتہ میں ایک سوسائٹی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لیے قائم کرنا، پھر دہلی کالج میں بہت سی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونا اور پھر اسی مقصد کے لیے سائنٹفک سوسائٹی علیگرہ کا قائم ہونا اور تینوں جگہ ناکامی کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہ ہونا نہایت عمدگی سے ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھنے ہیں کہ ”جب غیر قوم یعنی مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کیا تو میاں کے باشندوں میں سے وہی لوگ برسرِ عرصہ اور حکومت میں شریک ہوئے جنہوں نے اُن کے علوم، اُن کی زبان، اُن کے خیالات، اُن کا سامان، ان کا سائب و لہجہ اور اُن کی سی روش اختیار کی۔ ہندوستان میں اس خیال کا پید ا کرنا کہ ہم مشرقی علوم، ویسی زبان اور ویسی علوم کو ترقی دے کر عزت و دولت و حشمت و حکومت حاصل کریں گے بعینہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی امریکا کے اصل باشندوں کو خیال دلاوے کہ تم اپنی ویسی زبان اور ویسی علوم میں ترقی کر کے اپنی حکمران قوم میں عزت و دولت و حشمت و حکومت حاصل کرو گے۔“

”قومی ترقی اور حکومت دونوں ماں جانی بہنیں ہیں۔ پس جب کسی قوم میں حکومت نہ رہے تو اُس کی ترقی صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی فتح مند قوم کے علوم و زبان حاصل کرنے سے اپنے فتنہدوں کے ساتھ ملکی حکومت میں حصہ لے۔ علوم کی اُن شاخوں میں اعلیٰ درجہ کی لیانت حاصل کرے جن میں اُن فتنہدوں نے کاملیت حاصل کی ہے۔ سوشل عادات اور علمی و عملی و ملکی خیالات اُس قسم کے پیدا کرے جو فاتح و مفتوح میں کسی درجہ تک مناسبت پیدا کریں۔ جب تک فاتح و مفتوح میں اس قسم کی مناسبت پیدا نہ ہو اُس وقت تک باہمی دوستی کا ہر اثر محالات سے ہے اسی مناسبت کے نہ ہونے سے آج تک ہندوستان میں فاتح و مفتوح کے باہم دوستانہ

بڑناؤ نہیں ہے خوشامد کی باتیں جو کوئی چاہے سو کر لے اور پولٹکل طریقہ میں جو کچھ بیان کرنا ہو کیا جائے مگر ہندوستانیوں کا حال اپنی فتنہ قوم کے ساتھ غلامی کی حالت سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ہم اس کا الزام اپنی فتنہ قوم کے ذمہ نہیں دھرتے بلکہ خود اپنی قوم کے ذمہ ڈالتے ہیں کہ اُس نے خود اپنے تئیں اس لائق نہیں بنایا کہ ہماری فتنہ قوم ہم سے دوستانہ بڑناؤ کر سکے پھر علوم مشرقی کی ترقی اور چھوٹی سوٹی ترجمہ کی ہوئی کتابیں ہم کو کیا نتیجہ دیں گی! اور ہم کو کونسی عزت و دولت و حشمت و حکومت بخشیں گی! یونیورسٹی کالج لاہور نے اب تک ہم کو کس نتیجہ پر پہنچایا ہے جو آئندہ پوری یونیورسٹی بکرا اور مردہ علوم مشرقی کو زندہ کر کے اور ہماری بیانی شائستگی کو بھیر پیدا کر کے ہم کو پہنچانے گا۔ کچھ شبہ نہیں کہ یونیورسٹی کالج اب بھی ہماری ترقیوں کا سد راہ رہا ہے اور جب وہ یونیورسٹی ہو جائے گا اور ضرور ہو جائے گا تو ملک کے لیے، قوم کے لیے، ملکی اور قومی ترقی کے لیے آنت عظیم ہو گا ہم پر احسان رکھ کر ہم کو دھوکے میں ڈالا جاتا ہے کہ ہم تمہارے مشرقی علوم و تمہاری مشرقی زبان کو ترقی دیتے ہیں، مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیوں اور کس مطلب سے! اس کا جواب کسی پیرایہ میں اور کیسے ہی بیٹھے لفظوں میں دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہی ہے کہ غلامی کی حالت میں رکھنے کے لیے ۔

”گورنمنٹ نے ہمارے لیے سول سروس میں داخل ہونے کا رستہ گواہ میں کیسی ہی مشکلات پڑ گئی ہوں، ابھی تک کھلا رکھا ہے۔ بیرٹری کی سند، ڈاکٹری کا ڈپلومہ اور انجینیری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے کوئی امر ہم کو مزاحم نہیں ہے۔ ہندوستان میں اٹھین سول سروس کے عہدے کو جس میں ہماری بدبختی سے ابھی تک چنداں قابلیت کی ضرورت

نہیں سمجھی گئی ہے۔ جانے دو۔ مگر ہانی کورٹ کی حجتی حاصل کرنے سے ہماری امیدیں ابھی منقطع نہیں ہوئی ہیں۔ چند دستاویزوں کا کونسل قانونی میں داخل ہونا ابھی تک بند نہیں ہوا ہے۔ ہم کو سمجھنا چاہیے کہ ان حقوق کے واجبی طور سے حاصل کرنے کے لیے ہم کو کیا کرنا ہے؛ کیا مشرقی مردہ علوم کو زندہ کرنے والی یونیورسٹی؛ کیا ہماری پُرانی شائستگی کو پھر ہمارے لیے مہیا کرنے والی تجویز؛ معمولی عہدے بھی، جیسے وکالت و منصفی و سب ججی ہے؛ بغیر انگریزی زبان کی کافی بیانت کے ہم کو میسر نہیں آسکتے، پھر کیا مردہ علوم مشرقی کے زندہ ہونے اور ہماری مشرقی زبانوں کو ترقی سے ہم کو کچھ نتیجہ مل سکتا ہے؛ یونیورسٹی کالج لاہور، جو پوری یونیورسٹی ہونے والا ہے۔ بجز اس کے کہ ہم کو سیدھی ماہ چلنے سے روکے، ہم کو ہمارے حقوق سے محروم رکھے اور ہم کو اس لائق نہ ہونے دے کہ ہم اپنے حقوق کا دعویٰ کر سکیں۔ ہمارا حق میں اور کیا کر سکتا ہے؟

ہم کو ایسا لائق ہونا چاہیے کہ ہم دور دراز اور مختلف ملکوں کے سفر کرنے کے قابل ہوں ہم بساطی کی سی دوکانداری سے نکلیں۔ ہم اپنی اور اپنے ملک کی تجارت کو ترقی دیں، ہماری تجارت کی ”مٹھن اینڈ ہندو کمپنی“ کے نام سے کوشیاں لندن میں، ایڈنبرا میں، بروسلز میں، سینٹ پیٹرسبرگ میں برلن میں، وائنا میں، قسطنطنیہ میں، پکین میں، واشنگٹن میں اور دنیا کے تمام حصوں میں قائم ہوں اور ہم بحری و بری سفر اسی طرح خوشی سے کریں جیسے کہ اور تو میں کرتی ہیں جس سے ہم کو عزت و دولت، حشمت اور حکومت میں شرکت حاصل ہو۔ پھر کیا ہمارے مردہ مشرقی علوم کا زندہ ہونا اور مشرقی زبانوں کا ترقی دینا اور ہماری پُرانی شائستگی کو پھر قائم کرنا ہم کو اس قابل بنا دے گا؛ ہرگز نہیں۔ پس ہم کو علوم مشرقی

کے زہدہ کرنے اور مشرقی زبانوں کے ترقی دینے کے جال ہیں پھنسانا صاف ایسی تدبیریں کرنا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم کو ہماری ترقیات حاصل کرنے سے روکا جائے جو لوگ دور اندیش ہیں وہ کبھی ایسی باتیں کو پسند نہ کریں گے اور اس میں ہندوستان کی فلاح نہ تصور کریں گے۔ بلکہ اپنے حق میں ہندوستان کے حق میں اور گورنمنٹ کے حق میں شدید سفر بکھیں گے۔

اس کے بعد ان اسباب کی طرف جن سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ گورنمنٹ ہائی اکیڈمیشن موقوف کرنا چاہتی ہے۔ اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ”ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یونیورسٹی کی تعلیم نے بعض تعلیم یافتہ لوگوں کو زیادہ دلیر کر دیا ہے اور انہوں نے نہایت سخت اور بعض اوقات نہایت بیجا اور ناوایب اور نامنصفانہ نکتہ چینی گورنمنٹ پر کی ہے، مگر ہم دل سے یقین رکھتے ہیں اور گورنمنٹ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہی تعلیم یافتہ نکتہ چینی جس قدر گورنمنٹ انگریزی کے قدر دان ہیں شاید کوئی دوسرا نہ ہو گا۔ پس نکتہ چینی کے اندیش سے ہماری تعلیم کو برباد کرنا ہمارے حق میں کچھ انصاف نہیں ہے۔ ہم کو باخ العلوم اور مالک العلوم کے خطاب دینا اور پھر نابالغ کے سب سے پر رکھنا ہم کبھی پسند نہیں کر سکتے۔“

”ہماری لیے سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے یورپین لٹریچر اور یورپین سائنس میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کریں، جہاں تک ہم کو یونیورسٹی کے سچے خطاب حاصل ہو سکتے ہیں حاصل کریں، جب اس سے بھی زیادہ ہم میں جھگڑا ہو اسکو رڈ و کیمرج کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کو جائیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں حاصل کرنے میں کوشش کریں، اپنے تئیں مہذب و تعلیم یافتہ بنائیں اس کے اصلی و حقیقی معنوں میں بنائیں

اور جو فیض تعلیم و تربیت و تہذیب ہم نے اُن مہذب ملکوں میں حاصل کیا
 ہو اس کو اپنے ہموطنوں اور ہم قوموں میں پھیلا دیں بے شک ہم کو ایسا کرنے
 میں بہت مشکلات ہیں، ادھر ہم کو اپنی قوم کی جہالت و تعصب سے مقابلہ
 کرنا ہے اور ادھر اپنی فتنہ قوم کے اُن تنگدل لوگوں کی مزاحمت کا برداشت
 کرنا ہے جو ہماری موٹل اور پوکھل حالت کی ترقی اپنی طبعی تنگدلی کے برخلاف
 سمجھتے ہیں، ہماری انگلیش لائف، انگلیش تمدن جنٹلمین کیسے اخلاق، یہاں تک
 کہ ہمارے تغیر لباس سے بھی وہ ایسے ناراض ہوتے ہیں اور چشم چشم آلود
 سے ہم کو دیکھتے ہیں جیسے کوئی نہایت نیک دل بڑے مجرم کو دیکھتا ہو، مگر ہم
 کو اپنی اور اپنی قوم کی بھلائی پر نظر رکھنی چاہیے اور جو تکالیف اور مشکلات
 ہم کو پیش آئیں نہایت تحمل اور سچتہ مزاجی سے برداشت کرنی چاہئیں، مگر ہم
 اس بات کو مخفی رکھنا نہیں چاہتے کہ گریٹ ریپارمر (یعنی نانہ) ان باتوں کو
 ضرور ہونے دیگا اور کوئی مزاحمت اور کوئی ناخوشی و خفگی اس کو روک نہیں
 سکے گی لیکن بے شک یہ تنگدل کے خیالات ناراضی کو ترقی دینے والے اور
 فاتح و مفتوح ہیں ہمدردی و محبت کو توڑنے والے ہیں۔

یہ دو آرٹیکل جن سے مفہوم ہوتا تھا کہ سرسید نے خاکہ پنجاب یونیورسٹی
 پر حملہ کیا ہے جب یونیورسٹی کے مایوں کو شاق گذرے اور اُن کے برخلاف
 پنجاب سے بعض مضامین شائع ہوئے تو سرسید نے ایک تیسرا آرٹیکل جس
 کا عنوان ”ہمدی زبان اور ہماری اعلیٰ درجہ کی تعلیم“ تھا اور لکھا جس سے
 صریح یہ جتنا مقصود تھا کہ درحقیقت ہمارے دشمن پنجاب یونیورسٹی کی طرف
 نہیں بلکہ گورنمنٹ کی پالیسی کی طرف تھا جس سے خوف تھا کہ رفتہ رفتہ تمام
 ہندوستان کی یونیورسٹیاں یہی اصول نہ اختیار کر لیں، اس آرٹیکل کو اُنھوں

نے اس طرح شروع کیا ہے ”ہمارے دو اسکولوں نے ہمارے پنجاب کے
دو متفرق کو گھبرا دیا ہے بلکہ کسی قدر رنجیدہ کر دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان
اسکولوں سے ہم کو بااختصاص یونیورسٹی پر حملہ کرنا مقصود ہے اور اپنے حسن ظن
سے اس کی بنیاد حرد پر قائم کی ہے۔ ہم کو افسوس ہے اگر یہ کمینہ نضلت
ہم میں ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کالج جس کے اصول سے بلاشبہ ہم مختلف
الراے ہیں اگر وہ یونیورسٹی ہو جائے تو ملک کو ایسے اور وسیع ملک کو جس
میں تین اور یونیورسٹیاں موجود ہوں کوئی معتد بہ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اگر وہ
صحیح اصول پر قائم ہوتی ہے اور اس سے ملک کو بخلات بیماری رائے کے فائدہ پہنچنے
والا ہے تو چشم مارٹن۔ بیماری میں خوشی ہے کہ ملک کو فائدہ پہنچے اور بیماری رائے
غلط ثابت ہو۔ اور اگر وہ فی الحقیقت ملک کو فائدہ پہنچانے والی نہیں ہے تو اس
کو ہونے دو اس سے مخالفت کرتے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ خود اس
میں ناکامی کا بیج ہے اور وہ آپ ہی ناکام ہو جائے گی۔“

اس کے بعد وہ مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر کی تعلیم کے نتائج کی طرف
اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ ”بنارس کالج نے سنسکرت زبان کی ترقی پر بہت توجہ
کی مگر وہ ایک کو بھی سنسکرت میں ان پندتوں کے برابر نہیں بنا سکا جو دھرتی
باند سے کمرے پنے سنسکرت اور شیوالہ کھاٹ کی بیڑھیوں پر بیٹھ کر اپنی مقدس
زبان سنسکرت کو تحصیل کرتے ہیں۔ مگر ان کی تحصیل سے ملک کو بجز اس
کے کہ بنارس میں دس پانچ سنگاپڈت اور زیادہ ہو گئے کیا نتیجہ حاصل ہوا؟
یونیورسٹی کالج لاہور نے بلخ و بدخشاں کے طالب علموں کو جو کچھ تعلیم دی

لے جو آریکل سرسید کے خلاف لاہور سے نکلے تھے ان میں لکھا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کالج
میں بلخ و بدخشاں کے طالب علم پڑھتے ہیں۔

ہو۔ ہم کو اس کا حال معلوم نہیں۔ مگر آج تک (ہندوستان میں) اُس نے ایک کو بھی عربی یا فارسی میں اُن لوگوں کے برابر نہیں بنایا جنہوں نے مسجد کے چوڑوں اور خانقاہ کے تنگ و تاریک حجروں میں بیٹھ کر اور درود فاتحہ کی ردائی پہ گدبان کر کر عربی و فارسی کو تحصیل کیا اور اعلیٰ درجہ کا تبحر ان میں پیدا کیا۔ مگر اس کا نتیجہ بجز اس کے کہ سردوں کی روٹیاں کھانے والے اور زیادہ ہو گئے ملک کو کیا فائدہ پہنچا؟ اگر پنجاب یونیورسٹی قائم ہو جائے اور ہم کو علوم مشرقی میں ویسی ہی تعلیم دے (گو ویسی تعلیم بھی ممکن نہیں) تو بجز اس کے کہ چاند بھکاری اور چند فاتحہ کی ردائی کھانے والے ملک میں اور زیادہ ہو جائیں اور کیا نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے؟ ہم کو صاف صاف بتاؤ کہ لاہور یونیورسٹی کالج نے جن لوگوں کو.... پر وفیشیسی اور ہائی پروفیشیسی کے خطاب مرحمت فرمائے ہیں وہ کس مرض کی دوا ہیں اور اُن سے ملک کو قوم کو، اُس کی دولت کو، اُس کی حکومت کو، اس کی تجارت کو، اُس کے اخلاق کو، اس کی روشن ضمیری کو اور اس کی وسعت خیالات کو کیا فائدہ پہنچا یا آئندہ پہنچ سکتا ہے؟ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اس تعلیم مقصد یہ ہے کہ ایسے نہ ہونے پائیں تو سب کچھ تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد سرسید نے اس اعتراض کا سائنٹفک سوسائٹی جو انھوں نے علیگڑھ میں قائم کی تھی وہ بھی تو اسی اصول پر مبنی تھی کہ مغربی علوم ترجموں کے ذریعہ سے ملک میں شایع کیے جائیں۔ جواب دیا ہے۔ اور جو آسمان و زمین کا فرق سوسائٹی کے قیام کے وقت میں اور موجودہ زمانہ میں ہو گیا تھا اُس کو دکھایا ہے اور لکھا ہے کہ ”اُس زمانہ کے مناسب حال بلاشبہ ایک شخص کو جو تپے دل سے اپنی قوم اور ملک کی ترقی کا خواہاں ہو، اس خیال کا پیدا

ہونا کہ ہم ویسی زبان کے ذریعہ سے اپنے ملک و قوم کو ترقی دیں نہایت
 سچا اور واجب خیال ہو سکتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ تمام حجاب رفع ہوتے
 گئے اور خود زمانے نے بتا دیا کہ ہر جاتے ہو اور ٹھیک رستہ کہہ رہے
 پھر آٹھکل کو اس طرح ختم کیا ہے کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی
 کسی اصول پر قائم ہو، صحیح پیر یا غلط پیر، ہم کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتی
 اور اس لیے ہم ضرورت نہیں سمجھتے کہ پنجاب یونیورسٹی پر کوئی حملہ کریں۔ ہاں۔
 بلاشبہ ہم کو اس وقت خوف پیدا ہوتا ہے جبکہ ہم ایسے لوگوں کو جن کے ہاتھ
 میں خدا نے ہمارے ملک کی بھلائی بُرائی نفع نقصان سپرد کیا ہے۔ مردہ مشرقی
 علوم و مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے پر اُن پلستے ہیں تو ضرر سمجھتے ہیں
 بلکہ بہ لحاظ حب قومی اپنا فرض جانتے ہیں کہ اس امر کو بیان کریں کہ مردہ
 علوم مشرقی اور مشرقی زبانوں کے زندہ کرنے کی فکر میں پڑنا ہمارے لیے،
 ملک کے لیے، بلکہ گورنمنٹ کے لیے کچھ بھلائی نہیں ہے۔ اپنی قوم کو بھلتے
 ہیں کہ اُن کا مقصد مغربی علوم و مغربی زبان کو اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا تو ایسا ہے
 اندہ گورنمنٹ سے التجا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں یورپ کے علوم اور یورپ
 کی حکمت کو ترقی دینا اُس کا مقصد ہو۔

الہ آباد یونیورسٹی کی مخالفت

پھر ۱۸۸۹ء میں جب کہ الہ آباد یونیورسٹی اُسی اصول پر جس پر پنجاب یونیورسٹی
 کے قائم ہونے کا گمان تھا، قائم ہونے لگی اور سرسید کو معلوم ہوا کہ سرولیم میو
 لفٹنٹ گورنر سابق جو مشرقی علوم کے بڑے قند دان تھے اُن کی پُرانی تجویز کے
 موافق یہ یونیورسٹی بھی اسی غرض سے قائم ہونے والی ہے کہ مشرقی علوم اور

مشرقی زبانوں کو ترقی دے تو انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی کی بھی اسی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی جیسے کہ پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ اُن کے ایک آرٹیکل کے چند جملے بطور نمونہ کے میاں کہے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا: "افسوس ہے کہ لوگوں میں یہ خیال بچتا ہوتا جاتا ہے اور دن بہ دن اُس کو وسعت ہوتی جاتی ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی ایک نقل پنجاب یونیورسٹی کی ہوگی۔ شاید اُس کی صورت میں کچھ تبدیلی ہو مگر اُس کی پالیسی وہی ہوگی جو پنجاب یونیورسٹی کی تھی۔ پس علوم مشرقی کی ترقی کا دھوکا دے کر انگلش ہائی ایجوکیشن کو گھٹانا اور جس طرح ایک تیلی اپنے کو ٹھوکے پیل کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی سرکل میں گھومنے کے گرد پھراٹے جاتا ہے اسی طرح ہندوستانی رعایا کی آنکھیں بند کر کے دن رات ایک ہی چکر میں ڈالے رکھنا بے شک ایک مہذب گورنمنٹ کا کام ہے۔ ہم اپنا یقین ظاہر کرتے ہیں کہ الہ آباد یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی کی بہن نہیں سہنے کی وہ انگلش ہائی ایجوکیشن کے لیے بمنزلہ ایک مادر مہربان کے ہوگی۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ بیمار خیال غلط ہے تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ ہم کر کیا کرنا چاہیے؟ ہماری ماٹھے میں اس کا جواب صاف ہے۔ استقلال، استقلال، استقلال، محبت، محبت، محبت، محبت، کوشش، کوشش، کوشش، ہم کو گورنمنٹ کی پالیسی کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے اور خود اپنے لیے انگلش ہائی ایجوکیشن کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر ہم میں سیلف رسپکٹ کا کچھ اثر باقی ہے تو گورنمنٹ کو دکھا دینا چاہیے کہ بلاشبہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے مگر لوگوں کی رائیوں پر نہیں۔ اگرچہ بالیقین یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سرسید کی تحریروں کا کیا اثر ہوا اور کیا فی الواقع پنجاب یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی کا مقصد مشرقی علوم

کی آڑ میں انگلش ہاٹل ایجوکیشن کو گھسانا تھا یا نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ جوہ
 خیالات دونوں یونیورسٹیوں کی نسبت شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ
 گروہ میں پھیل گئے تھے اور جوہاں تک کہ معلوم ہوا ہے وہ خیالات محض بے بنیاد
 نہ تھے۔ اب تک علانیہ طور پر ان کا کچھ ظہور نہیں ہوا۔ بظاہر دونوں یونیورسٹیوں
 میں کوئی ایسا قاعدہ نہیں پایا جاتا جو ہاٹل ایجوکیشن کا سراہ ہو۔ بے شک پنجاب
 یونیورسٹی جس طرح بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں دیتی ہے اسی طرح انڈین
 کالج کے طلبہ کو بی اے او ایل اور ایم اے ایل یا بائخ العلوم اور مالک العلوم وغیرہ کی
 بھی ڈگریاں دیتی ہے مگر جیسا کہ سر سید نے کہا تھا کہ ”اس میں ناکامی کا بیج ہے“
 اس لیے وہ آپ ہی آپ ناکام ہو جائے گی۔ ”انڈین کالج روز بروز تنزل
 کرتا جاتا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ ایک عرصہ کے بعد وہ فضول سمجھ کر توڑ
 دیا جائے۔

سر سید نے جو مذکورہ بالا آرٹیکلوں میں مشرقی علوم یعنی قدیم منطق فلسفہ
 طبیعیات اور ہیئت وغیرہ جن کا دس و تیس مسلمانوں میں قدیم سے
 جاری ہے اور مشرقی زبانوں کو ترقی دینے یا ایسی زبانوں میں مغربی علوم
 کے شائع کرنے پر اس قدر دے دیے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے
 کہ وہ اس کے بالکل مخالف تھے۔ مشرقی زبانوں کی نسبت انھوں نے خود
 اپنے پہلے آرٹیکل میں لکھا ہے کہ ”بلاشبہ ہم اس بات کو کہ پنجاب یونیورسٹی
 کالج، قدیم مشرقی زبانوں کو ترقی دے، پسند کرتے ہیں کیونکہ قدیم لینگوج ماڈرن
 لینگوج کی زبور ہیں۔“ اسی طرح انھوں نے مغربی علوم کے دسی زبانوں میں
 ترجمہ ہونے کی نسبت دوسرے آرٹیکل میں لکھا ہے کہ ”ہم تسلیم کرتے ہیں
 کہ عام تعلیم کے لیے ہماری زبان نہایت عمدہ وسیلہ ہے جو تحصیل و تہائی

مکتبوں میں محدود رہنی چاہیے۔ اس کے سوا انھوں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں خود اس مضمون کا رزلویشن پیش کیا تھا کہ ”علوم عربی جو ہماری قومی نشانی ہیں اور علوم مذہبی جو ہماری روحانی تربیت کا ذریعہ ہیں بدستور قائم رہیں اور مسلمانوں کے اوقاف کا روپیہ ان کی ترویج اور ترقی میں صرف کیا جائے۔ پس انھوں نے جو علی العموم مشرقی علوم اور مشرقی لٹریچر اور ویسی زبانوں کے ترجموں کی مخالفت کی ہے اس سے ان کا صرف یہ مطلب ہے کہ ہندوستان کے کالجوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم محض انگریز لٹریچر کے ذریعہ سے ہونی چاہیے نہ یہ کہ کالجوں میں انگریز لٹریچر بطور سیکنڈ لٹریچر کے برائے نام رہ جائے اور اصل مقصود مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کی ترقی اور مغربی علوم کو بذریعہ ویسی زبانوں کے تعلیم دینا قرار دیا جائے۔

ٹیکنیکل ایجوکیشن کی مخالفت

مذکورہ بالا آرٹیکلوں کے سوا ان کی بشمار تخریریں اسی موضوع پر علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی جلدوں میں موجود ہیں جن میں شاید سب سے اخیر وہ آرٹیکل ہے جو علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۹ فروری ۱۸۹۸ء میں ان کے مرنے سے سوا مہینے پہلے شائع ہوا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے سر دست ٹیکنیکل ایجوکیشن کی چٹ داں ضرورت نہیں ہے بلکہ سب سے مقدم اعلیٰ درجہ کی مابغی تعلیم کی ضرورت ہے جو ہنگ بالکل پورے طور پر پوری نہیں ہوئی۔ چند برسوں سے جو اکثر اعلیٰ حکام اپنی اسپیسوں میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ضرورت بیان کرتے تھے اس سے بھی سرسید کو مبی اندیشہ ہو گیا تھا کہ گورنمنٹ کا ناشائستگی ایجوکیشن یا لٹریچر کی تعلیم کے موقوف کرنے کا ہے اور اسی لیے جب کوئی ایسی اسپیس ان کی نظر سے گذرتی تھی وہ ضرور اس کے برخلاف کچھ

نہ کچھ لکھتے تھے اور اسی بنا پر انھوں نے کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں ایک رزولوشن ٹیکنیکل ایجوکیشن کے خلاف پیش کیا تھا اور رزولوشن کی تائید میں ایک طویل اسپیچ کی تھی جو کانفرنس کی رولڈاؤ میں سمندر ج ہے اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ اگر ٹیکنیکل تعلیم کالجوں اور اسکولوں میں محض اوپنل طور پر جاری کی جائے اور ہماری اعلیٰ درجہ کی لٹریچر تعلیم کو اس سے کچھ صدمہ نہ پہنچے تو ہم کو اس میں کچھ عذر نہیں ہو سکتا لیکن اگر موجودہ طریقہ تعلیم میں کوئی ایسی تبدیلی کی جائے جو ہماری اعلیٰ درجہ کی لٹریچر تعلیم میں مغل ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں یہ بات ظاہر کر دینی چاہیے کہ ہم ایسی تبدیلی سے سخت ناراض ہیں۔ سر سید کو یہ خیال اس سبب سے پیدا ہوا تھا کہ آلہ آباد یونیورسٹی میں بغرض ترقی ٹیکنیکل ایجوکیشن یا یہ خیال ٹیکنیکل تہذیب گورنمنٹ متعصبہ دفعہ ایسے امور پیش ہوئے تھے جو سر سید کے نزدیک علانیہ لٹریچر تعلیم کو روکنے والے تھے اور انھیں دنوں میں گورنمنٹ شمال مغرب نے ایک رزولوشن بغرض ترقی ٹیکنیکل ایجوکیشن مسترد کیا تھا۔ اور ایک کمیٹی اس بات کے دریافت کرنے کو منعقد کی تھی کہ ٹیکنیکل تعلیم کو کن طریقوں سے ملک کے حق میں مفید بنایا جائے سر سید نے اس خوف سے کہ کہیں یہ سب تمہیدیں باقی ایجوکیشن کے موقوف کرنے کی نہ ہوں یہ رزولوشن کانفرنس کے جلسہ عام میں جس میں ایک ہزار لائق ہندوستانی موجود تھے اس غرض سے پیش کیا تھا کہ اس باب میں ہندوستانیوں کی عام رائے معلوم ہونے کے بعد یونیورسٹی کو اس سے آگاہ کیا جائے چنانچہ یہ رزولوشن جس کی تائید مولوی حسرت اللہ ایم اے اور مسٹر ٹھیوڈور بکن نے بڑے زور کے ساتھ کی تھی تمام مجمع کے اتفاق سے پاس ہوا اور آلہ آباد یونیورسٹی اور گورنمنٹ شمال مغرب کو اس تمام کارروائی کی اطلاع دی گئی۔

مرستید نے مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے لیے انھیں تدبیروں اور کوششوں پر
بس نہیں کی جو ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہونے والی تھیں بلکہ وہ قوم کی تعلیمی مشکلات
کی حل کرنے والی ایک ایسی انجمن چھوڑ گئے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے اس کو
قائم رکھا تو وہ تمام معاملات میں جو قومی تعلیم سے علاقہ رکھتے ہیں مرستید کا قیام البدل
ثابت ہوگی

محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام کرنا

انھوں نے سن ۱۸۸۶ء میں محمدن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی
جس کا ذکر پہلے حصہ میں تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ انھوں نے اس قومی انجمن
کو اپنی زندگی میں برابر گیارہ برس تک جاری رکھا اور اس عرصہ میں وہ تمام
مرحلے جو ابتداء ایسے کاموں میں پیش آتے ہیں نہایت خوبی کے ساتھ طے
کر دیے اور آئندہ نسلوں کے لیے رستہ بالکل صاف کر دیا کہ کس طرح
اُس کو چلائیں اور کنیز کر اس سے فائدہ اٹھائیں جو کام قوم کے کرنے کے تھے
ایک جم غفیر کے صلاح دشورے سے قوم کو اُن کے کرنے کی صلاح دی اور
جو باتیں گورنمنٹ پر ظاہر کرنے کی تھیں اُن کو بطور ایک جماعت کی رائے
کے با وقعت صورت میں گورنمنٹ کے کان میں ڈالا اور اپنی بے نظیر
یافت اور حسن تدبیر سے ایک ایسی مجلس کو جس میں تعلیم و تعلم کی روکھی بھکی
باتوں کے موا کچھ نہ تھا، چند سال کے عرصہ میں ایسا دلچسپ بنا دیا کہ پان پانسو
اور ہزار ہزار کوس سے ہندوستان کے مسلمان جو ایسی صحبتوں سے کوسوں
دور بھاگتے تھے خرچ کثیر برداشت کر کے ایسے چاڑ اور ملک کے ساتھ
جیسے کہ لوگ پھول والوں کی سیر یا شالامارے کے میلے میں دور دور سے آتے
ہیں۔ اس علمی مجمع میں آ کر شریک ہونے لگے۔

سول سروس فنڈ اور سول سروس کلاس

ایک اونڈیر ترقی تعلیم کی جو قوم کی معمولی بے پروائی سے براہ راست پوری نہ ہو سکی، سول سروس کلاس اور سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن کا قائم کرنا تھا جن کو سرسید نے اس غرض سے قائم کیا تھا کہ جو مسلمان اپنی اولاد کو ولایت کی تعلیم کے لیے تیار کرنا چاہیں ان کو محمدن کالج میں ایک خاص طریقہ پر تربیت لانی، تعلیم دیکھانے اور بعد امتحان کے جو لڑکے ولایت میں جانے کے قابل سمجھے جائیں ان کو چندہ کے ذریعے مدد دیکھانے۔ یہ تجویز بھی اگر عمل جاتی تو مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے حق نہایت مفید تھی۔ یہاں تک کہ ایجوکیشن کلاس کے بندو بھی اس ایسوسی ایشن میں شریک ہونے کی دل سے آرزو کرتے تھے چنانچہ ۱۸۸۷ء میں جبکہ سرسید نے پنجاب کا دوسرا سفر کیا تو لاہور کے مقام میں برہم سماج اور آریہ سماج کے تقریباً پچاس معزز ممبروں نے اور نینڈین ایسوسی ایشن لاہور نے سرسید سے یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ اس ایسوسی ایشن میں اگر ممکن ہو تو ہندوؤں کو بھی شامل کیا جائے وہ بہت خوشی سے اس میں چندہ دینے کو تیار ہیں۔ اگرچہ اور طریقوں سے ہندو مسلمانوں کے لیے ولایت کی تعلیم کی راہ کھل گئی مگر اس تدبیر میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی اور آخر کار وہ کلاس اور وہ ایسوسی ایشن دونوں توڑ دی گئیں۔

کونسل کی ممبری

کونسل کی ممبری کے زمانہ میں جو ملک کی خدمت سرسید نے کی اس کو نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ تمام تعلیم یافتہ ہندوؤں نے برابر تسلیم کیا ہے

چنانچہ جو ایڈریس انڈین ایسوسی ایشن لاہور نے ۱۸۸۴ء میں اُن کو دیا تھا اُس میں صاف لکھا تھا کہ ”ہندوستان کی قانونی کونسل میں جو آپ نے مہاسیست منفعیت بخش کارروائی کی اُس کی نسبت یہاں (یعنی ایڈریس میں) صرف سرسری طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے اور آپ جو اُس زمانہ میں جبکہ آپ مجلس مذکورہ (یعنی کونسل) میں کام کرتے تھے بے فدا رائے طور پر تمام فرقوں کی بہبودی فکر رکھتے تھے اور قومی خیالات کو دلیری اور راستبازی کے ساتھ ظاہر کرتے تھے اور بڑی سرگرمی کے ساتھ قومی مطالب کا خیال رکھتے تھے اس کے لحاظ سے آپ ہماری طرف سے اور ہمارے ہم وطنوں کی طرف سے ولی احسانندی کے مستحق ہیں۔ اس طرح برہم سماج اور آریہ سماج کے ایک معزز ڈپوٹیشن نے جیسا کہ سفرنامہ پنجاب میں مذکور ہے سید کی ممبری کونسل کی نسبت یہ الفاظ کہے تھے کہ ”ہم ممبران آریہ سماج اور برہم سماج لاہور تمام ہندوؤں کی طرف سے آپ کی اُن کوششوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو آپ نے قانونی کونسل میں اور نیز مختلف اوقات میں ہندوستان کے لیے کی ہیں۔ ہندو راجہ مہاراجہ (غالباً یہ اشارہ راجہ شیوپرہ شاد کی طرف ہے) جن سے بہت کچھ امید کی جاتی تھی ملک کے لیے خیر خواہ نہ ثابت ہوئے لیکن آپ نے حب الوطنی کو ہاتھ سے نہ دیا اور البرٹ ٹیل اور دیگر مفید ملک تجویزوں کی کونسل میں استقلال کے ساتھ حمایت کی۔“

حاشیہ بتفصیل) البرٹ ٹیل سے مراد وہ مشہور مسودہ قانون ہے جو لارڈ رین کے عہد میں وائسرائے کی کونسل کے لیگل ممبر مسٹر البرٹ نے ۱۸۸۴ء میں یہ اجلاس کونسل پیش کیا تھا اور اسی لیے یہ مسودہ البرٹ ٹیل کے نام سے

مشہور ہو گیا تھا۔ اس مسودہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مجسٹریٹوں کو بھی شل یورپین مجسٹریٹوں کے پورویہ پین اور یوریشین باشندگان ہند کے فوجداری مقدمات کے فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے۔ چونکہ اس مسودہ کو یورپین اور یوریشین باشندوں کے حقوق سے تعلق تھا اس لیے جس قدر کہ پچس لیٹر کنسل میں اور اخباروں میں اس مسودہ پر بحث اور ٹکنہ چینی اور مخالفت ہوئی تھی ویسی شاید ہی ہندوستان کے کسی مسودہ قانون پر ہوئی ہو۔ ہندوستانی ممبروں میں سے سر سید نے اور آئرلینڈ کرستو اس پال نے اس مسودہ کی بڑے زور سے تائید کی تھی مگر راجہ شیو پرشاد شل اکثر یورپین ممبروں کے اس کے مخالف تھے جس کی وجہ سے بنگالی اخباروں میں ان پر سخت تاڑ ہوئی تھی۔ جو اسپچ سر سید نے اس مسودہ کی تائید کی تھی اس کو کسی قدر اختصار کے ساتھ ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

انھوں نے کہا "مالی لارڈ: میں اس بات سے واقف ہوں کہ اس بل کی نسبت اخبارات میں بہت بحث ہوئی ہے اور یورپین اور یوریشین باشندوں کے غیر سرکاری گروہ میں اس کی نسبت بڑا تہلکہ مچا ہوا ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ قانون مجوزہ سے ان کی آزادی خطرہ کی حالت میں ہے۔ اگرچہ ہر طرح پر میری یہ خواہش ہے کہ جو لوگ یورپین اور یوریشین لوگوں نے ظاہر کی ہیں ان پر بخوبی غور کیا جائے لیکن مالی لارڈ میں اقرار کرتا ہوں کہ جو طریقہ مسودہ قانون سے برخلاف تحریک کرنے والوں نے اختیار کیا ہے اس پر میں دلی انوس کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ تحریک کرنے والوں نے اختیار کیا ہے اس پر میں دلی انوس میر

جمہوریتوں کے برخلاف نہایت سخت اور کسی قدر بے احتیاطی کے ساتھ
 کلمات استعمال کیے ہیں۔ مائی لارڈ، اس مقام پر میں اپنی دلی امید ظاہر
 کرتا ہوں کہ ہندوستان کے کسی حصہ میں میرے جمہوریت ان شخصوں کی
 پیروی نہ کریں گے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ واضعاً قانون کی غور کے
 واسطے وائل اور دونوں کے پیش کرنے کا سب سے عمدہ طریقہ عام
 طور پر مجمع کر کے سخت گفتگو کرنا ہے۔ میرے نزدیک جو مخالفت اس
 مسودہ قانون کی نسبت کی گئی ہے وہ زیادہ تر اس سبب سے ہے
 کہ لوگوں کو اس قسم کے معاملات میں ہندوستان کے قوانین کی تاریخ
 سے واقفیت نہیں ہے اور جو خفیف تبدیلی قانون مروجہ میں اس بل
 کی رو سے کوئی تجویز کی گئی ہے اُس کے سمجھنے میں انھوں نے
 غلطی کی ہے۔ میں کانسیٹیوٹنشل لا کے مسائل سے واقف ہونے کا
 دعویٰ نہیں کرتا لیکن اس مسودہ قانون کے برخلاف جو یہ حجت پیش
 کی گئی ہے کہ ہندوستان میں حضور قمبر بند کی یورڈین اور یوریشن رعایا
 ایسے حقوق رکھتی ہے جن کے سبب سے وہ ہندوستان کی لیمبلیٹو
 کونسل کے اختیار سے باہر ہے۔ اس کی قانونی صحت کی نسبت میں بل
 شامل شبہ کر سکتا ہوں۔ میں ہندوستان کی لیمبلیٹو کونسل کا ایک ناچیز
 ممبر ہونے کی حیثیت سے اس قسم کی پابندی کو ناپسند کرتا ہوں۔ ہم
 نے اپنے اختیارات انگلستان کی بڑی پارلیمنٹ سے حاصل کیے
 ہیں اور جب تک ہم ان اختیارات کی حد سے تجاوز نہ کریں اس
 وقت تک میرے نزدیک ان تمام معاملات میں جو ہندوستان

سے متعلق ہیں، اس کونسل کی قانونی حکومت کی نسبت شبہ کرنا بیجا معلوم ہوتا ہے۔ جو تحریک بالفضل اس مسودہ کے برخلاف کی گئی ہے اس میں ہم انھیں دلیلوں اور رالیوں کی تکرار پاتے ہیں جواب سے پہلے خطرہ پیدا کرنے والوں نے اس وقت پیش کی تھیں جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالتوں کے ہندوستانی ججوں کو صیغہ دیوانی کی ان ثالثت کی تجویز کا اختیار دیا گیا تھا جن میں یورپین اور یوریشین فریق مقدمہ ہوں ہیں بغیر اندیشہ تردید کے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ جن مقدمات میں یورپین شریک ہوتے ہیں ان میں ہندوستانی ججوں کے اختیارات دیوانی کے عمل میں لانے سے قومی اختلاف کی مثال کوئی نا انصافی بلکہ شکایت بھی نہیں پیدا ہوئی ہے بیشک اس زمانہ کے خطرے پیدا کرنے والوں کے اندیشے بے اصل تھے اور ان کی پیشین گوئی غلط ثابت ہونے والی تھی اس وقت تمام برٹش انڈیا میں ہندوستانی جج اہل یورپ پر اختیارات دیوانی ایک ایسے طریقہ میں استعمال کرتے ہیں جو درحقیقت اس الزام کے لائق نہیں ہے کہ قومی امتیاز کا اس میں اثر پایا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ دیوانی کا اختیار فوجداری کے اختیار سے مختلف ہے، دیوانی کا اختیار صرف جائیداد پر موثر ہوتا ہے اور فوجداری کا اختیار ذاتی خصانت اور آزادی پر پس ہندوستانی ججوں کے دیوانی کے اختیار کی اطاعت سے یہ لازم نہیں آتا کہ فوجداری کے معاملات میں بھی ان کے اختیار پر رونا مندی ظاہر کی جائے۔

(حاشیہ)

”مائی لارڈ! میں اس وجہ کو نہیں سمجھ سکتا جس پر یہ اقدار مبنی ہے۔ عدالت ہائے دیوانی کی وکالت ایک شخص کو دو لقمہ سے مجلس کر سکتی ہیں، دیوانی کے بعض ضیعے صرف ذاتی تعلقات ہی سے متعلق نہیں ہوتے مگر ان میں ذاتی گرفتاری کے اختیارات بھی شامل ہوتے ہیں اور انصاف کی غرض سے ان میں اس قسم کی کارروائی کی اجازت دی گئی ہے جو فوجداری کی عدالتوں کے واسطے قرار دی گئی، دیوانی کے مقدمات میں واقعات کی نسبت نتیجوں کے قرار دینے کا قاعدہ زیادہ تر وہی ہے جیسا فوجداری کے مقدمات میں ہوتا ہے ہندوستان میں دیوانی اور فوجداری کی عدالتوں میں امرحق کی تحقیقات ایک ہی قانون شہادت کے بموجب کی جاتی ہے۔ عدالت ہائے دیوانی کی تجویزوں سے فریقین کی نیکنامی پر تفسیر یا اسی طرح دھبا لگ سکتا ہے اور ان کی عزت برباد ہو سکتی ہے جیسی فوجداری عدالتوں کے احکام سے۔ پس میرے نزدیک دونوں عدالتوں کے جوڈیشل اختیارات میں امتیاز قرار دینے کے لیے کوئی معقول بنیاد موجود نہیں ہے۔ اگر راست بازی انصاف اور قومی بے تعصبی دیوانی کے معاملات میں ہندوستانی جموں میں پائی جاتی ہے تو اس بات کا سمجھنا مشکل ہے کہ ان میں وہی خصلیں فوجداری کے ان مقدمات میں نہ پائی جائیں جن میں یورپین اور یوریشین شریک ہوں۔ تمام ہندوستانی مجسٹریٹ اب بھی ان مقدمات فوجداری میں جن میں ایل لیو پ ناشری ہوں اور بطور فریق ضرر رسیدہ کے عدالتوں سے چارہ جونی کریں، اختیارات

(حاشیہ)

عمل میں لاتے ہیں۔ میں نے اب تک کبھی یہ نہیں سنا کہ یورپین
 انگریزی رعایا نے ہندوستانی مجسٹریٹوں سے دادخواہی کرنے میں
 کوئی عذر کیا ہو، پس جب کہ یہ صورت ہے تو اس بات کی کوئی
 وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستانی مجسٹریٹوں پر ان مقدمات میں
 جن میں یورپین انگریزی رعایا کی نسبت ناشیں پیش کی جائیں
 اس قسم کا اعتبار نہ کیا جائے۔ جو مجسٹریٹ کو دوسری کے مجاز ہیں۔
 ضرور ہے کہ وہ سزا دینے کے بھی مجاز ہوں اور رعایا کے کسی
 فرقہ کا یہ کہنا نا واجب اور بیجا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہندوستانی
 مجسٹریٹوں کے رو بہ و چارہ جوئی کے واسطے نو جائیں گے لیکن اس
 بات کو گواہ نہ کریں گے کہ جو ناش ہم پر کیجائے اُس میں وہ ہماری
 نسبت تجویز کریں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ محکمہ یہ صحیح اطلاع دی
 گئی ہے کہ جزیرہ لنکا میں جو اس ملک کے متصل واقع ہے۔
 اور جو برطانیہ کی وسیع سلطنت کا ایک جزو ہے ہندوستانی
 مجسٹریٹ انجج یورپین انگریزی رعایا پر فوجداری کا اختیار عمل میں
 لاتے ہیں اور وہاں اس جوڈیشل ناقابلیت کو جو قومی تفرقہ پر مبنی
 ہو، کوئی جانتا بھی نہیں حالانکہ انگریزی سرمایہ اور انگریزوں کی تجارتی
 اولوالعزمی کو بجائے اس کے کہ وہ اس جزیرہ سے جاتی رہیں ہو۔
 نہایت ترقی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک لنکا میں قبوہ کے کاشتکاروں
 کے مطالب بنگالہ کے نیل کے کاشتکاروں کے مطالب سے کسی
 حالت میں کمتر نہیں ہیں اور لنکا کے باشندے ہندوستان کے باشندوں
 کی نسبت کسی طرح پر کچھ کم ایشیائی نہیں ہیں اور نہ لنکا میں ان کا

ماشیہ
کوئی نہایت مضبوط محب قوم بھی میزان شائستگی میں اس سے زیادہ
نہر اعلیٰ رتبہ کا دعویٰ کرے گا جو وہ ہندوستان کے باشندوں کی
نسبت قرار دے گا مگر باوجود اس کے یوروپین انگریزی رعایا پر فوج
واری کے اختیار کے معاملہ میں پرنس انڈیا کا قانون لڑکا کے قانون
سے نیچھے ہے۔ پس مائی لارڈ! میرے نزدیک یہ کچھ نا واجب
بات نہیں ہے کہ ہندوستان کے باشندے یہ خیال کریں کہ اب
وہ زمانہ آگیا ہے کہ قانون میں اصلاح کرنے کی شدید ضرورت ہو گئی
ہے۔ مائی لارڈ! جیسا کہ میں نے اس مسودہ کو سمجھا ہے اُس میں یہ
تجویز نہیں کی گئی ہے کہ ہر ایک ہندوستانی مجسٹریٹ کو انگریزی
یوروپین رعایا کی نسبت تجویز کرنے کا اختیار دیا جائے بلکہ صرف
انھیں ہندوستانیوں کے معاملہ میں جنھوں نے اپنی مسلمہ راست باوری اور
لیاقت کی بدولت جوڈیشل سروس میں ایسے عہدے حاصل کیے
جائیں جو رتبہ میں اعلیٰ درجہ کے انگریزی عہدیداروں کے مساوی ہیں
اس مسودہ میں ان جوڈیشل نا قابلیتوں کے دور کرنے کی تجویز کی گئی
ہے جو قومی امتیاز پر مبنی ہیں۔ اس قسم کے ہندوستانی عہدیداروں
کی تعداد نہایت محدود ہے اور اسی وجہ سے اس مسودہ کی نسبت
یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ بغیر کافی غور و تامل کے پیش کیا گیا ہے یا
اس کے سبب سے وادرسی کے موجودہ ذریعوں میں کسی بڑی عملی
تبدیلی کا ہونا منظور ہے۔

”جس دلیل پر قومی امتیاز نہایت کا نہایت لحاظ کیا گیا ہے میرے
تذکرہ ایک اُس میں بڑی غلطی ہے جس چیز کی لوگ اُن ملکوں میں جن

کو شائبہ گورنمنٹ کی برکت حاصل ہے اطاعت کرتے ہیں۔ وہ کچھ خاص شخصوں کی حکومت نہیں ہے بلکہ وہ قانون کے احکام ہیں جب تک کہ قانون منصفانہ ہے طر فدار اور بارحم ہوگا اور جب تک اس قانون کا عمل درآمد ٹھیک ٹھیک طور پر کیا جاسکے گا اس وقت تک ان شخصوں کی قومیت جو قانون کی تعمیل کریں، باریک خیال والوں کے نزدیک بھی چنداں لحاظ کے قابل نہیں مہر فی چاہیے۔ جس چیز کی تعظیم اور ادب اور اطاعت درکار ہے وہ قانون کی حکومت ہے نہ کہ خاص خاص شخصوں کی۔ پس جو لوگ ہندوستانیوں کو اپنی برابری کا مستحق نہیں سمجھتے وہ اگر غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہندوستانی مجسٹریٹ گورنمنٹ کے نوکر ہیں جن کے متعلق گورنمنٹ کے احکام کی تعمیل کرنا ہے۔ قانون کے مناسب عمل درآمد کے واسطے انتظام کرنا گورنمنٹ کا فرض ہے اور اس مقصد کے واسطے گورنمنٹ کو ثبات عمدہ ذریعے جو ہم پہنچ سکیں منتخب کرنے پڑتے ہیں اور یہ ایک پورچ اور غیر واجبی تجویز معلوم ہوتی ہے کہ گورنمنٹ کی کوئی رعایا اس بات پر اصرار کرے کہ عہدیداروں کا انتخاب کسی خاص قوم یا فرقہ پر حصر رکھا جائے۔ میرے نزدیک یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے اصول کی نسبت کسی جدید فیصلہ کی حاجت نہیں ہے، اس سوال کی نسبت اس وقت بحث کی گئی تھی اور اس کا فیصلہ عمدہ طور پر ہو گیا تھا جبکہ انگلستان نے اپنی عالی حوصلگی اور انصاف سے ہندوستان کے باشندوں کو یہ حقوق عطا کیے تھے کہ سلطنت کی ملازمت میں ہندوستانیوں کی اسی حیثیت پر لوکری دی جائے

حاشیہ
جیسی کہ خاص انگریزوں کو اس فیصلہ کا پچھلے برسوں میں علی طور پر
نفاذ کیا گیا ہے اور انتظامی مصلحت اس خفیف تبدیلی کی مقتضی
ہوئی ہے جو اس بل میں تجویز کی گئی ہے۔

دو لیکن مائی لارڈ! اس مسودہ کی تائید میں انتظامی مصلحت
کی بہ نسبت زیادہ اعلیٰ درجہ کی وجوہات موجود ہیں، یعنی میں آزادی
النصاف اور انسانیت کے اُن عمدہ اصولوں کا ذکر کرتا ہوں جن
کی جائے قرار کہیں اس قدر نہیں جیسی کہ اُس قوم کی طبیعت میں ہے
جس نے سب سے پہلے غلاموں کو آزاد کیا اور سب سے پہلے
ہندوستانیوں کو اس امر سے مطلع کیا کہ سائٹیشنل حقوق کے
معاملہ میں قوم و مذہب کے امتیازات کی قانون کی نگاہ میں کچھ وقعت
نہیں ہونی چاہیے تاہم یہ سب دیتی ہے کہ کسی ملک کی فلاح و بہبودی
کی برباد کرنے والی اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے کہ حاکم
اور محکوم کے درمیان قومی تفرقہ قائم رکھا جائے۔ کوئی شخص مجھ سے
زیادہ اس باعث کا خواہاں نہیں ہو سکتا کہ انگریزی قوم اور ہندوستان
کے باشندوں کے درمیان دوستانہ خیالات کو بہ نسبت اس کے
جیسی کہ اب تک ہوئی ہے اور زیادہ ترقی ہو قدرت نے دونوں قوموں
کو ایک پولیکل اور میں کہہ سکتا ہوں کہ ایک سوشل رشتہ میں ملایا
ہے جس کو جوں جوں زمانہ گزرتا جاوے گا اسی قدر زیادہ استحکام
ہوتا جاوے گا۔ مجھ کو یقین و اتق ہے کہ جب تک قومی امتیازات کو ملک
کے عام قانون میں دخل ہو گا اُس وقت تک دونوں قوموں کے
درمیان اصلی دوستانہ خیالات کی ترقی کے باب میں مزاحمتیں قائم

ہیں گی۔ زندگی کی سوشل خوشی اور موافقت پر شکل ہماری سے اور ایک ہی قانون کے زیر حکم رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ذات کا سلسلہ شاید اس قدر عرصہ تک ہرگز قائم نہ رہتا اگر زمانہ قدیم کے متقن برہمن کے واسطے ایک قانون اور شدر کے واسطے دوسرا قانون نہ بناتے۔ خیر زمانہ سابق کی ضرورتیں کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن مائی لارڈ! میں امید کرتا ہوں کہ انگریزی حکومت کے ڈیڑھ سو برس گزر جانے سے ہم شائستگی کے اس درجہ تک پہنچ گئے ہیں کہ قومی امتیاز کو بہر کیفیت ملک کے عام قانون میں کم کرنا ہر ایک وجہ سے مناسب ہے۔ میرے نزدیک یقیناً اب وہ زمانہ آگیا ہے جبکہ ہندوستان کے تمام باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یوروپین ہوں یا پوریشین اس بات کو سمجھنے لگیں کہ وہ ہمسر رعایا ہیں اور ان کے پر شکل حقوق یا کانسٹیٹیوشنل رتبہ میں قانون کی نگاہ میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ماتحت جو حفاظت کا استحقاق ان کو حاصل ہے وہ کچھ قوم یا مذہب کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس بڑے حق کے سبب سے ہے جس میں سب شریک ہیں یعنی اس جلیل القدر شاہنشاہ کی وفادار رعایا ہونے کے حق کے سبب جس کے عہد دولت مہد نے ہندوستان کو امن و آسائش بخشی ہے اور اس کو تجارتی اولو العزمی اور زمانہ شائستگی کے سہرا اور قنون کے اکتساب کے واسطے ایک مناسب تمام بنا دیا ہے۔

”مائی لارڈ! چونکہ یہ موقع غالباً اخیر موقع ہے جو قانونی کونسل

جو کام خاص کر مسلمان معزز خاندانوں کی بھلائی کا سرسید نے ممبری کونسل کے زمانہ میں کرنا چاہا تھا اُس کا مفصل ذکر پہلے حصہ میں ہو چکا ہے یعنی قانون وقف خاندانی کا مسودہ جو میری محنت اور جانفشانی اور اعلیٰ درجہ کی قانونی لیاقت سے تیار کیا تھا اور جو بعض قانونی موافقات کے سبب کونسل میں پیش نہ ہو سکا وہ کم سے کم اس بات کو ہمیشہ یاد دلانے لگا کہ قوم کی بھلائی کی کوئی تدبیر جو خیال میں آسکتی تھی عام اس سے کہ ممکن الوقوع ہو یا نہ ہو، اس شخص نے اُس کا تقاضا کیا بغیر نہیں چھوڑا۔

نیشنل کانگریس کی مخالفت اور پٹریاٹک

ایسوسی ایشن قائم کرنا

نیشنل کانگریس میں شریک ہونے سے جو مسئلہ میں سرسید نے مسلمانوں کو باز رکھا اگرچہ انہوں نے اور نہایت افسوس ہے کہ ان کی اس کارروائی سے تعلیم

سے مخاطب ہو کر گفتگو کرنے کا مجھ کو حاصل ہوا گا اس لیے میں اس اخیر گفتگو کو بغیر کہے اس بات کے ختم نہیں کر سکتا کہ حضرات کا عہد حکومت اس بات پر دل سے مبارکبادی کا مستحق ہے کہ اُس میں ایک ایسا مسودہ قانون پیش کیا گیا جس کے ذریعہ سے میں یقین کرتا ہوں کہ حسد انگیز قوی امتیازات بہت کچھ دور ہو جائیں گے اور آخر کار حکام اور محکوم کے درمیان اس ملک میں جس میں بہت سی قومیں مختلف مذاہب کی رہتی ہیں، دوستی اور باہمی ادب اور سہاروی کو ترقی ہوگی۔

یافتہ ہندوؤں میں عموماً ایک قسم کی ناراضگی مسلمانوں سے پیدا ہو گئی مگر درحقیقت سرسید نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا کہ ایک خاصہ وار جھڑپی میں جو شاید اوروں کے لیے درخت بار بار ہوا اُن کا دامن الجھنے نہیں دیا۔ سرسید کی اس کارروائی کو اول اول تعلیم یافتہ لوگ نہایت تعجب سے دیکھتے تھے مگر پچھلے دنوں میں پونا کے افسوسناک واقعات نے امید ہے کہ اُن کا تعجب رفع کر دیا ہوگا۔ مسلمان جو تعلیم میں نسبت مرہٹوں سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے اگر کانگریس والوں کے خیالات عام طور پر اُن میں پھیل جاتے تو کچھ شک نہیں کہ وہ اپنی جہالت اور ناواقفیت اندیشی سے یہ نسبت پونا کے برہمنوں کے بہت زیادہ اپنے تئیں گورنمنٹ کی بدگمانی کا نشانہ بنالیتے اور جب اُن پر کوئی ایسا بُرا وقت اُتر پڑتا جیسا پچھلے دنوں میں پونا کے برہمنوں پر پڑا تو جو ہمہ روی اہل پونا کے ساتھ لاک نے ظاہر کی اور جس قدم اُن کی طرف سے ڈینیس میں پیروی کی گئی اس کا سوال حصہ بھی بد نصیب مسلمانوں کے ساتھ نہ مسلمانوں کی طرف سے اور نہ غیر قوموں کی طرف سے ظہور میں آنے کی امید تھی۔ اگر اس میں کسی کو شک ہو تو وہ مولوی ہدایت رسول کی مثال پر غور کرے جو کانگریس کے بعض جلسوں میں شریک ہو کر بنگالیوں سے آزادی کا سبق پڑھ کر آئے تھے اگر عام مسلمانوں میں جو تعلیم سے عموماً بے بہرہ ہیں اور جن میں شکل سے پچاس ہزار میں ایک تعلیم یافتہ نکلے گا۔ کانگریس میں گروہ کے خیالات پھیل جاتے تو اُن سے اکثر ایسی ہی نجف اور مالانی حرکتیں سرزد ہوتیں جیسی ہدایت رسول سے لکھنؤ کے ایک عام مجمع میں سرزد ہوئی اور جب وہ عدالت میں ماخوذ ہونے تو اپنے ہمیں ویسا ہی بے یار و مددگار پاتے جیسا مولوی ہدایت رسول کا حال ہوا کہ اس کو ضمانت تک میسر نہ آئی اور جو سزا عدالت مانتی تھی اس کے لیے تجویز کی اس کو بے چون و چرا اٹھنا مہرم کی طرح

پس اگرچہ مسلمانوں کی علیحدگی سے ہندوؤں میں ناراضی پھیل جانے کا نہایت افسوس ہے لیکن کانگریس کی شرکت میں جو مضر نتائج مسلمانوں کے حق میں پیدا ہونے والے تھے وہ ان کے لیے اس سے بہت زیادہ افسوس ناک ہوتے اس لیے مسلمانوں کو سرسید کا دل سے شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس شخص کی چیخ پکار سے وہ ایک ایسے انجیلیشن میں جو دیوانوں کے لیے ہوئی آواز اور ہشیاروں کے لیے خالی بادل کی گرج تھی، شریک ہونے سے باز رہے اصل بات یہ ہے کہ جب ہم کانگریس کے بلند ارادوں پر نظر کرتے ہیں اور پھر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے ہیں تو ہم کو لامحالہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ "حلو اخوندن را روئے باید" ہماری قوم میں عموماً پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔ مذہبی تعصبات مازہ اکالہ کی طرح قوم کو فنا کر رہے ہیں، ہر فرقت دوسرے فرقہ کی جان کا مال کا عزت و آبرو کا خواہاں ہے، پولیس ہمارے مذہبی جھگڑوں کی تحقیقات کرتے کرتے اور حاکم سرائیں دیتے دیتے ٹھک گئے مگر ہم رٹنے جھگڑنے کے لیے اُسی طرح تازہ دم ہیں، تمام قوم ہزاروں بیہودہ رسموں کی پابندی میں گرفتار ہے۔ اسراف اور فضول خرچی ہماری قومی خصیت بن گئی ہے، صد ہا خاندان اپنی فضولیوں کے سبب بگڑ گئے اور بگڑتے چلے جاتے ہیں کروڑ ہا روپیہ کی جائیداد قرضہ کی ڈگریوں اور عدالت کے جھگڑوں میں غیر قوموں کے پاس منتقل ہوتی چلی جاتی ہے، تقسیم کے لحاظ سے اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو ابھی ہم نے الف بے تے شروع کی ہے۔ سورتوں کی تعلیم جو قومی ترقی کی جڑ ہے، اس کے لحاظ سے ہم اب تک بالکل مضر ہیں، تجارت میں گویا ہمارا کچھ حصہ ہی نہیں دولت

کو ہمارے ساتھ وہ نسبت ہے جو پانی کو چھلنی کے ساتھ ہے، لاکھوں مسلمان شہر شہر اور گاؤں گاؤں بھیک مانگتے پھرتے ہیں مگر ہم اس کا کچھ تدارک نہیں کرتے، ہزاروں اشرف خاندانوں کے لاوارث اور مفلس بچے آوارہ اور مطلق العنان پھرتے ہیں مگر ہم سے ان کی پرورش اور تعلیم کا کچھ انتظام نہیں ہو سکتا، ہماری حالت پر فی الواقع یہ شل صادق آتی ہے کہ "اونٹ سے اونٹ پھری کنوسی کل سپدھی" جب کہ ہماری قوم کا یہ حال ہے تو کس برتنے پر ہم نیشنل کانگریس میں شریک ہو سکتے ہیں اور کیا سنے کر ہم گورنمنٹ سے ان حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں جن کے ہم مستحق نہیں ہوئے۔ ہم کو پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے کچھ مانگیں، مانگنے کا استحقاق پیدا کرنا چاہیے اور پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے ان اصلاحوں کے خواستگار ہوں ہو اس کے اختیار میں ہیں ہم کو وہ اصلاحیں کرنی چاہیں جو خود ہمارے اختیار میں ہیں۔ ہم کو اپنی معاشرت، مذہب، اخلاق اور تعلیم و تربیت کے متعلق ہزاروں کام کرتے ہیں جن کے بغیر ہماری دنیا اور دین دونوں خراب ہیں پھر ہم سلطنت کی کسی بات کی توقع رکھتے ہیں۔ ہم کو اپنے نبی کا یہ ارشاد یاد رکھنا چاہیے کہ "عَالَمُكُمْ مَّامَا لَكُمْ" (یعنی جیسی تمہاری حالت ہوگی ویسی ہی تم پر حکومت کی جائے گی) اس لیے سرسید نے اپنی لکھنؤ والی اسپچ کے آخر میں مسلمانوں کی یہ نصیحت کی تھی کہ "گورنمنٹ سے حقوق طلب کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اپنے نہیں ان حقوق کا مستحق بناؤ" اور کہا تھا کہ "جو چیز تم کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی ہے وہ صرف باقی ایجوکیشن ہے جب تک ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے ہم ذلیل رہیں گے، اور وہ سے لیست رہیں گے اور اس عزت کو نہ پہنچیں گے جس پر پہنچنے کو ہمارا دل چاہتا ہے۔ یہ دلسوزی کی چند نصیحتیں ہیں جو میں نے

تم کو کی ہیں مجھے اس کی کچھ پروا نہیں ہے کہ کوئی مجھے دیوانہ کہے یا اور کچھ، میرا فرض تھا کہ میرے نزدیک جو باتیں قوم کی بھلائی کی ہیں وہ ان سے کہدوں اور اپنا فرض ادا کروں اور خدا کے سامنے جوقادر مطلق اور رحیم اور گناہوں کا بخشنے والا ہے۔ اپنے ہاتھوں کو دھو دوں۔

یہ بے سلسلہ سرسید کی سرکاری، ملکی اور قومی خدمات کا جن میں بعض ایسی جلیل القدر ہیں کہ جس قوم میں ایک مثال بھی ایسی خدمات کی پائی جائے وہ قوم کم سے کم دنیا کی نظر میں حقیر نہیں سمجھی جاتی، جیسا کہ کہا گیا ہے

”مَنْ تَخَلَّى تَمِيمٌ وَنَ كَرِيْمٌ وَمُسْلِمَةٌ ابْنُ عَمْرٍا وَنَ قَسِيْمٌ“

(یعنی جب کہ مسلمہ بن عمرو یعنی میرا ممدوح، بنی تمیم میں سے ہے تو یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ بنی تمیم جو ان مردوں سے خالی ہیں)